مجلہ مکتبہ

(خاص اشاعت)

افسانے

تصاویر (۱) مسٹر وصنپت رائے بی۔ اے "منشی پریم چند" (۲) منشی سدرشن (۳) سلطان ابوالحسن تاناشاہ۔
(۴) غواصی (۵) خطاطی کا ایک شہکار۔

جلد (۵) بابتہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء م خورداد سنہ ۱۳۳۹ف شمارہ (۱)

فہرست

شذرات

یہ غیر معمولی اشاعت "مکتبہ" کی دو سالہ زندگی کی یادگار اور نئی جلد کے آغاز کی تقریب میں ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ کم و بیش بروقت شایع ہوتے ہوئے "مکتبہ" نے اپنی زندگی کے بچپن کے دو پرآشوب سال ختم کئے ۔

پچھلے سالوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ جو علمی خدمات "مکتبہ" نے انجام دی ہیں، وہ ہمارے معیار کے لحاظ سے ناقابل تعریف سہی، لیکن تقابلی حیثیت سے وہ دکن اور شمالی ہند کے اکثر مشہور رسالوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہا ۔ بلند پایہ اور مقبول ہر طرح کے مضامین اس میں شایع ہوتے رہے ۔ اچھے افسانوں کے پڑھنے اور لکھنے کا تو "مکتبہ" نے گویا ایک ذوق ملک بھر میں پیدا کر دیا ہے ۔ شاعری ابھی تک ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بنی ہوئی ہے لیکن شاعروں کی کثرت کے باوجود غیر فانی شعری کارنامے بہت کم پیدا ہو رہے ہیں ۔ اس لئے چند نظموں کے سوا، "مکتبہ" کو عام رسالوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ امتیاز حاصل نہیں رہا ۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ قحط شعری، ہماری قدیم شاعری کے غیر مقبول ہونیکے ساتھ ہی ساتھ جدید شعری فضا کے انتشار کا ایک ثبوت ہو ۔

جس ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ رسالے کے پچھلی جلدوں کے مضمون نگاروں نے ہاتھ بٹایا وہ بے حد قابل ستایش ہے ۔ اس احسان سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔ خصوصاً جناب ڈاکٹر اعظم کروی، مرزا ناصر علی بیگ بی ۔ اے ام، اسلم صاحب ۔ جناب راز چاندپوری، جناب صفی حیدرآبادی وغیرہ خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں ۔

یہ اشاعت خاص ادبی ہے اور صرف افسانوں پر مشتمل افسانہ ادبیات کا مہتم بالشان جزو ہے ۔ اس کی خدمت ادب کی قابل قدر خدمت ہے ۔ یہ افسانے زیادہ تر ایسی زبانوں کے شاہکار کے ہیں جو اب تک اردو سے روشناس نہیں ہوئے ۔ "سحر طراز" "دوزخ حرام" "محبت بنام شرافت" "ہنگامہ رقص" "فاتح" وغیرہ اسی قبیل سے ہیں ۔

خاص اشاعتوں کا دستور یورپ کے بلند پایہ اور مقبول رسالوں کے ساتھ عام ہے حیات انسانی اسقدر یکساں اور مکررات سے مملو ہے کہ جدت تھوڑی سی کیوں نہ ہو، بڑی خوش آئند ہوجاتی ہے ۔ اکثر یورپی رسالوں کا مطمح نظر عموماً تفریح ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ کی جدتیں نہایت مستحسن ہیں ان رسالوں کا ایک بڑا مقصد چونکہ عوام

اور نسبتاً کم تعلیم یافتہ طبقہ کو سنوارنا ہوتا ہے، اس لئے اس کی تکمیل کا اس سے بہتر ذریعہ انہیں مل سکتا ہے۔ دلچسپ سے دلچسپ چیزیں بھی جب ہر ائی جاتی ہیں تو اپنا سحر کھو بیٹھتی ہیں۔ یہ بھی ایک عذر خاص نمبروں کی اشاعت کا ہو سکتا ہے۔

گذشتہ موقع سے ہم نے ہر نئی جلد کے آغاز پر ایک غیر معمولی اشاعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دفعہ گذشتہ سے زیادہ تیاری ہو سکی لیکن ہمارے خیال کے موافق یہ بھی نہیں امید ہے کہ آئندہ ہم اس سے زیادہ انتظام کر سکیں گے۔

مسٹر راما نند چٹرجی، مدیر "ماڈرن ریویو" نے اپریل ۱۹۳۰ء کے رسالے میں ایک بڑی خوبی کی بات بتلائی ہے "کونسے رسالے پڑھنے چاہئیں" کی سرخی سے وہ لکھتے ہیں کہ انسان ہمیشہ ایسے رسالے اور کتابیں پڑھنا چاہتا ہے جو اس کے نقطۂ نظر کے مطابق ہوں۔ یہ حقیقت میں ایک فطری تقاضہ ہے۔ ہم اسی خیال کو پسند کرتے ہیں، جو ہمارے مذاق کے موافق ہو .... ہم خیال تحریروں کو دیکھ کر انسان اپنی رائے کو تقویت دیتا ہے۔ اس کو اپنی صدائے بازگشت بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے مسٹر چٹرجی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ انسان کو مخالف مطمح نظر کے رسالے پڑھنے سے بھی پہلوتہی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ان کا مطالعہ ہماری نظر کو وسیع کرتا اور ہمارے تعصبات کو دور کرتا ہے۔ غور کیجئے تو مخالفتوں سے انسان انسان بنتا ہے۔

دو مختلف تمدنوں کے تصادم کا مطالعہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اور اس تصادم کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ بنگال میں مسلمان اور ہندو صدیوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔ ان کے میل جول اور اختلاط سے عجیب عجیب طرح کی رسمیں اور اعتقادات نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ ایک طرف ہندویت کی خصوصیات جنگجو اور سخت جان مسلمانوں کی آمد اور حکومت میں بھی قائم رہیں دوسری طرف مسلمانوں کی جدید تہذیب ہندویت پر اثر انداز ہونے کے باوجود، مفتوح قوم سے ایک حد تک مفتوح ہو گئی۔ جوں جوں ہر دو کے رسم و رواج ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے اور مخلوط ہوتے رہے، دونو قومیں آپس میں قریب تر ہوتی گئیں۔ اس باہمی میل جول اور اثر اندازی کی مثالیں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بھی ملتی ہیں۔ ایک بنگالی مسلمان شاعر الاول نے ہندی نظم "پدماوت" کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ اس نے اور اسکے علاوہ بہت سے متقدمین اور متاخرین نے رادھا اور کرشن پر بنگالی زبان میں نظمیں بھی لکھیں۔ شیمانند کی تصنیف "مناسا منگلا" (جو سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں لکھی گئی) میں ایک جگہ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ لکشمندر کے لئے جو فولادی کمرہ تیار کیا گیا

تھا، اس میں کئی مقدس منتروں کے ساتھ قرآن مجید کا بھی ایک نسخہ منسا دیوی کے غضب کو فرو کرنے کی غرض سے رکھا گیا تھا۔

گذشتہ مہینے میں اردو کے ایک بڑے خدمت گذار لالہ سری رام۔ ایم۔ اے۔ کا انتقال ہوگیا۔ لالہ جی ۱۸۷۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے تھے۔ وہ مشہور راجہ ٹوڈرمل کی نسل سے تھے۔ اجداد نے مغل شہنشاہوں کے دور میں بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ ان کے والد رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے، دہلی اور لاہور کے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتے تھے چچا رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب آزاد اور حالی کے معاصر اور دوست تھے۔ آشوب کا تعلق بھی اردو زبان سے رہ چکا ہے۔

لالہ صاحب کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے گئے تھے جہاں سے انہوں نے ایم۔ اے تک کے امتحانات کامیاب کئے۔ (۱۸۹۸ء) اسی سال منصفی کا امتحان کامیاب کر کے سرکاری عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور لاہور، امرتسر، دہلی، جالندھر اور روہتک میں خدمت گزار رہے۔ ۱۹۰۲ء میں دمہ کا مرض لاحق ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں ترک ملازمت کرکے علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

لالہ سری رام کا مشہور کارنامہ "خمخانۂ جاوید" عرصہ تک باقی رہیگا۔ یہ اردو شعرا کا تذکرہ ہے اس کی چار جلدیں شایع ہوئی ہیں۔ مصنف کی تجویز کئی حصے لکھنے کی تھی۔ گو یہ اعلیٰ تنقیدی کارنامہ نہیں لیکن بڑا مادی تذکرہ ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ اردو تذکروں میں ایسا وسیع تذکرہ شاید ہی ملے۔ اس کی بدولت بہت سے اچھے شاعر روشنی میں آگئے ہیں۔

لالہ صاحب نے دیوان انور، مہتاب داغ، اور ضمیمہ یادگار داغ کو بھی مرتب کیا تھا۔ وہ ایک بڑے وسیع اور قیمتی کتب خانے کے بھی مالک تھے جس میں بعض مخطوطے اور نقاشی کے نمونے کمیاب ہیں۔

لالہ صاحب کی خدمات علمی دنیا میں انہیں عرصہ تک باقی رکھینگی۔

دار الطبع سرکار عالی کے ایجاد کردہ اردو ٹائپ کو زیادہ مفید اور ترویج کے قابل بنانے کی غرض سے بعض امور پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس ۱۴ ماہ اپریل میں شہر حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ جس کا افتتاح نواب صدر اعظم بہادر نے فرمایا کانفرنس کے صدر نواب ولی الدولہ بہادر نائب صدر اعظم تھے۔ دکن اور شمالی ہند سے اردو کے کئی سربرآوردہ انشا پردازوں کو دعوت دی گئی تھی۔ کئی امور پر بحث و مباحثہ کے بعد ایک سب کمیٹی ان پر غور کرنے کے لئے بنادی گئی ہے جو قریب میں اپنی رپورٹ پیش کریگی۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر اور مولوی عبدالحق صاحب اس میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(از جناب عزیز احمد صاحب)

اور آپ تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں یہ اتفاق تھا.......... محض اتفاق........ لیکن ہر معمولی سے معمولی بات کو بھی اس سے زیادہ سنجیدہ نظروں سے دیکھنا چاہیئے۔

ذرا خیال تو فرمایئے۔ میری عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ انسان اپنی تمام تر سیر و تفریح جذبات اور کشمکشوں سے نجات پا کر اپنے سامنے صرف تین راستے کھلے پاتا ہے۔ طمع۔ تمنا۔ اور فلسفہ۔ بلکہ یوں کہئے کہ صرف دو، کیونکہ تمنا بھی آسمانی یا ارضی امکانات کی طمع کا دوسرا نام ہے۔

فلسفی بننے کی تو میں جرأت کر نہیں سکتا۔ ایک تو یہ کہ مجھ میں اسقدر اہلیت نہیں۔ دوسرے یہ کہ میں "آپ کی دلیل کیا ہے؟" جیسے سوالوں کا مرکز بننا پسند نہیں کرتا۔ پھر بھی میں نے کافی آزاد اور متغیر زندگی بسر کی ہے میں دولت، مفلسی، بیماری، لڑائی، عزیزوں کی موت، قید، محبت، ذلت، اعتقاد، بے اعتباری سب کے مزے چکھ چکا.......... اور آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں انسانی طبیعتوں کو بھی ایک بڑی حد تک پہچان چکا ہوں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ تعجب خیز نہیں؟ جناب یہ تعجب خیز ہے۔ دوسروں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اپنے آپ کو بھول جانا ضروری ہے۔ ——— یہ فراموش کر دینا ضروری ہے کہ آپ کے گرد و پیش پر کیا بھلا اور برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور سینۂ فطرت میں آپ کو کیسی شاندار جگہ حاصل ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت کم آدمی اس راز سے واقف ہیں۔

اور اب اپنے آخری دنوں میں مجھ غریب گنہگار کو اپنی زندگی پر غور کرنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ مزید برآں ——— اب میں تنہا ہوں اور کہن سال۔ میری راتیں ——— آپ کیا جانیں کہ ایک بڈھے کی راتیں کسقدر طویل ہوتی ہیں۔ میرے دل اور میری یادداشت میں میری اور دوسروں کی زندگی کے ہزارہا واقعات محفوظ ہیں۔ گاؤ کی طرح یادداشت کی جگالی کرنا دوسری چیز ہے اور غائر نظر سے گذشتہ واقعات کو جانچنا دوسری بات۔ یہی وہ چیز ہے جس کو میں فلسفہ کہتا ہوں۔

اچھا تو ہم اتفاق اور قسمت پر بحث کر رہے تھے۔ میں آپ کی اس دلیل کا قائل ہوں کہ اتفاق 'اندھا ہے'،

بے ہنگام ہے، بے رحم ہے، بے نشان ہے۔ لیکن پھر بھی ــــــ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ــــــ کہ زندگی کو ترتیب اور تشکیل دینے والا قانون بھی یہی ہے ــــــ میرا مطلب یہ ہے کہ ان لاکھوں معمولی معمولی واقعات کا ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ ہر شے ہمیشہ چکر لگاتی رہی ہے ہر شے کسی دوسری شئے سے پیدا نہیں ہوتی تاہم بھڑکتی ہے، لرزتی ہے، ملاء اعلیٰ تک پہنچتی ہے۔ اور کسی زینے کی طرح جو وقت کی بلندی تک بل کھاتا ہوا تعمیر کیا گیا ہو۔ پھر چکر کھاتی ہوئی آتی ہے یہ زینہ صدیوں سے برابر چکر لگا رہا ہے ــــــ تمام زینوں کا زینہ ــــــ اس کی کوئی انتہا نہیں۔

آپ کہیں گے کہ اس قانون کا فی الحقیقت کوئی وجود ہوتا تو لوگ پہلے ہی اس سے واقف ہو جاتے۔ اور بآسانی اپنے مستقبل سے آگاہ ہو سکتے لیکن نہیں صورت واقعہ یہ نہیں۔ متعدد اقسام کے رنگ ہماری توجہ کو جذب کئے ہوئے ہیں۔ گلابی، لاجوردی، آسمانی، سبز رنگ جو ہم سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ہم اُس اصلی رنگ کو نہیں دیکھ سکتے جو ہم سے اسقدر قریب ہوتا ہے۔ صرف چند دماغ ہی ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی ان رنگا رنگ کی آویزشوں میں سے حقیقی اور اصلی رنگ کی بھی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

غالباً آپ میری گفتگو کو فلسفیانہ بکواس سمجھ رہے ہونگے ہے نا؟ ذرا ٹھہرئیے۔ اس طرح یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوتا جائے گا ــــــ آپ صاحبان کو تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟ مگر ریل کے ڈبے میں بھلا کوئی اور کیا باتیں کرے؟

میں ان قوانین کے وجود کا منکر نہیں جنہوں نے ستاروں میں گردش، اور غذا میں ہضم کی صلاحیت یکساں ذکاوت سے ودیعت کی ہے۔ میں ان قوانین کو مانتا ہوں۔ اور ان کا معتقد ہوں لیکن کوئی ہستی۔ کائنات اور قسمت سے بھی بالاتر موجود ہے۔ اگر یہ کوئی شئے ہے تو میں اس کو منطق کی بے ہنگامی یا بے ہنگام منطق کہوں گا اور اگر یہ کوئی شخص ہے تو اُس کے مقابلہ میں یہ روایتی شیطان اور اس کی داستانی ذریات معمولی مسخروں اور نوشق بچوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

یا یوں کہئے کہ وہ ہستی یا شئے وہ اُلوہیانہ طاقت ہے۔ جو ساری کائنات پر حکومت کر رہی ہے۔ اور جسکے سامنے شیطان کی کارگذاریاں طفلانہ شرارتوں سے بڑھ کر نہیں۔ شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھے؟ اچھا واضح طور پر سنئیے نپولین ہی کو لیجئے ایک تمثیلی زندگی۔ ایک عظیم شخصیت، ایک غیر مختتم طاقت ــــــ اور پھر اس کا انجام دیکھئے ایک چھوٹا سا جزیرہ، بیماریاں، غذا کی خرابی۔ ڈاکٹروں کی بے توجہی۔ اور ایک بڈھے کا تنہائی میں بڑبڑانا......

لیکن حقیقت میں اس باجبروت شہنشاہ کا یہ حسرتناک انجام، اسی پراسرار الوہیانہ طاقت کے ایک طنزیہ تبسم کا نتیجہ ہے اگر آپ اس تلخ سرگذشتِ حیات کو غائر نظروں، سے علماء کی لن ترانیوں کی پروا کئے بغیر پڑھیں (کیونکہ وہ ہر چیز کو عام

اور اصولی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں) ـــــ تو میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کیا نتیجہ اخذ کریں۔ مگر میرے نزدیک تو یہ بے ہنگامی اور منطق کے عجیب و غریب اتحاد کا ناقابل تشریح نتیجہ ہے۔

اچھا اب جنرل اسکوبلیف کی مثال لیجئے ـــــ ایک عظیم خوفناک شخصیت۔ جراءت اور خود اعتمادی کا مجموعہ انتہائی دبنگ، نڈر اور بہادر ہستی ـــــ اور پھر اس کا انجام، ایک سرائے کے عامیانہ بچھونے پر حسرتناک موت .... میں پھر دہراتا ہوں کہ یہ بے ہنگامی ہے، بے رحمی ہے، تاہم پھر بھی منطقانہ بے ہنگامی منطقانہ بے رحمی اور سچ پوچھئے تو ان دو حسرتناک موتوں نے ان دونوں عظیم الشان شخصیتوں کے مرقعوں کو زیادہ رنگین اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ـــــ یا دوسرے الفاظ میں ـــــ میں آپ کو یقین نہیں دلاتا۔ مگر خود مجھ کو پختہ یقین ہے کہ اب سے غالباً تیس ہزار سال کے بعد دنیا کی زندگی انتہائی پرلطف زندگی ہوگی محلات باغات، چشمے بیشمار ہونگے .... انسان غلامی، شخصی متاع فریب اور محکومیت کے پنجوں سے آزاد ہو جائے گا .... حسد اور بغض کا خاتمہ ہو جائے گا۔ رشتہ داری میٹ جائیگی اور سب آپس میں بھائی بھائی ہونگے۔ اور اس وقت وہ زبردست الوہیاتہ طاقت کائنات پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر مسکرائیگی۔ اور یہ پرانی خوبصورت دنیا جلکر خاکستر ہو جائیگی۔ ذرا خیال تو کیجئے جب انسان راست کاری یا مسرت کے معراج کمال تک پہنچ جاتا ہے تو اس کا انجام کسقدر خوفناک، خونیں، اور عبرتناک ہوتا ہے۔

نپولین یا قدیم یونانیوں کی مثال کی بھی ضرورت نہیں۔ خود میں نے اس پُراسرار اور خوفناک قانون کا اثر ایک معمولی سے واقعے میں دیکھا ہے۔ اگر ناگوار نہ ہو تو میں آپ کو وہ واقعہ سناؤں جس میں میں نے اس الوہیانہ طاقت کی صرف ایک ذراسی جھلک دیکھی۔

قصہ یہ ہے کہ میں ٹومسک سے ریل کے ایک معمولی پہلے درجہ کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ اسی ڈبے میں دوسرے مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان تنومند ہنس مکھ ریلوے انجینیر بھی تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت اچھا ہمسفر ثابت کیا۔ ایسے بے تکلف آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ اُس نے میرے لئے نچلی نشستگاہ خالی کر دی اسباب رکھنے میں مدد دی اور اسقدر اخلاق سے پیش آیا کہ مجھے ندامت سی ہونے لگی۔ اسٹیشنوں پر وہ کھانیکی چیزیں اور شرابیں خریدتا اور دوسرے مسافروں کو بھی بہت اخلاق سے مدعو کرتا۔ میں بھانپ گیا کہ اس کے دل میں انتہائی مسرت موجیں مار رہی ہے ابلی پڑتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھی بھی اسکی طرح بشاش اور خوش رہیں

اور واقعہ بھی یہی تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ مجھے اپنے دل کا حال کہنے لگا۔ ادھر اس نے قصہ شروع کیا اور اُدھر دوسرے مسافر کھڑکیوں میں سے گردوپیش کے مناظر مبالغہ آمیز دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ لوگ اس کی کہانی اس کی زبانی تقریباً دس بارسن چکے تھے اور سنتے سنتے اکتا گئے۔ میری قسمت میں بھی ان کی طرح اسی افسانے کا سننا لکھا تھا۔

یہ انجینیر، مشرق بعید سے وطن واپس جا رہا تھا۔ پانچ سال سے اس نے اپنے بال بچوں کو نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ سینٹ پیٹرس برگ ہی میں تھے۔ اُس کا اپنا اندازہ تو ایک ہی سال ٹھہرنے کا تھا۔ مگر اول تو وہ سرکاری کام سے اسقدر جلد پیچھا نہ چھڑا سکا اور بعد ازاں خود خانگی کاروبار کی وجہ سے اسے رک جانا پڑا۔ اُس نے کاروبار چھوڑنا بھی پسند نہ کیا کیونکہ اس میں دن بدن ترقی ہوتی جا رہی تھی اور کافی آمدنی حاصل ہو رہی تھی اور اب اس کاروبار سے فراغت حاصل کر کے وہ گھر واپس جا رہا تھا۔ پانچ سال تک وہ اپنے عزیز خاندان سے جدا رہا اور اب وہ تندرست، دولتمند، نوجوان، کامیاب، اور محبت کے لاتناہی خزانوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ کوئی شخص ان حالات میں کیونکر خاموش رہ سکتا ہے۔ اور اپنے بے پایاں اشتیاق، اور بے انتہا مسرت کو جو ہر میل کا عشرِ عشیر حصہ طے کرنے پر بڑھتی جاتی تھی کیونکر چھپا سکتا ہے۔

میں بہت جلد اس کے خاندانی رموز سے واقف ہو گیا۔ اس کی بیوی "سانا" یا "سونشکا" کہلاتی تھی۔ اُسکی لڑکی کا عجیب وغریب نام "یرونشکا" تھا۔ اس نے جب اسے چھوڑا تو وہ صرف تین برس کی ننھی سی بچی تھی۔ "اور اب میرے خیال میں" وہ چلدیا "اب وہ ایک نوجوان خاتون ہوگی۔ شاید شادی کے قابل" میں نے اس کی بیوی کے لڑکپن کا حال، اور ان تمام مصیبتوں کا حال سنا جو ان پر شادی کے بعد ہی پڑیں۔ اس زمانے میں وہ ایک طالبعلم تھا اور دو جوڑے کپڑے بھی اس کے پاس نہ تھے۔ اس زمانے میں اس کی بیوی نے کیسی ہمدردی اور دلسوزی سے اس کا ساتھ دیا۔ اور نایاب شریک زندگی بن کر اس کی خدمت کی۔

اُسنے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ فخر سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں دہکنے لگیں اور وہ بولا "کاش آپ بھی اس سے مل سکتے........ حُسنِ مجسّم ہے حُسنِ مجسّم —— اگر سینٹ پیٹرس برگ چلیئے تو میں ضرور تعارف کرادونگا۔ ہم سے ملنے آئیے گا؟ .... ضرور........ بلا تکلف........ سنتے ہیں آپ؟ .... انکار نہ کیجئے........ کروشینا ۱۶۵........ میں آپ کا تعارف کرادونگا اور آپ میری بڑھیا بیوی سے واقف ہو جائینگے۔ ہم ریلوے، انجینیروں کی محفل میں وہ صدرِ بزم رہتی ہے۔ دیکھیئے

اگر آپ نہ آئے تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔"

اس نے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے ملاقاتی کارڈ دیئے جن پر اس نے اپنا مجوزہ پتہ کاٹ کر پنسل سے اپنا سینٹ پٹیرس برگ کا پتہ لکھا تھا اور اس نے ہم سے یہ بھی کہا کہ اس کی بیوی نے یہ مکان گذشتہ سال ہی خریدا۔ جبکہ اُس کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی۔

ہاں۔ اس کے الفاظ میں آبشار کی سی تیزی تھی۔ دن میں چار چار مرتبہ وہ بڑے بڑے اسٹیشنوں سے اپنی بیوی کے نام جوابی تار بھیجتا، کہ آئندہ بڑے اسٹیشن ہو اس کا جواب موصول ہو۔ یا صرف ٹرین اور اپنے درجے کے پتہ پر جواب منگاتا۔ جب گارڈ تار لے کر داخل ہوئے اور اپنی سریلی آواز میں پکارتا "پہلے درجے کے فلانے مسافر کے نام ایک تار آیا ہے۔" تو اس کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک روشن ہالہ اس کے چہرے کو فرطِ مسرت سے منور کر دیتا۔ وہ گارڈ کو دل کھول کر انعام دیتا اور گارڈ ہی پر کیا موقوف ہے اس کے دل کی ترغیب تھی کہ ہر ایک کو خوش کرے۔ ہر ایک کو تحفے دے۔ اس نے یادگار کے نام سے بہت سی چیزیں مثلاً سائبیریا اور یورال کے جواہرات، چینی انگوٹھیاں، وغیرہ زبردستی ہم لوگوں کے سر منڈھیں۔ ان میں سے بعض بہت قیمتی چیزیں تھیں۔ صرف قیمت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صناعی کے لحاظ سے بھی۔ اُس کو اصرار سے بچنا محال تھا اور وہ اسقدر مسلسل اصرار اور التجا کرتا تھا کہ مجبور ہو جانا پڑتا تھا۔ جیسے کوئی لڑکا اپنی مٹھائی میں سے کچھ آپ کو دینا چاہے اور ضد کرے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔ بس اس کا بھی بالکل یہی حال تھا۔

اُس کے ساتھ بہت سامان تھا۔ اور وہ سب ان تحفوں پر مشتمل تھا جو وہ سنوتسکا اور پیروتسکا کے لئے لیکر جا رہا تھا۔ بہت سے خوبصورت کھلونے تھے چینی ریشم کے کوٹ تھے۔ اور ہاتھی دانت اور سونے کے ظروف، رنگین نکلیے، شرابیں، روغنی صندوقچے البم وغیرہ بہتری چیزیں تھیں۔ اور اس کی وہ حالت قابل دید تھی جب وہ یہ تحفے ہم کو دکھاتا جاتا اور نرم محبت بھرے لہجے میں اپنے عزیزوں کا ذکر کرتا جاتا۔ مانتا ہوں کہ اس کی محبت اندھی تھی، پرشور تھی، جنون آمیز تھی، سب کچھ تھی، مگر میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ سچی محبت تھی۔

ہر بڑے اسٹیشن پر اس کے تار کا جواب آتا۔ بچارہ اپنی بے پایاں مسرت کو چھپا نہ سکتا تھا۔ وہ ہم کو با آوازِ بلند تار کا مضمون پڑھ کر سناتا۔ گویا سوا اس کی خانگی مسرت کے ہم کو دنیا کے کسی کام سے کوئی واسطہ ہی نہیں بعض تاروں کا مضمون یہ ہوتا "اچھے رہو ہم سب کی طرف سے پیار، سب بیتاب ہیں ...... سنیوتسکا" یا "گھڑی ورٹائم ٹیبل دیکھ دیکھ کر سفر کرو ہمارے دل اور ہمارے خیالات تمہارے ساتھ ہیں"۔

ہمارے ہی ڈبے میں ایک اور مسافر بھی تھا کسی سونے کی کان کا مالک یا منیجر۔ ایک سچا سائبیری جس کے قد و خال یُوسنی یُورن کی تصویروں سے مشابہ تھے ـــــ خشک لمبا چہرہ گھنی سیاہ خوفناک بھویں۔ گھنی لمبی داڑھی ـــــ ایک ایسا آدمی جس کی چال ڈھال ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت سے تلخ تجربے حاصل کر چکا ہے۔ اس نے انجینیر کی طرف دیکھکر کہا۔

"آپ کو محکمۂ تار کا فضول استعمال نہ کرنا چاہیئے؟"

"فضول استعمال کیا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

"کیوں دیکھیئے نا۔ آپ اپنی بیوی کو کسقدر متاثر کر رہے ہیں۔ ہر شخص کو دوسرے کی دلی حالت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

لیکن وہ ہنسا اور اپنے عقلمند مخاطب کے زانو پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا "تو بڑے میاں ہیں آپ پُرانے خیالات کے لوگوں کا مقصد جانتا ہوں۔ آپ لوگ چپکے سے سفر کرنے نکلتے ہیں۔ اور بلا اطلاع دیئے۔ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہوئے کہ "میرا گھر کس حالت میں ہے" اچانک وارد ہونے کی کوشش کرتے ہیں نا؟"

لیکن اس کے مخاطب نے اپنی بھویں اٹھا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں ہاں۔ تو اس سے کیا؟ بعض اوقات یہ طریقہ صحیح ثابت ہوتا ہے"

تیزنی اور ماتسکو میں ہمارے درجے میں اور مسافر سوار ہوتے گئے اور ہمارے انجینیر کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ وہ بہت جلد ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتا۔ شادی شدہ آدمی سے وہ شادی شدہ زندگی کی مسرت سے متعلق باتیں کرتا اور کنواروں کے سامنے وہ کنوارپن کی خرابیاں بیان کرتا۔ نوجوان لڑکیوں سے وہ محبت کی نسبت گفتگو کرتا۔ شادی شدہ عورتوں سے بچوں کا ذکر کرتا۔ لیکن ہر قسم کے مباحثے میں اپنی سونشکا اور یروشکا کا ذکر ضرور چھیڑتا۔ میں ان باتوں کو بہت نرمی اور دلچسپی سے مگر ساتھ ہی ساتھ کسیقدر اکتا کر سن رہا تھا۔

صبح سویرے ہم سینٹ پیٹرس برگ کے علاقے میں داخل ہوئے۔ ریل کے دونوں طرف کہر چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ باہر دیکھتا اور پھر اپنی گھڑی دیکھنے لگتا۔

"اجی سلام علیکم" میں بولا "یہاں آپ کیا کر رہے ہیں"

"وعلیکم السلام"۔ مزاج شریف۔ میں ابھی ریل کی رفتار کا اندازہ لگا رہا تھا۔ ہم ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے ہیں جب ہم لوبان پہنچے تو اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ اسقدر مضطرب اور مشتاق تھا۔ کہ اس کا چہرہ

زرد ہو گیا اور وہ کمزور اور معمہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے بات چیت تک بند کر دی اور اخبار پڑھنے کا بہانہ کرنے لگا۔ بار بار وہ اٹھتا کھڑکی سے جھانکتا۔ رفتار کا اندازہ لگاتا۔ اور شاید یہ کوشش کرتا کہ ٹرین اور زیادہ رفتار سے چلے۔ کئی ہفتوں کا انتظار ان چند منٹوں کے انتظار کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ بالآخر ہم اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئے۔ پٹریاں بدلتے بدلتے بہت دیر ہو گئی۔ اور بالآخر جوبلی پلیٹ فارم بھی آ گیا۔ انجینیر نے اپنا یونیفارم پہن لیا۔ اور اپنا چرمی بیگ ہاتھ میں لیکر دروازہ کھولکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے غور کیا تو اس کا مضطرب چہرہ زرد تھا۔

ایک لمبی عورت سیمیں جاکٹ اور زمردین ٹوپی پہنے اور اس کے ساتھ ایک لڑکی چھوٹی فراک اور سفید پاتتابے پہنے کھڑی ہوئی تھیں ان کے پاس سے ہمارا ڈبہ نکل گیا۔ وہ ہر درجے کو مشتاق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہوں نے اپنے انجینیر کو نہ دیکھا۔ میں نے انجینیر کو ایک عجیب و غریب سست اور کانپتی ہوئی آواز میں پکارتے سنا "سوزنگا"

میرا خیال ہے کہ وہ دونوں مڑیں۔ دفعتاً ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ ...... آہ میں کبھی اسے بھول نہیں سکتا

...... یہ ایک چیخ تھی اضطراب، خوف، تکلیف اور رنج کی چیخ۔

ایک لمحے میں میں نے انجینیر کے سر کو پلیٹ فارم اور ریل کے زیریں حصے کے درمیان دیکھا۔ اس کا چہرہ میں دیکھ نہ سکا۔ پھر ایک اور بار میں نے اس کے سر کو ابھرتے دیکھا جو پھر نیچے غائب ہو گیا۔

میں بطور گواہ طلب کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی بیوی کو تسلی دینے کی کسقدر کوشش۔ مگر ان حالات میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میں نے ریلوے انجینیر کو بھی دیکھا۔ وہ ایک مسخ شدہ، زخمی گوشت کا لوتھڑا تھا اور بس۔ ٹرین کے نیچے سے نکالے جانے سے قبل ہی وہ دم توڑ چکا تھا۔ پہلے اس کا پیر کٹ گیا اور جب اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑا اور یہ اس کے سینہ پر سے ہو کر نکل گیا۔

اب میں قصہ کے سب سے زیادہ خوفناک حصہ پر پہنچ چکا ہوں۔ ان خطرناک اور ہمیشہ یاد رہنے والے لمحوں میں میں نے دل ہی دل میں خیال کیا "کسقدر حسرتناک موت۔ کسقدر بے ہنگام کسقدر بے رحم، اور کسقدر غیر منصفانہ موت" لیکن پہلی چیخ سنتے ہی مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا۔ کہ یہ بے ہنگامی، منطقانہ اور فطری تھی۔

اس کی بیوہ (بعد ازاں میں اس سے ملنے گیا اور اس نے مجھے اپنے شوہر کے متعلق کئی سوال پوچھے) مجھے صاف صاف الفاظ میں کہنے لگی کہ باہمی محبت میں وہ تقدیر کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کو اپنے یکجا ہونے، اور بامسرت زندگی بسر کرنے کا یقین تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ "آہ فردا" ہرگز قابل یقین نہیں ...... مشرق میں (جو قدیم عقل و تمدن کا گہوارہ ہے) یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص مستقبل میں کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو انشاء اللہ ضرور کہتا ہے

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ صرف تقدیر کی ترغیب انگیزی نہ تھی بلکہ یہ اسی پر اسرار خدا کا اصول تھا۔ کیا عجب کہ اگر وہ دونوں باہم ملتے تو ان کی زندگی بامسرت باکیف زندگی ہونے کے بجائے۔ بے لطف اور بے کیف زندگی ہوتی اور شاید وہ جدا جدا ہو جاتے۔ کیا معلوم ان کی محبت کا انجام بدگمانی، تھکن، حقارت اور شاید نفرت ہوتی۔

نوائے راز

(از جناب ابو الفاضل راز چاندپوری)

میکش تو ہوں لیکن ہوس خام نہیں ہے
میخانۂ ہستی سے مجھے کام نہیں ہے

جو بادہ حقیقت میں خوش انجام نہیں ہے
وہ اور ہی کچھ ہے، مۂ گلفام نہیں ہے

جو رند کہ سرگشتۂ اوہام نہیں ہے
ناکام بھی رہنے پہ وہ ناکام نہیں ہے

مے نوش ہزاروں نہیں لاکھوں سہی تو کیا
ساقی کا کرم بزم میں کیا عام نہیں ہے

کیا کہیے کہ کس رنگ میں ہیں میکدہ والے
مدت سے کوئی نامہ و پیغام نہیں ہے

جو دم ہے غنیمت ہے خرابات جہاں میں
پابند نفس گردش ایام نہیں ہے

میخانہ میں ہے سوء ادب حسن طلب بھی
اس بزم میں گنجائش ابرام نہیں ہے

بے مانگے پلا دیتا ہے خود ہی مجھے ساقی
جب دیکھتا یہ ہے کہ طلب خام نہیں ہے

جس بادۂ سرجوش سے ہیں مست ہوں اے راز
میخانۂ ہستی میں تو وہ عام نہیں ہے

دوزخ حرام

ترجمہ

(ازجناب محمد محی الدین صاحب)

ان دنوں کا جبکہ حضرت عیسیٰ اور سینٹ پیٹر کے قدموں کی برکت زمین پر ابھی قایم تھی یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کا گذر ایسے ایک لوہار کی دوکان پر ہوا جس نے شیطان کے ساتھ اس امر کا معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر سات سال تک وہ دنیا کے تمام لوہاروں کا صدر اور استاد بنا رہے تو اس مدت کے اختتام پر وہ خود کو اس کے حوالہ کر دیگا۔ دونوں نے ایک اقرارنامہ پر اپنے اپنے دستخط کر دیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی دوکان کے اوپر ایک بڑا سائین بورڈ لگا یا تھا جس پر لکھا تھا "یہاں دنیا بھر کے لوہاروں کا چودھری رہتا ہے۔"

جب حضرت عیسیٰ نے یہ پڑھا تو وہ اندر داخل ہوئے۔

"تم کون ہو؟" انہوں نے لوہار سے پوچھا۔

"دروازے پر جو لکھا ہے۔ پڑھ لو۔" اس نے جواب دیا" اور اگر تمھیں پڑھنا نہیں آتا تو ٹھیرو تا کہ کوئی پڑھنے والا تمھیں آکر بتاوے۔" قبل اس کے کہ حضرت جواب دیں ایک شخص اپنے گھوڑے کی باگ ہاتھ میں لئے ہوئے آیا جس کی وہ نعل بنوانی چاہتا تھا۔

"اچھا مجھے اس گھوڑے کو نعل لگانے کی اجازت دو" حضرت نے کہا۔

"تم کوشش کر سکتے ہو" اس نے کہا "تمھاری حالت بتا رہی ہے کہ تم بھی کچھ جانتے ہو۔ خیر اگر بگڑ بھی گئی تو میں درست کر لونگا" اس پر حضرت دوکان سے باہر آئے اور گھوڑے کا دایاں پاؤں ٹخنے کے پاس سے کاٹ ڈالا۔ اسے بھٹی میں جھونک دیا۔ ایک آہنی نعل لیکر اس کو گرم کیا حتیٰ کہ وہ سرخ انگارہ بن گیا۔ اس کے سوراخ اور کیلے تیز کئے اور اسے جلتے ہوئے پاؤں سے جوڑ دیا۔ اور پھر اسے اٹھا کر گھوڑے کے ٹخنے سے لگا دیا۔ جب یہ ہو چکا تو انہوں نے دوسرے سامنے کے پاؤں کو لیا اور اسی طریقہ سے جوڑ دینے کے بعد دو پچھلے پیر لیے۔ پہلے دایاں پھر بایاں بلوہیں بھٹی میں سفید رنگ ہونے تک دھونکتے رہے۔ نعلوں کے کیل اور سوراخ تیز کئے۔ ان کو کٹے پاؤں پر ٹھونک دیا۔ اور پھر کٹے ہوئے پاؤں کو صحیح سالم گھوڑے کے ٹخنے سے جوڑ دیا۔

لوہار اس دوران میں تعجب سے انھیں دیکھتا ہوا کھڑا رہا ۔

"تم نے کچھ ایسا برا کام نہیں کیا ۔ آخر کار" اس نے کہا ۔

"کیا تم واقعی ایسا ہی خیال کرتے ہو یا صرف دل رکھنے ـــــ" حضرت نے پوچھا ۔

اسی وقت لوہار کی ماں اسے اطلاع دیتے آئی کہ کھانا تیار ہے ۔ وہ بوڑھاپے کے بوجھ سے دھری ہوکر بڑی مشکل سے چل رہی تھی ۔ "اچھا ۔ اب غور سے دیکھو میں کیا کرتا ہوں اور یاد رکھو" حضرت نے کہا ۔ بوڑھی کو اٹھا کر دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا جس میں سے وہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بنکر باہر نکلی ۔ "میں اپنی پہلی رائے کو دہراتا ہوں" اس نے کہا ۔ "تم اچھے لوہار ہو ۔ حالانکہ میرے دروازہ پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں دنیا کے تمام لوہاروں کا استاد رہتا ہے ۔ مگر کسی فن کو پورا حاصل کر لینے کے لئے ایک سے زیادہ عمریں درکار ہیں" یہ کہتے ہوئے وہ کھانے کے لئے اپنے گھر گیا جب وہ واپس ہوا تو دیکھا کہ کوئی شخص اپنے گھوڑے کو نعل دلوانے کھڑا ہوا ہے ۔ حضرت اور سینٹ پیٹر اب بھی وہیں تھے ۔

"ابھی ۔ ابھی ۔ ایک منٹ میں" لوہار نے کہا ۔ "میں نے ایک نیا طریقہ سیکھا ہے جو وقت بچانے کے لئے کچھ ایسا برا نہیں" اس نے یہ کہکر گھوڑے کے چاروں پاؤں قلم کر ڈالے ۔ "کیونکہ" اس نے کہا "کوئی وجہ نہیں کہ انھیں یکے بعد دیگرے کاٹ کر کوئی کیوں پریشان ہو اور وقت ضایع کرے ۔"

اس نے چاروں پاؤں بھٹی میں رکھدیے ۔ جیسا کہ ابھی حضرت کو کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا ۔ کوئلے کا ایک ڈھیر لگا دیا ۔ اور شاگردوں کو خوب زور زور سے دھونکنے کا حکم دیا ۔ مگر نتیجہ وہی نکلا جس کا ہر ایک کو متوقع ہونا چاہیئے پاؤں جل کر راکھ ہوگئے اور اس کو گھوڑے کے دام اپنی گرہ سے دینے پڑے ۔ اپنی اس حرکت سے وہ کچھ خوش نہ ہوا ۔

اسی وقت ایک غریب بوڑھی غلیظ عورت رینگتی ہوئی سامنے آئی ۔ بھیک مانگتی ہوئی ۔ لوہار نے سوچا گو اس کو پہلے کام میں کامیابی نہیں ہوئی مگر دوسری میں ہونا یقینی ہے ۔ اس لئے اس نے بوڑھی عورت کو پکڑا اور اس کی چیخوں ۔ التجاؤں اور رونے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے بھٹی میں ٹھونس دیا ۔

"تو بڈھی ہوگئی مگر عقل نہیں آئی ۔ نہیں جانتی کہ یہ سب کچھ تیرے ہی بھلے کے لئے ہو رہا ہے" اس نے کہا تو ایک منٹ کے اندر نوجوان لڑکی بن جائیگی ۔ اور میں ایک پیسہ بھی تجھ سے معاوضہ کا نہ لونگا ۔" مگر بڈھی کا حال بھی گھوڑے کے پاؤں کے حال سے کچھ بہتر نہ ہوا ۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے ۔"

"شرم ۔ شرم" حضرت نے کہا ۔

"اوہ۔ اس کا تبدیل ہو جانا یقینی تھا" اس نے جواب دیا "میرا کیا قصور۔ شرم تو شیطان کو کرنا چاہیئے جو اپنے وعدہ کو پورا نہیں کر رہا ہے"

"فرض کرو۔ کہ میں کہ تمھاری کوئی تین خواہشوں کو پورا کرنے کا وعدہ کروں۔ تو تم کیا خواہش کروگے" حضرت نے کہا "پہلے وعدہ کرو" لوہار نے جواب دیا "پھر وہ بھی معلوم ہو جائینگی۔

حضرت نے وعدہ کیا۔ اور پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"اچھا۔ میری پہلی خواہش یہ ہے کہ میں جس کسی کو اس دوکان کے باہر کے سیب کے جھاڑ پر چڑھ جانے کا حکم دوں وہ چڑھ جائے اور پھر بغیر میری اجازت کے نہ اتر سکے" لوہار نے کہا "دوسرے یہ کہ میں جس کسی کو اس کمرہ کی آرام کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہوں۔ وہ وہیں جما رہے۔ اور بغیر میری اجازت کے نکل نہ سکے۔ اور سب سے آخری یہ کہ اگر میں کسی کو اس لوہے کے جال کے بٹوہ میں جو میرے جیب میں پڑا ہے گھس جانے کے لئے کہوں تو جب تک میں بٹوہ نہ کھولوں وہ نکل نہ سکے"

"تم نے بیوقوفی کی" سینٹ پیٹر نے کہا۔ پہلے اپنی بخشائش اور خدا کے کرم کی دعا مانگتے پھر ——" "میں اتنی بڑی چیز مانگنے کی جرأت نہیں کرسکتا" لوہار نے کہا جس پر حضرت اور سینٹ پیٹر سلام کر کے رخصت ہوئے۔ زمانہ گذرتا گیا۔ اور جب سات سال گذر گئے تو شیطان اقرار نامہ کے عہد کے موافق لوہار کو لینے آیا۔

"کیا تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو؟" اس نے دوکان کے دروازہ میں ناک گھسا کر پوچھا۔

"ہاں۔ مگر پہلے میں اس کیلے کا سر بنا چاہتا ہوں" لوہار نے جواب دیا "جب تک تم ذرا اس سیب کے درخت پر چڑھ جاؤ۔ اور ایک سیب توڑ لاؤ۔ تم کو خود بھی سفر کی مشقت سے بھوک پیاس لگ رہی ہوگی"

شیطان نے اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور درخت پر چڑھ گیا۔

"اب جو میں اس کام پر غور کرتا ہوں" لوہار نے کہا۔ "تو مجھے خوف ہوتا ہے کہ یہ کم از کم چار برس میں ختم ہوگا۔ کیونکہ کیلے کا لوہا ذرا سخت ہے۔ اور اس عرصہ تک تم درخت سے نیچے نہیں اتر سکتے۔ وہیں آرام سے بیٹھے ہوئے سیب کھایا کرو۔

شیطان نے پہلے خود اترنے کی کوشش کی۔ پھر التجا کرنے اور دھمکیاں دینے لگا۔ مگر کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ آخرکار اس نے پھر چار برس کے بعد آنے کا وعدہ کر کے اپنی جان چھڑائی۔

"اچھا۔ اب تم اتر سکتے ہو" لوہار نے کہا۔

جب چار سال گزر گئے تو شیطان پھر نمودار ہوا۔

"اب تو تم تیار ہو" شیطان نے پوچھا۔ "اور اس کیلئے کا سر نوکیلی کا بنا دیا ہوگا۔"

"ہاں۔ بنا تو دیا ہے" لوہار نے کہا۔ "مگر پھر بھی تم ذرا جلد آئے ہو۔ کیونکہ اس کی نوک تیز نہیں ہوئی۔ خیر اب آئے سو آئے۔ تھکے ماندے ہونگے۔ ذرا اس آرام کرسی پر بیٹھ کر سستا لو میں ابھی بنا لیتا ہوں۔" "شکریہ" شیطان نے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مگر جونہی وہ بیٹھ چکا تو لوہار کہنے لگا۔ "نوک تیز ہونے کے مزید چار سال درکار ہیں۔ اور اگر تم چاہو تو وہیں بیٹھ کر دیکھ سکتے ہو۔" شروع شروع میں شیطان نے نرمی سے التجا کی کہ وہ اسے کرسی سے چھڑا دے۔ مگر آخر کار اسے غصہ آ گیا اور وہ اسے ڈرانے دھمکانے لگا۔ لوہار ہر قسم کے بہانہ بتاتا رہا۔ اور کہنے لگا کہ یہ سب لوہے کا قصور ہے جو اتنا سخت ہے۔ اور شیطان کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ کرسی بڑے آرام کی ہے۔ بیٹھ پر گدے لگے ہیں۔ اور چار سال بات کرتے ہیں گذر جاتے ہیں جس کے بعد وہ ٹھیک اسی وقت اسے رہا کر دیگا۔

آخر کار شیطان نے دیکھا کہ سوائے اس کے کہ چار سال کی اور مہلت دی جائے کوئی چارہ نہیں۔

"ہاں اب تم اٹھ سکتے ہو" لوہار نے کہا۔ اور شیطان اتنی تیزی سے جتنا کہ اس سے ممکن تھا نکل بھاگا۔

چار سال گذر جانے کے بعد وہ پھر لوہار کے لینے کو آیا۔

"اب تو تم یقینی طور پر چلنے کے لئے تیار ہو گئے ہو گے؟ دروازے میں سے اپنی ناک دکھاتے ہوئے شیطان پوچھا۔" "ہاں۔ بالکل ہی فوراً چلنے کے لئے تیار ہوں" لوہار نے کہا۔ "تم جہاں کہو میں چلتا ہوں۔ مگر ذرا سنو تو۔ ایک چیز ہے جس پر میں ایک طرف سے غور کر رہا تھا اور تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ تم کو جون بدلنے پر قدرت حاصل ہے۔ تم جیسا چاہے بن سکتے ہو؟ کبھی بندر کبھی انسان۔ کبھی بچہ کبھی بوڑھا۔ کبھی بالکل چھوٹا جیسے ریت کا ذرہ اور کبھی ایسا عظیم الجثہ جیسے پہاڑ۔"

"ہاں۔ صحیح ہے" شیطان نے جواب دیا۔

"مگر بظاہر تو یہ ممکن نہیں نظر آتا۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو میرے اطمینان کی خاطر تو اس لوہے کی جال کے بٹوے میں گھس جاؤ اور دیکھو کہ کہیں اس کی کوئی کڑی تو ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔ میرے روپیہ اکثر اس میں سے گر جاتے ہیں۔"

"اچھا لو دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے شیطان نے خود کو اتنا چھوٹا بناتے ہوئے جتنا کہ اس سے ممکن تھا۔ بٹوہ میں گھس گیا اس کے اندر جاتے ہی لوہار نے کھٹکا دبا کر اسے بند کر دیا۔

"اس کی سب کڑیاں صحیح سالم ہیں" شیطان نے بٹوہ کے اندر سے جواب دیا۔
"شاید" لوہار نے جواب دیا "مگر وقت پر ایک ٹانکا نو ٹانکوں کی آمد کو روکتا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ ذرا اس کے کونوں کو پھر ایک مرتبہ جھال دیا جائے"۔ یہ کہکر اس نے بٹوہ بھٹی میں جھونک دیا جہاں وہ تپ کر سرخ انگارہ بن گیا۔
"ہائے۔ ہائے۔ مرا ——— کیا تو دیوانہ ہے؟ نہیں جانتا کہ میں اندر ہوں" شیطان نے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا
"مجھے خود افسوس ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں" لوہار نے کہا "ایک پرانی کہاوت ہے کہ لوہے کو پہلے سرخ کرو پھر گھن مارو۔ ورنہ ٹوٹ جائیگا" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا وزنی گھن اٹھایا اور بٹوہ کو چمٹے سے اٹھا کر نھائی پر رکھتے ہوئے اپنی پوری قوت سے دے مارا۔
"اوہ۔ ہو۔ میں مرا" شیطان چلانے لگا "مجھے چھوڑ دے۔ مہربانی کر کے چھوڑ دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی میں تیری منحوس صورت نہ دیکھونگا۔ اقرار نامہ پھاڑے دیتا ہوں ہمیشہ کے لیے"۔
"ہاں غالباً اب بٹوہ درست ہو گیا ہوگا" لوہار نے کہا۔ "اور اب تم باہر نکل سکتے ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے ڈھکنا کھول دیا۔ اور شیطان باہر کود کر تیزی سے ایسا بھاگا کہ پلٹ کر تک نہ دیکھا۔ لوہار نے جب اس معاملہ پر غور کیا تو اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے شیطان کے ساتھ معاہدہ کرنے اور پھر اس سے ایسا سلوک کرنے میں سخت غلطی کی ہے: کیونکہ اگر میں جنت میں داخل نہ ہو سکوں" اس نے اپنے آپ سے کہا "تو پھر میرا ٹھکانا کہاں؟ دوزخ کے مالک (شیطان) نے تو میری منحوس صورت دیکھنے کی قسم کھائی ہے"۔
اس نے ارادہ کیا کہ آخر ایک نہ ایک دن یہ مشکل ضرور پیش آتی ہے۔ پھر اس سے آج ہی کیوں نہ آزما لیا جائے۔ کیونکہ ایک مرتبہ راستہ دیکھ لینے اور اپنا ٹھکانا دیکھ پا لینے کے بعد دوسری مرتبہ وہاں جانے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے کندھے پر گھن ڈال لیا اور نکل کھڑا ہوا۔
وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک دوراہہ ملا۔ جہاں سے ایک راستہ جنت اور ایک دوزخ کو جاتا تھا۔ وہاں اسے ایک نو آموز درزی ملا جو اپنی استری ہاتھ میں لئے جا رہا تھا۔
"آداب عرض ہے مزاج شریف" لوہار نے پوچھا "کدھر کے ارادے ہیں؟"
"جنت بشرطیکہ داخل ہو سکوں" درزی نے جواب دیا۔
"اوہ۔ تو مجھے افسوس ہے کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے" لوہار نے کہا "میرا ارادہ

پہلے دوزخ سے شروعات کرنے کا ہے کیونکہ اس کے مالک کی خدمت میں مجھے ذرا نیاز حاصل ہے۔"
انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ اور ہر ایک اپنے راستہ پر ہولیا۔ لوہار جو موٹا تازہ لانبے قد کا جوان تھا۔ کمزور درزی سے کہیں زیادہ تیز چلنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں دوزخ کے پھاٹک پر پہونچ گیا۔ اس نے دربان سے اطلاع کروائی کہ کوئی شخص اندر داخل ہونے کا متمنی ہے۔
"جا اور پوچھ کہ وہ کون ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟" شیطان نے دربان سے کہا جو فوراً واپس ہوا۔
کہو میں کہ وہ ہتھوڑہ کرسی اور دخت کا مالک لوہار ہے۔" لوہار نے کہا "وہ پہچان لیگا۔ اور کہو کہ میں دوپہر تک دوکان میں کام کرنے اور دوپہر سے اب تک راستہ طے کرنے کی وجہ سے بہت تھکا ماندہ ہوں۔ کم از کم مجھے تھوڑی دیر کے لیے اندر آکر ستا لینے کی اجازت دے۔"
جب شیطان نے سنا کہ آنیوالا کون ہے تو اس نے دربان کو حکم دیا کہ وہ اسے ہرگز اندر قدم نہ رکھنے دے۔ اور پھاٹک کو دوزخ کے پورے تو قفل ڈالدے۔ "بلکہ ایک زنجیر زیادہ کرے کیونکہ اگر وہ اندر آگیا تو پھر ہم سب کی خیر نہیں۔"
"اب یہاں انتظار کرنا فضول ہے۔" لوہار نے آخری قفل کے کھٹکے کی آواز سن کر کہا۔ "ذرا جنّت کی کوشش کرنی چاہیے۔" وہ واپس ہوا اور چوراہے پر پہونچا جہاں سے وہ اس راستہ پر ہولیا جس پر درزی گیا تھا۔
وہ تیز چلنے لگا۔ کیونکہ سفر کی تکان اور داخلہ کی ممانعت کی وجہ سے اس کو غصّہ آگیا تھا۔ اور جنّت کے دروازہ پر ٹھیک اس وقت پہونچا جب کہ سینٹ پیٹر اسے کھولکر درزی کو اندر داخل کر رہے تھے۔ لوہار دروازہ سے ابھی چھ سات قدم کے فاصلہ پر تھا۔ "یہ موقع ضائع کرنے کا نہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے ورنہ پھر جنّت میں داخلہ معلوم۔" اس نے سوچا۔ اور اپنے گھن کو اٹھا کر تیزی سے بند ہوتے ہوئے کواڑوں میں اسطرح پھینکا کہ وہ بیچ میں اڑگیا اور پھاٹک بند نہ ہوسکا۔
اگر درزی اس ادھ کھلے پھاٹک میں سے اندر نہ داخل ہوسکا۔ تو پھر خدا جانے کہ اس کا کیا حشر ہوا؟

محبت بنام شرافت

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب۔ بی۔ اے۔ عثمانیہ)

کہا جاتا ہے کہ سپینا میں گال گیانو نامی ایک نوجوان رہتا تھا جو علاوہ شریف الخاندان عالی نسب اور دولتمند ہونے کے نہایت ہوشیار دلیر اور خوش خلق بھی تھا اور ان صفات کی وجہ ادنی اعلی سب اس کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن وہ مینوشیا نامی ایک حسین عورت کے حسن کا متوالا تھا جو ایک شریف شجاع اسٹریکا کی بیوی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا عشق اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے مینوشیا کا دستانہ چرایا اور جب کبھی نیزہ بازی کھیل تماشوں اور بڑی بڑی دعوتوں اور میلوں میں جاتا تو اس دستانہ کو ہاتھ میں پہنتا اور اپنی معشوقہ کی محبت میں اس کو پہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا لیکن اس کی یہ تمام کوشش بیکار ثابت ہوئی کیونکہ معشوقہ نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ اور اس واقعہ سے گیالگانو کو بڑی تکلیف اور اضطراب ہوا۔ اپنی معشوقہ کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا لیکن اس نے نہ تو اس کی طرف توجہ کی نہ اس کے باتوں کو سنا حالانکہ گال گانو معشوقہ کی انتہائی جفا اور لاپروائی کا شکار بن گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر مجلس میں خواہ وہ شادی کی ہو یا غم کی یا کھیل تماشے کی اس سے ملنے کی کوشش کیا کرتا تھا ایک عرصہ تک یکے بعد دیگرے عشقیہ پیام اور تحائف بے فائدہ طور پر پیش کرنے کے بعد اس نے اپنی درخواست پیش کی لیکن معشوقہ نے کوئی توجہ نہ کی اور جوں جوں گالگانو شادی کے لئے اصرار کرتا گیا وہ دن بدن زیادہ سخت دل بنتی اور کنارہ کش رہنے لگی۔ اس طرح اس کی قسمت میں عشق کے اس تکلیف دہ اور زبردست جذبہ کا مطیع رہنا لکھا تھا آخر تنگ آکر اس نے غمگین لہجہ میں عشق سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میری قسمت کے مالک عشق کیا تجھے نہیں دکھتا کہ میری روح گھل رہی ہے میں تو کسی کو چاہتا ہوں لیکن مجھ کو کوئی نہیں چاہتا۔ اے عشق خبردار ایسا نہ ہو کہ اس طرح تو اپنے قوانین کی مخالفت کر بیٹھے"۔ غرض وہ اس طرح معشوقہ کی جفا کو برداشت کرتے کرتے مایوس ہو گیا لیکن پھر اس بیوفا کے کسی کسی وقت اپنی طرف مائل ہونے کی امید میں اپنے دن گذارتا رہا۔

حسن اتفاق سے اسٹریکا اور اس کی زوجہ کچھ دن کے لئے سپینا گئے اور جب وہ وہاں قیام پذیر تھے عشق کا مریض گال گانوان کے مکان پر سے گذرا کرتا اور ہمیشہ اپنے ہاتھ پر باز کو بٹھائے ہوئے

یہ ظاہر کرتا کہ گویا وہ پرندوں کے شکار میں مصروف ہے۔ اکثر وہ ان کے مکان کے قریب سے گذرتا تھا ایک روز اسٹریکا نے اس کو دیکھکر پہچانا اور اس سے دوستانہ طور پر یہ ظاہر کیا کہ اس سے ملاقات کرنے کا متمنی ہے۔ اور شام اپنے پاس آنے کی دعوت بھی دی۔ اس دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گال گانو نے کسی دوسرے کام کا حیلہ کر کے معافی چاہی لیکن اس کا اس کو افسوس ہوا۔ اس پر اسٹریکا نے کہا کہ "کم از کم غریب خانہ میں تشریف لاکر چائے وغیرہ نوش فرمائیے" جس کا گال گانو نے صرف یہ جواب دیا کہ "مسٹر اسٹریکا آپ کی اس عنایت کا بے حد شکریہ۔ مجھے عجلت ہے "خدا حافظ" جب اسٹریکا واپس چلا گیا تو گال گانو نے اس دعوت سے فائدہ نہ اٹھانے پر خود کو سخت لعنت ملامت کرنے لگا۔ کہا کہ "میں کیسا بد قسمت ہوں کہ میں نے ایسی دعوت قبول نہ کی" اس ذریعہ سے میں کم از کم اپنی معشوقہ کو جسے میں دنیا میں اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں دیکھ لیتا۔" راستہ پر تن تنہا اس خیال میں چلا جا رہا تھا کہ اتفاق سے اس کو ایک نیل کنٹھ نظر آیا اس نے اپنے باز کو اس کی طرف چھوڑا باز نے مسٹر اسٹریکا کے باغ تک تعاقب کر کے شکار کو قابو میں کیا اور دونوں پرندوں میں جھڑپ ہونے لگی۔ باز کا آواز سن کر اسٹریکا اور اس کی بیوی باغ کی کھڑکی کی طرف دوڑے اور باز نے جس چالاکی اور جرات سے اپنے شکار کو پکڑ رہا تھا اس کو دیکھکر سخت متحیر ہوئے۔ باز کے متعلق عورت کو علم نہ ہونے سے اس نے شوہر سے دریافت کیا کہ "باز کس کا ہے"؟ اسٹریکا نے جواب دیا۔ "باز کو دیکھو وہ اپنا کام خوب کرتا ہے وہ اپنے مالک کے سے صفات رکھتا ہے جو سینا کا ایک حسین ترین بہادر نوجوان ہے۔ بیوی نے کہا کہ بے شک باز اپنا کام عمدگی سے کرتا ہے لیکن اس کا مالک کون ہوگا؟ شوہر نے جواب دیا کہ اس کا مالک گال گانو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے وہی گال گانو جو ابھی ابھی ہمارے مکان پر سے گذرا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہمارے ہاں آکر ہمارے ساتھ کھانا کھائے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا وہ یقیناً ایک بہترین خصائل اور نیک فطرت کا آدمی ہے یہ کہکر اسٹریکا اور مینوشیا کھانے کے لئے چلے گئے۔ اس اثنا میں گال گانو اپنے باز کو بلا کر خاموشی سے اپنا راستہ لیا ادھر مینوشیا کے شوہر نے گال گانو کی جو تحسین کی اس کا اس کے دل پر اسقدر اثر ہوا کہ اتنا اثر گال گانو اس سے قبل اپنی ساری کوششوں اور التجاؤں سے بھی نہ پیدا کر سکا تھا حسن اتفاق سے انہی ایام میں باشندگان سروجیا کے ہاں سینا کی جانب سے بحیثیت سفیر بھیجنے کے لئے مسٹر اسٹریکا کا انتخاب ہوا اور عجلت سے روانہ ہونے کی وجہ اس کو مجبوراً اپنی بیوی سے جدا ہونا پڑا۔ جوں ہی سفارتی جلوس سینا سے روانہ ہوا مینوشیا کو اپنے عاشق کا خیال آیا اور اس نے بھی گال گانو کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا اور استدعا کی

کہ وہ شام میں اس سے ملاقات کرے۔ کسی عذر و انکار کے بغیر گال گانو نے شکریہ کے ساتھ قاصد کے ہاتھ جواب بھیجا کہ وہ خوشی حاضر ہوگا۔ اور مسز اسٹریگا کے پروجیا جانے کی خبر سن کر وہ سرِ شام ہی گھر سے نکلا اور بہت جلد اپنی معشوقہ کے مکان پر پہنچ گیا۔

گھوڑے کو پوری طاقت سے روک کر وہ نیچے اترا مینوشیا سامنے موجود تھی اس کو دیکھتے ہی گال گانو نہایت ادب سے سلام کر کے اس کے قدموں پر گر گیا مینوشیا نے اس کو قدموں پر سے اٹھا کر پرتپاک خیر مقدم کیا او موسی تہیں ذا کہ کھانے کے لئے تیار کر کے اس کو بلایا۔ گال گانو نے دیکھا کہ انتظام بڑا معقول کیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ حسین خاتون بذاتِ خود اس کا انتظام کر رہی تھی موقع کو غنیمت جان کر اس نے اپنی محبت اور تکالیف کا افسانہ شروع کیا اگرچہ کہ گال گانو مینوشیا کے اس غیر متوقع تغیر سے جس قدر متعجب ہوا اس کو چھپا نہ سکا لیکن حد سے زیادہ خوش اور متحیر ہو کر اس نے تشکر و تحسین و توصیف کے الفاظ کی بھرمار کر دی۔ اور آخر میں یہ استدعا کی کہ اسے اس دعوت کا مقصد معلوم کرایا جائے حسین مینوشیا نے جواب دیا۔

”میں ابھی ساری حقیقت سنائے دیتی ہوں کہ میں نے تم کو کس لیے طلب کیا ہے“ یہ کہکر سنجیدہ پاک وصاف لیکن کسی قدر رنجیدہ چہرہ سے گال گانو کی طرف دیکھنے لگی۔ گال گانو کسی قدر پریشان ہو کر کہنے لگا ”پیاری محبوبہ میں نے ایک عرصہ تمہاری محبت میں گذارا اور میری ساری کوشش اکارت ہوی لیکن آج جب میں نے سنا کہ آپ نے مجھے طلب کیا ہے اس وقت مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے اظہار سے الفاظ یا زبان قاصر ہے“ یہ سن کر مینوشیا نے جواب دیا ”گال گانو! سنو میں تمھیں کہتی ہوں لیکن پہلے میرے قریب بیٹھو کیونکہ میں تمھیں محبت کرتی ہوں تمھیں یاد ہوگا کہ چند روز قبل تم ایک مرتبہ شکار کا تعاقب کرتے ہوے ہمارے مکان کے قریب سے گذرتے تھے میرے شوہر نے بیان کیا کہ اس وقت اس نے تمھیں دیکھا کر کھانے کی دعوت دی تھی لیکن تم نہیں آئے۔ اس وقت تمھارا باز اپنے شکار کے تعاقب میں ہمارے باغ میں چلا آیا تمھارے باز کو صید سے دلیرانہ جنگ کرتے ہوے دیکھ کر میں نے شوہر سے دریافت کیا کہ یہ باز کسکا ہے اس نے مجھے جواب دیا کہ ”سینا کے نہایت پاکیزہ نوجوان کے سوا یہ باز کسکا ہوسکتا ہے پرندے نے آپ کی سی بہادری دکھلائی“ اور میرے شوہر نے آج تک ”تم جیسا“ دلیر اور پاکیزہ شخص نہ دیکھا تھا“ گال گا نو نے مداخلت کر کے پوچھا ”کیا آپ کے شوہر نے ایسا کہا“ اس پر مینوشیا نے جواب دیا ”حقیقت میں میرے شوہر نے ایسا کہا اور سب سے یہ کہ بار بار میرے سامنے تمھاری تعریف و توصیف کی۔ جنانکہ تمھاری تعریف سننے کی وجہ سے اور تمکو مجھ سے جو محبت عرصہ سے تھی اس کے خیال سے میں تم کو بلوائے بغیر نہ رہ سکی۔ اور کسی قدر شرمندہ اور

چشم پرآب ہوکر اس نے اعتراف کیا کہ وہ حقیقت میں گال گانو سے لاپروا نہ تھی۔ گال گانو نے حیرت و استعجاب سے پوچھا "کیا یہ سب صحیح ہے" اس پر محبوبہ نے جواب دیا "بالکل صحیح ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کس لئے صحیح ہے لیکن کاش اس نے تمہاری تعریف نہ کی ہوتی" اور چند منٹ کی گفتگو کے بعد بدنصیب عاشق نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر کہا "بخدا جس شخص نے میری اس تحسین کی اور جس کا میرے متعلق ایسا پاکیزہ خیال ہے اس کی شان میں ایسی گستاخی نہ کرونگا" یہ کہہ کر فوراً کرسی سے اٹھا اور خاتون سے رخصت ہونے لگا۔ جانبین کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دونوں ایک دوسرے کی محبت اور عزت کرتے تھے اس کے بعد سے گال گانو نے اس واقعہ کا کبھی ذکر نہ کیا اور ہمیشہ مسز اسٹریکا کی بڑی عزت و توقیر کیا کرتا تھا۔

ارادات

(از جناب علی اختر صاحب اختر)

تجھے عہد سلف پر ناز بیجا بے خبر کب تک
فضا بیدار اور خواب آشنا تری نظر کب تک

یہ مانا قابل تقلید تھی ہر جنبش پیشیں
رہیں نقش پائے جادہ پیما تو مگر کب تک

جو آنکھیں ہوں تو بزم مہر و مہ ہے دور حاضر بھی
تجھے اس پر گمان حلقۂ بیروں در کب تک

کبھی عہد سلف بھی داخل "ایام حاضر" تھا
نہ سمجھے گی یہ نکتہ سطح بیں تیری نظر کب تک

نشاں تیرے عمل کے جلوہ گر رہ جائینگے آخر
یہ دن بھی آہ "ایام سلف" کہلائینگے آخر!

آزاد فضا میں جینا یا آزادی کی خاطر مرجانا
جینے کا یہ ہے مفہوم فقط کچھ نام جہاں میں کرجانا

وہ اوج حیات انسانی کی حدیں پستی سے ملاتے ہیں
جو ننگ زمانہ خطروں کے احساس سے ہی گھبرا جاتے ہیں

تم موت سے لرزاں ہو لیکن یہ طرز نہیں دانائی کا
موت آکے رہے گی موت سے بدتر جینا ہے رسوائی کا

ہنگامۂ رقص

(مترجمہ جناب عزیز احمد صاحب)

پیاری الما میں نا امید ہوں سخت بیمار اور غالباً بستر مرگ پر۔ پھر کبھی میں کسی جلسۂ رقص میں شریک نہ ہوسکونگی۔ ذرا خیال تو کرنا کہ مجھ پر کیا گذری۔ کسقدر خوفناک۔ کسقدر وحشتناک۔ تم نے ایسا کوئی واقعہ کسی افسانے میں بھی نہ پڑھا ہوگا

تم نے تو سنا ہی ہوگا کہ گذشتہ ہفتے جنگ برُاسکو کے بعد ہنگاری سپاہی اس شہر سے ہو کر گذرے تھے۔ اُن کے آنیکی خبر ہی سے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ گاؤں کو آگ لگا دیں گے۔ یہاں تک اماں جان نے تو مجھے نصیحت کی کہ ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچ کر اپنی صورت بگاڑلوں کہ کہیں یہ لوگ مجھے اٹھا نہ لیجائیں۔ کیسا پُر لطف خیال تھا ؟

جلد ہی قومی سپاہی آگئے۔ ابّا اُن سے ملنے اور ان کا استقبال کرنے چلے گئے۔ تمام نوکر بھی سپاہیوں کو دیکھنے چلے گئے۔ اور مجھے اماں بھی کہیں نظر نہ آئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سپاہیوں کے خوف سے کہیں چھپ گئیں

میں اکیلی تھی۔ اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میز پر تمام کھانے کے قابل چیزیں اور شرابیں چُن دوں۔ تاکہ ان قومی سپاہیوں کو کھانے کی چیزیں مل جائیں اور وہ مجھے نہ کھا جائیں۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ ان کے ہر کام کو خاموشی سے انجام دونگی اور ان کو ذرا بھی اس کا احساس نہ ہونے دونگی کہ میں اُن سے رتی برابر بھی ڈرتی ہوں۔ اور پھر میں چیخ پکار اور "مدد۔ مدد" کی آوازیں سننے کا انتظار کرنے لگی۔

آخر کار آہنی قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ مگر مطلق غل وشور نہ ہوا۔ بلکہ دروازے پر نرم دوہری دستک کی آواز آئی۔ شدت خوف سے میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ "چلے آؤ" مگر یہ نہ خیال کرنا کہ انہوں نے بندوقوں کے کندوں سے دروازہ توڑ ڈالا نہیں۔ بلکہ وہ دوبارہ دستک دے کر منتظر کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں انہیں داخل ہونے کی اجازت دی۔ اور کیا تم میرے تعجب کا اندازہ کرسکتی ہو جب میں نے تاتاری وحشیوں کے بجائے دو خوش پوش اور خوبصورت فوجی افسروں کو داخل ہوتے دیکھا۔

انہوں نے آنے کے ساتھ ہی عذر خواہی کی کہ ان کی وجہ سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ میں نے جواب دیا کہ کوئی تکلیف نہیں ہوی۔ اور میں ان کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔

میز پر سامان خورد و نوش دیکھ کر انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور مجھے ایک کمرے میں بستر بچھا دینے کی درخواست کی اور کہا کہ چھ ہفتوں سے انہیں بستر نصیب نہیں ہوا۔

"فی الحقیقت" میں نے جواب دیا "چھ ہفتوں تک کوچ یا قالین پر سونا بہت تکلیف دہ ہے"۔

وہ دونوں ہنسے اور کہنے لگے زمین پر ——— برف پر ——— کھلے آسمان کے نیچے"

چونکہ تمام نوکر باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے اپنے ہاتھوں سے بستر بچھانا چاہا۔ مگر انہوں نے اس کو گوارا نہ کیا۔ اور کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں۔ ہم خود بچھا لینگے"۔ یہ دیکھ کر کہ ان دونوں کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں خدا حافظ کہکر کمرے سے چلی گئی۔

میں کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ "مدد۔ ڈاکو۔ قتل" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں آواز اچھی طرح پہچانتی تھی۔ مگر شدت خوف سے یہ نہ سمجھ سکی کہ کس کی آواز ہے۔ اب ذرا خیال تو کرو۔ میں شدت خوف سے ایک سکتہ کے عالم میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ یہانتک کہ وہ آواز دوسرے کمروں سے ہوتی ہوئی میرے کمرے میں پہنچی یہ میری اماں تھیں ——— مگر کس حالت میں۔ کپڑے تمام الجھے ہوئے۔ آنکھیں ٹوپی میں چھپی ہوئی۔ ایک جوتا ندارد۔ تمام چہرہ سرخ۔ ذرا سنو تو۔ وہ اسی کمرے میں چھپی ہوئی تھیں جس میں میں نے دونوں مہمانوں کے سونے کا انتظام کیا تھا۔ اسی کمرے میں وہ ایک بستر میں پردوں کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اور اب سارا قصہ تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جب تھکے ماندے سپاہیوں نے بستر بچھانا چاہا تو اماں چلا کر بھاگیں۔ خیر میں نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کیا۔ اور بڑی دقت سے سمجھا سکی کہ یہ قومی سپاہی ہیں لوٹنے یا قتل کرنے نہیں آئے۔ یہانتک کہ انہوں نے پھر نہ چھپنے کا وعدہ کیا۔ میں نے فوجی افسروں کو بھی سمجھا دیا کہ میری اماں گٹھیا میں مبتلا ہیں۔ اور گرمی کے لئے انہیں پردوں میں لیٹنے کی ضرورت ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی نے آکر سوال کیا کہ دونوں افسر کہاں ہیں۔ میں بولی کہ وہ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ تم سے مل نہ سکیں گے۔ سپاہی نے پوچھا کہاں سو رہے ہیں؟ میں نے کمرہ بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ نیند میں خلل انداز ہونے کے جرم میں وہ سپاہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں افسر بلا کسی ناگواری کے پورے لباس میں کمرے سے نکلے۔ ان کو میجر نے طلب کیا تھا۔

سپاہیوں کی زندگی بھی کس قدر عجیب وغریب ہے۔ کسقدر سلجھی ہوئی زندگی۔ میں غالباً بہت بری سپاہی ثابت ہونگی۔ کیونکہ میں کوئی حکم اس وقت تک نہیں بجا لاتی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ میں اس کی تعمیل کیوں کروں؟

نصف گھنٹے میں دونوں افسر واپس آگئے ——— ان کے چہروں پر ناگواری یا بے خوابی کی ذرا بھی جھلک

نہ تھی وہ اپنے کمروں تک واپس نہ گئے۔ بلکہ مجھے اور اماں کو بلا کر کہا کہ آج سپہ سالار کے یہاں جلسۂ رقص ہونے والا ہے جس میں ہم دونوں ماں بیٹیوں کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ کاربنوال کے بعد پھر یہ پہلا جلسۂ رقص تھا۔ اور میں اس کے خیال سے اسی قدر خوش تھی جتنے کہ دونوں سپاہی کیونکہ وہ دونوں بھی پھر نہ سوئے۔ لیکن اماں نے حتی الامکان مخالفت کی۔

"تمہارے پاس رقص کا لباس نہیں۔"

"میرا سفید لباس! پیاری اماں میں نے اسے صرف ایک بار پہنا ہے۔"

"وہ پرانے فیشن کا ہے۔"

"فوج میں بہتر سے بہتر لباس موجود ہیں" ایک فوجی افسر نے جواب دیا۔

"مگر میرے جوتے"

"اماں تمہارے ناچنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

وہ اخلاقاً افسر ہنس نہ سکے۔ اور اسی وجہ سے اماں ان کے سامنے مجھ پر خفا نہ ہوسکیں۔

"انکے جانے کے بعد اماں نے مجھ سے غصے میں بھر کر کہا "کیسی احمق چھوکری ہے۔ خود خطرے کے منہ میں جاکر گر رہی ہے۔ اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہے۔"

میں نے خیال کیا کہ شاید اماں مجھ پر اس وجہ سے خفا ہو رہی ہیں کہ کہیں مجھے زکام نہ ہو جائے۔ میں نے کہا کہ کھلی ہوا میں رقص نہ ہوگا۔ اس پر وہ اور زیادہ بگڑ کر کہنے لگیں "کتنی احمق لڑکی ہے جلسۂ رقص صرف رقص و سرود کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ گاؤں کی تمام نوجوان لڑکیوں کو جمع کر کے زبردستی ترکی لیجائیں۔"

"آہ اماں۔ تو پھر کیا اسی وجہ سے سپاہیوں کو شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی؟ میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ جس پر وہ اور زیادہ بگڑیں اور گالیاں دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میں شام تک رقص کی تیاری کرتی رہی۔ اور افسر کی نصیحت کے مطابق سُرخ، سفید، سبز، تین رنگ کی قومی پٹی لگائی اور سرخ و سفید گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بنایا جس کو سبز پتیوں نے بالکل قومی رنگ دیدیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی غور نہ کیا تھا کہ ان تینوں رنگوں کی یکجائی کسقدر دلکش معلوم ہوتی ہے۔

دونوں افسر ہم سے بڑے اخلاق سے ملے اور اس عزت و حرمت سے پیش آئے کہ میں اپنی جھینپ مٹانے کو ہنسنے لگی۔

"دیکھ لینا۔ اس کا انجام خون کے آنسو ہونگے۔" اماں نے کہا۔ پھر بھی وہ میرا لباس ٹھیک ٹھاک کرتی ہیں

کہ اگر سپاہی مجھے اٹھا لیجائیں تو مجھے کافی اچھے لباس میں پائیں۔

دونوں افسروں کے ساتھ ہم کمرۂ رقص میں پہنچے۔ میرے تمام ساتھی قومی پٹیاں لگائے ہوئے تھے۔ یہ دونوں ساتھی افسر فوج میں نمبیر امرتبہ رکھتے تھے۔ سارے فوجی خوش باطنیان خوبصورت، اور متبسّم تھے۔ اور تعجب ہوتا تھا کہ یہی لوگ لڑنے اور اسقدر خون بہانے ہیں۔

صرف ایک آدمی ایسا تھا، جس نے میری توجہ جذب کرلی۔ صرف میری ہی نہیں ——— ہر ایک کی توجہ یہ ایک نوعمر کپتان تھا۔ اُس کے خوبصورت چہرے اور طویل متناسب قد پر اس کا لباس بے حد جچتا تھا۔ اور پھر اس کا رقص کس شان سے وہ تھرک تھرک کر رقص کر رہا تھا۔ اور پھر اس کے رقص اس کے اخلاق سے زیادہ جاذب کونسی چیز تھی جو اس کی خواب آلود آنکھوں سے ٹپک رہی تھی؟ تمہارا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ یہ وہ کشش تھی جس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہر لڑکی کو اس کے عشق میں مخمور کر دیا اور میں مستثنیٰ نہ تھی۔ اگر میدان جنگ میں بھی وہ اس طرح ڈٹ کر کھڑا ہو جائے تو میں نہیں سمجھ سکتی کہ کون اس کی نگاہوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ اور ذرا خیال تو کرو کہ اُس وقت میرے جذبات اور احساسات کی کیا حالت ہوئی ہوگی جب وہ دفعتاً میرے سامنے جھکا۔ اور مجھ سے ساتھ ناچنے کی درخواست کی۔ بدقسمتی سے میں ایک اور کے ساتھ ناچنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ کپتان نے کہا "اچھا اس کے بعد کے رقص میں" اور وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔

معلوم نہیں میں نے جواب بھی دیا یا نہیں۔ مگر میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ میں ایک شیریں خواب میں مصروف پرواز ہوں۔

"کہیں اپنا وعدہ بھول نہ جاؤ" وہ کہہ رہا تھا۔

اگر میں اپنے ہوش میں نہ ہوتی تو شاید جواب دیتی "کیا میں اپنی ہستی کو فراموش کر سکتی ہوں" مگر میں نے سادہ لہجے میں جواب دیا "نہ بھولونگی"۔

"مگر شاید تم مجھے پہچان نہ سکو گی"۔

کوئی گنوار لڑکی بھی ہوتی تو جواب دیتی "سیکڑوں میں ——— ہزاروں میں پہلی ہی نظر میں" مگر میں نے یہ جواب نہ دیا ایک گلاب کی کلی اپنے گلدستہ سے نکال کر دی اور بولی "اس کلی سے پہچان جاؤنگی"۔ اور میں نے اپنے سوز دروں۔ اپنے اضطراب پنہاں کو بالکل نہ ظاہر ہونے دیا۔

کپتان نے آہستہ سے یہ کلی اپنے لبوں سے لگا لی۔ میں نے دیکھا نہیں۔ مگر میں جانتی تھی۔ میں ساری

دنیا کے بدلے بھی اس وقت اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھتی، پھر وہ مجھے چھوڑ کر ایک آئینہ کے سامنے جا بیٹھا، بجائے رقص کرنے کے اپنے خیالات میں غرق رہا۔ ذرا خیال تو کرو انتظار کی گھڑیاں کسقدر طویل تھیں۔ میں نے کبھی مردوں کو اس تیزی سے رقص کرتے نہ دیکھا تھا۔ یہ لوگ مسلسل تین راتوں سے پلک بھی نہ جھپکا سکے تھے۔ مگر اب کس تیزی سے ناچ رہے تھے۔

بالآخر وہ گھڑی آگئی۔ بینڈ سے نغمے نکل رہے تھے۔ اور لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈھ رہے تھے جب میں نے اپنے کپتان کو قریب آتے جھکتے اور اور ننھی سی کلی کو اپنے سینے سے لگاتے دیکھا۔ تو میرا دل میرے پہلو میں نہ تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ جب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو میرا ہاتھ لرز رہا تھا۔ مگر میں صرف مسکرائی۔ فن موسیقی سے متعلق باتیں کرنے لگی۔

"تم میرے ہمسائے کو لئے جا رہی ہو" میجر نے ہنس کر چلاتے ہوئے کہا۔

ہمارے پیچھے بعض لوگ سرگوشی کر رہے تھے۔ "کتنا خوبصورت جوڑا ہے"

آہ! الہا! میں کسقدر مسرور تھی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور میں محسوس کر رہی تھی کہ میرا خون اس کی رگوں میں اور اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

ہم گانے کے منتظر تھے۔ مگر گانا شروع ہونے سے قبل ہی گھوڑوں کے سموں کی آوازیں آئیں۔ دور توپوں کی گرج سنائی دی اور ایک افسر کیچڑ میں لت پت کمرہ میں داخل ہو کر کہنے لگا کہ دشمنوں نے چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ میجر نے توپوں کی گرج اور افسر کی صورت ہی سے صورت حال کو پہچان لیا تھا۔

"آہ ٹھیک ہے" اس نے مٹھیاں تان لیں اور ان خوفناک علامات کا اظہار کرتے ہوئے جو قتل کرنے کی نشانیاں ہوتی ہیں، کہنے لگا "صاحبو! ہم اسی کے منتظر تھے۔ ہم عورتوں سے چند لمحوں کی رخصت لیں گے۔۔۔ صرف چند لمحوں کی۔ ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ جب تک بیڈیاں آرام کریں۔ اور پھر ہم آکر رقص شروع کر دیں گے"

اس نے دوڑ کر تلوار لگائی۔ تمام افسروں نے دوڑ دوڑ کر اپنی تلواریں ڈھونڈھیں۔ ان کے خوبصورت مطمئن چہرے۔ اب خوفناک جنگی صورتوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اور وہ سب لڑنے اور جان دینے کے منتظر تھے۔

میرا ساتھی بھی مجھے چھوڑ کر تلوار اور زرہ ڈھونڈھتے چلا گیا۔ اس کا قدم سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ اسکی آنکھیں سب سے زیادہ تیز تھیں۔ اگر میں نے اب تک کبھی صحیح معنوں میں مسرت کو محسوس کیا ہے تو اس کو دیکھ کر میرے دل میں تعریف اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ جب اس نے تلوار باندھی تو ایک قسم کی حرارت بھی

وپے میں سرائت کر گئی۔ شاید میری تمنا تھی کہ میں اس کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر لڑتی۔ اور اس کے ساتھ، پہلو بہ پہلو۔ دشمن فوج کے قلب لشکر پر حملہ کرتی۔ اب تک میری دی ہوئی کلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ زرہ پہن کر اس نے کلی اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر مڑا گویا کوئی چیز تلاش کر رہا ہے۔ ہماری نظریں ملیں —— پھر وہ روانہ ہو گیا۔ کمرۂ رقص خالی تھا۔

ہم سب عورتیں کمرے ہی میں تھیں کیونکہ میجر کا حکم تھا کہ اس کی واپسی تک کوئی باہر نہ جائے۔ سب سے زیادہ طویل گھنٹہ تھا۔ میری عمر کا سب سے زیادہ طویل گھنٹہ ——

جنگ کی آوازیں دھیمی ہو گئیں۔ یہانتک اب چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ قومی سپاہیوں کو فتح ہوئی۔ اور یہ نتیجہ درست نکلا۔ پاؤ گھنٹے کے اندر اندر قومی سپاہی داخل ہوئے۔ بالکل خندہ پیشانی گویا کوئی واقعہ ہی پیش نہ آیا۔ ان میں سے اکثر اپنے لباس پر سے کوئی چیز صاف کر رہے تھے۔ غالباً کیچڑ یا خون۔ اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنے لگے۔

پھر صفیں جم گئیں۔ رقص شروع ہونے لگا۔ صرف میجر اور میرا کپتان اب تک نہ آیا تھا۔

ناحق میری آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر گھڑی کوئی نہ کوئی داخل ہوتا۔ مگر وہ نہ آتا تھا نہ آیا۔

بالآخر میجر بھی آگیا۔ اور چاروں طرف دیکھا۔ اور مجھے دیکھ کر آگے بڑھا اور جھک کر کہنے لگا "حسین خاتون آپ کا ساتھی معافی چاہتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رقص میں شامل نہیں ہو سکتا۔

اس کے پیر میں گولی لگی ہے۔ اور وہ بیکار ہو چکا ہے۔"

اوہ اماں! اب میں کبھی رقص نہ کرونگی۔

میں بہت بیمار ہوں اور سخت ناامید۔

(جوکائی)

الفت کا انجام

(از نٹن گیشیہ تاتاز)

وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ اور دوسری منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر ہوا کھا رہا تھا۔ لیکن اُس کے خیالات بہت دور دور بھٹک رہے تھے۔ قرضوں کے بار میں دب کر اُسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ اُس کے خاندان نے اُسے ایک پیسہ دیے بغیر نکال باہر کیا۔ جنیوا میں اُس نے قمار بازی شروع کی اور بلغاری طلبا سے مقابلے میں اسقدر جیتا کہ ان میں سے ایک کو خودکشی کر لینی پڑی۔ کالس نے قمار بازی چھوڑ دی۔ اور ایک کمرہ لیکر اس میں لڑکوں کو گھونسہ بازی اور لڑائی کے کرتب سکھانے شروع کئے۔

پھر تلوار کے زور سے ترقی کرتے کرتے بلند پایہ سوسائٹیوں تک اس کی رسائی ہو گئی۔ وہ بڑی دھوم دھام سے پیرس واپس آیا۔ عورتیں اُس کی شہزادوں کے برابر عزت کرتیں۔ عُمر بھر میں پہلی بار وہ روپیہ بچا سکا۔ اس نے اپنے قرض سے سبکدوشی حاصل کرنا شروع کی۔ اس کے طرزِ عمل نے ہر شخص کا دل موہ لیا تھا۔ اگرچہ کہ اس کے معاشقوں کی انتہا نہ ہوئی تھی۔ تاہم اُسے کسی عورت سے سچی محبت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ بھی ڈان کوئکسات کی طرح کسی غیر معمولی اور مکمل عورت کا خواہاں تھا۔

عریض صحن سے جو باغ کی صورت اختیار کر چکا تھا بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک پرندہ قریبی کھڑکی کے پاس گا رہا تھا۔ کالس سگریٹ کے پیچدار دھوئیں کی طرف متعاقب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتًا وہ چونک اٹھا۔ اس کی گردن پر پانی کے چند قطرے گر رہے تھے۔ اُس نے رومال سے پونچھ ڈالے۔ مگر پھر چند قطرے۔ جون کا مہینہ تھا اور مطلع ابر سے بالکل پاک تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ گملوں اور پھولوں کے گلدانوں کے درمیان ایک عورت کھڑی ہوئی اور اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر گویا معافی مانگنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہی تھی۔

"مادام۔ آپ خوبصورت پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر بھی پانی برسا رہی ہیں" اُس نے شستہ فرانسیسی مگر غیر ملکی لہجے میں کہا اور اسی طفلانہ لہجے کی وجہ سے وہ عورتوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔

"لیکن میں اسقدر دور ہوں کہ کانٹے مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے" عورت نے طفلانہ تعجب سے دلچسپی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر بعض کانٹے ایسے بھی ہوتے جن سے کوئی نقصان پہنچ ہی نہ سکتا۔"

میں علم نباتات سے قطعاً نابلد ہوں۔ پھر بھی آپ جو کچھ کہیں ماننے کو تیار ہوں۔

"مادام۔ خدا کے لئے وہیں کھڑی رہو۔ آسمان کی سبزی میں تمھیں ان خوبصورت پھولوں میں گھرے ہوئے دیکھنا کسقدر لاجواب منظر ہے۔"

"آپ کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غیر ملکی ہیں۔"

"افسوس کہ میں غیر ملکی ہوں۔ ایک ناکامیاب فوجی افسر جواب فوجی تعلیم دیتا ہے۔"

"ہاں میں نے آپ کا ذکر اور آپ کی شہرت اخباروں میں پڑھی ہے۔

"ناکام شہرت۔ خیر پھر بھی یہ غنیمت ہے۔ سوائے کوشش کرنے کے کوئی آدمی اور کیا کرسکتا ہے۔

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

شام کو کارلس کھانا کھانے شہر نہ گیا۔ وہ کسی وجہ سے شرمندہ تھا۔ ایک اجنبی کی موجودگی اس کی شرمندگی کا باعث تھی۔ اپنے تاریک کمرے میں جب وہ صوفے پر لیٹا تو اپنے تئیں غیر معمولی طور پر ملول اور محزوں محسوس کیا۔ اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آگئی جس کے لاڈ پیار نے اس کی عادتیں خراب کردی تھیں۔ پھر اسے اپنا باپ یاد آگیا۔ اس کا سُرخ اور سخت چہرہ جس کے سامنے وہ اب تک مارے ڈر کے سگریٹ نہ پی سکتا تھا۔ اور اُس کو وہ لمحہ یاد آگیا جب اس کے باپ نے اُسے گلے سے لپٹا کر رخصت کیا تھا۔ اس وقت تک وہ اپنے رخساروں پر اس کے آنسوؤں کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کی یہ نصیحت "دیکھو بیٹا اگر تم کامیاب سپاہی نہ بن سکے تو کم سے کم ایماندار تو رہنا۔ مزدور بننے کو عار نہ سمجھنا مگر بے ایمانی اور بدتمیزی کر کے باپ دادا کے نام کلنک کا ٹیکہ نہ لگانا۔ یہ ریوالور لو۔ کہ تمھارے کام آئے۔ اور اگر تم کوئی قابل شرم کام کرو تو خودکشی کے کام آسکے۔ عزت کی موت۔ ذلت کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے۔"

دروازے پر کسی کی دستک نے اُس کو اپنے خیالات سے بیدار کردیا۔ خوف کے سوا ہر جذبے سے متاثر ہونیکی وجہ سے وہ ششدر رہ گیا، اور سمجھا کہ اُس کا واہمہ ہے۔ دوبارہ دستک سنائی دی۔ پھر سہ بارہ۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سب طرف خاموشی طاری تھی۔ وہی عورت ایک میٹھی روٹی لیے ہوئے کھڑی تھی۔

"میں سرحد فرانس کے ایک میلے سے یہ روٹی لائی تھی۔ اور اب یہ دیکھکر کہ تم اکیلے ہیں یہ تحفہ تمھارے لئے لائی۔ مجھے تنہائی سے سخت نفرت ہے۔ ان تنہا تاریک کمروں میں تمھاری زندگی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی ہوگی۔"

"شکریہ، شکریہ" وہ تحفہ لیکر کہنے لگا۔ اُس کی آواز نالوں میں بدل گئی جو بہت دیر سے اس کے دل میں

ہلچل بپا کر رہے تھے ۔ اُس نے اُس حُسنِ مجسّم کی طرف نظر بھر کر دیکھا جو چاند کی روشنی میں بہت زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی ۔ "آہ تم کسقدر خوبصورت ہو ۔ میری پیاری پڑوسن تمھیں کیا معلوم کہ اس میٹھی روٹی کے ذریعہ تم نے میرے دل کے لئے کیسی عظیم مسرّت فراہم کر دی ہے ۔ آہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میرے دل اور میری روح میں تمھاری ہی روح طاری وساری ہے ۔

"آہستہ آہستہ باتیں کرو ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے ہمسائے سُن لیں ۔"

"گھبراؤ نہیں ۔ نیچے لوگ رہتے ہیں ۔ وہ سب سفر کرنے گئے ہیں ۔"

کاآس ۔ ایک جست کر کے چھت کا چھجّہ پکڑ کر لٹک گیا کہ اوپر کی منزل میں اپنی خوبصورت مخاطب کے پاس پہنچ جائے ۔ لیکن وہ کہنے لگی "خدا کے لئے ٹھہرو ۔ کیا دیوانگی کی حرکت کر رہے ہو ۔ اگر یہ بوسیدہ لکڑی ٹوٹ پڑے تو تم نیچے صحن میں گر پڑو گے اور گردن ٹوٹ جائیگی ۔" اور وہ رونے لگی ۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر کاآس کی پیشانی پر گر پڑا ۔

"میری پیاری میری خوبصورت ہمسائی ۔ اگر تمھیں رنج نہ پہنچتا تو میں اس وقت نیچے کود پڑتا کیونکہ تمھارے آسمان سے میری پیشانی پر ایک شبنم کا قطرہ گرا ہے ۔"

"رحم ، رحم ۔ اے دیوانے اپنی اور میری حالت پر رحم کر" وہ خوف اور وحم سے کہنے لگی ۔ "اپنے کمرے میں چلے جاؤ کسقدر خطرناک حالت میں چھجے کے سہارے کھڑے ہو ۔"

لکڑی کے لچکنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی ۔ عورت نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری ۔ لیکن کاآس ایک جست لگا کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا ۔ اور ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگا "اب تک میں تمھارے اور تاریکی کے درمیان ۔ موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا تھا ۔ مگر اب تمھاری محبت نے مجھے دائمی مسرت عطا کر دی ہے ۔"

اس نے کھڑکی سے جھانک کر اُسے دیکھا ۔ وہ تاروں بھری رات میں رات کی پری بنی کھڑی تھی ۔ بہت دیر تک وہ آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے رہے ۔ آخر وہ بولی ۔

"میں تم کو پسند کرتی ہوں کیونکہ تم نے میری بات مان لی ۔ خدا حافظ ۔ یہ تانبے بہت قیمتی ۔ خدا حافظ اور شکریہ"

"آہ ذرا دیر اور ٹھہرو ۔ تو بتاؤ کہ میں تمھیں کیا کہہ کر پکارا کروں ۔"

"ویلینشیا ۔"

"ویلینشیا ۔ کسقدر خوبصورت نام ہے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک شہزادی کا بھی یہی نام تھا ۔"

"ہاں ویلنٹیا۔ ملکہ سیلان کا........ اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"پیٹر۔ بدنصیب پیٹر کالس"

"خدا حافظ۔ پیارے مسٹر پیٹر۔ اب میرا شوہر آتا ہوگا۔"

"کون؟"

"میرا شوہر"

"اوہ۔ خدا حافظ"

شوہر۔ اُسے اب تک اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ وہ باہر نکلا اور طلوع آفتاب تک خاموش نورانی جھیل کے اطراف ٹہلتا رہا۔ جھیل میں ستاروں کا عکس نظر آرہا تھا جو جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آرہے تھے۔

ابھی وہ لیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ پھر دروازے کے قریب دستک کی آواز سنائی دی۔ اس کی خوبصورت ویلنٹیا مخملی گون پہنے۔ صبح کی طرح درخشاں، زرّیں، حسین اور نازک نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں۔

"رات بھر مجھے چین نصیب نہ ہوا" اس نے سرگوشی کی اس کا رنگ زرد تھا۔

"گھبراؤ نہیں پیٹر" وہ بولی "گھبراؤ نہیں پیٹر میں جانتی ہوں۔ مجھے تم سے اور صرف تم سے محبت ہے"

دفعتاً ایک مرد کی کرخت آواز سنائی دی۔ دو ہفتے سے یہ آواز برابر سنائی دیتی تھی۔ ویلنٹیا چلی گئی۔

کالس لاپتہ ہوگیا۔ ویلنٹیا سخت متعجب ہوئی۔ صدمے نے اُسے بیمار کر دیا۔ کچھ عرصہ گذر گیا۔

ایک شام اس کا شوہر اُس سے کہنے لگا "آج میں ایک اہم مہمان سے ملنے والا ہوں" ویلنٹیا نے خیال کیا کہ کوئی کاروباری ہوگا۔ دستاویزات وغیرہ سے متعلق مگر جب کھانے کے وقت اس نے زینے پر اپنے پیٹر کی آواز سنی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

بجلی کی طرح خادم نے حاضر ہو کر کہا "مسٹر کالس نے اپنا کارڈ دیا ہے۔ اور اندر داخل ہونا چاہتے ہیں"

پہلی نگاہ میں وہ اُسے پہچان نہ سکی۔ ان چند دنوں میں اس میں بہت تبدیلی ہوگئی تھی۔ اُس کا شوہر اٹھا اور اپنے چہرے کو غیر معمولی طور پر بشاش بنا کر آگے بڑھا۔ ملاقاتی فوجی انداز سے جھکا اور نمایاں اضطراب سے اپنی میزبانہ سے ہاتھ ملایا۔ اور کچھ دیر کی ناگوار خاموشی کے بعد اپنے میزبان سے کہنے لگا۔

"مسیو۔ کالگنان میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے بہادری سے میرا خیر مقدم کیا۔ اور جیسا کہ میرا خیال ہے

آپ نے مادام کو میری آمد کے حال سے آگاہ نہیں کیا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" میزبان نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے جواب دیا "آج میں نے آپ کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا مستقبل بہت زیادہ شاندار ہے۔ ایک کاروباری آدمی کی حیثیت سے میں سمجھ گیا کہ آپ کے یہاں آنے کا منشا کیا ہو سکتا ہے۔ یہاں آپ کے جان پہچان کے لوگ اور ہموطن بہت کم ہیں۔ اور آپ مجھ سے مدد کے طالب ہیں۔ اور اپنی شجاعت اور شرافت کو اپنی ضامن بنانا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ نے میری بیوی کی موجودگی کی بھی درخواست کی تھی۔ میرے کوئی بچے نہیں، اور خدا کے فضل سے کاروبار اچھا چلتا ہے۔ مجھے آپ کے ایسے ہونہار نوجوانوں سے بے حد ہمدردی ہے۔

"معاف فرمائیے............"

"سنئے سنئے موسیو کالس اگرچہ میں اسقدر دولتمند نہیں جتنا کہ دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں۔ پھر بھی میں آپ کو ہر قسم کی مالی مدد دینے میں کوتاہی نہ کروں گا۔ آپ دن بدن ترقی کر رہے ہیں۔ اور یہ میرے لئے باعث فخر ہوگا کہ آپ جو غیر ملکی سلطنتوں خصوصاً جنوسلافیہ کے شاہانہ دربار میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ میرے لئے ایک شہری اور کاروباری آدمی ہونگے۔"

"میرے پیارے پڑوسی۔ آپ بالکل غلطی پر ہیں۔" نوجوان فوجی افسر نے کہا اور پیلا پڑ گیا۔

گہری دمے کی سانسیں۔ گھڑی کی آواز کے ساتھ دلوں کے دھڑکنے کی صدا سنائی دینے لگی۔ ولینیا کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔

"معزز ہمسائے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ میرے اندازے سے کہیں زیادہ بہتر اور شریف ہیں۔ اور اسی وجہ سے میری غرض اور زیادہ تکلیف دہ اور مصیبت ناک ہو گئی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں یہ راہ ہرگز اختیار نہ کرتا۔" کالس کے منہ سے یہ الفاظ اس طرح نکلے گویا کسی گنبد سے آواز بازگشت کی طرح سنائی دے رہے ہوں۔ اور کالگنان چاروں طرف خوف آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ گویا اُسے کسی خوفناک شیر صورت دیوانے سے مقابلہ کرنا ہے۔

"ہاں تو پھر کیا؟ پھر کیا؟" اُس نے بڑی مشکل سے سانس لیتے ہوئے کہا اور میز کے نیچے سے اپنی بیوی کو ایک دھکا بھی دیا۔ مگر والنیا کی روحانی اور جسمانی طاقت اسقدر برقرار تھی کہ اس نے دھکے کو محسوس بھی نہ کیا۔

"نہیں جناب میں آپ کے پاس روپیہ مانگنے نہیں آیا۔ بلکہ آپ سے آپ کی بیوی ولینیا کو پہچاننے آیا ہوں اپنی پیاری........"

"دیوانے تو نہیں ہو؟" میزبان نے گہری سانس لیکر کھڑکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ گویا وہ یہ پکارنا چاہتا ہے "آگ آگ" لیکن کالس کی چبھتی ہوئی بخار آلود نظروں سے مسحور ہو کر وہ پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔

"ہاں جناب آپ ٹھیک بولے تھے کہ میں ایماندار آدمی ہوں۔ اسقدر ایماندار کہ میرا نفس دروغ گوئی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ کسی آدمی کی بیوی کو بھگا لیجانے سے قبل میں خودکشی ہی کو زیادہ بہتر سمجھونگا۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں کسی شخص، اور خصوصاً آپ جیسے ہمدرد آدمی کی محبت کا یوں خاتمہ کروں مجھے آپ کی بیوی سے محبت ہے اور آپ کی بیوی کو مجھ سے آج رات کو میں آپ سے یہی کہنے یہاں تک آیا ہوں تاکہ اُس کو اپنے ساتھ لیتا جاوں۔" کالس نے ایک ریوالور میز پر رکھتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ جناب آپ ڈرتے ہیں۔ میں دیوانہ نہیں مجرم نہیں اور اگر آپ مجھے کوئی بدمعاش یا مجرم سمجھتے ہیں تو یہ ریوالور حاضر ہے۔ میں سر جھکائے حاضر ہوں مجھے گولی مار دیجئے۔"

اور پھر ایک تکلیف دہ و رنج آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ میزبان کی سانس لینے کی آواز اور دلوں کے دھڑکنے کی آوازیں صاف صاف سُنائی دینے لگیں۔

"لیکن کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے۔ ویلنٹیا کیوں؟ نہیں یہ صحیح نہیں۔ ویلنٹیا۔ میری پیاری ویلنٹیا" اس کا شوہر گریہ وزاری کر رہا تھا۔

"پیئر کالس۔ زویکارز کا قلعہ دار۔ سپا اور بہادر سپاہی ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا" پیئر نے سینہ پھلا کر بلند آواز سے کہا گویا وہ سپاہیوں کو کوئی حکم دے رہا ہے۔ ویلنٹیا نے اپنی پر آب آنکھیں اُٹھائیں۔ اٹھی اور پیئر کی طرف دو قدم بڑھکر، اُس پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈال کر کہنے لگی "تم آسٹروی ہو یا ہنگاری یا سلافی۔ بہرحال تمھیں جاننا چاہیئے کہ میں ایک فرانسیسی عورت ہوں اور فرانس میں یہ قاعدہ نہیں کہ عاشق اپنی محبوبہ کو اس کے شوہر سے چھڑا لے۔ (اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر) موسیو کالگنان فی الحقیقت مجھے اس شخص سے محبت تھی۔ لیکن میں نے اب تک اپنے تئیں اس کے حوالے نہیں کیا۔ مگر آج سے میں اس شخص سے نفرت کرتی ہوں۔ اس غیر ملکی کو اب بالکل ناامید ہو جانا چاہیئے۔ خدا حافظ۔ جناب" یہ کہکر وہ کمرے سے چلی گئی۔

"جناب موسیو کالس کیا میں آپ کی کوئی اور مدد کر سکتا ہوں؟ میں آپ کے کام آنیکو تیار ہوں" کالگنان نے نوجوان افسر سے کہا جو کمرے سے کسی مردود کتے کی طرح باہر نکل گیا۔

اُس کے پیچھے نوکر دوڑتا ہوا پہنچا "جناب من معاف کیجئے۔ آپ اپنا ریوالور بھول گئے تھے۔ یہ لیجئے۔"

اسکی خوبصورت بیوی

(از ہر من بعر)

اپنے عزیز دوست پال ڈورن سے سڑک پر اتفاقیہ ملاقات ہوگئی ۔

"سروس" میں بولا "خیال تو کرو۔ اتنے دن کے بعد۔ آخر اس کے کیا معنی؟ کم سے کم چھ ماہ ہوگئے ......
مگر خیر ...... ذرا تمھاری طرف دیکھوں تو۔ ہاں بتاؤ اب کیسے رہتے ہو۔ اب تو تمھاری شادی ہو چکی ——
پال، پال بھلا کسی کو امید تھی کہ تم شادی کروگے۔ میں قسم کھانیکو تیار تھا۔ کہ تم کنوارپنے پر ثابت قدم رہوگے۔ لیکن عورتیں۔ عورتیں۔ —— آہ، ہاں عورتیں۔

پال ہنسا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور ہم باہم ملکر چلنے لگے ۔

میں بے حد متاثر ہوا۔ پال ڈورن اور شادی شدہ! ...... مجھے یقین ہی نہ آتا تھا۔ ہماری جوانی کیا ہوی؟ کیا وہ واقعہ جس کا تعلق م—— سے تھا وہ بالکل بھول گیا ۔

مگر یہ دیکھ کر کہ وہ اس واقعہ کو فراموش کر دینا چاہتا ہے۔ میں نے اس کا ذکر چھوڑ دیا ۔

وہ جیب سے سگار نکال کر پینے لگا۔ میں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بہت سنجیدہ تھا اس کی چال ڈھال سے خاموشی، وقار اور تمکنت ظاہر ہو رہی تھی .... یا میرے اللہ وہ شادی شدہ ہے مجھے خود اپنے تعجب پر شرم معلوم ہو رہی تھی۔ "میں سنجیدگی سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو۔ کہ میری طبیعت کیسی ہے۔ اب تو تم بالکل بدل گئے۔ ایک خوبصورت بیوی کے شوہر ——"

اس نے کمزوری کے انداز سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اب یہ ذکر چھوڑ دو۔ اگر سب نے یہی تذکرہ چھیڑا تو مجھے یقین ہے کہ کسی طرح ختم نہ ہو سکے گا۔"

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ "میرے پیارے پال!"

"ہاں یہ سچ ہے کہ وہ میری خوبصورت بیوی ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ نعمت ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ ایک خوبصورت بیوی کے شوہر ہونے کیا معنی ہیں۔ عزیز من۔ تمھیں یہ شرف حاصل ہی نہیں اور اس مبحث پر تمھارا گفتگو کرنا لایعنی ہے۔ اس کے لئے عقل اور صبر کی ضرورت ہے۔"

میرا خیال ہے کہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور بہت خوش ہوا ۔ "پال دیکھتے ہونا ۔ یہ واجبی سزا ہے ۔ اب تمہارے پچھلے گناہوں کا صلہ مل رہا ہے ۔ اب اگر تم آتش رشک میں جلو تو بہت زیادہ نقصان نہ ہوگا ۔"

پال نے میری طرف تعجب سے دیکھا "مزے گدھے ہی رہے ۔ رشک کا تو سوال ہی نہیں کس خیال میں ہو"

"نہیں تو تم جلتے نہیں ؟" میں کسیقدر افسردہ ہو گیا ۔

"بالکل نہیں بلکہ معاملہ برعکس ہے ۔ میں چند الفاظ میں تم کو سمجھا نہیں سکتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ خوبصورت بیوی بہت کارآمد ہوتی ہے اگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر وہ خوبصورت نہ ہو ۔"

"میں سمجھ نہیں سکا ۔"

"اچھا سنو ۔ تشریح تو فضول ہے ۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے تم معاملے کو سمجھ سکو گے ۔"
میں نے خیال کیا کہ اس مبحث پر گفتگو کرنے سے اُس کے دل کی بھڑاس نکل جائیگی ۔ سگریٹ جلا کر اس نے کہنا شروع کیا ۔

اب ذرا ہماری شادی کے دن کا اندازہ تو کرو ۔ ہم ماہ عسل بسر کرنے جا رہے ہیں ۔ میں بے حد مسرور تھا ۔ شادی کی مصروفیتیں آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہیں ۔ ہم سیوچ گئے ۔ میں چاہتا تھا کہ اُس کو اس شہر کی سیر کراؤں ، اور اپنے قدیم احباب سے ملوں ۔ پھر وہاں سے کوہستان بویریا کی طرف روانہ ہو جائیں ۔ پہلے چند دنوں کی کیفیت تو میں تم سے بیان نہیں کر سکتا ۔ میں اور وہ دونوں مسرت اور محبت کے نشے میں چور تھے ۔ ہر چیز اور ہر بات ہمارے لئے مسرت بخش تھی ۔ لیکن زیادہ عرصہ گذرنے سے قبل ہی میں نے محسوس کیا کہ ہر چیز جیسی تھی ویسی نہیں رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یقیناً اب اُس کے لئے کسی چیز کی کمی تھی ۔ کوئی بات ضرور ایسی تھی جو اس کی طبیعت کے مطابق نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کیا ؟ میں نے اُس سے کئی بار پوچھا بھی مگر اس نے ہر بار احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت مسرور ہے ۔ اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ پھر ذرا تامل کے بعد کہنے لگی ۔ "یہاں کے لوگ بڑے غیر مہذب ہیں ۔"
میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے ۔ یا میرے مولا ۔ میرے پرانے سیوچ کے لوگ کسیقدر سست تو ضرور ہیں ۔ مگر غیر مہذب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

"نہیں وہ بولی یقیناً غیر مہذب ہیں ۔ کوئی گھنٹہ بھر تک سڑکوں پر پھرتا رہے مگر کوئی نظر بھر کر دیکھنے والا نہیں ۔ کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں ۔ مگر اس رویئے کو غیر مہذبانہ

ضرور کہوں گی۔

جانتے ہو؟ میری بیوی بگڑ رہی تھی۔ خوبصورت بیوی چاہتی ہے کہ سڑکوں پر اس کے حسن کی تعریف کرنیوالے قطار در قطار کھڑے ہوں۔ بیویچ کے باشندے اس کے عادی نہیں تھے —— تم ہنس رہے ہو؟ مگر ذرا سنو تو یہ تو صرف تمہید تھی۔

دوسری صبح کو میں میکسیلین کے قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دن کے کوئی دس بجے ہونگے۔ ہم دونوں نمائش گاہ جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی چیز ہے جس کا لطف صرف شادی شدہ اشخاص ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ میں نو بجے سے قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی اخبارات مع اشتہارات کے ختم کر چکا۔ اور حقیقت مٹانیکے لئے شراب کا دوسرا جام پی رہا تھا میز پر بیٹھا ہوا کھڑکی سے اوپر اٹھکر دیکھ رہا تھا جو بہت دور دُھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ سُنا ہوگا تا ہی وہ جگہ ہے جہاں رُابن اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت تک قہوہ خانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف چند طالب علم البتہ وسطی میز پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بج گئے۔ میں روزنامہ بذیکر کے اشتہارات پڑھ رہا ہوں اور ذرا ذرا دیر کے بعد اُس دروازے کی طرف دیکھتا ہوں جس سے وہ داخل ہونیوالی ہے۔

آخر کار وہ داخل ہوتی ہے۔

اپنا نفیس انگریزی کوٹ اور چھوٹی جیرارڈی ٹوپی پہنے وہ بہت خوش نظر آ رہی ہے منتظمہ کو دیکھکر مسکراتی ہے خادمہ سے میرا پتہ پوچھتی ہے۔ اور یہ مُسکراتی ہوئی تاش کھیلنے والے طالبعلموں کے پاس سے گذرتی ہے۔ جب طالبعلموں کے پاس پہنچتی ہے تو اپنی چھتری گرا دیتی ہے۔ میں چھتری اُٹھانے کو اُٹھتا ہوں۔ مگر خادمہ پہلے ہی اٹھا لیتی ہے۔ انگلستانی اُس کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ مگر طلبہ اپنے کھیل ہی میں مصروف رہتے ہیں اُس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔

میں نے اُس سے ناشتہ کرنے کو کہا مگر اب وہ افسردہ ہو چکی تھی۔ "نہیں" وہ بولی میں کھڑکی کے اسقدر قریب نہیں بیٹھ سکتی۔ روشنی بہت ہے ...... اور تھیئیٹر کی سفید عمارت .... ذرا مہربانی کر کے ادھر چلے آؤ"

وہ اُٹھی اور طلبا کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گئی۔ جب اُس نے اپنی کُرسی ہٹائی تو عمداً دوسری کرسی جس پر اخبارات رکھے تھے اُلٹ دی۔

مگر طلبا اپنے کھیل ہی میں مصروف رہے۔

میں نے اخبارات چن لئے اور اُس سے پوچھنے لگا کہ ناشتے میں کیا کیا کھائیگی۔ اپنے آپ کو میں نے غیر معمولی طور پر بشاش ظاہر کیا کیونکہ میں جلد سے جلد نمائش پہنچنے کو بیتاب تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر چشمہ

دُرست کرتے ہوئے مجھ سے دلکش آواز میں سوال کیا "کیا ان نوجوانوں کو بجائے شراب پینے اور تاش کھیلنے کے کوئی اور کام نہیں مل سکتا"

میرے دوست اب تم ہی بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے ۔

میں نے روزنامہ وی آنا پر نظریں جمالیں بلکہ کولون گزٹ بھی پڑھنے لگا کیونکہ اس کی تقطیع ذرا زیادہ بڑی ہے ۔ مگر میری بیوی برابر اپنے کام میں مصروف رہی وہ چاکولیٹ کھا رہی تھی، اور چمچے کو اس انداز سے پکڑے ہوئے تھی کہ اپنے چھوٹے ہاتھ کا حسن دکھلائے ۔ بلکہ وہ کسیقدر زیادہ بلند آواز میں کہہ رہی تھی "افسوس بچارے والدین ۔ وہ بچارے تو خون پسینہ ایک کرکے کماتے ہونگے ۔ اور یہ صاحبزادگاں ہیں کہ یہاں شراب نوشی اور تاش کھیلنے میں مصروف ہیں ۔ تعجب ہے کہ پروفیسر اب تک اپنا ڈنڈا لیکر نہیں آیا ۔"

میں کولون گزٹ کے مطالعے میں محو ہوں لیکن اس کی زبان کسی طرح نہیں تھمی ۔ "ان کی چھوٹی ہری ٹوپیوں کو دیکھو جو ان کی کھوپریوں پر رکھی ہوئی ہیں ۔ کیا کوئی چیز ان سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہو سکتی ہے ۔ ۹ بالکل ریل کے چوکیدار معلوم ہو رہے ہیں ۔"

میرے احساسات ناقابل بیان ہیں ۔ میں طبعاً بزدل نہیں ۔ لیکن بہار کی پرلطف تعطیلات میں اس قسم کے واقعات کا پیش آنا کافی ناخوشگوار ہے ۔ میں بولا "معلوم ہوتا ہے کہ میونچ میں تمھارا دل نہیں لگتا ۔ اور اگر فی الحقیقت یہی بات ہے تو تمھارا یہاں ٹھہرنا فضول ہے ۔ چند گھنٹوں میں ہم شیلرسی جانے والی ٹرین پر سوار ہو سکیں گے شیلرسی اچھا قصبہ ہے ۔ اور وہاں میرا پرانا دوست ڈرٹیشر تھا ۔ نمائش وغیرہ کو چولھے میں ڈالے اور چلو سامان باندھ کر دو تین گھنٹوں میں یہاں سے روانہ ہو جائیں ۔"

چار بجے ہم شیلرسی پہنچے ۔ میں نے ڈرٹیشر کو تار دے دیا تھا ۔ وہ ہم سے ملا اور جھیل کے کنارے ہوٹل پر لے گیا جہاں ہم نے ایک بڑا سا کمرہ کرائے پر لے لیا جس سے جھیل اور وادی کا دلکش منظر نظر آتا تھا ۔ لوگا تھا، تھک کر سو گئی اور میں بائیسکل پر نکل کھڑا ہوا جھیل کا چکر لگاتا ہوا گاؤں میں سے گذرتا ہوا ۔ ڈاکخانہ سے ہوتا ہوا ۔ کوئی آٹھ بجے میں واپس ہوا ۔ وہ باغ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی ۔ دوسرے میز پر چند دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے ۔ اس مقام کی خاموشی اور حسن نے مجھ پر اسقدر اثر کیا کہ میں نے چند دن یہیں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا ۔ میں اپنی بائیسکل رکھ کر اس کے پاس گیا ۔ وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے باغ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی ۔ ایک میز پر چند دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے ۔ دوسرے میز پر ایک پادری اور چند کھلاڑی بیٹھے ہوئے تھے ۔ وہ اپنی خواب آلود آنکھوں سے جھیل کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ وہ اس وقت ایک

خوبصورت تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ مگر یہ خوبصورت تصویر دیہاتیوں، پادری، اور کھلاڑیوں کی توجہ جذب کرنا چاہتی تھی۔
میں کسی قدر کمزوری کے ساتھ اس کی طرف بڑھا "بتاؤ۔ کیسی ہو؟"
اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن کو میں کبھی نہیں بھول سکتا اور کہنے لگی "تم نے اس گاؤں کا نام تسیلرسی بتایا تھا نا؟ خیر میں یہ کہتی ہوں کہ میں یہاں دو دن بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ مقام میرے لئے موزوں نہیں"
"مگر میرے خیال میں تو یہ بہت خوبصورت ہے۔ دیکھو جھیل............"
"جھیل بہت چھوٹی سی ہے"
"دلکش وادی............"
"وادیاں غیر صحت بخش اور پست کن ہوتی ہیں۔ ہر ڈاکٹر تم سے یہی کہیگا"
"لیکن پہاڑ————"
"مجھے پہاڑوں سے نفرت ہے۔"
ایک لمحے تک خاموشی چھا گئی پھر وہ کہنے لگی۔ "اور غذا بھی خراب ہے۔ بویریا کی شراب سے چربی بڑھتی ہے اور میں موٹی ہو کر دہقانی عورت بننا نہیں چاہتی۔ اگر مجھے خاموش زندگی پسند ہوتی تو بجائے شادی کرنیکے کسی خانقاہ میں جا کر زندگی بسر کرتی۔ ہاں مگر تم کو تو مجھ سے محبت ہے ہی نہیں"
"بہت اچھا" میں نے کہا "اگر تمہارا دل نہیں لگتا تو کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائینگے"
تاہم میں کسیقدر ملول ہو گیا۔ مسلسل تبدیلیاں۔ آئے دن کا سفر، نئی بستیوں کا قیام۔ نئے لوگوں سے سابقہ......... میں ان جھنجھٹوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ کسی دل پسند مقام پر آرام سے زندگی بسر کروں لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ اگاتھا کو تو اپنے حسن کی تعریفیں سننے کی عادت تھی۔ جب ہم وی آنا میں باہر نکلتے تھے۔ تو تھیٹر میں، راستوں پر ہر شخص اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ اتنے عرصے سے جاری تھا کہ اب اپنے حسن کی تعریف نہ کرنے والوں کے بغیر اگاتھا کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی تمباکو نوش کی تمباکو نہ ملنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ ان باتوں پر بحث کرنا فضول ہے کیونکہ یہ حقیقی واقعات ہیں۔ اگر کسی کو یہ باتیں ناپسند ہوں تو اس کو خوبصورت عورت سے شادی نہ کرنا چاہیئے۔ اور بس۔
علی الصباح وہ ابھی سو ہی رہی تھی کہ میں اٹھا اور جنگل میں تفریح کرنے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے چمکتی ہوئی جھیل اور مسکراتی ہوئی وادی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ نغمہ خیز قطعہ تھا جسے میں دنیا کے تمام تر مقامات سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور اس جگہ کا

قیام یقیناً میرے لئے مسرت کا باعث ہوتا۔"

دفعتاً میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا........ شاید اس کا انتظام ہو سکے میں ڈریشیر کے خوبصورت مکان کو تیر ہیلتا بلکہ دوڑتا ہوا پہنچا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ڈریشیر ایکٹر ہے اور یونیورسٹی نیشنل کمپنی کا ممبر بھی۔ میرا عزیز بڈھا ڈریشیر جس کی تصویریں لیناش اور استاک نے اُتاری تھیں۔ تم تو اس کو جانتے ہی ہو گے؟ بڑا خوش مذاق آدمی ہے عقلمند بشاش اور خوش قسمت۔ کسی قدر میلا کچیلا بھی۔ مگر بہت اچھا ساتھی۔

"ڈریشیر" میں نے کہا "میں تمھاری عنایت کا خواہاں ہوں۔ تم یہاں ہر شخص سے واقف ہو۔ کوئی نوجوان کاشتکار یا محرر یا کوئی ایسا شخص تلاش کر دو جو حسن کا معترف بننے پر آمادہ ہو۔"

"حسن کا معترف.............."

"ہاں حسن کا معترف۔ بس وہ صرف گھورا کرے بیٹھا نظر بازی کرتا رہے۔ دیکھتے ہو نا میری بیوی اس کی عادی ہو گئی ہیں اُس کو شراب اور کھانا اور اس کے سوا تین مارک روزانہ دیا کروں گا۔ بس اُس کا کام یہ ہوگا کہ باغ میں بیٹھا میری بیوی کی طرف اس طرح گھورتا رہے کہ گویا.........."

"منظور.........." ڈریشیر نے چلا کر کہا۔

میں نے اُس کو واقعات سے آگاہ کیا میونچ کا قصہ سنایا اور بتایا کہ اگاتھا اس وقت تک یہ ں ٹھہر سکتی جب تک کہ اس کے حُسن کا کوئی مُعترف نہ ہو۔

"خیر میں اس کا انتظام کر دونگا۔ ذرا سوچنے دو۔ اپنے کسی ایکٹر کو تو میں دے نہ سکوں گا کیونکہ وہ سب بے حد مصروف ہیں۔ مگر........ ہاں ایک آدمی ہے۔ کافی ہوشیار........ اور خوش پوش بھی ہے خیر میں اُس کو بھیج دونگا۔ اسی سہ پہر سے کام شروع ہو جائیگا۔ تم نے کیا کہا تھا "گھورا کرے" ہاں گھورا کرے۔"

"عورتوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اُن کے حُسن کے مُعترف کیسے ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہیں کہ وہ خود کیسی ہیں۔ تم دیکھو گے......" اور اس کا قول سچ نکلا۔ شام کو میں پوسٹ آفس گیا۔ اگاتھا باغ میں رہی لیکن گھورنے والا آدمی برابر ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے واپس ہو کر کہا میں نے اسٹیشن جا کر گاڑی کا وقت معلوم کر لیا ہے دس بجے گاڑی جائیگی۔"

"تمھاری باتیں تو سمجھ ہی میں نہیں آتیں" اگاتھا نے جواب دیا "تھوڑی دیر تک تم سے چپ کیوں نہیں رہ جاتا مجھے یہ مقام بے حد پسند ہے یہ جھیل..." "جھیل چھوٹی بہت ہے......"

"پہی تو اس کی دلکشی کا باعث ہے۔"

"اور اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں۔"

"پہاڑوں میں رہنا صحت بخش ہے۔ ہوا صاف ہے ڈاکٹروں سے پوچھو۔ یہ آئے دن کا سفر مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔ اب یہیں رہو۔"

اور ہم وہاں تین ہفتے ٹھہرے۔ ہر ہفتے مجھے بل ملتا۔ اکیس مارک ہفتہ وار تنخواہ دینا پڑتی۔ اور دس بارہ مارک شراب وغیرہ کے لیئے۔ اور جب ہم روانہ ہونے لگے تو میں نے اس کو ایک نیا کوٹ بنوا دیا کیونکہ اس کا اپنا کوٹ گھورتے گھورتے پھٹ گیا تھا۔"

پال کہہ رہا تھا کہ وہ اس سال تعطیلات بسر کرنے پھر شیلسرسی جانیوالے ہیں۔

تو رہے اور میں رہوں

(از مولانا عبد القدیر صاحب حسرت صدر شعبہ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ)

مولانا عربی اور فارسی کے بڑے عالم اور عربی کے تمام علوم متداولہ پر حادی نظر رکھتے ہیں۔ اردو نظم میں بھی آپ کا ایک خاص رنگ ہے جو تغزل کے بالکل مختلف اور فلسفیانہ ہے۔ آپ نے غالب کی بحروں میں بیشتر کلام موزوں کیا ہے۔ دونوں کو مقابل رکھکر دیکھنے سے آپ کی بلند آہنگی کا بڑا اثر قاری کے دل پر ہوتا ہے آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شایع ہو چکا ہے۔ ابھی اس سے بہت زیادہ غیر مطبوعہ کلام باقی ہے۔

درد لا علاج بن او شب غم دراز ہو
میں رہوں اور بیکسی کوئی نہ چارہ ساز ہو

سینہ میں دل کباب ہو آنکھوں میں سیل آب ہو
نغمہ طرب فزا نہ ہو نغمہ فزا نہ ساز ہو

نیم نگاہ بے پناہ خنجر غمزہ دل شگاف
مجمع عاشقاں میں آہ مشق فسوں ناز ہو

یوں مری عمر ہو تمام اسکے سوا رہے نہ کام
سنگ در حبیب ہو مرا سر نیاز ہو

اتنی پلا مجھے شراب ہوش و حواس ہوں خراب
فتح ہو باب بیخودی فاش ہر ایک راز ہو

حسرت مبتلا ہوں میں مجھکو کسی سے کیا غرض
تو رہے اور میں رہوں ناز ہو اور نیاز ہو

پریم

(از جناب محمد عبدالرحمن چغتائی صاحب آرٹسٹ)

شاہ بلوط کے بلند تر درختوں نے جب کرون کو جو بازوں میں بازو ڈال دئے جبین اس وقت جب ان میں سانس زور زور سے آنے لگ گئے تو میں اور وہ ایک گانے والے پرند کی طرح اس بنی ہوئی قوس قزح میں سے لہراتے ہوئے گذر گئے۔

آنند کی دنیا جہاں امرت رس دیوتاؤں کے چرنوں سے چھوتا گنگناتا ہوا اک نیا سنسار آتما جیسی دولت سے جل تھل بن رہا تھا انہوں نے نیلی نیلی ہواؤں میں جب میرے زرد اوڑنے کو اڑتے ہوئے دیکھا یہ انہوں نے کہا تھا یہ ان بادلوں کا ایک ٹکڑا ہے جو مہکتے ہوا کا پیغام لئے جا رہے ہیں۔ میری نظریں جھک گئی تھیں وہ کہتے رہے یہ شانوں پر جٹا دھاری کی یاد میں سیاہ لہرا رہے ہیں۔ انہوں نے میرے مکھ کو مدھ بھرا کٹورہ کہا اور یہ بھی کہا دنیا کی مایا کو اس پر ہمیشہ چڑھنا ہے۔ یہ گھڑی تھی بالکل پہلی جسے میں سمجھی مجھے کسی نے دیکھا ہے۔

وہ جن کی آواز بھی دیوتاؤں کا سا حسن اور وہ جن کی مدھ بھری نینا گنگا جل کا کھیل کھیلتی جا رہی تھیں۔ کہا۔ بلند آواز میں دیوتاؤں کی طرح سمجھو بالکل دیوتاؤں کی طرح کہا۔ وہ دیکھو اندھیرے میں پڑے ہوئے جیون کو آتما کی روشنی من کی جو یا سلجھا رہی ہے اور پریم رس کی پکار اس پوتر دھارا سے آپ سے آپ من کا سکھ گیان کا کارن۔ یہ وادی ہے جہاں دیوتا نے جنم لیا تھا۔ وادی کا حسن یہ چھوٹی سی آبشار نین جل جیسے کسی راج ہنس نے اپنے سپید سپید پر پھیلا رکھے ہوں سمجھو یہی معلوم دیتا تھا۔ بدگمانی سے وہ دور ہی دور اڑنے کو پر تول رہا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی آبشار تھی۔ جس کا جل جگمگ جگمگ کرتا کیلاش سے آیا ہوا امرت ایشور کے گانیں گاتا من کے اندر جو لگتے جاتا کہتے تھے یہ دیوتاؤں کے اشنان کی جگہ ہے۔ پجاریوں کا عقیدہ۔ یہ ان کا دھرم وہ مدتوں سے یہی کہتے چلے آتے ہیں وہ موتی ہونگے جو اکثر اس پوتر جل کے نیچے کھیلتے رہتے ہیں۔ دیوتاؤں کی مالا اور ان کے گھٹ میں اٹکی ہوئی جٹاؤں سے گر گر کر پجاریوں کے لئے دیا کے بھپ میں پڑے رہتے ہیں۔

میرا دامن ایک جھاڑی سے جا اٹکا نہ وہ ایک ہاتھ میری کمر پر رکھے ہیں پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ آہ میری عمر اور من کے اندر کی دولت نے میری تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ پھر میرا اوڑنا انہوں نے مجھے دیدیا۔ ہم بہت دیر تک

خاموش بالکل خاموش بہت دور تک نکل گئے یکایک ان کی آنکھوں میں ایک روشنی آئی اس میں بجلی سے بھی زیادہ چمک تھی کہنے لگے میں ایک یادگار قائم کرونگا۔ میں اک پراسرار دنیا نیار کرونگا۔ جو ستاروں سے زیادہ روشن۔ آسمانوں سے بلند رنگوں سے بے نیاز۔ دنیا پر ایک سکوت چھا گیا۔

میرے اندر پریم ناچا میں پریم انار سکھ سنسار میں کھو گئی۔ صرف یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے پجاری سمرن کریں گے۔ دیوتا اسے گائینگے۔ وہ دل کی دنیا۔ پریم۔ پونر کار..... یہ آخری بار تھی جب میں نے دیکھا۔ نیلے نیلے آکاش پر دیوتا نے رقص کیا۔ اور افق کی تیز دھار پر اپنے قدموں سے دنیا کے سینے پر پر اتھنا کی باری باری اس دھرتی پر آتے اور درجہ بدرجہ اس آبشار کے ارد گرد چٹانوں پر اپنے اپنے استھان پر بیٹھ گئے۔ وہ سماوی لگائے دم کشی کرتے رہے۔ ایشور کی آواز دنیا کا سکھ دکھ بھگتی نے اپنے اندر دیکھا۔ وہ اچاٹ ہو گئی تھی۔ نیل گوں آسمان پر سرخی چھا گئی اور وہ ایک دیوتا سندر مکھ نیل سا جھگ شیام مکٹ پر ایک چمکتا ہوا کندن لگائے بے سرت کر دینے والی لے میں جیسے مدھر مرلی بجاتے وہ آپ سے آپ کچھ بجائے جارہا تھا وہ سب دیوتاؤں سے اونچا اونچا آکاش کے رنگوں میں ملا جھلملا۔ آکاش دیوتا وہ پریم کی نیا۔ امرت جل ابھی تک بہے جارہا تھا۔ آہ صرف دیوتاؤں نے آنکھیں بند کر لی تھیں! وہ جھوم رہے تھے۔ میں عریاں دریا کے بہاؤ میں جیسے کوئی آستان میں ہو سمٹی ہوئی بل کھاتے اک آبدار سیپ کی طرح اس جل ترنگ میں تیرتی ہوئی آنکھوں سے تک رہی تھی بہتا ہوا پانی پریم جل آہستہ آہستہ سے جارہا تھا۔ میری آنکھوں نے۔ یہ آسمان۔ آہ ویسا نیل گوں آسمان آج تک نہیں دیکھا۔

ہوتا!

(از علامہ حکیم محمد وحید الدین عالیؔ مرحوم)

اگر اپنے دل پہ ناصح مجھے اختیار ہوتا
نہ مصیبتیں اٹھاتا نہ ذلیل و خوار ہوتا۔

اگر انقلاب ہر دم مجھے روزگار ہوتا۔
تو کبھی تو لطف فرما وہ جفا شعار ہوتا

شب و روز بو وفا کی مجھے گلستاں سے آتی
اگر ان گلوں میں میرا دل داغدار ہوتا

وہ ہماری لاغری تھی تیرے در پہ ہلکے جاتے
اگر اپنا دیدہ تر کبھی اشکبار ہوتا۔

جو زمیں میں سو رہے ہیں وہ تمام چونک پڑتے
میرے ساتھ اگر لحد میں دل بیقرار ہوتا

بخدا کہ زندگی سے میری موت اچھی ہوتی
گزران کا بعد مردن جو سر مزار ہوتا

سر بزم دشمنوں میں اگر امتحان لیتے
تو نثار بندہ پرور یہی جان نثار ہوتا

جو نگاہ لطف ساقی سر بزم مجھ پہ پڑتی۔
یہی خون ان رگوں میں مے خوشگوار ہوتا

کچھ ادا سے کر دکھاتے ترے بے نقاب عارض
سر طور جلوہ ان کا اگر آشکار ہوتا

تیرے میکدے میں ساقی کٹی اپنی عمر ساری
پس مرگ چاہیئے تھا کہ وہیں مزار ہوتا

نہیں شوق حور مجھ کو نہ ہوائے باغ جنت
کوئی مرغزار ہوتا کوئی گلعذار ہوتا

تیرے دل میں میرے نالے نے اثر کیا نہ کبھی
یہ وہ تیر بے خطا تھا کہ فلک کے پار ہوتا

پس مرگ جی نہ اٹھتا میں لحد میں دفن ہو کر
جو تیری وفا کا ظالم مجھے اعتبار ہوتا

جو لہو ہے میرے دل میں وہی آنکھ سے ٹپکتا
کہ جو خم میں ہے قدح سے وہی آشکار ہوتا

میں ہزاروں فکریں کرتا اور آخر یہ کہ مرتا
جو کسی طرح سے حاصل مجھے وصل یار ہوتا

نہیں رہتی لن ترانی کبھی برق طور تیری
جو مقابلہ میں میرا دل بے قرار ہوتا۔

مجھے ہے وہ شوق رحمت اگر اختیار ہوتا۔
تو طرف سے سب کے عالیؔ میں گناہ گار ہوتا

سحر طراز

ایک چینی افسانہ

از جناب افتخار الدین و مسٹر خواجہ معین الدین صاحبان

پانسو سال پہلے منگ خاندان کے شہنشاہ ہانگ رو کے عہد میں چینی ایک شہر تھا جسمیں ٹین پلو اپنی علمیت اور تقویٰ کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس کا اکلوتا لڑکا منگوائی علمی قابلیت جسمانی نزاکت اور شریفانہ کردار کی وجہ بمثال گنا جاتا تھا۔

ابھی لڑکے کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی کہ پلو شہر شنگ ٹو کا مہتمم تعلیمات مقرر ہوا اور منگوائی کو بھی اپنے ساتھ لیگیا۔ شنگ ٹو کے قریب ایک امیر جو وہاں کا صوبہ دار بھی تھا رہتا تھا۔ اس کا نام شیانگ تھا اور اس کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک قابل اتالیق کی تلاش تھی۔ نئے مہتمم تعلیمات کے آنے کی خبر سنکر امیر شیانگ مشورہ کرنے کے لیے اس کے پاس آیا اور اتفاق کی بات ہے کہ پہلے ہی پہل پلو کے سابق لڑکے سے ملاقات ہوگئی۔ اور اس کی گفتگو کا اتنا اچھا اثر ہوا۔ کہ اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے منگوائی کو مقرر کر لیا۔

چونکہ امیر شیانگ کا مکان شہر سے کئی میل فاصلہ پر تھا۔ اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ منگوائی اپنے مربی کے ہاں مقیم رہے اور اس نوجوان نے اپنے ضروریات کی تمام چیزیں فراہم کرلیں۔ والدین نے بھی بخوشی اجازت دیتے ہوئے بہت سی نصیحتیں کیں اور لیوٹسیو اور دیگر علمائے سلف کے اقوال یاروں سے اور ان پر کاربند رہنے کی تاکید کی۔

"ایک حسین چہرے کے وجود سے دنیا محبت سے بھر جاتی ہے لیکن حقیقت شناس کبھی دھوکا نہیں کھاتے حقیقی معنوں میں انسان وہی ہے جو صنف لطیف کو مشرق کی طرف سے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھے تو مغرب کی طرف منہ پھیر لے۔ اور اگر وہ مغرب کی طرف سے بڑھے تو مشرق رویہ ہو جائے۔"

منگو آئی نے اپنی آئندہ زندگی میں اس قول کی اگر کچھ پروا نہیں کی تو اس کو معذور سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے نئے شباب اور بڑھتے جذبات کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس کو والدین سے جدا ہو کر امیر شیانگ کے مکان میں رہتے ہوئے خزاں اور بہار کے دونوں موسم گزر گئے۔

موسم بہار کا جب دوسرا چاند قریب تھا۔ اور چینیوں کی مسرت کا وہ دن جس کو ہاچوا یعنی ہزاروں غنچوں کی شگفتگی کا دن کہتے ہیں آن پہنچا۔ تو منگو آئی اپنے والدین سے ملنے کو بیقرار ہو گیا۔ اور اس نے جب اپنا منشا نیک دل شیانگ کے آگے ظاہر کیا تو نہ صرف اس کی خواہش کے مطابق اجازت دیدی گئی۔ بلکہ اس کو نقرئی تحفہ بھی دیا گیا۔ تاکہ وہ اپنے والدین کی خدمت میں پیش کر سکے۔ چینیوں کا دستور ہے کہ ہاچوا کی عید میں وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اکثر تحفے دیا کرتے ہیں۔

اس یادگار دن کی تمام فضا پھولوں کی خوشبو سے معطر تھی۔ اور شہد کی مکھیوں کی آواز سے خلا بھرا تھا۔ منگو آئی نے محسوس کیا کہ جس راستے پر کہ وہ چل رہا تھا اس پر کسی نے ایک زمانہ سے قدم نہیں رکھا۔ گھانس راستہ پر بہت اگ آئی تھی اور دو طرفہ گھنے درخت اپنی سرسبز شاخیں پھیلائے منگو آئی کو آغوش میں لیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جنگل کے تنگ و تاریک حصہ بھی ایک جھاڑ کنول کی طرح روشنی سے چمک اور خوشبو سے مہک رہے تھے۔ اس بدمست کن فضا کا اثر منگو آئی کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ منگو آئی ان نو شگفتہ پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ اور ہوا کی عطر بیزیوں خوشگوار اور پرلطف خاموشی کے مزے لینے لگا عین اس عالم سرور میں اک نازک آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جو پھولوں کے ایک سایہ دار جھنڈ سے آئی تھی اس نے دیکھا کہ ایک گلبدن دوشیزہ اپنے آپ کو پھولوں کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گو منگو آئی نے ایک ہی جھپک دیکھی تھی۔ لیکن چہرہ کی ملاحت۔ بدن کی نزاکت آنکھوں کی دلربائی۔ اور خصوصاً خمدار ابرو کی رعنائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ منگو آئی نے جلدی سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور فوراً کھڑا ہو گیا اور اپنا راستہ لیا لیکن پتوں کی آڑ سے متوالی آنکھوں کی ناوک زنی کے تصور میں کچھ ایسا کھو گیا۔ کہ تحفہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ کسی نازک قدم کے پیچھے سے دوڑتے آنے کی آواز آئی۔ اور زنانی آواز میں کسی نے منگو آئی کو نام لیکر پکارا۔ منگو آئی فوراً پلٹا اور نہایت استعجاب سے دیکھا

کہ ایک لڑکی اس کی طرف دوڑتی چلی آرہی ہے۔ قریب آکر لڑکی نے کہا "میری مالکہ نے حکم دیا ہے کہ یہ چاندی کی چیز جو راستہ میں گر گئی تھی اٹھا کر آپ کو دیدوں۔" منگوآئی نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا "میری جانب سے تمھاری مالکہ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرنا" یہ کہا اور اس معطر خاموش فضا میں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح روانہ ہوگیا۔ لیکن محسوس کر رہا تھا کہ اس کا قلب اس سرمایہ حسن کے خیال میں غیر معمولی تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔

واپسی میں منگوآئی پھر اسی راستہ سے آیا۔ مناظر قدرت کا وہی حال تھا۔ منگوآئی پھر اسی مقام پہ ٹھیرا جہاں پچھلی دفعہ اس نے اس پیکر حسن کی جھپک دیکھی تھی۔ لیکن اس مرتبہ وہ یہ دیکھکر اور متعجب ہوگیا کہ دو طرفہ درختوں کے درمیان ایک محل ہے جس پہ پچھلی مرتبہ نظر نہیں پڑی تھی یہ خاص قسم کی ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ مکان گو عالیشان نہیں لیکن بڑی حد تک خوبصورت ضرور ہے۔ اس کے دوہیرے اور خمیدہ چھت کی نیلی چمکدار کویلو درختوں پر سے خاص طور پہ جاذب نظر ہے۔ رنگ برنگ کے نقوش جو جھرکوں کے اطراف ابھرے ہوئے بنائے گئے تھے۔ فن نقاشی کا بہترین نمونہ تھے۔ محل کے آگے ایک وسیع چبوترا تھا۔ اور چبوترے کی بالائی سیڑھیوں پہ دونوں جانب چینی کے گملے بنے ہوئے تھے۔ منگوآئی نے محل کی مالکہ کو اپنی اس خادمہ کے ساتھ کھڑے ہوئے پایا جس نے اس سے پہلے شکریہ کے الفاظ پہنچائے تھے۔ منگوآئی نے نظر اٹھاتے ہی دیکھا کہ دونوں اسی پہ نظر جمائے مسکرا رہی ہیں۔ گو منگوآئی شرما رہا تھا۔ لیکن ہمت کر کے کسی قدر قریب گیا اور حسن کی دیوی کو سلام کیا۔ منگوآئی کی اس کھوئی ہوئی حالت کو دیکھکر محل کی مالکہ تو اندر چلی گئی۔ لیکن نوجوان خادمہ نے اشارہ سے نزدیک بلایا اور ایک قدیم طرز کا دروازہ جس کو سرخ پھولوں کی بیل نے تقریباً نصف کے ڈھانک دیا تھا۔ منگوآئی کے لئے کھول دیا۔ منگوآئی دروازہ کھول کر نو شگفتہ پھولوں کی روش سے ہوتا ہوا تعجب اور مسرت کے مشترکہ جذبات کے ساتھ چبوترے کی طرف بڑھا۔ اور خادمہ وسیع زینہ تک اس کے استقبال کو آئی اور جب منگوآئی زینہ چڑھنے لگا تو خادمہ نے کہا۔

"جناب عالی میری مالکہ کا خیال ہے کہ آپ اس ناچیز خدمت کا جو حال میں اس کے حکم سے کی گئی تھی۔ شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ تشریف لائے۔ وہ آپ سے واقف ہے اور گفتگو کرنا چاہتی ہے۔"

منگوائی اندر آیا۔ اس کے قدم سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ فرش نرم اور ملائم ہونے کے علاوہ جنگل کے سبزے کی طرح لچکدار بھی تھا۔ کمرہ ملاقات جس میں یہ داخل ہوا کشادہ، ٹھنڈا اور تازہ گلدستوں سے معطر تھا۔ ایک لطف انگیز سکوت سارے محل پر چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا بانس کے نیم وا دریچوں سے آنیوالی روشنی میں اوپر سے گزرنے والے پرندوں کا سایہ دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی تیتریاں جن کے پروں پر سرخ رنگ کے درخشاں چھینٹے ہوتے تھے۔ اندر چلے آتے اور کچھ دیر رنگین ظروف کے اطراف گھوم کر نکل جاتے۔ ان تیتریوں کی خاموش پرواز کی طرح محل کی نوجوان مالکہ مقابل کے دروازہ سے کمرہ ملاقات میں داخل ہوئی۔ اور نہایت مشفقانہ انداز میں منگوائی سے مخاطب ہوئی۔ منگوائی سینہ پر ہاتھ رکھکر تعظیم کے لیئے جھک گیا۔ حسینہ کسی قدر بلند قامت تھی اس کا چھریرا بدن خوبصورت گل لالہ کی طرح نازک تھا۔ اس کے بالوں میں چیونشاکی کے زردی مائل سفید پھول گوندے ہوئے تھے۔ قیامت خیز چال میں زرد ریشمی لباس اس طرح رنگ بدلتا تھا جیسے روشنی میں تبدیلی کے ساتھ۔

رسمی آداب کے باہمی تبادلے کے بعد جب دونوں بیٹھ گئے تو حسینہ نے کہا، "اگر میرا خیال غلطی نہیں کر رہا ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میرا معزز مہمان وہی ٹین شا ہے جو منگوائی کے نام سے مشہور ہے جو میرے معزز رشتہ دار صوبہ دار کے بچوں کا اتالیق ہے۔ چونکہ امیر شانک کا خاندان میرا ہی خاندان ہے۔ اس لئے اس کے بچوں کا اتالیق گویا میرے بچوں کا اتالیق ہے۔

منگوائی نے تعجب کا اظہار کئے بغیر پوچھا، "کیا میں آپ کے معزز خاندان کا نام اور میرے مربی سے آپ کا رشتہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟" حسینہ نے جواب دیا کہ "میرے غریب خاندان کا نام ینگ ہے جو شہر شنگ ٹاد میں ایک زمانہ سے آباد تھا اور میں مون ہاؤ کے ایک سائی (SiE) کی لڑکی ہوں۔ اسی مناسبت سے میرا نام بھی سائی رکھا گیا۔ اور میں ینگ خاندان کے ایک نوجوان سے بیاہی گئی جس کا نام شانگ تھا۔ اس تعلق سے مجھے آپ کے عالی قدر مربی سے قرابت ہے۔ لیکن شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اور میں نے اسی سنسان مقام کو اپنی بیوگی کا زمانہ گزارنے کے لیے کنج عافیت بنا لیا ہے۔"

سائی کی آواز میں ابلتے چشموں اور بہتے نالوں کا سا مترنم کرنے والا ترنم تھا۔ اور باتوں

تیں کچھ ایسی مٹھاس تھی کہ منگو آئی کو اس سے پہلے کبھی سننا نصیب نہیں ہوا تھا لیکن یہ معلوم کرکے کہ وہ بیوہ ہے نوجوان نے مناسب نہ سمجھا کہ بغیر اصرار کے دیر تک ٹھیرا رہے۔ اس لیئے چائے کے بعد ہی رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ لیکن ساآئی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس قدر جلد چلا جائے۔

"نہیں جناب" حسینہ نے کہا "براہ کرم تشریف رکھیئے اگر آپ کے معزز مربی کو معلوم ہو جائے کہ یہاں آپ کی چاہیئے ویسی آؤ بھگت نہیں ہوئی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور مجھ سے ناراض ہوں گے۔ کم از کم شام کے کھانے تک تو ٹھیر جایئے۔"

منگو آئی ٹھیر گیا اور اس روک لئے جانے پر دل ہی دل میں خوش تھا۔ ساآئی اس کی نظر میں حسین ترین عورت تھی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اپنے والدین سے زیادہ وہ اس حسینہ سے محبت رکھتا ہے۔ باتوں باتوں میں شام کے ارغوانی دھندلکے پر رات کی تاریکی غالب آگئی۔ اور غروب آفتاب کی شفق آہستہ آہستہ غائب ہوگئی۔ تین ستاروں کا مجموعہ جس کو برج میزان کہتے ہیں اور جس کے قبضہ میں انسانی حیات و ممات کا معاملہ ہے۔ قطب شمالی کی جانب آسمان پر نمودار ہوا ساآئی کے محل کے رنگین قمقمے روشن کئے گئے۔ شام کے کھانے کے لیئے دسترخوان چنا گیا۔ منگو آئی بیٹھنے کو تو بیٹھ گیا لیکن اشتہا مطلق نہ تھی اور مقابل کے حسین چہرہ کی دید میں محو تھا۔ یہ دیکھکر کہ نوجوان مہمان نے پیش کردہ لذیذ غذاؤں میں سے بمشکل چند نوالے اٹھائے ہیں۔ ساآئی نے شراب سے تواضع کی۔ اور جام کے دور شروع ہوگئے۔ شراب ارغوانی تھی اور اسقدر ٹھنڈی کہ اس سے جام کے باہر تو نمی پیدا ہوتی تھی۔ لیکن رگ و پے میں پہنچتے ہی خاص حرارت پیدا کردیتی تھی۔ عالم سرور میں منگو آئی کی نظر میں آرائش کی تمام چیزیں پر نور ہوگئیں۔ کمرے کی دیواریں پیچھے کو ہٹتے ہوئی چھت اوپر کو بلند ہوتی ہوئی۔ اور قمقمے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ساآئی کی آواز نوجوان کے کان میں ایسی سریلی معلوم ہوئی جیسے دور سے سنائی دینے والا راگ رات کی خاموشی میں۔ دل اچھلنے لگا۔ زبان بھکنے لگی۔ اور ایسے الفاظ نکلنے لگے جس کو وہ ہوش کی حالت میں زبان پر نہ لاسکتا تھا۔ اس پر بھی ساآئی نے اس کو باز رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ساآئی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ لیکن منگو آئی کی زبان سے اپنی تعریف سنکر اس کی بڑی چمکدار آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں اور منگو آئی کی نگاہ شوق کو محبت آمیز نظر

سے دیکھنے لگی۔
سائی: "میں نے آپ کے عجیب و غریب کمالات اور قابلیتوں کی شہرت سنی ہے۔ گو میں نے موسیقی کی باضابطہ تعلیم نہیں پائی مگر کچھ گا لیتی ہوں۔ اور اب چونکہ فن موسیقی کا ایک ماہر میرا مہمان ہے۔ اس لیئے تکلف کو بالائے طاق رکھکر چاہتی ہوں کہ آپ میرے ہم نوا ہوں اور ذرا توجہ سے میرے راگنیوں کو سن لیں تو بڑی عزت افزائی ہوگی۔"
منگوائی "یہ میری بڑی عزت افزائی ہے اور میں ان غیر مترقبہ عنایات کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔"
چاندی کی گھنٹی کی آواز پر خادمہ آئی اور ساز رکھ گئی۔ منگوائی نے مسودات کو اٹھایا۔ اور شوق سے دیکھنے لگا یہ کاغذات بہین تھے اور ان کا رنگ زردی مائل تھا خط میں قدیم نستعلیقی خوبیاں تھیں۔ گویا ہی سانگ اور سی چی شو کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ اور اس پر خاندان سانگ کے یاں چین۔ کیوپین۔ بھیومیو بلند پایہ شعرا اور گویوں کی مہریں تھیں منگوائی ایسے بیش بہا اور نادر خزانہ کو دیکھ کر خوشی سے چیخ اٹھا۔ اور ان کاغذات کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ہاتھ سے علٰحدہ نہیں کرتا تھا۔
منگوائی۔ (جوش سے) "یہ انمول سرمایہ تمام بادشاہوں کے خزانوں سے کہیں زیادہ بیش بہا ہے۔ یہ اُن استادان فن کی تحریر ہے جو ہم سے پانسو سال قبل گزرے ہیں۔ کیسے عجیب طریقہ سے ان کو محفوظ کیا گیا ہے۔ کیا یہ وہی عجیب روشنائی نہیں؟ جس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "صدیوں تک مجھ میں پہاڑ کا استحکام ہوگا۔ اور میرے بنائے ہوئے الفاظ میں دائمی پائداری۔" اس کلام میں کتنی روحانیت اور جادو اثری ہے جس کو کیوپین کا حاکم ذی جوآن نے جو اپنے عہد کا ملک الشعرا بھی تھا۔ پانسو سال قبل لکھا تھا۔
سائی۔ (دبی آواز میں) "کیوپین۔ کیوپین۔ پیارے کیوپین" اس وقت سائی کی آنکھیں چمک رہی تھیں "وہ کیوپین کو میں بھی پسند کرتی ہوں۔ پیارے منگوائی آؤ اس کی غزلوں کو ہم تم ملکر گائیں۔ اور اس قدیم زمانہ کی طرز میں گائیں جس کے لوگ اس زمانہ سے زیادہ شریف اور عقلمند تھے۔"
ان کی سحرکار آواز ایک خوش نوا پرندے کی طرح معطر رات میں گونجنے لگی۔ فضا بھی انکی

ہم آہنگی کر رہی تھی سیال شیرینی سے ماسور ہو گئی تھی۔ منگو آئی اپنی پُر سحر انگیز آواز سے بہت جلد مسحور اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کمرہ کی روشنی اس کی نظر میں دھندلی ہو گئی۔ اور مسرت کے آنسو اس کے رخساروں پہ بہنے لگے۔

اس حالت میں نو بجگئے۔ اور پھر بڑی رات تک بات میں بات نکلتی گئی۔ ارغوانی شراب کے دور چلتے رہے۔ شانگ کے زمانہ کی گیتیں گائی جاتی رہیں۔ ایک سے زائد مرتبہ منگو آئی کو رخصت ہونے کا خیال آیا۔ لیکن سائی شعرائے قدیم کے عجیب و غریب قصّے۔ ان کی عشق کی داستانیں کچھ ایسے دلربا انداز میں سناتی رہی کہ منگو آئی حرف مطلب زبان پر نہ لاسکا۔ بعض وقت وہ ایسا نادر گیت گاتی کہ منگو آئی کی قوت سامعہ کے علاوہ تمام احساسات معلوم ہوتا کہ سلب ہو گئے ہیں۔ آخر میں جب شراب پینے پلانے کے لیئے اس نے گانا بند کیا تو منگو آئی اس کی سڈول گردن میں بائیں ڈالنے۔ نازک سر کو قریب تر لینے اور شراب سے زیادہ سرخ ہونٹوں کا بوسہ لینے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔ دونوں کے ہونٹ جب مل گئے تو پھر جدا ہونے کا نام نہ لیا۔ رات گزر گئی۔ اور انھیں اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔

پرندے چہچہانے لگے۔ کلیاں چٹکنے لگیں۔ اور منگو آئی کے لیے حسین ساحرہ سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ سائی رخصت کرنے کے لیئے چبوترے تک آئی۔ اور گرم جوشی سے پیار کیا۔ اور کہا "پیارے! جب کبھی آسکو آؤ اور جب جی چاہے بے تکلف چلے آنا مجھے یقین ہے کہ تم ان میں سے نہیں ہو جن میں وفاداری اور صداقت نہیں ہوتی۔ اور راز فاش کر دیا کرتے ہیں۔ بمقتضائے سن ممکن ہے کہ تم سے بھی غلطی ہو جائے۔ یاد رکھو ہماری محبت کے گواہ نقطہ پہ چمکتے ستارے ہیں۔ کسی زندہ ہستی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا۔ اور اس خوشگوار رات کی یہ چھوٹی سی یادگار اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

سائی نے ایک عجیب اور نادر پیپر کا غذ (PAPERWEIGHT) جس کی شکل ایک بیٹھے ہوئے شیر کے مانند تھی۔ اور ایک زرد رنگ کے دھاری دار پتھر سے تراشا گیا تھا۔ تحفتاً پیش کیا۔ منگو آئی نے تحفے اور تحفہ دینے والے ہاتھ۔ دونوں کو بوسہ دیا اور کہا " پاک روحوں کی مجھ پہ لعنت ہو اگر کبھی دانستہ تمھاری دلشکنی کا باعث ہوں"۔ یوں باہمی عہد و پیمان کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

امیر شانگ کے مکان پر کرنے کے بعد یہ پہلی جھوٹ تھی جو عمر بھر میں اس کی زبان سے نکلی۔ اس نے بیان کیا کہ اب چونکہ موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کی ماں کی خواہش ہے کہ آئندہ سے وہ رات اپنے گھر پر بسر کرے۔ اگرچہ مسافت طویل تھی۔ لیکن اس کے طاقتور اور تندرست قویٰ کے لیے فطرتاً تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت تھی۔ منگوائی کے بیان پر شانگ کبھی شبہ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے بعد سے منگوائی کی راتیں خوبصورت ساآئی کے ہاں بسر ہونے لگیں۔ ہر رات اسی قسم کی رنگ رلیاں تھیں جس نے پہلی مرتبہ ان کی ملاقات کو دلچسپ بنایا تھا کبھی گاتے کبھی باتیں کرتے۔ کبھی شطرنج کھیلتے اور کبھی پھولوں۔ درختوں۔ بادلوں چشموں اور پرندوں کی تعریف میں شعر موزوں کرتے۔ لیکن ان تمام مشاغل میں ساآئی اپنے نوجوان محبوب سے بدرجہا بڑھی چڑھی رہتی۔ جب بساط بچھتی منگوائی کے شاہ اور فرزین کو قلعہ بند ہونا پڑتا۔ اور شکست کھانی پڑتی جب شعر موزوں کیے جاتے تو ساآئی کی نظمیں الفاظ کی برجستگی۔ خیالات کی بلندی اور موسیقیت کے لحاظ کرنے بہت بلند پایہ ہوتی تھیں۔ موضوع بھی خاندان شانگ کے شعرا کی طرح اکثر ادق انتخاب کیا جاتا۔ گیت بھی وہی گاتے جو پانسو سال قبل گائے جاتے تھے۔

گرما کا موسم عشق و عاشقی میں گزر گیا۔ اور خزاں کا موسم آن پہنچا۔ خلاف توقع ایک وقت امیر شانگ، منگوائی کے باپ سے پوچھ بیٹھا کہ "اب موسم سرما شروع ہونے کے بعد بھی کیا تمہارے لڑکے کو ہر رات گھر جانے کی ضرورت ہے؟ مسافت طویل ہے اور صبح وہ یہاں آنے تک تھک جاتا ہے۔ کیوں اس کو اجازت نہیں دیجاتی کہ برف باری کے زمانہ میں رات کو وہ یہیں سو جایا کرے" منگوائی کے باپ نے بڑی جرأت سے جواب دیا "جناب یہ لڑکا شہر میں نہیں آتا۔ اور نہ موسم گرما میں وہ کوئی رات میرے ہاں رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے اطوار کہیں بگڑ نہ گئے ہوں۔ اور وہ اپنی راتیں جوا کھیلنے اور بازاری عورتوں کے ساتھ شراب خانوں میں نہ گزارتا ہو" صوبیدار نے کہا "اس پر شبہ نہ کرو۔ میں نے لڑکے میں آج تک کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ اور ہمارے قرب وجوار میں شراب خانہ اور چکلے وغیرہ مخرب اخلاق مقامات نہیں ہیں۔ بلاشبہ منگوائی کو کوئی ہم عمر حسینہ مل گئی ہے جس کے ہاں وہ رات بسر کیا کرتا ہے۔ اور صرف اس اندیشہ سے اس نے جھوٹ کہا کہ میں اس کو وہاں جانے کی

اجازت نہ دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملہ میں اس سے کچھ نہ پوچھیں آج ہی میں اپنے آدمی کو اس کے پیچھے روانہ کروں گا۔ کہ اصلیت کو دریافت کرے۔

پلو نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور کل صبح آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ شام ہوتے ہی جب منگوائی شانگ کے گھر سے نکلا ایک ملازم اس کی آنکھ بچا کر ساتھ ہو لیا۔ لیکن راستہ کے ایک تاریک مقام پر پہنچکر منگوائی یکایک نظروں سے غائب ہو گیا بہت دیر تک لاحاصل جستجو کے بعد ملازم پریشان ہو کر واپس آیا۔ اور مالک سے واقعات بیان کیے۔ امیر شانگ نے فوراً پلو کو اطلاع دی۔

اس اثنا میں منگوائی اپنی محبوبہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس کو روتا دیکھ کر بیقرار ہو گیا۔ حسینہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے منگوائی کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور کہا "پیارے! اب ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کو ہیں۔ وجہ بیان کرنی فضول ہے میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ جدائی کا ایک دن ضرور آنے والا ہے لیکن اس پر بھی اتنی جلد جدائی اور قسمت کی کایا پلٹ پر آنسو بہائے نہیں رہ سکتی۔ پیارے! آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم عمر بھر مجھے نہ بھولو گے۔ تم بڑے عالم ہو گے۔ تم پر عزت اور دولت کی بارش ہو گی۔ ایک حسین اور محبت والی عورت تیری نعم البدل ہو گی۔ جیران رنجدہ باتوں کو جانے دو اور اس آخری رات کو خوشی میں بسر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں میری یاد ستائے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بجائے میرے رونے کے میرے ہنسنے کو یاد رکھ سکو" سائی نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور شراب و ساز لے آئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ تاری کن بھی اٹھا لائی۔ تاکہ منگوائی کا دل ایک لمحہ کے لیے آنیوالی جدائی کے خیال سے غمگین نہ ہو۔ اور ایک قدیم گیت گانا شروع کیا جس میں موسم گرما کے چشموں کی خاموشی۔ اور اس میں نیلگوں آسمان کا عکس رنج و افکار کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں دل کی مختصر دنیا کی پر سکون حالت کا ذکر تھا۔ محفل کا رنگ جمتے ہی رنج کا خاتمہ ہو گیا۔ منگوائی کے لیے یہ آخری گھڑیاں پہلی ملاقات سے کہیں زیادہ پر لطف گزریں۔

لیکن جوں ہی صبح نمودار ہوئی افکار نے آگھیرا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر ایک مرتبہ سائی اپنے عاشق کے ساتھ چبوترے تک آئی اور وداعی بوسہ لیا۔ اور ایک رخصتی

تحفہ دیا ۔ یہ تحفہ برش رکھنے کا ایک خوبصورت ڈبہ تھا۔ جو قیمتی پتھر سے تیار کیا گیا تھا۔ اور ایک بلند پایہ شاعر کی میز پر رکھنے کے لیئے موزوں تھا۔

منگو آئی کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہ مفارقت دائمی ہے۔ دل میں کہنے لگا" میں کل ضرور آؤں گا۔ کیونکہ میری زندگی بغیر اس کے محال ہے۔ اگر میں آجاؤں تو وہ مجھے منع تو نہیں کرے گی" یہی خیالات تھے جن کو لیئے ہوئے منگو آئی شانگ کے مکان پر پہنچا۔ دیکھا کہ اس کا باپ اور اس کا مربی دونوں برآمدے میں کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہیں اور قبل اس کے کہ منگو آئی ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔ پلو نے دریافت کیا" بیٹا! تمھاری راتیں کہاں بسر ہوا کرتی ہیں" یہ دیکھ کر کہ اس کی جھوٹ ظاہر ہوگئی منگو آئی نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ پلو غضب آلود ہو کر منگو آئی کے ایک ڈنڈا رسید کیا۔ اور حکم دیا کہ وہ صاف صاف کہدے۔ کچھ تو والدین کے ڈر سے اور زیادہ تر اس قانون کے خوف سے جن کے تعزیراتی الفاظ یہ ہیں" جو لڑکا اپنے باپ کا کہا نہ مانے اس کو سو ڈنڈے رسید کیئے جائیں" منگو آئی نے محبت کی داستان سنانی شروع کی۔

شانگ کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ آخر میں صوبہ دار نے کہا "میاں بچے! پنگ نامی نہ کوئی میری رشتہ دار ہے۔ نہ میں اس عورت کو جانتا ہوں اور نہ کبھی اس مکان کے متعلق ہی سنا ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ تم اپنے باپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے البتہ اس میں مافوق الفطرت اثر ضرور معلوم ہوتا ہے"

منگو آئی نے سائی کے دیئے ہوئے تحفے۔ زرد پتھر کا شیر۔ برش رکھنے کا ڈبہ اور حسینہ کے موزوں کیئے ہوئے چند اشعار۔ پیش کیئے۔ پلو اور شانگ دونوں متحیر تھے۔ برش کے ڈبہ اور شیر پتھر میں ان چیزوں کی شباہت تھی جو صدیوں پہلے سپرد خاک کر دی گئی تھیں۔ اور اس زمانہ میں کوئی کامل صناع ان کی نقل اتار نہ سکتا تھا۔ اور نظمیں مسلمہ طور پر شہ کار تھیں جو خاندان شانگ کے شعرا کے قدیم طرز پر موزوں کی گئی تھیں۔

"دوست پلو"! صوبہ دار نے جلدی سے کہا "ہمیں اس لڑکے کے ساتھ اس مقام پر جانا چاہیئے جہاں سے یہ نادر چیزیں اس کے ہاتھ لگی ہیں۔ آؤ اس مسئلہ کو حل کرنے کی

کوشش کریں۔ لڑکا سچا ہے لیکن اس کی داستان میری سمجھ سے باہر ہے" اور سائی کے قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

جب راستہ کے اس سایہ دار حصہ پہ پہنچے۔ جہاں خوشبو مہک رہی تھی اور سبزہ لہلہا رہا تھا۔ منگوائی درختوں کے جھنڈ پہ نظر دوڑا کر مایوسی سے چیخ اٹھا۔ کیونکہ جہاں پہلے نیلی کوپلو والا مکان کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہاں فضا کے نیلے رنگ کے سوا اب کچھ نہ تھا۔ اور جہاں سبز اور سنہری برآمدے تھے وہاں خزاں کی زرد روشنی میں صرف سنز پتے ہلتے نظر آتے تھے۔ جہاں وسیع چبوترہ تھا وہاں ویرانہ سائی کا محل غائب ہوگیا تھا۔ اور اس کے بجائے ایک قدیم مزار تھی جس پہ اسقدر کائی جمی ہوئی تھی کہ اس کا کتبہ بھی پڑھا نہیں جاتا تھا۔

مزار دیکھتے ہی صوبہ دار سر پیٹنے لگا۔ اور پلو سے مخاطب ہو کر شنکو کا مشہور شعر پڑھا۔

۶ "پھول نرگس کے کھلینگے سائی تھاؤ کی قبر پر"

"دوست پلو" شانگ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ حسن جس نے تمھارے بیٹے کو مسحور کیا ہے اس عورت کے سوا کوئی اور نہیں جس کا مزار اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کیا اس نے نہیں کہا کہ وہ ہینگ کاتگ کی بیوی ہے۔ گو اس نام کا کوئی خاندان باقی نہیں رہا۔ لیکن اس نام کی شہر میں ایک گلی اب بھی موجود ہے دوسری تمام باتیں ایک معمہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سائی موتن ہیو بتاتی ہے۔ اس نام کا نہ کوئی خاندان ہے اور نہ کوئی گلی بھی اس نام سے موسوم ہے۔ البتہ چینی زبان موتن اور ہیو دونوں لفظوں کو ملانے سے کیو یعنی سننے کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہینگ کھاتگ۔ کیوکی شرک کی ایک گلی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں شانگ خاندان کی وہ عورت رہتی تھی جس کو شاہی تقرب حاصل تھا۔ کیوپین نے اپنی نظموں میں ان دونوں تختوں کی تعریف کی ہے اور ان صناعی کے بہترین نمونوں کو شہر تھوائی کے اور شاہ کاؤ کی ملکیت ہونے پر فخر کیا ہے شہر کا تو اب پتہ نہیں البتہ کیوپیں کی یاد تازہ ہے جو صوبہ سشن شوان کا حاکم تھا اور ایک زبردست شاعر بھی۔ اس زمانہ میں خوبصورت سائی اس کی محبوبہ تھی جو اپنے ہمعصر حسینوں میں لاجواب گنی جاتی تھی یہی وہ کیوپین ہے جس نے یہ نظمیں اس کو دی تھیں اور یہی وہ شخص

ہے جس سے صناعی کے یہ اعلیٰ نمونے سائی کے نذر کی تھیں۔
سائی کی موت عام عورتوں کی سی نہ تھی۔ اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ ہوں گی لیکن اس کی روح ان تاریک مقامات میں ابتک موجود ہے۔"
شانگ کی زبان بند ہوگئی۔ تینوں پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ صبح کی کہر نے سبزہ زار کو دھندلا بنا دیا تھا۔ جنگل اور زیادہ بھیانک ہوگیا۔ نسیم کا ایک ہلکا سا جھونکا چلا اور آن مرجھانے والے پھولوں کی آخری خوشبو سنگھا گیا جو اکثر گل پیرہنوں کے اتارے ہوئے لباس سے آتی ہے۔ اور ہوا کے جھونکوں کے درختوں سے ہو کر گزرنے میں سائی سائی کی آواز سنائی دی۔
چونکہ لڑکے کی جان کا خوف تھا اس لیئے یَلو نے اس کو شہر کورنگ جاتو بھیجدیا۔ جہاں منگو آئی نے اپنی علمیت کے زور سے بڑے بڑے اعزاز اور رتبے حاصل کیئے۔ اور ایک معزز خاندان کی لڑکی سے شادی کی جس سے کئی لڑکے لڑکیاں ہوئیں جنھوں نے بعد میں حسن صورت و حسن سیرت کی وجہ سے دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ لیکن منگو آئی کے دل سے سائی کی یاد نہ جاتی تھی نہ گئی۔ اس نے کبھی اس کا ذکر زبان پر نہ لایا۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں سے بھی کچھ نہ کہا حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ اس کے میز پر رکھے رہنے والی دو خوبصورت چیزوں کا قصہ بیان کرنے کے لیئے اس کو تنگ کرتے۔

احسان کا معاوضہ

از
جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی اے

شاہ منصور بجملہ دیگر مشاغل تفریح کے شکار کا بیحد شایق تھا ایک روز وہ شکار کو نکلا تھا کہ اتفاقاً ایک خوفناک طوفان اٹھا جس سے تمام فصلیں تباہ اور جنگل برباد ہوگئے اور اس کے درباری اس سے جدا ہو کر اس کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے۔ پریشانی میں راہ

بھٹک کر بادشاہ اپنے ہمراہیوں سے جدا ہو گیا شام تک جنگل میں پھرتا رہا اور ہوا کا اس قدر زور تھا کہ پناہ ملنے کی کوئی توقع نہ تھی اس پر بھی وہ اپنے گھوڑے کو اپنے قبضہ میں رکھے رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اب بچاؤ کی کونسی راہ اختیار کی جائے شب کی تاریکی نے دنیا پر تسلط جما لیا تھا اور بادل گرج رہے تھے اس لیئے وہ آگے بڑھنے سے ڈرتا تھا کہ مبادا غاروں میں یا جنگل کے دلدلوں میں گر کر مزید خطرہ میں گرفتار نہ ہو جائے۔ جس وقت وہ اس طرح برق کی تابندگی اور طوفان کے زور کو دیکھتا کھڑا تھا اس نے ہر اطراف میں کسی انسان کی تلاش میں نظر دوڑائی لیکن کوئی چیز نظر نہ آئی لیکن چند قدم اور آگے بڑھنے کے بعد اس کو تھوڑے فاصلہ پر کچھ روشنی نظر آئی یہ روشنی ایک غریب مچھیرے کے جھونپڑے کی تھی جو آس پاس کے کھڈوں اور تالابوں میں بام مچھلیاں پکڑ کر اپنی گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ بادشاہ کی آواز سنکر جو انسانوں کی بستی سے خوش ہو کر چیختا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مچھیرا بھٹکے ہوئے مسافر کی مدد کے خیال سے آگے بڑھا وہ سمجھ رہا تھا کہ غریب مسافر طوفان کی تاریکی میں راہ بھول گیا ہے۔ بادشاہ نے اس کے قریب جا کر استدعا کی کہ وہ اسے شاہی محل کی قریب ترین راہ بتلا دے مچھیرے نے کہا شاہی محل یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ہے یہ سنکر بادشاہ نے کہا "اے دوست میں تجھ کو زحمت دیتا ہوں۔ مجھ پر احسان کر و آئندہ تجھ کو شکایت کا موقع نہ ملیگا" مچھیرے نے جواب دیا اگر شاہ منصور بھی اسوقت اس قسم کی استدعا کرتا تو میں اتنی رات کو جبکہ طوفان زوروں پر ہے رہنمائی کی جرأت نہ کرتا تھا کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو غالباً اپنے بادشاہ کو تباہی و خطرہ میں ڈالنے کے جرم کا مرتکب ہوتا۔ رات تاریک ہے اور ہر طرف پانی ہے" بادشاہ نے کہا "تمہیں بادشاہ کی سلامتی کی اسقدر فکر کیوں ہے" اس پر مچھیرے نے کہا "میرے دل میں سب سے زیادہ اس کی عزت ہے اور میں اپنی ذات سے بڑھ کر اس کو محبت کرتا ہوں" بادشاہ نے سوال کیا "ایسی کونسی نیکی یا عنایت بادشاہ نے تیرے ساتھ کی ہے کہ تو اس کی اسقدر عزت کرتا ہے میرے خیال میں اگر تو اس کا مقرب ہوتا تو تجھ کو اس سے بہتر قیام و طعام نصیب ہوتا۔" مچھیرے نے جواب دیا "میرے جان و مال اور آزادی کی حفاظت سے بڑھ کر میں اپنے بادشاہ سے اور کیا عنایات حاصل کر سکتا ہوں میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب اس کے رحم و کرم عقلمندی اور عدل و انصاف کا

پھل ہے اس کے علاوہ وہ امن کے زمانہ میں ہماری حفاظت کرتا ہے اور جنگ میں بھی عربوں اور دیگر دشمنوں کے حملوں سے بچاتا ہے حتیٰ کہ مجھ جیسے غریب مچھیرے کو بھی جس کے زیرپرورش ایک بیوی اور چند بچے ہیں بادشاہ نے فراموش نہیں کیا اور میں امن و آرام سے اپنی مفلسی میں آزاد ہوں۔ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں۔ جہاں کہیں چاہوں مجھے مچھلیاں پکڑنے اور اپنے بال بچوں کے لیے روزی پیدا کرنے کے لیے موقع ہے انھیں اچھے بازاروں میں لیجا کر فروخت کرنے کی اجازت ہے دن ہو یا رات ہر وقت بھی میں جس طرح چاہتا ہوں نہایت آزادی کے ساتھ اپنے مسکین جھونپڑے سے باہر جاتا اور واپس آتا ہوں اور آس پاس کے جنگلوں اور وادیوں میں کسی شخص نے آجتک مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا یہ ساری راحتیں مجھے کس کی وجہ سے نصیب ہیں؟ ان سب نعمتوں کے لیے میں اسی کا رہین منت ہوں میں دن رات خدا سے اور پیغمبر برحق سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ ہمارے بادشاہ کی حفاظت کرے سپاہی صاحب۔ آپ پانی میں بھیگتے کھڑے ہیں۔ اور میں باتیں کئے جا رہا ہوں۔ براہ کرم غریب کٹیا میں قدم رنجہ فرمائیے۔ اور جسقدر آرام ممکن ہے حاضر ہے۔ کل میں آپ کو بادشاہ کے پاس یا جہاں آپ چاہیں پہنچا دوں گا۔"

منصور نے بخوشی یہ دعوت قبول کی اور گھوڑے سے اتر کر طوفان سے پناہ لینے کی غرض سے مچھیرے کے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ منصور کا گھوڑا بھی اس نیک آدمی کے جھونپڑے کے ایک حصہ میں جو اس کے گدھے کے لیے تیار کیا گیا تھا پناہ گزین ہو کر غلہ اور گھانس کھاتا رہا آگ کے قریب بیٹھکر بادشاہ اپنے جسم میں گرمی پیدا کرنے اور تھکاوٹ کو دور کرنے میں مصروف تھا اور مچھیرے کی عورت کھانے کے لیے مچھلیاں پکا رہی تھی کھانا کھاتے وقت بادشاہ نے پوچھا کہ کیا مچھلی کے سوا اور کسی قسم کا گوشت نہیں ملسکتا؟ مچھیرے نے جواب دیا کہ اس کے پاس ایک بکری اور اس کا بچہ موجود ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کا مہمان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے تو اس نے بکری کو ذبح کر کے اسکے لذیذ حصے بادشاہ کے خاصے میں رکھے۔ کھانے کے بعد بادشاہ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے سو گیا۔

صبح کو وقت مقررہ پر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اس کا مہربان میزبان اس کے

ہمراہ تھا اس نے اب رہبری کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ ابھی وہ دلدل اور تالابوں کی حدود سے آگے بھی جانے نہ پائے تھے کہ بادشاہ کے کئی ہمراہیوں سے ان کی ملاقات ہوئی جو بڑی پریشانی سے بادشاہ کو پکارتے ہوئے ہر طرف تلاش کر رہے تھے بادشاہ کو اس طرح صحیح سلامت پانے پر انھیں جو مسرت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ بادشاہ نے غریب مچھیرے سے مخاطب ہو کر کہا کہ "جس بادشاہ کی اس نے بیحد توصیف کی اور گذشتہ شب جس کی اخلاق اور عزت کے ساتھ مودبانہ دعوت کی خود ہی ہے نیز اس کو یقین دلایا کہ اس کی عجیب و غریب مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا صلہ اس کو ضرور ملے گا۔

مچھیرے کے جھونپڑے سے کچھ فاصلہ پر بادشاہ نے دوران شکار میں آرام لینے کی خاطر چند مکانات تیار کئے تھے اور اس کے بہت سے درباری اور امرا نے بھی اطراف واکناف کی اراضی پر اپنے مکانات تعمیر کر رکھے تھے اس کی وجہ سے منظر نہایت خوشنما ہو گیا تھا۔ شریف مچھیرے کو موزوں انعام عطا کرنے کے خیال سے بادشاہ نے حکم دیا کہ ان مکانات کے متصل جو تالاب اور کنٹے ہیں خشک کر دیئے جائیں اس کے بعد ایک شاندار شہر کے حدود مقرر کر کے جدید تعمیر شدہ محلات اور مکانات اس میں شامل کئے اور شہر کو خاص مراعات عطا کر کے جس کی وجہ سے وہ بہت جلد نہایت مشہور۔ آباد اور طاقتور ہو گیا اس نے اس مقام نام محل اعظم" (CeSAT Alkebir) رکھا۔ اور اپنی احسان مندی اور شکر گزاری کی یادگار کے طور پر ہر ایماندار مچھیرے کو نذر کیا۔ ھل جزاء الاحسان الا احسان۔

اس بادشاہ کے بعد جب اس کے فرزند اس کے جانشین ہوئے تو اس وقت تمام ریاست میں کوئی شہر بلحاظ عظمت شان اور وضع و خوبی کے اس شہر کا مدمقابل نہ تھا۔ ہر قسم کے تجار اور ہنرمندوں سے بھرا ہوا تھا مسجدیں نہایت شاندار تھیں اور کالج اور شفاخانے بھی قابل تعریف تھے۔ چونکہ شہر میں اچھے کنویں صرف معدودے چند ہیں اس لیئے پانی کے حوض اور دیگر ؟ کثرت سے موجود تھیں۔

پولی منظر کا ایک رُخ

مترجمہ

جناب محمد محی الدین صاحب

[منظر ایک تنہا سرائے کا ہے جو روسی پولینڈ میں جرمنی کی سرحد پر واقع ہے۔
اس کا مالک ہرزلک نامی ایک یہودی ہے جس کے پیشہ کا ایک حصہ یہ بھی
ہے کہ وہ امریکہ کے لیئے ترک وطن کرنے والوں کو چوری سے رات کے وقت
سرحد کے پار کردے۔ حاضروں اور ہرزلک کے علاوہ یہاں ایک بوڑھا
فقیر۔ اس کی بیوی ڈاکسی اور دو مزدور بھی ہیں جو ساتھ بیٹھے ہوئے شراب
پی رہے ہیں۔ جزیک نامی ایک نوجوان بھی جو حالت اشتعال میں کسی خادم
کو بیجا طور پر مارنے کی سزا میں دو مہینے کے لیئے قیدخانہ بھیجا گیا تھا اور جو
مغرور ہوگیا تھا اب اطراف کے گھنے جنگل سے نکلکر سرائے میں داخل ہوگیا ہے]
وہ مارچ کی ایک سرد اور طوفانی رات تھی۔ بارش زور سے ہو رہی تھی۔

قریب کے جنگل کی سرزمین بارش کی کثرت کی وجہ سے کیچڑ سے دلدل بنی ہوئی تھی۔ درخت سردی سے کانپ رہے تھے کبھی ان کی شاخیں زور سے ہلنے لگیں گویا وہ پتوں پر جمے ہوئے پانی کو جھٹک کر صاف کر رہے ہیں اور کبھی کسی درندے کی وحشی چنگھاڑ جو اس سخت طوفانی اذیت میں گرفتار تھا فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی۔ پھر وزنی برف تیزی سے گر کر اس مدھم شور کو دبا دیتا جو کسی اکڑے ہوئے پرندے کی چیخ یا شاخوں کے سرسرانے سے پیدا ہوتا۔ مگر طوفانی ہوا پھر زور و شور سے چلنے لگتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو تنکوں کی طرح توڑ کر گرا دیتی اور پتوں میں سے فاتحانہ سیٹی بجاتی ہوئی گزر جاتی جنگل اس سرے سے اس سرے تک ہلنے لگ جاتا۔ یا خلاء کی گہرائیوں سے سڑے ہوئے گھانس کے خرمن کی طرح عظیم الجثہ خاکی بادل اٹھتے اور جھاڑوں سے بغلگیری میں الجھ جاتے اور رفتہ رفتہ سرد مسلسل

ترشح کی صورت میں گھل جاتے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کیچڑ پانی اور برف کی ندی ان پر بہہ رہی تھی۔ گاؤں قبرستان معلوم ہوتے تھے۔ کھیت تاراج اور ندیاں برف سے جمی ہوئیں۔ آدمی اور زندگی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ رات کی طاقتور خودمختار ملکہ تنہا حکمرانی کر رہی تھی۔

صرف ہر زلک کی سرا میں چھوٹی سی روشنی چمک رہی تھی۔ سرا جنگل کے بیچ میں ایک چورا ہا پر واقع تھی۔ جس سے تھوڑی دور پر پہاڑ کے دامن میں چند جھونپڑیاں دھندلی سی دکھائی دیتی تھیں۔ باقی چاروں طرف تناور درخت اور گنجان جنگل تھا جس کے درمیان سے سڑک گزرتی تھی۔

جزیک دن کیارک باحتیاط تمام جنگل سے سڑک پر آیا۔ اور سرا کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھ کر کھڑکی تک گیا۔ اندر جھانکا۔ پھر خوف و تامل سے چند قدم پیچھے ہٹا۔ حتیٰ کہ ہوا کے ایک سرد ترین جھونکے نے اس میں جرأت پیدا کر دی۔ وہ دوبارہ واپس آیا۔ پلٹا اور سیدھا اندر داخل ہوا۔

سرا زمین کے بڑے رقبہ پر سادگی اور بے ڈھنگے پن سے بنائی گئی تھی۔ زمین ہی کا فرش تھا۔ اور مستطیل دیواروں کے سہارے پر کالی چھت کھڑی تھی۔ دیواروں پر سے قلعی ایک زمانہ ہوا کہ اُڑ چکی تھی۔ دو چھوٹی سی کھڑکیاں بھی مخالف سمتوں میں کھلی ہوئی تھیں جن میں آدھے سے زیادہ گھانس ٹھوس دیا گیا تھا۔ لکڑی کے ایک پوشیدہ کٹھرے کے پیچھے ایک پیپا اور چند برتن ٹوٹی ہوئی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ارنڈی کے تیل کے چراغ کی سرخ لو بدبودار دھواں پھیلا رہی تھی۔ کمرہ کے بڑے حصہ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی جو کبھی کبھی زمانہ قدیم کی قابل قدر یادگار آتشدان کی بجھتی ہوئی آگ کے بھڑک اُٹھنے سے تھوڑی دیر کے لئے دور ہو جاتی۔ آتشدان کے سامنے فقیر اور اس کی بیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کئی آدمی گٹھریوں کی طرح لیٹے ہوئے آپس میں کانا پھوسیاں کر رہے تھے۔ پیپے کے بازو دو مزدور تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور دوسرا گلاس تھامے ہوا تھا۔ وہ بار بار ایک دوسرے کی صحت کا جام پیتے اور نیند بھری ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلاتے۔ کٹھرے کے پیچھے ایک سرخ موٹی عورت زور زور سے خراٹے لے رہی تھی۔ ان سب کے اوپر فضا میں شراب۔

سڑی ہوئی مٹی اور بدبودار پسینہ سے بھرے ہوئے کپڑوں کی ملی جلی تیز بُو قوت شامہ کی ضیافت کر رہی تھی۔

کبھی کمرہ میں یکایک ایسی خاموشی طاری ہو جاتی تھی کہ جنگل کی آوازیں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔ بارش کی کھڑکی کے پٹوں پر بوندا بوندی۔ آتشدان میں سوکھی ٹہنیوں کے جلنے اور چرچرانے کی آواز صاف صاف سنائی دیتی۔ کٹھڑے کے پیچھے ایک نیچا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے یہودی کا بھورا سر نمودار ہوا۔ وہ اپنی عبادت کے لباس میں ملبوس دبی ہوئی آواز میں کوئی مذہبی گیت گا رہا تھا۔ کھلے ہوئے دروازہ میں سے چھوٹی پھیلی شمعوں سے منور ایک کمرہ نظر آتا تھا جس میں سے عود و عنبر کی بو اور غمگین مسلسل آواز گانے کی آ رہی تھی۔

جرنیک نے یکے بعد دیگرے چند جام چڑھائے۔ اور نیم بیہوشی کی حالت میں کھاری مچھلی کے ساتھ چمڑے کے جیسے سخت روٹی کے ٹکڑے چبانے لگا۔ بار بار وہ دروازہ اور کھڑکی کی طرف ایک نظر ڈال لیتا۔ اور پھر خاموشی سے کئی آوازوں سے ملا ہوا دھیما شور سننے لگتا۔

"شادی۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں کبھی شادی نہ کرونگا" مزدوروں میں سے ایک نے دفعتاً چیخ کر کہا۔ اور بوتل کو میز پر پٹک کر نفرت سے زمین پر تھوکا۔

"مگر تم کو ضرور کرنی چاہئیے" دوسرے نے سرگوشی کی "یا نہیں تو لاؤ میرا روپیہ ادا کر دو"

"خدایا! جیو کا۔ سنو تو سہی۔ یہ اس لڑکی کی صحت ——— وہسکی آدھی پینٹ قیمت میں دونگا"

"میاں روپیہ بڑی چیز ہے۔ مگر عورت روپیہ سے بھی بڑی"

"نہیں لعنت ہے۔ میں کبھی شادی نہ کروں گا۔ میں خود کو فروخت کر دوں گا۔ قرض لوں گا اور روپیہ ادا کر دوں گا" "مگر اس بوڑھی قحبہ سے کبھی شادی نہ کرونگا"

"اچھا۔ ذرا میری صحت کا ایک جام اور پی لو۔ اینتھیک۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"

"تم مجھے کبھی اپنا طرف دار نہیں بنا سکتے۔ میں ایک مرتبہ "نہیں" کہہ چکا ہوں اور آخر دم تک اسی پر ثابت قدم رہوں گا اگر کوئی اور صورت بچاؤ کی نہ نکلی تو میں برازیل بھاگ جاؤں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ جو اس کونے میں پڑے ہیں دنیا کی آخری حد تک چلا جاؤں گا۔"

"بیوقوف! لو یہ گلاس لو۔ آخر سنو تو سہی۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی صحت کا جام کئی بار پیا پھر خاموش ہو گئے۔ کیونکہ کونے میں ایک بچہ رو رہا تھا۔ ساکت مجمع میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔

ایک لانبا دُبلا مزدور اندھیرے میں سے ظاہر ہوا اور سرا کے باہر چلا گیا۔

جزیک آتشدان کے پاس گیا۔ کیونکہ سردی اُس کی ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ اور مچھلی کے ٹکڑے کو لکڑی کے سرے پر رکھ کر بھوننے لگا۔ "ذرا ہٹ جاؤ" اس نے فقیر سے کہا۔ جو اپنے دونوں پاؤں آتشدان کی منڈیر پر رکھے ہوئے تھا۔ اور جو اندھا تھا۔ مگر ہوشیاری سے اپنے پاؤں گرد لپٹے ہوئے بھیگے چیتھڑوں کو سکھا رہا تھا۔ اور اپنی بیوی سے جو اس کے بازو بیٹھی ہوئی تھی دھیمی آواز میں کبھی نہ ختم ہونے والی گفتگو کر رہا تھا۔ عورت کچھ پکا رہی تھی اور چولھے کے نیچے پتلی پتلی شاخوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی تاکہ آگ خوب بھڑکے۔ چولھے پر ایک برتن رکھا ہوا تھا جس میں سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

جزیک کو گرمی اور آرام محسوس ہوا۔ اس کے لانبے بھیگے ہوئے کوٹ سے چاردان کی طرح سے بھاپ نکلنے لگی۔

"تم بری طرح بھیگ گئے ہو" فقیر نے ناس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں" جزیک نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

باہر کا دروازہ کھلا۔ مگر صرف دبلا مزدور جو باہر گیا تھا واپس ہوا۔

"یہ کون ہے؟" جزیک نے فقیر کے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"اسے تو میں نہیں جانتا" مگر وہ لوگ چند بیوقوف گدھے ہیں جو برازیل جا رہے ہیں۔" فقیر نے زمین پر تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

جزیک خاموش رہ گیا۔ اس نے آگ تاپتے ہوئے کمرہ کا نظری جائزہ لینا شروع کیا۔ جہاں وہ لوگ جو بظاہر بے چینی سے بڑھتی ہوئی آواز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ دفعتاً خاموش ہو گئے۔ بار بار ان میں سے ایک اُٹھ کر باہر جاتا اور اسی وقت واپس آجاتا۔ اندرونی کمرے سے درد بھرے لہجہ میں دھیمے سے گانے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔

ایک بھوکا کتا آگ کے قریب آکر فقیروں پر بھونکنے لگا۔ مگر لکڑی کی ایک مار پڑتے ہی کراہتا ہوا دور بھاگ گیا اور کمرہ کے بیچ میں بیٹھ کر بھوکی نظروں سے برتن کو دیکھنے لگا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

جزیک کے کپڑے سوکھ گئے۔ اس نے اپنی روٹی اور مچھلی کھائی تھی۔ مگر اب اس کی بھوک پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ مگر وہاں ایک پائی بھی نہ تھی۔ وہ جھک گیا اور کاہلی کے انداز سے برتن اور آگ کی جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھنے لگا۔

"تم کچھ کھانا چاہتے ہو۔ کیوں؟" فقیرنی نے فوراً سوال کیا۔

"مجھے..... بھوک تو ضرور لگ رہی ہے مگر ـــــ"

"کیوں ہے؟" فقیر نے عورت سے نرمی سے پوچھا۔

"حرص مت کرو۔" فقیرنی نے نفرت سے کہا۔ "وہ تمھیں کچھ دینے والا نہیں۔"

"کسان؟"

"ہاں جیسے کسان کہ تم ہو۔ جھولی لیے مارا مارا پھرنے والا۔" وہ چولھے پر سے برتن اتارنے لگی۔"

"دنیا میں بعض اچھے لوگ بھی رہتے ہیں۔ اور بعض وحشی درندے بھی... کیوں؟

"ہاں۔ ہاں۔" لڑکے نے یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جواب دیا۔

"اسوقت تم کسی فکر میں ہو۔ میں جانتا ہوں۔" فقیر نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"خداوند یسوع نے کہا ہے۔ اگر تم بھوکے ہو تو کھاؤ۔ پیاسے ہو تو پیو۔ لیکن اگر

مصیبت میں ہو تو گفت گو مت کرو۔"

"تھوڑا سا تم بھی کھا لو" عورت نے جزیک سے کہا۔ "یہ فقیروں کی غذا ہے۔ مگر تمھارے لئے مفید ضرور ہے۔"

اس نے رکابی میں شوربہ ڈالا۔ اور جھولی میں سے روٹی کا ٹکڑا نکال کر اس پر رکھ دیا۔ پھر جب جزیک نے کھانے کے لیے منھ بڑھایا تو عورت نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اترا ہوا۔ سفید محض ہڈی اور چمڑا ہے۔ رحم نے یہاں تک اسے مجبور کیا کہ اس نے جھولی میں سے تھوڑا سا بھونا ہوا گوشت نکالا اور اسے روٹی پر رکھ دیا۔

جزیک جلد جلد کھا رہا تھا۔ کبھی وہ کتے کے سامنے کوئی ہڈی ڈال دیتا جو التجا بھری ہوئی آنکھوں سے تک رہا تھا۔

فقیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جب عورت نے برتن اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ تو اس نے چمچہ اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے یوں کہا "کھاؤ کھاؤ! خداوند یسوع نے فرمایا ہے کہ فقیر کو ایک پیسہ دو تو خدا تمھیں دس دیگا۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔"

وہ دونوں خاموشی سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد فقیر نے کہا۔

"کھانے میں تین چیزیں سب سے زیادہ پر لطف اور ضروری ہیں۔ شراب نمک اور روٹی۔ مجھے شراب دے۔ خاتون!"

دونوں نے پینا شروع کیا۔

جزیک اپنا خطرہ بھول چکا تھا۔ اور سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنا بند کر دیا تھا۔ وہ کھاتا تھا۔ اور آگ تاپتا جاتا تھا۔ وہ اپنی چار روز کی بھوک مٹا رہا تھا اسے آرام و خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں مزدور جا چکے تھے۔ اور کونے کا مجمع اپنی اپنی گٹھڑیوں کو سرہانے رکھے ہوئے گیلی زمین پر سو رہا تھا۔ اندرونی کمرے سے ابھی تک نیند سے متوالی گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بارش بھی ہو رہی تھی اور چھت کے بعض شکستہ مقامات سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پانی قطروں کی صورت میں گرتا تھا اور نیچے جمے ہوئے کیچڑ اور پانی میں چمکتے ہوئے ہلکے دائرے بناتا تھا ہوا زور سے چل رہی تھی۔ جو سرا کو

ہلا دیتی آتشدان کی چمنی میں گھس کر طرح طرح کی آوازیں پیدا کرتی ۔جلتی ہوئی لکڑیوں کو بکھیر دیتی اور کمرہ کو دھوئیں سے بھر دیتی تھی۔

"تمھیں بھی کچھ ملنا چاہیئے" عورت نے بچا ہوا کھانا کتے کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔جو وہیں منڈلا رہا تھا۔پھر فقیر نے کہا "پیٹ بھرا آدمی دوزخ میں بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔" اس نے خالی برتن پٹکدیا۔

"خدا تمھیں اس کا اجر دے" جزیک نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ اور فقیر کے ہاتھ کو تشکر سے دبایا۔فقیر نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔اور اسے دیا کر دیکھنے لگا۔

"کچھ روز سے تم نے اپنے ہاتھوں سے کوئی کام نہیں لیا ہے" فقیر نے کہا "درست۔خداوند یسوع نے کہا ہے "خدا سے ڈرنے اور غریب اور یتیموں کی مدد کرنے والے لوگ جنتی ہیں" خوف مت کرو۔میں کچھ جوڈاس یا کوئی یہودی نہیں ہوں بلکہ ایک ایماندار عیسائی اور نادار و بیکس یتیم۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔پھر دبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"تین چیزوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔خداوند یسوع سے محبت کرو۔کبھی بھوکے مت رہو اور غریبوں اور فقیروں کو جتنا تم سے ہو سکے خیرات دو۔باقی سب ہیچ ہے فضول اور وہم۔ عقلمند کبھی رنج و فکر کو پاس نہیں آنے دیتے۔اللہ بس باقی ہوس۔کیوں؟"

وہ جواب کا منتظر تھا۔مگر جزیک نے کچھ نہ کہا۔اس خیال سے کہیں باتوں باتوں میں وہ اپنے دل کا راز نہ کہہ بیٹھے۔فقیر نے جیب سے ناس کی ڈبیہ نکالی۔انگلیوں سے اوپر کے ڈھکنے کو جھٹکا۔اور کھول کر ناس لی۔اور جزیک کی طرف بڑھایا۔پھر اپنے چہرہ کو آگ کے سامنے کر کے اس نے دھیمے اور رنجیدہ لہجہ میں گفتگو شروع کی۔

"دنیا میں انصاف نام کو نہیں ہے۔ہر ایک دوسرے کو اپنے راستے سے ہٹانے۔دھوکا فریب دینے کی کوشش کرتا ہے۔مگر یہ منشا خداوندی نہیں۔اوہو! کسی زمیندار کے گھر جاؤ۔اپنی ٹوپی اتار لو اور گانا شروع کرو۔تمھارے حلق میں کانٹے ہی کیوں نہ پڑ رہے ہوں۔یسوع اور مریم اور کل بزرگوں کی تعریف کے راگ الاپو۔پھر انتظار کرو۔کچھ نہیں ملتا پھر اپنی امت کی نجات کی خاطر خداوند یسوع کے صلیب

بر چڑھ جانے کا واقعہ دردناک پیرایہ میں بیان کرو۔ تھوڑی دیر ٹھیرو ۔کوئی دکھائی تک نہیں دیتا ۔صرف چھوٹے شکاری کتے تم پر بھونکینگے اور لونڈیاں ادھر اُدھر پھرتی نظر آئینگی اب خیرات کی برکتیں گنانی شروع کرو ۔ممکن ہے اب دو ایک فارزنگ یا روٹی کا چھوٹا ٹکڑا مل جائے تو لعنت ہو ان لوگوں پر۔ خدا کی مار ۔کیا اچھا ہوتا جو اندھا بلکہ دست و پا شکستہ اور گندگی میں لتھڑا ہوا ہوتا کہ فقیروں کو بھی تیری حالت پر رحم آجاتا کیوں ؟ اتنی چیخ پکار پر جو بھیک ملتی ہے ۔اس سے دگنی کی بھی شراب سے میرا حلق تر نہیں ہوتا" اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا ۔

"مگر کیا دوسرے کچھ اچھی حالت میں ہیں۔کبھی نہیں" اس نے ناس کی چٹکی سڑکی اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ۔جینک کو اک ـــــ تم اس سے ضرور واقف ہوں گے ـــــ نے ایک سور کا بچہ چرایا ۔اور اس کا مزا اسے کیا ملا ؟ بالکل چھوٹا کتے کے برابر سور تھا ۔اور اس کے لیئے جنیک کو چھ مہینے کے لیئے جیل کی ہوا کھانی پڑی ۔اور کس پاداش میں ؟ ایک چھوٹے سے سور کے لیئے ۔گویا سور خدا کی مخلوق نہیں ہے اور گو بعض انسان تو بھوکوں مرنے کے لیئے پیدا کئے ہیں اور بعض سونے کو ٹھے کھڑا کرنے کے لیئے ۔حالانکہ خداوند یسوع نے کہا ہے" تم میرے لیئے غریبوں کو دو" آمین ۔کیا ایک گلاس اور نہ پیوگے ؟

"خدا تمھیں اجر دے ۔مگر میرا سر ابھی سے چکرا رہا ہے "

"بیوقوف ۔خداوند یسوع خود کئی مرتبہ دعوتوں میں پی چکے ہیں ۔پینا کوئی گناہ نہیں۔ البتہ یہ گناہ ہے کہ دمست بن جاؤ ۔یا جب کوئی گفتگو کر رہا ہے تو چپ سادھ لو مگر یہ نہیں کہ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کو مت چھوؤ ۔تم صرف میری صحت کا ایک جام پی لو" اس نے آہستہ سے کہا ۔

اس نے خود ایک بوتل منہ سے لگائی ۔اور ایک ہی سانس میں آدھے سے زیادہ ختم کر کے بوتل جزیک کے حوالے کر دی ۔اور خوشی میں آکر یوں کہنے لگا ۔

"یتیم بچے پیو ۔صرف تین چیزوں پر عمل کرو ۔پورا ہفتہ بھر کام کرو ۔خدا کی عبادت کرو ۔اور اتوار کے دن فقیروں کو کچھ خیرات دو ۔پھر تمھارے ہاتھ میں نجات کی کنجی ہے ۔

اگر تم ایک گیالن نہیں پی سکتے۔ تو کم از کم ایک پاؤ بھر تو پی لو"
اس وقت سب کے سب دفعتاً خاموش ہو گئے۔ عورت اپنا سر جھکائے ہوئے سو رہی تھی۔ مرد نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دہکتے ہوئے کوئلوں کو دیکھ کر کئی مرتبہ زور زور سے سر ہلایا۔ کونے میں سرگوشیاں موقوف ہو چکی تھیں۔ صرف ہوا بار بار کھڑکی کے کواڑوں کو کھڑکھڑاتی اور مکان کو ہلائے دیتی تھی۔ اندرونی کمرہ سے رحم و یاس کی ملی ہوئی گیتوں کی آواز سرگرمی سے آنے لگی"۔

جزیک پر شراب کے نشہ نے اپنا اثر جما لیا تھا۔ اس کو نیند آنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں آگ کی طرف پھیلا دیئے۔ اور نیند کے خلاف کشمکش کرنے لگا۔ مگر آہستہ آہستہ نیند اس پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ آس پاس کی چیزیں اس کو موہوم نظر آنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ یکایک چونک پڑتا اور جاگنے کی کوشش کرتا۔ کمرہ پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالتا۔ یا فقیر کی بجواس سنتا جو نیند میں بڑبڑا رہا تھا "خدا کے لیے — جنت میں — اے میرے —" "او لڑکے شخص! میں تجھ سے کہتا ہوں۔ اچھے فقیر کو صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک لمبی نوکدار لکڑی۔ ایک بڑی زنبیل۔ اور ایک ایسی طویل دعا جو آدھے گھنٹہ تک ختم نہ ہو"۔ یہاں وہ چونک پڑا۔ اور جزیک کی آنکھوں کو اپنے چہرہ پر جمی ہوئی دیکھکر کہنے لگا۔

"سنو۔ ایک بوڑھا جہاندیدہ آدمی تم سے کیا کہتا ہے۔ میرے جام صحت کا ایک قطرہ پیو اور سنو۔ تم دور اندیش رہو۔ مگر دوسروں کو محسوس نہ ہونے دو۔ تم ہر چیز کو غور سے دیکھو۔ مگر اندھے بنے رہو۔ اگر تمہارا ساتھ ایک بیوقوف سے ہے تو تم اس سے بڑھ کر بیوقوف بن جاؤ۔ اگر تم لنگڑے کے ساتھ رہو تو ایسا ظاہر کرو کہ تمہارے دونوں پیر کٹ گئے ہیں۔ بیمار کے سامنے قریب الموت کا روپ بھرو۔ اگر کوئی تمہیں ایک فارذنگ دے تو تم روپیہ کے برابر شکریہ ادا کرو۔ اگر تمہارے پیچھے شکاری کتے چھوڑے جائیں تو تم انھیں خداوند یسوع کی بھیجی ہوئی نعمت سمجھو۔ اگر وہ تمہیں لکڑی سے پیٹنا شروع کریں تو تم نیکی، صداقت اور ہدایت کی ان کے حق میں دعا کرو۔
"میاں لڑکے! میں تم سے کہتا ہوں۔ میرے کہنے پر عمل کرو اور تمہاری جھولی ہمیشہ

بھری رہے گی اور تمھارا پیٹ پہاڑ کی طرح اونچا اور سخت ۔ اور دنیا کے کل آدمی تمھارے اختیار میں ایسے ہوں گے۔ جیسے چرواہے کے سامنے بکریوں کا گلّہ۔ اجی ہاں یہ میں کچھ کل کا لونڈا تو ہوں نہیں ؟ اور نہ میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے ہیں۔ وہ جو دنیا کو خوش رکھنے کا گر جانتا ہے خود کبھی مصیبت و تکلیف میں نہیں رہتا۔ زمیندار کے دروازہ پر مزدور کو گالیاں دیکر اپنا جی ٹھنڈا کرو۔ پھر ایک فارذنگ کا مل جانا یقینی ہے بلکہ شاید تھوڑا سا مکھن اور روٹی بھی پادری کے مکان پر مزدور اور زمیندار دونوں کو پانی پی پی کر کوسو۔ دو فارذنگ کہیں نہیں جاتے اور نجات کا پروانہ ملجاتا ہے۔ اور جب مزدوروں کی جھونپڑی پہنچ جاؤ تو دنیا کی کل موجودات زمین۔ بارش۔ زمیندار پادری سب کو گالیاں سنانی شروع کرو۔ روٹی گوشت بلکہ مسکہ اور شراب بھی مل جائیگی۔"

یہاں اُسنے اونگھنا شروع کر دیا۔ اور ایسی آوازیں بڑبڑانے لگا جو سمجھ میں نہ آتی تھی۔

"آدمی! میں تجھ سے کہتا ہوں ...... جولینا کی روح کے لیے .... آمیریا...."

اور وہ بینچ پر لڑھک گیا۔

"گریشیا پلینا .... ایک غریب لنگڑے کی مدد کرو" عورت نیند میں چیخ اٹھی۔ اس نے اپنا سر آتشدان سے اٹھایا مگر فقیر جاگ پڑا" بیوقوف چپ رہ" اس نے کہا دروازہ کے کواڑ بڑے زور سے کھلے اور وہی لانبا زرد رو یہودی نمودار ہوا۔

"چلو۔ باہر سڑک پر" اور دفعتاً سونیوالوں کا کل مجمع اُچھلکر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اور سامان کی بقچیاں کنڈھوں اور پیٹھ پر لادی جانے لگیں۔ سب تیار ہونے لگے۔ ایک عام ہلچل اور اضطراب مچ گیا۔ لوگ دیوانے بنے ہوئے اِدھر سے اُدھر پھرنے لگے۔ سب کے سب بوکھلائے ہوئے تھے۔ مخلوط سمجھ میں نہ آنے والی آوازوں کا دھیما شور ـــ شکایتیں اور گالیاں ـــ سب کے منھ سے نکل رہی تھیں۔ گرم الفاظ چیخیں قسمیں۔ گالیاں اور بچوّں کے رونے کی آواز ایک دوسرے سے مخلوط ہو کر چھت پر مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور پیدا کر رہے تھے۔ کمرہ۔ گھبراہٹ۔ جلد بازی۔ غمگین۔ اور خوف کی مخلوط فضا سے بھر گیا۔

جزیک پوری طرح جاگ اٹھا۔ اور بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں تعجب اور خوف سے اس ہنگامہ کو دیکھنے لگا۔ "یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے فقیر سے پوچھا۔

"برازیل۔"

"کیا وہ بہت دُور ہے۔"

"اوہو! وہ دنیا کے دوسرے سرے پر ہے۔"

"پھر یہ جا کیوں رہے ہیں؟"

"پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ بیوقوف ہیں اور دوسری یہ کہ وہ بدقسمت ہیں۔"

"کیا وہ راستہ جانتے ہیں؟"

مگر فقیر نے اس کا جواب نہ دیا۔ عورت کو اپنی لکڑی سے ڈھکیلتے ہوئے وہ کمرہ کے بیچ میں آیا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل گر پڑا اور التجا کے لہجہ میں یوں کہنے لگا۔

"تم دریا پار جا رہے ہو۔ جنگل پہاڑ سب سے پرے۔ دنیا کی آخری حد۔ خداوند یسوع تمھاری مدد کرے۔ اور زنسٹوچوا کی کنواری اور کل شہید اور دوسرے بزرگ مجھ غریب لنگڑے کو ایک پیسہ دینے کے صلہ میں تمھیں اپنی حفاظت اور اپنے سایہ میں لیں۔ خداوند یسوع کے لیے ...... ایک پیسہ آمیر یا ......"

"گریشیا پلینا! خدا تمھارے ساتھ رہے۔" عورت نے بھی شوہر کے بازو زمین پر گھٹنوں کے بل گر کے کہا۔

"ہم سب میں تو خوش قسمت ترین عورت ہے۔" مجمع نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ سب نے خصتی دعا کے لیے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے۔ اور سر جھک گئے۔ ایمان رکھنے والے خوش عقیدہ اور قانع دل اپنے معبود کی عبادت میں جوش بھرے ہوئے لفظوں کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ بھروسہ اور ایمان کی چمک ان کی افسردہ آنکھوں اور اُداس چہروں پر علانیہ نظر آنے لگی۔ اور جب وہ اٹھے تو ان کے دل قوی اور عزم مضبوط ہو چکے تھے۔

"ہرزلیگ۔ ہرزلیگ۔" انھوں نے یہودی کو پکارا۔ جو اندرونی کمرہ میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ دوسری اور نئی دنیا کو دیکھنے کی تمنا میں جلد باز اور بے تاب تھے۔ جو صرف اجنبیت کی وجہ سے اپنے اندر دل کشی رکھتی تھی۔

ہرزلیگ باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قندیل تھی۔ اس نے سب آدمیوں کا شمار کیا۔ سب کو دو دو کی جوڑیوں میں قطار در قطار کھڑا کیا۔ اور دروازہ کھولا۔ وہ تکلیف

اور غربت زدہ بھوتوں کی فوج کی طرح اس میں سے گزرنے لگے موہوم اور دھندلے عکسوں کا ایک عمود ـــــ وہ بارش اور تاریکی میں غائب ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے اندھیرے اور جھومتے ہوئے درختوں کے درمیان ان کے ابھر کیباتھ کی ایک روشنی جھپکتی نظر آتی تھی۔ اور تھیمی سی دعا کی آواز سنائی دیتی تھی "وہ خود کو اپنے خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ پھر طوفان شروع ہوا اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کئی سو آدمی ایک ساتھ دم توڑ رہے ہیں۔ اور ان کے رونے چلانے اور کراہنے کی آواز ایک ساتھ نکل رہی ہے"۔

"غریب انسان ...... قابلِ رحم" جنزیک نے کہا اور اس کے دل میں ہراس اور درد و غم شروع ہوا۔"

پھر وہ سرائے کی طرف مڑا جواب تاریک اور سنسان تھی۔ آگ بجھ گئی تھی۔ اور خادمہ روشنی بجھا کر سونے چلی گئی تھی۔ صرف فقیر جاگتا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی بھیک کا شمار کر رہے تھے۔

"بالکل کم۔ دو تین پنّی والے سکّے اور پچیس فارذنگ۔ پورے تماشہ کا معاوضہ۔ ہا۔ ہا۔ خداوند یسوع کبھی ان کو یاد نہ کریں اور کبھی ان کی مدد نہ کریں"۔

وہ بڑبڑاتا ہی رہا۔ مگر جنزیک نے اس طرف کچھ توجہ نہ کی۔ وہ آتشدان کے قریب اپنے ہنوز نم لبادہ میں سمٹ کر گہری نیند سو گیا۔

"اے۔ ہو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ تم کون ہو تمھارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

وہ فوراً اپنے ہوش میں آیا۔ دو پولس والے اس کے سر پر کھڑے تھے۔ مگر جواب میں جنزیک اُچھلا اور سامنے والے آدمی کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں تاک کر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ گرا۔ قندیل لڑھکتی ہوئی دور جا کر بجھ گئی۔ جنزیک بے تحاشا دروازہ سے نکل کر جنگل کی طرف دوڑا۔ دوسرے نے تعاقب کیا مگر دوڑنا لاحاصل دیکھ کر فائر کیا۔

جنزیک پلٹا۔ ایک چیخ ماری۔ کیچڑ کے گڑھے میں گر پڑا۔ پھر اسی وقت اُچھلا اور تاریکی اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

فاتح

اطالوی افسانہ

صوفیا کی آنکھیں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں اور اس کی نازک انگلیاں نفیس کناری پر تیز چل رہی تھیں لیکن لولو نے تمام کمرہ ایک کر رکھا تھا۔ کبھی وہ الماری کو کھول کر جواہرات کو تتر بتر کرتی اور کبھی دروازہ کھول کر اس کے مشتملات کو غور سے دیکھتی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا اور کرنا چاہتی تھی، لیکن اپنی بڑی بہن کی سنجیدگی مانع تھی۔ آخر کار تنگ آکر اس نے ایک غزل گائی، ایک شعر پڑھا، لیکن صوفیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اب تو اس سے رہا نہ گیا، وہ بہن کے سامنے ڈٹ گئی اور پوچھنے لگی۔

"صوفیا! تمھیں یاد ہے کہ مجھے نٹ نے کچھ کہا تھا؟"

"کوئی دلچسپ بات تو نہ تھی۔"

"کیا ٹھنڈا جواب دے رہی ہو۔ یہ تو گرمیوں میں بھی کپکپا دیگا۔ میری برف کی بنی ہوئی بہن! سچ کہنا یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

"لو لو، کیسی نادان بچی بن رہی ہو۔"

"جان من! یہی تمھاری غلطی ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ اب تو میری شادی ہونے والی ہے"

"کیا؟"

"یہی تو مجھے نٹ نے کہا ہے۔"

"کیا بیہودہ بک رہی ہو۔ میں تو تمھارے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھ سکتی۔"

"خوب! لے اب میں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ کیا متانت مآب سرکار سے پوری

توجہ کی اجازت مل جائیگی۔"

"ہاں ہاں جلد کہہ ڈالو۔"

"شرط دوڑ کا دن اور مارس کے کھیت کا مقام تھا۔ تم کیوں آنے چلی تھیں تمھاری ہر دم کی ساتھن کتابیں تمھیں کہاں چھوڑتی تھیں۔"

"اگر اس طرح غیر متعلق گفتگو پر آجاؤ گی تو میں سننا نہیں چاہتی۔"

"تمھیں سنائے بغیر چھوڑتا کون ہے۔ یہ راز میرا گلا گھونٹ رہا ہے مجھے مارے ڈالتا ہے۔"

"کیا شروع نہیں کروگی؟"

"سنو، سنو! شرط دوڑ کے وقت ہم بڑے تماشائیوں کی پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں پادو تولونیو آیا اور اپنے ساتھی خوبرو نوجوان رابرٹو مانٹی فرانکو کا ہم سے تعارف کروایا۔ معمولی علیک سلیک کے بعد وہ دونوں آکر ہمارے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ گھوڑوں کی روانگی کے اشارے تک ہم نے دو چار باتیں کیں۔ اب سنو۔ کارگان کو میں کسقدر پسند کرتی تھی۔ کاش یہ معلوم ہوتا کہ یہ دھوکا دیگی۔ گرد میں گھوڑے نظروں سے اوجھل ہوگئے میں نے کہا۔" کارگان جیت گئی" مانٹی فرانکو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " نہیں۔ لارڈ لیو یلو" مجھے اس مخالفت پر سخت غصہ آیا۔ لیکن وہ برابر مسکراتا اور مخالفت کرتا رہا آخر کار ہمارا جھگڑا شرط بند ھنے پر ختم ہوا۔ آدھے گھنٹہ کے اضطراب اور دھڑکن کے بعد معلوم ہوا کہ کارگان نے مجھے دھوکا دیا۔ اور میں ہار گئی اور مانٹی فرانکو جیت گیا۔ خیال تو کرو۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ روپیہ ابھی ادا کرونگی۔ وہ تعظیم سے جھک کر کہتا ہے کہ اس کے لئے ابھی بہت وقت ہے میں اس سے پھر چھپا چاہ رہی۔ اور مستفسرانہ نظر ڈالی۔ وہ صرف تعظیماً جھکتا اور پراسرار ہنسی ہنستا رہا۔ یہی حال تھیٹر کیا ہر جگہ ہے۔ میں حیرت میں ہوں۔ رابرٹو خوشگل ہے نوعمر ہے صرف بیس اوپر چھ سال کی عمر ہے آج صبح میرے آئندہ شوہر، بوڑھے مانٹی فرانکو نے امی سے دو گھنٹے تک گفتگو کی تھی۔"

"ہوں۔"

"سامع خبردار رہے۔ ہاں، میں جے نٹ کے پاس اس کی آمد و رفت سے واقف

ہوں ۔ شادی ٹھیر گئی ہے ۔ صرف ایک اہم امر کا تصفیہ باقی ہے ۔ جب میں عقد کے لیے جاؤں گی تو مجھے بھورے رنگ کا گون پہننا چاہیے یا کاسنی ۔ ٹوپی میں پر خچے ہوں یا نہ ہوں ۔

"تم کدھر بہے جا رہی ہو؟"

"بہے! کیوں، کیا رکاوٹ درمیان میں ہے ۔ راآبرٹو اور میں ایک دوسرے سے بری طرح محبت کرنے لگیں گے ۔ ہمارے والدین بھی راضی ہیں ۔

"اور تم اس مرد سے اس طرح شادی کر لو گی؟"

"اس طرح کے کیا معنی؟ اس میں بڑی وسعت ہے ۔"

"اس کو جانے بغیر، اس سے مانوس ہوئے بغیر؟"

"میں تو اس کو جانتی ہوں ۔ شرما دو بڑیں میں نے اس کو دیکھا ہے ۔ یا پھر بھی اس سے ملاقات ہو چکی ہے اس کی پرستش کرتی ہوں ۔ پرسوں میں نے دو پہر کا کھانا کھانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ملا نہیں تھا ۔ اور خودکشی کے ارادہ سے تین پیالے کافی کے پیے ۔

"اور اس کا کیا حال ہے؟"

"وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔ اس لیے مجھ سے محبت کرتا ہے ۔" لوتو نے عقلمندانہ طریقہ سے جواب دیا لیکن صوفیا کا چہرہ زرد دیکھ کر وہ اس ناعاقبت اندیشانہ گفتگو پر متاسف ہوئی ۔ اور بہن پر جھک کر محبت سے پوچھا ۔

"کیا مجھ سے کوئی نامناسب بات سرزد ہوئی ہے؟"

"نہیں، پیاری بہن، نہیں تم درست کہہ رہی ہو ۔ جب کسی سے محبت ہو تو شادی کر لینی چاہیے ۔ محبت کا پیدا کرنا مشکل ہے ۔"

"محبت پیدا کرنا، محبت پیدا کرنا!" لوتو نے جوش سے دہرایا ۔ "صوفیا ۔ یہ بہت آسان ہے لیکن جب تمھاری طرح کسی کے چین پر جبیں، آنکھوں میں اداسی ہو اور لب پر ہنسی کا نام ونشان نہ ہو، اور وہ غور و فکر میں غوطہ زن گوشہ نشین رہے حالانکہ دوسرے اطراف ہنس بول اور کھیل کود رہے ہوں ۔ یا جب کوئی ہنسنے کے بجائے پڑھتے اور جاگنے کے بجائے سوتے رہے، یا کسی کی طبیعت دقیانوسی ہو جائے ۔ تو خواہ نوعمر ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس کے ساتھ کوئی محبت نہیں کر سکتا ۔"

"صوفیا نے سر جھکا لیا۔ اور جواب نہ دیا۔ اس کے ہونٹ کچھ جنبش کر رہے تھے گویا وہ ضبط گریہ کر رہی ہے۔

"کیا تم رنجیدہ ہوئیں؟" لولو نے پوچھا "یہ اس لیے کیا کہ میں تم کو بھی محبوب اور محبت سے ملتی دیکھنا چاہتی ہوں۔ دلہن بنتے دیکھنا چاہتی ہوں، کیا ہی اچھا ہو اگر میں اور تم دونوں ایک ہی روز دلہن بنیں۔"

"یہ فضول ہے۔ میں 'بوڑھی کنواری' بنی رہونگی۔"

"نہیں، نہیں، شریر مخلوق ایسا نہ کہنا۔ اگر رابرٹو شریف النفس ہے، تو اس کے کوئی کنوارا بھائی بھی ہونا چاہیئے۔ میری یہی خواہش ہے۔"

اس قدر کہنے پائی تھی کہ لڑکیوں کی ماں چلنے پر تیار کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا امی تم باہر جا رہی ہو" لولو نے پوچھا

"ہاں بیٹی میں سکاک جا رہی ہوں۔"

"اچھا سکاک جا رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم کام ہے۔"

"ہاں جانمن، تم بھی اس کو جلد جان لو گی۔ صوفیا ذرے کی ذرے میرے ساتھ چلنا۔"

"تو کیا صوفیا کا بھی سکاک کے ہاں کوئی فضول معاملہ ہے؟"

"لولو، تم متانت کب سیکھو گی؟"

"جلد ہی، اماں، تم دیکھ لو گی۔"

لولو نے ماں اور بہن کے لیئے دروازہ کھولا۔ اور جب وہ گزرنے لگیں تو اس نے دو دفعہ بندگی کی "بیگم، صاحبزادی" کے الفاظ کہتے ہوئے۔ جب وہ چلنے لگیں تو اس نے دہلیز پر کھڑے ہو کر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بولو، بولو، میں سمجھوں گی کہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

رابرٹو مانٹی فرانکو کی عادت عام طور سے بے حد غور و فکر کی طرف مائل نہ تھی اور نہ ہی اس کو اتنی فرصت ملتی تھی۔ دعوتوں، گھوڑے کی سواری، ملاقاتوں اور جلسوں میں اس کی عمر گزرتی تھی۔ اور شام کا وقت اس کی محبوبہ لولو کے ہمراہ خوشگوار گزرتا تھا کبھی اس کو پیچیدہ معاملات کی مصروفیت درپیش ہو جاتی۔ وکیل سے ملاقات، معاہدات کی

یکسوئی اور کبھی قدیم قرضوں کا تصفیہ وغیرہ۔ یہ امور ایسے تھے کہ اس کو شادی کی تیاری اور مابعد تفریح کے انتظامات کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ پڑھنے کے لیئے اور چند منٹ گپنے تک جانے کو مشکل سے ملتے۔ اسی واسطے اس کو کسی سماجی سوال پر غور کرنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ رابرٹو کے کردار میں کوئی چیز مجزوں یا شجاعانہ نہیں تھی۔ اس نے متین طبیعت پائی تھی۔ اور اسی پر اکثروں کے لیئے باعث رشک تھا۔

اپنی عادت کے خلاف وہ آج شام ایک آرام کرسی پر دراز تھا اور ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں ڈالے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جس کو پڑھنے پر تلا ہوا تھا۔ کتاب تو دلچسپ تھی لیکن قاری اپنی عادت کے خلاف کھویا کھویا سا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب تھی وہ پریشان اور مضطرب معلوم ہوتا تھا۔ ابھی اس نے ایک صفحے کو کھولکر دو ہی سطریں پڑھی تھیں کہ حروف مطبوعہ صفحے سے جگہ چھوڑتے ادھر اُدھر ناچتے اور غائب ہوتے معلوم ہونے لگے۔ رابرٹو اضطراری طور پر خیالات کی موہوم دنیا میں چکر لگانے لگا۔

"ابا مطمئن ہیں۔ پھوپھیوں نے دعائیں لکھی ہیں۔ میری رشتہ دار بہنیں خفا ہیں کفنے کے دوست طنزاً مبارک باد دے رہے ہیں سچے دوست خوش ہیں۔ اس لیئے میں شادی کرنے میں حق بجانب ہوں اس سے بھی انکار نہیں کہ تو تو بہت حسین ہے۔ جب وہ اپنی شریر آنکھیں میرے چہرہ پر گاڑ دیتی ہے، ہنستی اور اپنے چھوٹے چھوٹے سفید دانت دکھاتی ہے تو میں اس کے خوبصورت سر کو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لیکر چومنے کا کس قدر خواہش مند ہوجاتا ہوں۔ اس کی طبیعت کی خوبی کے تو کیا کہنے۔ اسکی سیرت فرشتوں جیسی ہے۔ ہر دم مسرور، نیک طینت، مذاق پر تیار، ذہین، شرارتوں سے لبریز، گویا غم اسے چھو بھی نہیں گیا۔ ہم میں خوب نبھیگی مجھے محبوب کی متانت کبھی پسند نہیں۔ اس میں ایک غم پنہاں نظر آتا ہے۔ جس سے میں واقف نہیں ہو سکتا اور جس کو میں غلط نہیں کہہ سکتا۔ یا جس کا میں نادانستہ سبب بنا ہوں۔ صوفیا، میری ہونے والی سالی اپنی بے حسی اور سرد مہری سے مجھے بہت رنجیدہ کرتی ہے۔ جب کبھی وہ میرے سامنے آتی ہے میرے حواس گم اور ہنسی لبوں سے غائب ہوجاتی ہے۔ اگر

یہ خوشی کا موقع بھی ہو تو غم سے تبدیل ہو جاتا ہے لولو سے بھی اس وقت مذاق کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ صوفیا کیسی غارت گر مسرت ہے۔ ممکن ہے کہ خود اس نے میرے اس تاثر غم کو محسوس کرلیا ہو، کیونکہ بات کرتی ہے تو نظریں زمین سے نہیں اٹھاتی۔ مصافحہ نہیں کرتی۔ اور کم سے کم الفاظ میں جواب ادا کردیتی ہے۔ اس نے میری ناپسندیدگی کا بھی مشاہدہ کیا ہوگا۔ ممکن ہو کہ یہ اس کو ناگوار گزرا ہو۔

"لولو ہنس مکھ ہے۔ نو عمر ہے۔ میرے سامنے کبھی کوئی رنجیدہ لفظ زبان سے نہیں نکالتی۔ اور اگر ایسا کرے بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ چڑا رہی ہے۔ اس کو مجھ سے محبت ہے گو مجنونانہ نہیں۔ اور میری محبت بھی مجنونانہ نہیں یہی مناسب بھی ہے۔ میرے دل میں دو نظریے خوب متمکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ منسوب جوڑے میں یہی بات ہونی چاہئیے۔ دوسرے محبت کی ابتدا پرجوش نہ ہونی چاہئیے۔ اس سے توقع ہے کہ ہماری زندگی خوشگوار رہیگی ہم پورے اطالیہ کا سفر کریں گے۔ بغیر جلد بازی کے اور دھیرے دھیرے۔ ہر طرح کی آسائشیں اٹھاتے ہوئے۔ اور تمام چیزوں کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے۔ اس کے لیئے کوئی تین ماہ کافی ہوں گے۔ نہیں یہ ناکافی ہیں۔ چار مہینے درکار ہیں۔ لولو کو صوفیا کی المرزا صحبت سے کچھ دنوں کے لیئے چھڑا لینے سے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک نوجوان لڑکی اس عمر میں اسقدر رتین ہو سکتی ہے؟ کوئی تیئس سال کی ہوگی وہ سادہ نہیں پرکار ہے۔ آنکھیں کیسی خوبصورت ہیں۔ چال ڈھال سے پوری ملکہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر اسقدر سنجیدہ نہ ہوتی تو ضرور خوش کن تھی۔ میں شرط بدھتا ہوں کہ وہ بوڑھی کنواری ہی رہیگی۔ شاید یہ اس کی کوئی پوشیدہ خلش سے ہو۔ ہو نہ ہو کوئی عشق مایوس عشق کا اثر ہے۔ میں اس کی سنجیدگی کا سبب معلوم کرنے کا خواہشمند ہوں۔ تنہائی میں لولو سے پوچھونگا۔

"لولو بتاسوں پر مری ہوئی ہے۔ یہ اس نے دوسری رات ہی میں مجھ سے کہا تھا، جب میں اس کے مکان پر ملنے گیا۔ ان کو کیسا کترتی ہے! اس کے سرخ ہونٹوں میں وہ کیسے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک لمحہ کے بعد جب وہ ختم ہو جاتے ہیں وہ بناوٹی تاسف کا چہرہ کیسے بناتی ہے۔ بڑی پیاری ادائیں ہیں۔ اس نے دبی زبان سے

یہ راز بھی مجھے بتایا تھا کہ گرج سے اس کے ہوش اڑجاتے ہیں۔ اور وہ بھاگ کر تکیوں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ہمیشہ وہ سیاہ ریشم کے گون کی خواہش مند رہی جس کے طویل دامن ہو۔ اور جس کا گریبان اور آستینیں سفید ہوں کبھی وہ کہتی ہے کہ اس میں شک بہت ہے۔ اسلئے وہ ہسپانیوں کی طرح ایک چھوٹا خنجر رکھیگی تاکہ اس سے اپنا انتقام لے سکے۔ جب وہ ان معصومانہ خیالات کا اظہار بچوں کی طرح کرتی ہے، اس پر سے نثار ہوجانے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی حرکات بعض وقت صوفیا کو بھی ہٹا دیتی ہیں۔ اس کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا ہے۔"

اس محویت میں کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ وہ مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شام کی تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ صوفیا دریچہ میں کھڑی بالاخانہ سے گلی کے ہجوم اور شور وغل کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دیا ٹالیدو اس وقت سواریوں کی آمد و رفت سے خطرناک ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ صوفیا کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ یکا یک شرم اس کے چہرہ پر دوڑ گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اور چہرہ پھر زرد ہوگیا۔ وہ کمرہ میں واپس ہوگئی۔ ایک ہی منٹ گزرا ہوگا کہ لولو بھونچال کی طرح نازل ہوئی۔ کواڑوں کو زور سے دھکا دیتے اور کرسیوں کو الٹے پلٹتے وہ جلد کمرہ کے اندر داخل ہوئی۔

"کیا کر رہی ہو، صوفیا! کیا پڑھنا ابھی ختم نہیں ہوا؟"

"ہاں میں پڑھ رہی تھی۔"

"تمھیں بالاخانہ پر بھی نکلنے کی مہلت نہیں ملی؟"

"اگر ملی ہو تو؟"

"خوب! مجھے دیکھو کر چند لمحوں کے لیے اوپر ٹھہرنا پڑا۔ الینا درزی میرے آج شام کو پہننے کا گون لایا تھا۔ لیکن میں یہاں آنے کے لیے بے چین تھی۔" کل شام کو میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ وہ اپنا بھورا اور کوٹ پہن کر سلم کو گاڑی میں لگائے اور ساڑھے چھ بجے ادھر سے نکلے۔ کیا معلوم کہ اس نے تعمیل کی ہو۔"

"رابرٹو ابھی ادھر سے بھورا اور کوٹ پہنے ہوئے گزرا"

"سبحان اللہ! تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوگیا۔ تم تو پڑھ رہی تھیں؟"

"میں دریچہ میں کھڑی ہوئی تھی۔"

"اور تم نے رآبرٹو کو پہچان بھی لیا۔ حالانکہ اس کو دیکھا بھی نہیں۔ تعجب ہے کیا اس نے تمھیں بندگی کی؟"

"ہاں"

"اس نے ٹوپی کس طرح اٹھائی؟"

"کیوں! جس طرح وہ ہمیشہ اٹھاتا ہے۔"

"اور تم نے بھی جواب دیا؟"

"تو کیا تم مجھے بدتہذیب سمجھتی ہو؟"

"کم ازکم تم مسکرائی تو ہوں گی؟"

"نہیں — اس کا مجھے علم نہیں"

"صوفیا! یہی تو بات اچھی نہیں۔ کل شام میں رآبرٹو نے مجھ سے تمھارے متعلق گفتگو کی تھی۔"

"کہا ہوگا کہ میں بدتہذیب ہوں؟"

"نہیں، تمھاری اکھل کھری طبیعت کا سبب پوچھا جو میری طبیعت سے بالکل مختلف ہے میں نے اس سے کہا کہ تم مجھ سے زیادہ خوش اخلاق، بڑی دوست پرست اور محبت کرنے والی ہو۔ اور تمھارا ایک ہی قصور ہے کہ تم ان تمام خوبیوں کو چھپاتی ہو یہ سنکر تم خوش ہونگی کہ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتا رہا۔ اور آخر میں اس کا سبب پوچھا کہ تم اس سے کوری کیوں بنی رہتی ہو۔"

"کوری!"

"یہی تو اس نے پوچھا۔ اور تم جانتی ہو کہ وہ غلطی پر بھی نہیں ہے۔ تم اس کیساتھ دوستانہ برتاؤ نہیں کرتیں — لیکن اس معاملے میں بھی میں نے تمھاری حمایت کی۔ میں نے اس کو بتایا کہ تم اس کو بہت پسند کرتی ہو۔ اور عزت کرتی ہو —"

"لو لو!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ لیکن رآبرٹو کا بھی تو خیال کرو۔ وہ تمھارا کسقدر شایق ہے۔ کیا یہ تمھاری ناشکری نہیں کہ تم اس سے اجنبی کی طرح برتاؤ کرتی ہو؟"

"صوفیا نے بائیں لولو کے گلے میں ڈال دیں۔ اور اس کا منہ چوم لیا۔ لولو اس کو تھوڑی دیر تک پکڑے رہی۔ اور محبت سے کہا۔

"تم کو رابرٹو سے ذری محبت بھی کیوں نہیں ہے؟"

"صوفیا نے جلدی سے اپنے آپ کو کھینچ لیا۔ اور ایک لفظ بھی نہ کہا۔

"خیر" لولو نے شانے ہلاتے ہوئے اور موضوع کو بدلتے ہوئے کہا "کیا تم حقیقت میں ہمارے ساتھ آج شام کو نہیں چلوگی؟"

"نہیں میرے سر میں درد ہے۔ تم امی کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"یہ تو روز کی بات ہے۔ لیکن میں ضرور جاؤنگی کیونکہ وقت بڑا لطف سے گزریگا"

"کیا۔ رابرٹو بھی تمھارے ہمراہ جا رہے ہیں؟"

"نہیں وہ کلب جا رہے ہیں۔ وہاں نظامی مجلس ہے۔ میں اس سے فائدہ اٹھا کر رقص میں جا رہی ہوں۔ اور کل صبح تک ناچتی رہونگی۔"

"اگر وہ اس سے واقف ہو جائے"؟

"اور بھی اچھا ہے۔ اس کے بعد سے وہ مجھے زیادہ آزادی سے رہنے دے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بدعادتیں سیکھے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اس سے بہت تھوڑی محبت ہے؟"

"بہت زیادہ لیکن اپنے خاص انداز میں لیکن اب مجھے لباس پہننے کے لیے جلد چلنا چاہیئے۔ کوئی دو گھنٹے لگیں گے۔"

"صوفیا' گاڑی کے جانے کی آواز سنتی کھڑی رہی جس میں اس کی ماں اور بہن بیٹھی تھیں۔ وہ اکیلی اور بالکل اکیلی رہ گئی' جیسی وہ ہر وقت رہنا چاہتی۔ جب وہ بچہ تھی' تو تکلیف پہنچنے پر وہ اکیلی اندھیرے میں بستر پر پڑی رویا کرتی تھی۔ اب وسیع کمرہ ملاقات میں اکیلی' خوشنما روشن فانوس کے نیچے' ہاتھ بے حس اور سر کرسی کی پیٹھ پر رکھے ہوئے' اس کے چہرہ پر گہرے غم و اندوہ کے آثار تھے۔ جس سے اس کے دل کی کشمکش ظاہر ہو رہی تھی یقین ہے کہ ایسی قطعی تنہائی کے موقع پر' ایک ناقابل تسخیر غم اس پر مسلط ہو گیا۔ اور احساس حقیقت جو عرصہ سے دبا ہوا تھا' اس پر

واضح، روشن اور تکلیف دہ ہو گیا تھا۔

پیروں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ رابرٹو آ رہا تھا۔ اس کو تنہا دیکھ کر وہ ٹھٹھر گیا اور پس و پیش کرنے لگا لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ دوسرے لوگ اندر ہوں گے وہ آگے بڑھا۔ صوفیا فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دل میں ہیجان تھا۔

"گڈ ایوننگ، صوفیا!"۔ دونوں منتشر تھے۔

"یا خدا! صوفیا کس قدر بے مہر ہے"۔ رابرٹو دل میں کہنے لگا۔

اس اثنا میں لڑکی ذرا سنبھلی۔ چہرے سے انتشار کے اثرات دور کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس کے چہرہ سے سنجیدگی ٹپکنے لگی۔

"اماں اچھی ہیں؟"

"بہت اچھی ہیں۔ شکریہ"

"اور۔ لوکو"

"وہ بھی تندرست ہے"

تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ رابرٹو کے دل میں ایک عجیب احساس، خوشی اور رنج سے ملا ہوا، ابھرنے لگا۔

"کیا لوکو مصروف ہے"؟ اس نے پوچھا۔

"صوفیا نے اضطرار کو روک کر کہا۔

"وہ امی کے ساتھ ڈبی ناس کے رقص میں گئی ہوئی ہے" اس نے جلدی سے کہا۔ اس طرح کہ اب اس پر مزید سوالات ہونے والے ہیں۔

صوفیا تنہا تھی۔ اس لیے مہذب انسان کی طرح، اس کو وہیں ٹھیر کر اس کا دل بہلانا چاہئے تھا۔ اس خیال کے آتے ہی رابرٹو کے دل میں یکایک بھاگ چلنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن وہ اٹھا نہیں۔

"میں یہاں اس لیے چلا آیا کہ کلب میں جلسہ کا نصاب پورا نہیں تھا" اپنے آنے کے عذر کے طور پر اس نے کہا۔

"لوکو کو آپ کے آنے کی توقع نہ تھی۔ افسوس ہے"

"نہیں۔ اس کا کیا مضایقہ" رابرٹو نے مداخلت کر کے کہا۔
"مداخلت ایسی بے وقت تھی کہ لوکو کے لیے خوش کن نہ ہوتی۔
"اور تم نہیں گئیں" رابرٹو نے سلسلہ گفتگو جاری کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ تم جانتے ہو کہ رقص کی میں زیادہ دلدادہ نہیں"
"کیا تم مطالعہ کی اہمیت زیادہ سمجھتی ہو"
"ہاں۔ بیحد"
"کیا تمھیں اس میں نقصان کا اندیشہ نہیں"
"میری آنکھیں اچھی ہیں" صوفیا نے انھیں سائل کے چہرہ کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔
"اور خوبصورت بھی" رابرٹو نے دل ہی دل میں کہا "لیکن غمگین۔ میرے خیال میں ــــ"
"کوئی اخلاقی نقصان تو نہیں پہنچتا۔ ان کتابوں سے جن کا میں مطالعہ کرتی ہوں مجھے بڑا اطمینان نصیب ہوتا ہے"
"کیا تمھیں اطمینان قلب چاہیئے؟"
"ہم سب کو اطمینان قلب کی ضرورت ہے"
صوفیا کی آواز سنجیدہ اور گہری تھی۔ رابرٹو کو اس کے سننے میں دلچسپی معلوم ہو رہی تھی گویا وہ پہلی دفعہ اس کو سن رہا ہے۔ اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی مٹ بھیڑ ایک ایسی عورت سے ہو گئی ہے جس سے وہ اب تک ناواقف تھا۔ اور وہ اپنے دل کی گہرائیوں کو اس پر ہر لفظ اور ہر اشارہ سے ظاہر کر رہی تھی۔ اب صوفیا کی سرد مہری ختم ہو چکی تھی۔ وہ رابرٹو کی طرف نیچے بھی لیتی تھی۔ کبھی کبھی ہنس بھی دیتی۔ اور اس سے ایک دوست کی طرح گفتگو کر رہی تھی۔ اس سے پہلے ان کے درمیان کیا شے تھی؟ اب کیا پیش آ رہی تھی؟
"جب میں کوئی کتاب پسند کرتا ہوں" رابرٹو نے کہا "تو مجھے اس کے مصنف کو جاننے کی بڑی آرزو ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا وہ شخص یا خاتون

نیک نفس ہے۔ وہ کسی تکلیف میں تو مبتلا نہیں ہوا، آیا وہ بھی محبت کے دام میں گرفتار ہے؟

"شاید آپ دھوکے میں پڑ جائیں۔ مصنفین ہمیشہ دوسروں کے عشق کی داستان بیان کرتے ہیں۔ نہ کہ اپنی۔"

"شاید بغیر کسی ذاتی تاثر کے؟"

"ہاں سے۔ میرا خیال ہے۔ کئی صورتیں ایسی پیش آئی ہیں، جہاں صرف محبت ہی دل کا پوشیدہ راز تھا۔"

صوفیا کی آواز میں یہ الفاظ کہتے ہوئے کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا۔ اس کے چہرہ پر ایسے بے تکلفی کے آثار اسقدر سادہ، پاک متیقن تھا کہ اس کے محبت کے موضوع پر یقین کے ساتھ گفتگو کرنے میں رابرٹو کو کوئی تعجب نہیں معلوم ہوا۔ اب اس کے لیئے کوئی امر تعجب زا نہیں بلکہ بالکل فطری اور متوقع معلوم ہو رہا تھا۔ یہ شام بھی جو اس نے اس عجیب لڑکی کے ساتھ گزاری، اس کو مقررہ اور متوقع معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ جدا ہوئے دونوں کی نظریں ایک دوسرے کے چہرہ پر گڑھی ہوئی تھیں۔ گویا وہ ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ صوفیا نے ہاتھ مصافحہ کے لیئے بڑھایا۔ رابرٹو اس کو لیکر احتراماً اس کے سامنے جھک گیا۔ اس کے جانے کے بعد کیواڑ زور سے بند ہوئے۔ وہ جدا ہو گئے۔

جب صوفیا کی گفتگو اور ملاقات کا تسخیر کن اثر کم ہوا، تو رابرٹو کا دماغ منتشر ہونے لگا۔ اس کو خوشی اور غم توام تھے۔ وہ مرنے پر تیار تھا، لیکن پھر بھی رگ رگ میں روح دوڑ رہی تھی۔ وہ لولو، اپنے اور اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ صوفیا بشاش اور بیحد بشاش تھی۔ اس لیئے وہ روتی رہی اور ہچکیاں لے لیکر اس کا سر تکیوں میں دھنسا ہوا تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ لولو کی شادی ابھی تک بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں جو اس تاخیر کی سبب سے ناآشنا تھی، اکثر بیٹی کو علیحدہ لیجا کر اس کا سبب پوچھا کرتی۔

لولو کہتی "میں ابھی ٹھیرنا چاہتی ہوں۔ میں رابرٹو سے اور زیادہ اچھی طرح واقف

ہونے کی ضرورت سمجھتی ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ لڑکی غور کرنے لگی تھی۔ وہ بدستور پھرا کرتی۔ گاتی، ناچتی، مذاق میں شریک ہوتی۔ لیکن اکثر اس خوشگوار مصروفیت کو روک بہن کی حالت کا مطالعہ کرتی یا رآبرٹو کے الفاظ کو غور سے سنتی رہتی۔ لوسی نے اپنے اطراف دیکھا۔ اس کے اطراف عجیب عجیب امور پیش آ رہے تھے۔ رآبرٹو پہلے کی طرح مطمئن اور بشاش نہیں تھا بلکہ وہ اب غور و فکر میں منہمک تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور خیالات میں تموّج برپا نظر آتا تھا اس کی گفتگو مختصر اور کھوئی کھوئی سی ہوتی۔ بہت سی چیزیں جن میں وہ پہلے دلچسپی لیتا تھا، اب ان سے لاپروا سا بن گیا تھا۔ کبھی کبھی بڑے ضبط سے کام لیکر وہ پہلے سا رآبرٹو بننے کی کوشش کرتا۔ لیکن یہ صرف تھوڑی دیر کے لیئے وہ جذبات کے چھپانے کا پہلے سے عادی نہ تھا۔ اس لیئے اس کی کوشش ناکام ہی رہتی اس کے جذبات اور دلی بےچینی چہرہ سے ٹپک پڑتی تھی۔

صوفیا میں بھی اب تغیر ہو گیا تھا۔ وہ منتشر اور بےچین سی ہو گئی تھی۔ بہن سے گلے ملتی۔ اور اکثر اس سے بچنے کی کوشش کرتی۔ چہرہ تمتایا رہتا۔ اور آنکھوں میں ایک شعلہ سا نمودار تھا۔ اس کی آواز کبھی عمیق اور جذباتی ہوتی۔ اور کبھی خشک اور اس کے ہاتھ مرتعش تھے۔ رات رات بھر وہ جاگتی رہتی۔ لوسی اکثر رات میں اٹھکر ننگے پاؤں چپکے سے اس کے کمرہ کے قریب جاتی اور سنتی اور اس کو کروٹیں بدلتے اور روتے پاتی۔ اگر کوئی سوال کرتا۔ صوفیا کہتی کہ یہ حالت اس کی نئی نہیں ہے۔

جب صوفیا اور رآبرٹو ملتے۔ تقریباً ہر روز ان دونوں کے تغیرات نمایاں ہو جاتے۔ یہ آپس میں بات چیت کم کرتے۔ اور ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھتے۔ بعض وقت وہ بالکل خاموش ہوتے لیکن ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتے رہتے۔ پہلو بہ پہلو بیٹھنے سے وہ گریز کرتے تھے۔ اس پر رآبرٹو صوفیا کی چیزوں یا کتاب کو چھونے کے لیئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا۔ کبھی صوفیا کمرے میں نہ ہوتی۔ تو رآبرٹو بند کیواڑ کی طرف ٹکٹکی جمائے اور بےچین و مضطرب رہتا۔ اس کی گفتگو پریشان سی ہوتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ادھر صوفیا نمودار ہوئی، ادھر رآبرٹو ٹوپی اٹھاکر

چلا دیا۔ لڑکی زرد پڑتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے پڑ گئے تھے آخر کار صوفیا نے یہ انتظام کیا کہ رابرٹو اس کو دیکھنے نہ پائے۔ ایک ہفتہ تک شام ہی سے وہ کمرہ میں بند ہو جاتی۔ ناصبوری سے کانپتے اور غم کو غلط کرتے ہوئے۔

"ایک روز شام میں لولو اس کے کمرہ میں آپہنچی۔ اور کہا۔ "کیا تم مجھ پر ایک عنایت کرو گی"؟

"کیا چاہتی ہو"؟

"مجھے ایک چھٹی لکھنی ہے۔ رابرٹو چاندنی پر تنہا ہے۔ کیا تم جا کر اس کی رفاقت کرو گی"؟

"لیکن میں ـــــ"

"کیا تم اس طرح بند پڑی رہنے کو پسند کرتی ہو؟ میری خاطر یہ ذری سی عنایت کرو گی تو تمھارا ایسا کونسا نقصان ہو جائیگا"؟

"کیا تم جلد لوٹ آؤ گی"؟

"مجھے صرف چار سطر لکھنے کا وقت درکار ہے"۔

صوفیا ہمت کر کے چاندنی کی جانب چلی۔ دہلیز پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ رابرٹو ٹہل رہا تھا صوفیا اس کے قریب گئی اور کہا۔

"لولو نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

"تم جبراً چلی آئیں"۔

"جبراً؟ نہیں"۔

اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ رابرٹو اس کے قریب ہی تھا۔ اس کے چہرہ پر جذبہ کی وجہ سے سختی پیدا ہو گئی تھی۔

"میں نے تمھارے ساتھ کیا برائی کی ہے۔ صوفیا"؟

"نہیں کچھ نہیں۔ میری طرف اس طرح نہ دیکھو"، صوفیا دہشت ناک ہو کر درخواست کرنے لگی۔

"صوفیا تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے بڑی محبت کرتا ہوں"!

"رابرٹو" خدا را چپ رہو، چپ رہو۔ لولو سن لیگی"۔

"مجھے لولو سے محبت نہیں، صوفیا۔ مجھے تم سے محبت ہے"۔

"یہ دغا ہے"!

"یہ میں جانتا ہوں لیکن مجھے تم سے محبت ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھا" لولو نے دُور سے پکارا۔ اور دوسرے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے کہا" اچھا۔ کیا تم دونوں میں مصالحت ہو چکی ہے؟"

لیکن وہاں جواب کون دیتا۔ صوفیا ہاتھوں میں منہ چھپا کر بھاگی۔ اور رآبرٹو خاموش، بے حس کھڑا رہا گویا وہ سکتہ کے عالم میں ہے۔

"رآبرٹو" لولو نے پکارا۔"

"لولو"

"کیا ہوا"

"کچھ نہیں میں جا رہا ہوں۔"

اس سے اجازت لیئے بغیر وہ بھی مایوسانہ باہر چلا گیا۔ لولو وہیں خیالات میں غوطہ زن کھڑی رہی اور نظریں رآبرٹو کے تعاقب میں دور تک گئیں۔

"ایک یہاں اور ایک وہاں" وہ بڑبڑانے لگی" اور اس سے پہلے؟ بس مجھے اس میں ہاتھ ڈالنا چاہیئے۔"

"--- اس لیئے ان موجہ وجوہات کی بنا پر میں رآبرٹو مانٹی فرانچے سے شادی نہیں کر سکتی" لولو نے آخر کار اپنی ماں سے کہا۔"

"یہ وجوہات، میری بیٹی سب بیہودہ ہیں" ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مختصر یہ کہ میں تم سے صاف اور بے تکلف کہتی ہوں کہ رآبرٹو سے مجھ کو خوشی نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ میں اس سے شادی نہیں کرونگی۔"

"یہ کم از کم بے تکلفی تو ہے۔ لیکن اس کی اہمیت ایک خبط سے زیادہ نہیں۔ رآبرٹو تم کو چاہتا ہے"

"اس کی تسلی ہو جائیگی۔"

"تم نے اس سے وعدے وعید کر لیئے ہیں۔"

"ہم ان کا استرداد کر سکتے ہیں ہم اب ان ایام میں بسر نہیں کر رہے ہیں، جب لوگ مجبوراً شادی کر لیا کرتے تھے۔"

"دنیا کیا کہیگی؟"

"امی! دنیا کی تجدید تو کیجیے۔"

"لوگ۔"

"اور یہ جناب لوگ کون ہے۔ میں اس کو نہیں جانتی۔ میں جناب لوگ کی خاطر اپنی خوشی کو برباد کرنے پر مجبور نہیں ہوں۔"

"تم بڑی سخت لڑکی ہو۔ لیکن اب میں رابرٹو کو کس طرح سمجھاؤں؟ اس سے کیا کہوں؟"

"جو تم چاہتی ہو۔ اور پھر تم کس دن کے لئے ہو؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں ہوں اسی لیئے کہ تمھاری غلط کاریوں کا خمیازہ بھگتوں۔ کیسی بدنامی ہوگی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ یہ کام تم سلیقہ سے کرسکتی ہو۔ تم میری شکایت بھی کرسکتی ہو کہ وہ الہڑ متلون ہے سبک ہے اور کہنا کہ اس میں بیوی بننے کی ابھی قابلیت نہیں۔ اس میں سنجیدگی نام کو نہیں، اور اس میں متانت مفقود ہے جو میری بہن کے حصے میں آئی ہے۔"

"تمھاری بہن؟ تو کو کیا عقل ماری گئی ہے؟"

"ہش! یہ تو تم آسانی سے کہہ سکتی ہو۔ اب تو رابرٹو اور صوفیا ایک دوسرے سے نامانوس ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہو؟ تمھاری تعریف ہوگی کہ اچھی ماؤں کی طرح تم نے بڑی بیٹی کو پہلے بیاہ دیا۔"

"کیا حقیقت ہے؟"

"مجھے تو شوہر مل ہی جائیگا۔ ابھی میرا سن ہی کیا ہے۔ بمشکل اٹھارہ سال۔ ابھی مجھے آزادی کا لطف اٹھانا ہے میں رقص کی بڑی شیدائی ہوں۔ میں اپنی کمسنی کا لطف 'اپنی پیاری' عزیز امی جان کے ساتھ اٹھانا چاہتی ہوں۔"

"تم بڑی مکار ہو۔" ماں نے جوش میں آکر بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"تو ہم میں سمجھوتہ ہوگیا۔ رابرٹو کو یہ خبر بد ذرا دلجوئی کے ساتھ سنانا۔ لیکن یہ بھی سمجھا دینا کہ ہماری دوستی میں کچھ فرق نہیں آئیگا۔ اور ہم اس سے روز ملتے رہنے کے متوقع ہیں۔ اگر یہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے لگیں تو کوئی انوکھی بات نہیں۔ یہ پیش بینی ہے۔"

"لیکن شریر تو تو کیا تمھیں یقین ہے کہ معاملات آسانی کے ساتھ طے ہو جائیں گے تم کو

معلوم ہے کہ میں لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرتی ہوں۔"

"اجی بے بھروسہ امی جان۔ تمہیں کس طرح یقین دلاؤں۔ میرے وسیع تجربہ کی بنا پر میں تم کو قول دیتی ہوں کہ کچھ بدنامی نہ ہوگی۔ ر آبر تو شریف انسان ہے۔ بغیر محبت کے مجھ سے وہ شادی کی توقع نہیں رکھ سکتا۔"

"مجھے جس بات کا ڈر ہے وہ صوفیا کی طبیعت ہے۔"

"ناممکن سے زیادہ کوئی چیز ممکن نہیں۔" لولو نے سنجیدہ پن کے ساتھ جواب دیا۔

"عزیز من! یہ پیش بینیاں۔ بس۔ اس کو وقت پر موقوف رکھو۔ شاید وقت ان معاملات میں کسوئی کی صورت پیدا کر دے۔ لیکن ایک بات جو تم سے چھوٹ نہیں سکتی، وہ بد دماغی ہے۔"

"اور

"معاملہ فہمی بھی نہیں۔"

"اور خبطی انسان۔ مجھے جو چاہو کہو۔ خطبہ دے جاؤ۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ ہاں کیا ختم کر دیا۔ دیکھو میں منتظر ہوں۔"

"مجھے ایک پیار دو۔ اور جا کر سو رہو۔ بچی خدا حافظ!"

"شکریہ امی۔ خدا حافظ۔"

نیک بخت ماں نے سوچا "یہی مناسب ہے۔ لولو کا ابھی سن ہی کیا ہے۔ اس قسم کی مصلحت کی شادیوں کے برے نتائج آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ خداوندا! ہمیں ان سے بچانا یہی مناسب ہے۔"

"اف!" لولو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "کسقدر ریاکاری سے مجھے کام لینا پڑا۔ امی کو سمجھانے کے لیے کتنی ترکیبیں استعمال کرنی پڑیں۔ کیسی شاندار فتح ہے۔ یہ محبت کی فتح نہیں بلکہ لولو کی فتح ہے۔"

سونے جاتے ہوئے، وہ بہن کے کمرہ کے دروازے پر رکی۔ اور سننے لگی۔ اسکو تھوڑی دیر سے زیر لب آہیں سنائی دیتی تھیں۔ غریب صوفیا کا اطمینان قلب رفو چکر ہوگیا تھا۔

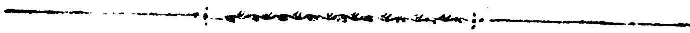
"سو رہو۔ صوفیا۔ سو رہو" لولو نے آہستہ آہستہ گنگنایا۔ زنجیر در کو بوسہ دیتے ہوئے گویا وہ بہن کے سلسلہ زلف کو بوسہ دے رہی ہے۔ "قلب کو تسکین دو۔ سو جاؤ۔ میں نے آج شام کو تمہاری گرگا

بنادی ہے ۔"

"فیاض لڑکی بھی سورہی ۔ نہایت بشاش اور مطمئن ۔ اپنی محبوب بہن کی مسرت کے خیال میں اسکی آنکھ لگ گئی ۔ وقت کا بوڑھا، ہوشیار کارساز اپنا کام کر گیا تو تو مذاق سے سوچنے لگی کہ اب "بوڑھی کنواری" بہن جو عروس کی سہیلی کی خدمت انجام دینے والی تھی، ریشم کا گون پہنیگی یا سادہ تو ردار ۔ اس نے راٰبرٹو سے پوچھا کہ وہ کسقدر بتاسے لائیگا ۔ اور صوفیا سے کہا کہ وہ اپنی شادی میں نئے جانے والے رومال کا تحفہ تیار رکھے ۔

صوفیا اور راٰبرٹو لڑکی کی باتیں سنکر ہنستے ۔ اور اس سے اپنے سازگار کی طرح محبت کرتے ۔

راٰبرٹو نے اپنے ایک دوست سے شادی کے متعلق بعد میں یہ کہا "میں ہمیشہ اس کا معتقد رہا ہوں کہ ایک جوڑا کتنا ہی مختلف الخیال مختلف المذاق اور افراط و تفریط پر کیوں نہ ہو، اگر دونوں آپس میں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوجائیں، تو یگانگت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں"۔ اور ددہم خیال اور ہم مذاق دو متوازی خطوط کی مانند ہیں ۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن مل نہیں سکتے ۔ اور سب بھر جب آپس میں محبت ہو ۔ ! میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں "



بے نام و نشان

(۱)

(جناب ام، اسلم صاحب)

اٹک کے اس پار دامن کوہسار میں پٹھانوں کی ایک بستی تھی۔ یہ لوگ کھیتی باڑی تو برائے نام کرتے لیکن اکثر مویشیوں کی تجارت میں مشغول رہتے تھے پنجاب کے اضلاع سے مویشی سستے داموں پر خرید لاتے اور سرحدی علاقے میں منافع پر فروخت کر دیتے۔

لعل خاں ایک بوڑھا زمیندار تھا۔ اس کا گھر ایک چھوٹی سی چٹان کے دامن میں گاؤں سے کچھ فاصلہ پر ایک ایسے مقام پر واقع تھا جس کے پاس سے دریائے اٹک کی ایک چھوٹی سی شاخ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اور لہراتی ہوئی بہتی تھی۔ لعل خاں اپنے ڈھور ڈنگر فروخت کر کے آج ہی گھر واپس آیا تھا۔ اس کا گھر کیا تھا پتھروں کی چار دیواری کے اندر ایک معمولی سا مکان تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ اور کوئی بچہ۔ دونوں وقت کا کھانا وہ نان بائی کی دکان پر کھا لیا کرتا۔ رات کو گھر آ کر پڑ رہتا۔ بستی میں وہ بہت بخیل مشہور تھا۔

آج لعل خاں کے پاس کچھ کم دو ہزار روپے تھے۔ یہ روپے اس نے چمڑے کی ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا اور وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر واپس آیا تھا۔ اور اس فکر میں تھا کہ اس دولت کو کہاں ٹھکانے لگائے۔

دور فاصلہ پر بے برگ و گیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو بادل جمع ہو رہے تھے اب گرجتے ہوئے آبادی کی طرف بڑھے۔ ہوا بھی تیز ہو گئی۔ لعل خاں نے چراغ روشن کیا اور چارپائی دیوار کے ساتھ کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت طیور کے قافلے نہایت تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے طوفان برق و باد سے بچنے کے لیے دامن کوہسار کی جانب جا رہے تھے۔ لعل خاں کے گھر کے آس پاس جو درخت تھے ان پر بھی طیور نے بلّر مچا رکھا تھا۔

نیلے نیلے بادلوں پر کلنگ کا ایک قافلہ کہیں سے اڑتا چلا آ رہا تھا۔ ان کا سردار آگے آگے تھا۔

اور باقی ماندہ پرندے قینچی کی طرح دو قطاروں میں پیچھے پیچھے اڑے چلے جا رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بد نصیبی بھی کوئی پناہ کا آسرا ڈھونڈ رہے ہیں۔

لعل خاں کھاٹ پر بیٹھا اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ کاش اس کی جورو نہ مرتی یا کوئی بچہ اپنی یادگار چھوڑ جاتی۔ افسوس اس نے تمام عمر یوں ہی رائگاں ضائع کر دی۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ دوسری شادی کر لیتا۔ اور آج اس کا گھر یوں سونا پڑا نظر نہ آتا..... پھر اس نے خیال کیا کہ زندگی کے جنجال سے جتنا بھی انسان بچا رہے اتنا ہی غنیمت ہے۔ بال بچے ہوتے تو ہزاروں تفکرات بھی دامنگیر رہتے۔ پھر وہ ایک آہ بھر کر بولا۔

دنیا میں بے نام و نشان رہنا ہی اچھا ہے

بارش موسلا دھار ہونے لگی تھی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہوا درختوں کے پتوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے دل دہل جاتا تھا۔ اس شب طوفان خیز میں ایک گرانڈیل آدمی لعل خاں کے دروازے کے پاس ہی دیوار سے چمٹا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور کمر کے ساتھ ایک پستول لٹک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لعل خاں چارپائی سے اٹھا بستر ٹھیک کیا اور پھر کیواڑ بند کرنے کے لیے دروازہ کی طرف آیا دروازہ بند کرنے سے بیشتر اس نے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اجنبی بجلی کی طرح تڑپ کر اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ اور جھٹ لعل خاں کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ لعل خاں نے ایک چیخ ماری اور دروازہ میں گرا۔ یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ قاتل اس کی تڑپتی ہوئی لاش پر سے گزر کر گھر میں داخل ہوا اور وہ تھیلی جس میں روپے رکھے تھے کھاٹ پر سے اٹھا کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لی اور پھر چپکے سے گھر سے نکل کر چار دیواری پھلانگ کر دریا کی شاخ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں ایک مقام پر اس نے سرکنڈوں میں ایک چھوٹی سی کشتی چھپا کر باندھ رکھی تھی۔ قاتل جلدی سے کشتی میں سوار ہو کر چپو چلانے لگا۔ اور کوشش کرنے لگا کہ کشتی کو دریا کے اس پار لیجا اور پھر دوسرے کنارے پر اتر کر سرحدی علاقے میں بھاگ جائے۔

قاتل پوری قوت کے ساتھ چپو چلا رہا تھا۔ اس کی جان کی سلامتی کے خوف سے اس وقت نہ تو سردی کی فکر تھی اور نہ بارش اور برق و باد کا خیال تھا چپو چلاتے چلاتے وہ تھک چکا تھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ دریا تو لعل خاں کے مکان سے کچھ بہت دور تھا۔ اور

اس وقت تک تو اسے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ ابھی تک دریا کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہی پھر رہا تھا۔ کبھی کبھی چپو کی آواز سے ڈر کر مرغابیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر چلی جاتی تھیں۔ کبھی اس کی کشتی سرکنڈوں میں سے گزرنے لگتی تھی۔ کبھی پانی کا پاٹ بہت کم ہو جاتا تھا۔ گاہے دھار کی تیزی کے باعث اسے بہت قوت سے چپو چلانا پڑتا تھا۔ چونکہ اسے دریا کے بہاؤ کے خلاف جانا تھا۔ اس لیے اسے بہت تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔

قاتل اب تھک کر چور ہو چکا تھا۔ سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے تھے۔ اور اس کے تمام بدن میں رعشہ تھا۔ گو طوفان تھم چکا تھا اور آسمان پر کہیں کہیں ستارے بھی چمکنے لگے تھے۔ لیکن تاہم اندھیرا اسقدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کشتی کدھر جا رہی ہے۔ وہ اس خیال سے بہت بے چین ہو رہا تھا کہ اسوقت تک وہ دریا کے پار کیوں اتر نہیں گیا۔ تھکاوٹ اور کوفت کے باعث اب وہ آہستہ آہستہ کھینے لگا۔ اچانک چپو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گر گیا۔ اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی بہہ گیا۔

وہ اپنی دست وپائی پر بہت پریشان ہوا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اب وہ جان کے خوف سے ہاتھوں سے کشتی کھینے لگا۔ لیکن اب کشتی کو قابو میں رکھنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ کشتی ایک پایاب مقام پر آکر رک گئی۔ اور ساتھ ہی اسے اور فاصلہ پر سے مرغ سحر کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قاتل کے لیے پیغام قضا سے کم نہ تھی۔

اب رات کی ظلمت سیماب پا تھی۔ اور آہستہ آہستہ دور فاصلہ پر کچھ کالے کالے سے سائے بھی نظر آنے لگے تھے۔ قاتل گرد و پیش کے مناظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور اس کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ آخر وہ مجبور ہو کر کشتی سے اترا۔ اور جس طرف سائے نظر آ رہے تھے ادھر پانی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ ابھی پانچ سات گز گیا ہو گا کہ اس کے پاؤں دلدل میں دھنسنے لگے۔ اور پھر یہ حالت ہوئی کہ دلدل سے قدم نکالنا دوبھر ہو گیا۔

اب اسے اونچے اونچے شجر صاف صاف نظر آنے لگے تھے۔ اور اس خیال سے کہ کنارہ قریب ہی ہو گا اسے کچھ اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ ہر قدم پر دلدل میں نیچے دھسا چلا جا رہا تھا جبقدر کشمکش سے وہ ایک پاؤں نکالتا دوسرا پاؤں اتنا ہی اور زیادہ نیچے دھس جاتا۔ اور اس تگ و دو کا آخری

نتیجہ یہ تھا کہ وہ گھٹنوں تک دلدل میں دھنس گیا۔ اسے خیال ہوا کہ ہو نہ ہو تھیلی کا بوجھ اس مصیبت کا باعث ہو رہا ہے۔ کنارہ صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کنارے سے کچھ دُور نہ تھا۔ اس نے کمر سے تھیلی کھولی اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اُسے دونوں ہاتھوں سے اچھال کر کنارے کی طرف پھینکا۔ سخت زمین پر روپے کے گرنے کی جھنکار سے اسے کچھ اطمینان ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کمر تک دلدل میں دھنس گیا۔ اب اس نے خنجر اور پستول بھی کمر سے کھولا اور اسے بھی کنارے کی طرف پھینک دیا لیکن اب وہ سینہ تک دلدل کے اندر تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اور ہر درخت کے ڈالی ڈالی پہ سے پرندوں کے الاپنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک قاتل کی نظر ایک دیوار پر پڑی۔ یہ پتھروں کی ایک چھوٹی سی دیوار تھی اور اس دیوار سے کچھ فاصلہ پر اسے ایک چھوٹا سا گھر نظر آ رہا تھا۔

یہ گھر لعل خاں کا تھا اور قاتل اس وقت اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں وہ بوڑھے کو قتل کرنے کے بعد دیوار پھلانگ کر آ کر کھڑا ہوا تھا وہ رات بھر دریا اٹک کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہی چکر کاٹتا رہا۔ اور صبح ہوتے ہی اجل اسے اسی مقام پہ لے آئی جہاں اس نے ایک بے گناہ کا خون بہایا تھا۔

قاتل اس دلدل سے نکل بھاگنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا لیکن اب وہ بے بس تھا اور لحظہ بہ لحظہ دلدل میں نیچے دھنسا چلا جا رہا تھا۔ سورج کی پہلی سنہری کرن کے ساتھ ہی اسے کنارے پر وہ تھیلی نظر آئی جس کے لیئے اس نے اپنے ہاتھ ایک بے گناہ کے خون سے رنگے تھے۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اور یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ دریائے اٹک کی خوفناک دلدل اس کی قبر بن گئی۔ جس طرح لعل خاں اس جہان سے بے نام و نشان رخصت ہوا۔ وہی حشر اس کے قاتل کا ہوا۔ ع

"کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے"

ایقانِ روح

(از جناب حکیم آزاد انصاری صاحب)

ایک دن ہر سازِ سر تا پا صدا ہو جائے گا — ایک دن ہر راز، رازِ بر ملا ہو جائے گا۔

ایک دن ہر جزو و کل کا امتیاز اٹھ جائے گا — ایک دن ہر قطرہ دریا میں فنا ہو جائے گا۔
ایک دن ہر خار و گل کا امتیاز اٹھ جائے گا — ایک دن ہر ذرہ مہر جلوہ زا ہو جائے گا۔

ایک دن ہر رنج راحت انتہا بن جائے گا — ایک دن ہر دکھ ہم آغوشِ دوا ہو جائے گا
ایک دن ہر زہر لطف جانفزا بن جائے گا — ایک دن ہر زہر تریاقِ شفا ہو جائے گا

ایک دن ہر کفر و دیں کی کشمکش ہٹ جائیگی — ایک دن ہر شبہ و شک کا فیصلہ ہو جائے گا
ایک دن ہر این و آں کی چپقلش مٹ جائیگی — ایک دن ہر پیش و پس کا خاتمہ ہو جائے گا

ایک دن ہر سو نشانِ دوست پایا جائیگا — ایک دن ہر بتکدہ قبلہ نما ہو جائے گا۔
ایک دن ہر گھر مکانِ دوست پایا جائے گا — ایک دن چاروں طرف سجدہ روا ہو جائیگا

ایک دن ہر ساز سے اس کی صدائیں آئینگی — ایک دن نغمات کا طوفاں بپا ہو جائے گا۔
ایک دن ہر سمت آنکھیں اُس کو پیدا پائینگی — ایک دن عالم کا عالم ہی نیا ہو جائے گا

ایک دن ہر بابِ الطاف و کرم کھل جائیگا — ایک دن ہر روک ہٹ کر راستہ ہو جائے گا
ایک دن ہر لن ترانی کا بھرم کھل جائے گا — ایک دن ہر پردہ اُٹھ کر سامنا ہو جائے گا

ایک دن ہر گفتگو کی ہمتیں بڑھ جائینگی ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر مطلب بے جا بجا ہو جائے گا۔
ایک دن ہر آرزو کی ہمتیں بڑھ جائینگی ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر امر ناجائز روا ہو جائے گا۔

ایک دن ہر رنج الفت کا صلہ مل جائیگا ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر وعدۂ الفت وفا ہو جائے گا۔
ایک دن ہر شوق منھ مانگیں مرادیں پائے گا ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر حسرت دل کا بھلا ہو جائے گا

ایک دن ہر دوری قانی کے غم مٹ جائیں گے ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر صدمہ باقی فنا ہو جائے گا۔
ایک دن ہر بُعد جسمانی کے غم مٹ جائیں گے ‏ ‏ ‏ ایک دن ہر قرب روحانی عطا ہو جائے گا

ایک دن تقدیر بالکل راہ پر آجائے گی۔ ‏ ‏ ‏ ایک دن بخت رسا بخت رسا ہو جائے گا
ماحصل یہ ہے کہ ہر امید بر آجائے گی۔ ‏ ‏ ‏ مختصر یہ ہے کہ ہر فضل خدا ہوا جائیگا

بس اب اے آزاد تصریح مزید اچھی نہیں
جا، اور اطمینان رکھ جو کہہ دیا ہو جائے گا

دلِ مادر

(از جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی مدرس مدرسہ مفید الانام)

"منظوم افسانے" کی یہ جدت مکتبہ کی اس افسانوی اشاعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ منظوم افسانہ نگاری "ارتقائے افسانہ" کا اولین مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن اب بھی اس قسم کی چیزوں سے عوام اور خواص کو سیری نہیں ہوئی فخر صاحب کی یہ مثنوی سادہ اور سلیس ہے۔ قصے میں انتہا کا موقع ذرا اگراں معلوم ہوتا ہے لیکن جہاں خاتمہ پر پہنچتے ہیں طبیعت میں ایک عجیب احساس احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ (مجلہ مکتبہ)

شب تجلی ریزیوں پر ماہ پرتنویر تھا
سر بسر سارا جہاں اک نور کی تصویر تھا

عاشق و معشوق اک بیٹھے کنار آب جو
کر رہے تھے پیار کی پر لطف باہم گفتگو

دختر نوخیز وہ مست غرور حسن تھی
جس کی مستانہ اداؤں میں تھی شان دلبری

وہ جوان جو عاشق روئے جہاں افروز تھا۔
لذت سوز و گداز عشق سے تھا آشنا۔

دلپذیر الفاظ میں اس داغ خوردہ نے کہا
اے حسین اے نازنیں اے مہ جبیں اے مہ لقا!

عمر کے سرمایہ کو صرف محبت کر دیا۔
دل کے گوہر کو نثار راہ الفت کر دیا

کیا نہ تیرے ساتھ کیں میں نے وفائیں آج تک
کیا تجھے اب بھی مری سچی محبت میں ہے شک

بے رخی سے تیری کچھ اس کا نہیں چلتا پتا
آخر اس کا کیا سبب یہ بات کیا ہے سچ بتا

یہ گلہ عاشق کا سنکر یوں ہوئی وہ گلفشاں
آپ نے بھی واہ کیا اچھی سنائی مہرباں۔

دل کا دینا راہ الفت میں تو ہے پہلا قدم
ناز اس پر آپ کو بے کار ہے کھائیں نہ غم

بیش قیمت آپ کے گوہر سے بھی ہے ایک چیز
آپ کو جو جان سے اپنی زیادہ ہے عزیز

قیمتی شے سے کیا عبارت وہ دل مادر سے ہے
چاہتی ہوں آپ سے میں مجھکو لا دیجے وہ شے

پھر تو میں پابستۂ مہر و وفا ہو جاؤں گی
ظلم سے توبہ کرونگی جور سے باز آؤں گی

گر ثبوت الفت صادق کی ہے تاب و تواں
پھر ارادہ کیجیے بسم اللہ دیجیے امتحاں

دعوے الفت کو ثابت کر کے پھر دکھلائیے
جائیے اور سینۂ مادر سے دل لے آئیے

ورنہ ہی یہ ادعا الفت کا دم بھرئیے نہ اب
ملے گلوں سے کب ہوا ہے جادۂ راہ طلب

سنتے ہی تقریر یہ اس پر قیامت آگئی
اڑ گیا چہرہ کا رنگ اور دل پہ ہیبت چھا گئی

ہاتھ کے طوطے اڑے آئی نظر تصویر یاس
نام کو باقی رہے اس میں نہ کچھ ہوش و حواس

یہ اثر لیکن ذراسی دیر میں جاتا رہا۔
الفت مادر پہ جوش عشق غالب آگیا

اٹھ کھڑا پڑھتے ہوئے مصرع یہ وہ شوریدہ سر
این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔

جب اسی دھن اور اسی حالت میں وہ پہنچا مکاں
گو بہت بے چین کردیں اس کو دل کی چٹکیاں

اس سے بچنے کی مگر صورت نہ کچھ آئی نظر
دیکھا جب ہوتی نہیں تدبیر کوئی کارگر

بس اسی جوش جنوں میں خنجر خونخوار سے
چیر ڈالا ماں کا سینہ خاطر دلدار سے

یہ جنون عشق تھا جو کچھ نہ کرنا تھا کیا
کام اس کے ہاتھ سے جو کچھ نہ ہونا تھا ہوا

لے کے دل ماں کا وہاں سے یوں ہوا ہی وہ رواں
جس کی شرح تیز رفتاری میں قاصر ہے زباں

سوجھتا تھا اس کو تیزی میں نہ کچھ پست و بلند
راہ پیما تھا عجب سرعت سے وہ زار و نژند۔

دوڑنے میں یک بیک ٹھوکر جو کھائی گر پڑا
لاکھ کوشش کی سنبھلنے کی نہ سنبھلا جا سکا۔

اس کا گرنا ہی غضب تھا ہاتھ سے دل چھوٹ کر
مرغ بسمل کی طرح تڑپا وہ روئے خاک پر

پھر اسی حالت میں یہ دل سے صدا آنے لگی
جو زمین و آسماں کے دل کو تڑپانے لگی۔

میں ترے صدقے گئی اے میری جان مجھکو بتا!
میرے بیٹے! میرے فرزند جواں! مجھ کو بتا!!!

"تیرے جسم نازنیں نے چوٹ تو کھائی نہیں
صدمہ جانکاہ تو تجھ کو نہیں پہنچا کہیں"

تنقیدیں

عروس غربت میاں محمد اسلم صاحب لاہور کے ان قدیم انشاپردازوں میں ہیں جو ایک عرصہ دراز سے خاموش طور پر اردو ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ مخزن کے دور اول سے لیکر جب کہ سر عبدالقادر رکن عدالت عالیہ لاہور اس کے مدیر تھے اس وقت تک وہ متعدد مضامین اور افسانے لکھ چکے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر کتابی صورت میں شایع ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کی طرز تحریر کی دلاویزی اور پاکیزگی کی وجہ سے ان کی کتابیں باوجود اس کے کہ وہ کبھی ان کی تشہیر ودعایہ کی کوشش نہیں کرتے عام مقبولیت رکھتی ہیں اور کئی کتابیں ایسی ہیں جو ایک سے زاید بار چھپ چکی ہیں۔

'عروس غربت' فرانس کے مشہور ادیب وکٹر ہیگو کے ناول کا ترجمہ ہے جو چھوٹی تقطیع کے (۱۹۸) صفحات پر اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ پنجاب کے مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی کی دلکش تصویریں بھی ہیں اور سرورق بھی حسن کارانہ انداز میں بنایا گیا جس سے کتاب کی ظاہری آب و تاب میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

متن سے پہلے پروفیسر میاں محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے کی مختصر سی تمہید بھی ہے جس میں انہوں نے اردو ادب میں ناول اور ڈراموں کی حالت پر بحث کرتے ہوئے اس ناول کے محاسن بھی بیان کیے ہیں جب کہ وہ کہتے ہیں

"یہ افسانہ گویا سرگزشت گل ہے۔ کس طرح ایک ناشگفتہ کلی جو غلیظ ماحول میں کچلی جا رہی تھی کھلی فضا میں نشو و نما پا کر ایسا رنگین پھول بن جاتی ہے کہ اس کے سامنے سورج کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ کس طرح نیکی مصائب کے مقابلے میں کامیاب ہو کر پہلے سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ کشمکش دنیا سے زندگی پایندہ تر ہو جاتی ہے۔"

میاں صاحب نے جیسا کہ ان کا خاص انداز ہے اس کو اصل لفظی ترجمہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ یورپ کی ایک چیز کو اپنا لیا ہے وہ ناول کے تمام کردار اور ذیلی ماحول کو اپنے سماج کے موافق بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ یہ چیز باہر کی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس پر ہندی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمہید نگار نے بتایا ہے یورپ والوں کے رہنے سہنے کے طریقے ہم سے زیادہ آزادانہ ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جو چیزیں وہاں تہذیب میں داخل ہیں وہ ہندوستان میں معیوب اور مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہیں۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر میاں صاحب نے کوشش کی ہے کہ ان کی عروس غربت میں وہ بے اعتدالیاں نہ آنے پائیں جو وکٹر ہیوگو کے اصل ناول میں ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اب اس قابل ہو گئی کہ بلا کھٹکے مستورات اور بچوں کے مطالعہ میں دی جا سکے۔ ہم میاں صاحب کی اس ادبی کوشش کو بہت کامیاب

سمجھتے ہیں اور عمدہ سیرت کی پیدائش جو اکثر میاں صاحب کی تالیفات کا مقصود رہتی ہے اس میں بھی بہ احسن الوجوہ پیش نظر رکھی گئی ہے ۔ اس کی قیمت (۱۲؍) ہے

پیغام سروش یہ میاں صاحب کے آٹھ دلکش افسانوں، بارہ دلچسپ مضامین اور آٹھ چھوٹی بڑی دلسوز نظموں کا مجموعہ ہے ۔ عروس غربت کی طرح اس کی طباعت و کتابت اور سرورق نہایت دیدہ زیب اور دلکش ہے ۔ کتاب کے شروع میں پنجاب کے مشہور شاعر جناب حفیظ جالندھری مدیر مخزن کا دیباچہ ہے ۔ اس مجموعہ کے افسانوں اور مضامین کے ساتھ مختصر سی تمہیدیں بھی ہیں جن میں ان کی شان نزول بیان کی گئی ہے ۔ یہ بڑی مفید چیز ہیں ۔ ان سے مولف کے دماغ کی رفتار کار اور اس کے تخیل کی تدریجی بلندی و ترقی کا پتہ چلتا ہے ۔ افسانے اور مضمون اکثر انگریزی سے ماخوذ ہیں ۔ بعض تو ترجمے ہیں مگر ایسے جنھیں آزاد ترجمہ کہنا چاہیئے ۔ افسانوں میں رادھا کی کنٹھی بڑا پاکیزہ افسانہ اور مولف کی اعلے قوت تخیل کا بہترین مظہر ہے ۔ رویا کے مرزا ؔ ادیسن مشہور انگریزی مضمون نگار کے ویژن آف مرزا کا ترجمہ ہے ۔ یہ عجیب دلچسپ مضمون ہے ۔ اردو میں کئی لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے ۔ میاں صاحب کا ترجمہ بھی بہت ہی دلکش ہے ۔ نظمیں بعض چھوٹی اور اور بعض بڑی ہیں لیکن سب کی سب حزن و ملال اور یاس و امید کے مخلوط جذبات کی حامل ہیں ۔ وسط ایشیا نامی نظم سنہ ۱۹۱۰ء کی کہی ہوئی اور شاعر کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے تو پیغام اصغری وغیرہ پختہ عمر کا کارنامہ ہیں ۔ ان کے باہمی مقابلے سے شاعر کے خیالات میں رفتہ رفتہ جو ترقی اور تبدیلی ہوئی ہے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ میاں صاحب کی ایک کمسن دختر معصوم اصغری ۲۸؍ اگست سنہ ۱۹۲۶ء کو چھ گھنٹہ کی مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئی ۔ اس حادثہ نے میاں صاحب کے دل کو وہ صدمہ پہنچایا کہ ان کے خیالات میں حزن و ملال کچھ دائمی سا ہو گیا ۔ اسی نے ان کو حیات بعد الممات کی طرف متوجہ کیا ۔ آج کل وہ اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں اور بقا، دوام وغیرہ کئی کتابیں اس موضوع پر لکھ چکے ہیں پیغام سروش جو (۲۹۱) صفحات کا قابل مطالعہ مجموعہ ہے (۲؍) میں ملتا ہے ۔

خطا تقدیر یہ یورپ کی گزشتہ جنگ عظمیٰ کی ایک عبرتناک اور سبق آموز کہانی ہے ۔ میاں صاحب نے اس کو بھی اپنے سادہ اور دلکش طرز تحریر میں لکھا ہے اور کردار نگاری میں بڑی کامیاب چیز ہے ۔ اس کے تمام کردار یورپی ہیں اور مولف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ان میں اس طریقہ پر روشناس کرائے کہ ہندوستانی قارئین جو کم سواد اور انگریزی سے ناواقف بھی ہوں، بلا دقت کہانی سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکیں ۔ اس کا حجم (۶۴) اور طباعت کتابت پاکیزہ ہے قیمت ۸؍

ساربان یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے جس کے کرداروں کا میدان عمل عرب کی ارض مقدس ہے ۔ اس کے کرداروں میں عربیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بالخصوص ساربان کا کردار خاصا دلچسپ ہے ۔ یہ کہانی بڑی مقبولیت

حاصل کر چکی ہے۔ اور اب تک چار اڈیشن شایع ہوے ہیں۔ قیمت ۱۲/

میاں صاحب کی تمام کتابوں کے ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو، بازار بارود خانہ لاہور

(سس۔ م)

دنیا کے بہترین افسانے تقطیع اوسط۔ کتابت و طباعت نہایت اچھی۔ قیمت (عمار) مجلد (عمار)

یہ مولوی منصور احمد صاحب جائینٹ اڈیٹر ہمایوں کے قصوں کا پہلا مجموعہ ہے جو دنیا کی کئی زبان کے بہترین قصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں اکثر قصے تو وہی ہیں، جو اس سے پہلے ہمایون لاہور میں شایع ہو چکے ہیں۔ اور اب دوبارہ اس مجموعہ میں شایع ہوئے ہیں۔

انگریزی میں دنیا کے بہترین قصوں کے نام سے اب تک کئی مجموعے شایع ہوئے جن میں سے میکسم لائیر اور...... کا مجموعہ اور دوسرا مجموعہ "اسٹوریز آف ال نیشنز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منصور احمد صاحب نے بھی غالباً انہیں نمونوں کو پیش نظر رکھ کر اور ایک بڑی حد تک ان سے مدد لیکر، یہ مجموعہ اردو میں شایع کیا ہے۔

غیر زبانوں کے شاہکاروں سے زبان اور ادب کو کئی فائدے پہنچتے ہیں۔ ایک طرف تو زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، دوسرے غیر زبانوں کے باکمالوں کی تصنیفات بھی اپنی زبان میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ جو بذات خود کئی مخصوص فائدوں پر مشتمل ہے۔ ان سے اس خاص شعبے میں کام کرنے والوں کی رہبری ہوتی ہے۔ اگر یہ شاہکار نہایت احتیاط اور خوبی کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کئے جائیں تو یہ خود ادبیات کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔

انہیں امور کو مد نظر رکھ کر ہم منصور احمد صاحب کی اس کوشش کو نہایت مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس میں دنیا کے اکثر ممالک کے مقبول اور مشہور مختصر قصے آ گئے ہیں۔ منصور احمد صاحب کو انگریزی قصص کے ترجمہ کرنے میں خاص مہارت ہے وہ کچھ عرصہ سے برابر قصوں کا ترجمہ کرتے رہے ہیں۔ ادبیات کے ترجمے میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں وہ منصور احمد صاحب کے ہاں موجود ہیں، وہ مفہوم کا اپنے طور پر ترجمہ کرتے ہیں۔ مکھی پر مکھی مار کر زبان کو گرا نبار اور غیر مانوس نہیں بنا دیتے۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے ان کے ترجموں میں دلچسپی پیدا ہونیکی۔ عموماً دنیا کے بہترین افسانوں کے جتنے مجموعے شایع ہوتے ہیں، وہ ہر ملک کے افسانوں کے تاریخی ارتقا اور تنقیدی نوٹس پر مبنی ہوتے ہیں لیکن منصور احمد صاحب نے غالباً اختصار کے خیال سے ہر ملک کے صرف ایک ایک افسانے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

(س،

فہرست مضامین مجلّہ مکتبہ

(جلد چہارم)

۵. دکھنیات

مضمون	مضمون نگار
ہمت حیدرآبادی	عمر یافعی
شر حیدرآبادی	״
درگاہ قلی خان	״

۶. منظومات

مضمون	مضمون نگار
کلام بیگم	عابد مرزا بیگم
عنقا	نصیر الدین خان
نیرنگ زبان	ابوالضیا گل
پردۂ قدرت	محمد اقبال صدیقی
غزل	صفی اورنگ آبادی
ثبوت عشق	ثامن علی نیساں
نقش عمل	علی اختر
سیر و تفریح	محسن خان متین
رباعی	مودود احمد تشنہ
طوطے آتوریان	عبدالرحمن خان صدر کلیہ عثمانیہ
رباعی	محمد علی قتیل
چاندنی	فخر حیدرآبادی
رباعی	رضی دہلوی
غزل	عبدالحمید خیالی
پند بے سود	صفی اورنگ آبادی
غزل	سالار حیدرآبادی
شب برات و آتش بازی	ابوالضیا گل
غزل	اخگر حیدرآبادی
سوال و جواب	قادر حسین قادر
غزل	محبت
غزل	توفیق الحسن
محرم سے بقرعید	راز قاسمی
مشاہدات	راز چاندپوری
غزل	صفی اورنگ آبادی
غزل	تشنہ حیدرآبادی
غزل	آزاد انصاری

۷. متفرقات

مضمون	مضمون نگار
خود اعانتی	مرزا ناصر علی بیگ بی۔ اے

۸. تنقیدیں

مضمون	مضمون نگار
فرہنگ عثمانیہ	پردہ
سالنامہ رہبر دکن	تاریخ
دی اسٹار	القضا فی الاسلام
دیوان اثر	عالم حیات
مسلمان اور شادی	چاند
طبیبہ	متعلم
ہمدرد اطفال	جونیر سلف ٹیچنگ ٹرانسلیشن
ادب	دروس الادب
جن	خمکدۂ سرور
دیوان تاباں	ارنسٹ
ہونہار	روضۃ البہیہ
ہندی اردو مالا	ہونہار

کردار اور افسانہ

اردو کے موقر رسالوں کی رائیں

یہ دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اشخاص قصہ، دوسرے حصے میں کردار نگاری، اور تیسرے حصے میں اردو کے بعض مشہور افسانوں کے کردار پر بحث کی ہے۔ اگرچہ کوئی ہدایتوں سے افسانہ نویس نہیں بن سکتا تاہم ان ضروری باتوں کا جاننا اس کے لئے ضرور مفید ہے۔ تیسرے حصے میں سحر البیان اور نجم النساء کے کردار اور عمرو عیار کی سیرت کو تفصیل اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ جو لوگ افسانوں کو غور سے پڑھنا چاہتے ہیں یا جن کو فسانے لکھنے کا شوق ہے ان کے لیے بہت کار آمد ہے۔

کردار اور اس کا بیان فسانے کا سب سے بڑا اہم جز ہے۔ اس سے وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن میں بیان کی خداداد قابلیت اور مشاہدے کی قوت ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انسان کے اعمال وافعال میں سے صرف انہیں پر نظر پڑے جو کردار کو نمایاں کر کے دکھا سکتے ہیں۔ یہ مصنف کی ذہانت اور ذوق پر منحصر ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اس کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اگرچہ پڑھنے والے کو بعض باتوں میں مولف سے اختلاف ہوگا لیکن اس مضمون پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ قابل مولف نے اس کے لکھنے میں پوری کوشش اور محنت کی ہے۔ (اردو جنوری سنہ ۱۹۳۰ء)

جناب عبدالقادر سروری ام۔ اے۔ اس سے قبل "دنیائے افسانہ" لکھ کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اب انہوں نے یہ دوسری کتاب پیش کی ہے جسے "دنیائے افسانہ" کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں سیرت نگاری سے بحث کر کے مثالاً مثنوی سحر البیان کے "نجم النساء"، مراثی انیس کے "عون و محمد"، نذیر احمد کے "نصوح و نعیمہ" اور داستان امیر حمزہ کے "عمرو عیار" کے کردار سے بحث کی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ، مفید اور پر از معلومات ہے۔

پاکیزہ کتابت طباعت دیدہ زیب چھوٹی تقطیع خوبصورت جلد قیمت (۱عہ) (نگار اپریل سنہ ۱۹۳۰ء)

پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن

قاعدہ فارسی

ملک کے وقیع رسالوں کی نظر میں

یہ فارسی کا ایک جدید قاعدہ ہے جو نئے اسلوب میں جدید طریق تعلیم یعنی سے طریق راست (DIRECT METHOD) کے اصول پر مرتب کیا گیا ہے جو غالباً ہندوستان میں فارسی زبان کے لئے سب سے پہلی کوشش ہے۔ رسالہ (۲۱) درس پر منقسم ہے۔ پھر مختلف درس مختلف مشق میں مشق کرائے گئے ہیں۔ ہر درس میں الفاظ کی تعبیر تصویروں سے کی گئی ہے۔ نیز قدیم فارسی الفاظ کے پہلو بہ پہلو جدید الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر ہر درس کی تعلیم کے لیے ہدایتیں الگ درج ہیں۔ آخر میں ایک فرہنگ منسلک ہے جس میں مشکل الفاظ کے اردو معنے بتائے گئے ہیں۔ جناب مولف اس تالیف کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ یہ رسالہ طلبہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ (معارف اپریل ۱۹۳۰ء)

یہ کتاب ان چھوٹے بچوں کے لئے مفید ہے جو جدید طریقے سے فارسی پڑھنا چاہیں۔ اس کے مولف ابوالمحاسن محسن خاں متین ہیں۔ یہ کتاب ان خصوصیات کی حامل ہے۔

(۱) (DIRECT METHOD) کے اصول پر لکھی گئی ہے۔ (۲) ہر درس میں تصویر ہے تاکہ طلبہ کو پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ (۳) فارسی قدیم کے ساتھ فارسی جدید کا نمونہ بھی اس میں ہے۔ (چاند اپریل ۱۹۳۰ء)

یہ فارسی زبان کی پرائمر بجنسہ انگریزی پرائمروں کی شکل وصورت میں شایع ہوئی ہے جس کے ہر سبق کے ساتھ اس کے مضمون سے متعلق تصاویر دی گئی ہیں۔ حروف تہجی کے ساتھ بھی آج کل کے اردو قاعدوں کی طرح تصاویر دی ہیں۔ اور ظاہر ا نئے مگر بالکل صحیح طریق سے تعلیم دینے اور بندیوں کی دلچسپی قایم رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ آخر میں ہر سبق کے متعلق ترجمہ کی مشق کرائی گئی ہے اور خاتمے پر فرہنگ دیا گیا ہے۔ جو ایک نئی جدت ہے۔ مولوی ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین کے مذاق کی داد دینا شائقین کا کام ہے جنہوں نے فارسی زبان میں تعلیم جدید یہ طریق راست کی پہلی کتاب لکھ کر دنیائے ادب میں ایک خاص اضافہ کیا ہے۔ (رہنمائے تعلیم لاہور اپریل ۱۹۳۰ء)

چھوٹی تقطیع، کتابت ایرانی طرز میں، پاکیزہ طباعت، حجم (۶۴) صفحے۔ **قیمت** (۶/)

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

مجلّہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احکام بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلّہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکا

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

مجلۂ مکتبہ

یہ رسالہ [illegible] ہر [illegible] کی [illegible] تاریخ کو شائع ہوتا ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] درست ہو [illegible] [illegible] [illegible] ۔

نرخ اشتہار [illegible] بذریعہ [illegible] اشتہار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] صفحہ کے لئے [illegible] نصف [illegible] [illegible] اور چوتھائی کے لئے [illegible] اگر بارہ ماہ تک کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس سالانہ شرح میں [illegible] ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی ۔

ترسیل زر و مضامین اور ہمہ خط و کتابت بنام منتظم مجلۂ مکتبہ - مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے ۔

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ تیر سنہ ۱۳۳۹ف م مئی سنہ ۱۹۳۰ع شمارہ (۲)

تصویر :- حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری

فہرست مضامین

شذرات

برطانوی ہند میں اُردو زبان کو سرکار دربار کی سرپرستی سے محروم ہوکر ایک عرصہ دراز ہوگیا اور وہ تمام ذرایع جو سرکاری توجہ سے ایک زبان کی ترقی کے لئے پیدا ہوجاتے ہیں اُردو زبان کے لئے گم ہوگئے۔ علاوہ بریں خالص ہندی کے پرستار جو اردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت سے قریب ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کے آرزومند ہیں ہر طرح اس کو نقصان پہنچانے میں جائز و ناجائز طور پر دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ان مخالفانہ کوششوں کے باوجود اردو کو جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے وہ اس کی خوش بختی کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ خبر بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ مصر جیسے دور دراز ملک میں بھی اردو کا چرچا ہونے لگا ہے۔ وہاں سے ایک پرچہ اسلامی دنیا نامی جناب محمود احمد صاحب عرفانی کی ارادت میں شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ پرچہ ممالک اسلامیہ کے اخبار و آثار، مشاہیر مسلمانانِ عالم کے حالات اور ان کے افکار و خیالات کی اشاعت کیلئے وقف ہے۔ ٹائپ پر چھپتا ہے اور مصور ہے۔ مصر جیسے دور دراز ملک سے ایک اردو پرچے کا اجراء اس امر کی بین دلیل ہے کہ اردو اگر حقیقی معنوں میں بین الاقوامی پوزیشن اختیار نہیں کر رہی ہے تو بلاشبہ اقطاع عالم کے مختلف نسل کے مسلمانوں میں تبادلہ خیالات کا ذریعہ بننے کی خاص صلاحیت رکھتی ہے۔

اس پرچہ کے دوسرے نمبر میں حیدرآباد کی دو مشہور شخصیتوں نواب سالار جنگ بہادر اور خان بہادر احمد علاءالدین کے حالات اور تصویریں درج ہیں۔ اور عظماء اسلام کے عنوان سے ایک خاص باب مختلف ممالک اسلام کے مشہور بزرگوں قائدوں اور قابل قدر ہستیوں کے لئے مستقلاً وقف ہے۔ جن اچھے مقاصد کو پیش نظر رکھکر یہ پرچہ جاری کیا گیا ہے ان کی تکمیل بہت زیادہ تعاون و اشتراک عمل کی محتاج ہے اور ہم مدیر "اسلامی دنیا" کے بالکل ہم خیال ہیں کہ جب تک مسلمانانِ ہند دامے درمے قدمے سخنے اس کی طرف توجہ نہ کریں گے یہ کام چلنا مشکل ہے۔

ہر ہائی نس سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کی افسوسناک وفات پر اسلامی ہند جس قدر اظہار رنج و افسوس کرے بجا ہے۔ ریاست حیدرآباد کے بعد یہی ایک دوسری اسلامی ریاست ایسی ہے جہاں سے برطانوی ہند کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک کم و بیش تمام اسلامی اداروں

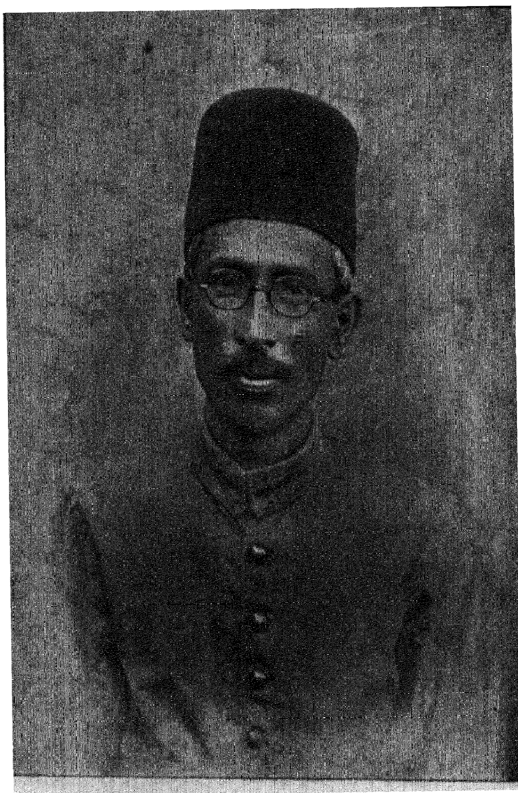
جامعوں اور مدرسوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً امداد ملتی رہتی ہے۔ بالخصوص مرحوم مادر ریاست بھوپال
نیز اسلامی درد رکھتی تھیں۔ ان کا دست کرم ہر وقت مسلمانانِ ہند کی امداد کے لئے کھلا رہتا تھا۔ انکی
وفات ایک اور حیثیت سے بھی حزن آگین ہے۔ ان کے انتقال سے اردو کی ایک بلند پایہ خاتون
مصنف دنیا سے اٹھ گئیں۔ تعلیم نسواں کی حمایت اور عورتوں کی ضرورت کی متعدد کتابیں ان کے
قلم سے شائع ہوئیں اور ہندوستان کے طبقہ اناث کے لئے بڑی فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ نہ صرف
بھوپال بلکہ اسلامی ہند کی خوش قسمتی ہوگی اگر مرحوم کے تخت نشین فرزند ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں بہادر
اپنی بزرگ ماں کے نقش قدم پر چل کر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ان کے سچے جانشین ثابت ہوئے۔

یہ خبر بھی اردو دنیا میں بڑے رنج و ملال سے سنی جائے گی کہ مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان نے
جن کی تصنیف "رحمت اللعالمین" اردو کی مقبول ترین سیرت نبوی اور مدارس اسلامیہ اور جامعہ عثمانیہ کے
نصاب تعلیم میں شریک ہے۔ حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہوئے جہاز پر داعی اجل کو لبیک کہا۔
قاضی صاحب ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔ انکی وفات سے اردو کو بڑا نقصان پہنچا۔ اگرچہ
اردو میں سیرت پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی سیرت نبوی ملتی ہے لیکن مرحوم
کی تالیف "رحمت للعالمین" صحت واقعات طرز بیان اور دیگر متعدد حیثیتوں سے اپنی نوع کی واحد کتاب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے میں ابتداً اردو اور فارسی کی جدا جدا جماعتوں کی بجائے بعض مجبوریوں سے
صرف ایک جماعت قائم کی گئی تھی اور اردو و فارسی دونوں کی تعلیم ایک ہی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی تھی
اب یہ سن کر ہر ہوا خواہ اردو کو مسرت ہوگی کہ صدر صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ اور اردو اور فارسی کے لائق پروفیسر
کی کوششوں سے اردو اور فارسی دونوں کی علحدہ علحدہ جماعتوں کے قیام کی تحریک بار آور ہوئی۔ عنقریب
تعلیم کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ نئی تنظیم میں دونوں زبانوں میں مقالہ نویسی بھی لازمی کر دی گئی ہے۔ اور غالباً
ادب کی تعلیم کے ساتھ صوتیاتی اور لسانیاتی پہلو سے زبان کا مطالعہ بھی اس کے نصاب میں شامل ہوگا۔ ترقی
کی طرف جامعہ عثمانیہ کا یہ قدم اس کی کامیابی کا ایک اور ثبوت ہے۔

ابتدائے دنیا سے افسانہ ہر قوم میں مقبول عام رہا ہے۔ ہر قدیم و جدید قوم میں قصوں اور افسانوں کا ذخیرہ
کثیر موجود ہے۔ انگریزی میں متعدد افراد کی منفرد اور مجتمع کوششوں سے دنیا کے بہترین افسانوں کے متعدد
مجلدات شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں دوسری مشرقی اور مغربی زبانوں کا

مجلہ مکتبہ



حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری

مصنف ''اردوئے قدیم'' و مدیر رسالہ تاریخ

مطبع کوہ نور

اعلیٰ لٹریچر اور علوم وفنون کا ذخیرہ ترجمے کے ذریعہ منتقل ہوتا جارہا ہے۔ یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ہر قوم اور ہر زبان کے چیدہ افسانے اس میں منتقل کر لیئے گئے ہیں۔

اردو میں اب سے پہلے اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی۔ چند ہی روز ہوئے کہ پنجاب کے مولوی منصور احمد صاحب شریک مدیر ہمایوں نے "دنیا کے بہترین افسانے" کے نام سے (۳۳) افسانوں کا ایک اچھا مجموعہ شائع کیا ہے۔ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ نے اس خصوص میں ایک عظیم الشان سلسلہ شروع کیا ہے جو امید ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں غیر معمولی پسندیدگی حاصل کرے گا۔ یہ سلسلہ حسب تفصیل ذیل چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۱) قدیم افسانے (۲) برطانوی قصے (۳) جرمن قصے (۴) فرانسیسی قصے (۵) اطالوی قصے (۶) ہسپانوی قصے (۷) چینی اور جاپانی افسانے (۸) ولندیزی، سوئس اور دیگر قصے (۹) روسی مختصر قصے (۱۰) یورپی اور دیگر افسانے (۱۱) بلجیمی قصے (۱۲) جدید اسلامی قصے (۱۳) امریکی افسانے (۱۴) بہترین اردو قصے۔

پہلا حصہ جس میں مصر، یونان، روم، ہندوستان، ایران اور عرب کے (۲۵) چیدہ افسانے ہیں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے اور دو حصے تقریباً مکمل ہو چکے ہیں ہفت عشرہ میں شائع ہو جائیں گے۔

باقی گیارہ حصے زیر طبع ہیں۔ حیدرآباد کے سات مشہور انشاپرداز اس سلسلے کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ پہلے حصے کے متعلق ہمارے پاس جو حوصلہ افزا رائیں وصول ہوئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہماری یہ امید بے جا نہیں معلوم ہوتی کہ یہ سلسلہ اردو ادب میں ایک خاص نوعیت کا اضافہ کرے گا

ہماری فیاض حکومت نے حکیم سید شمس اللہ قادری مدیر رسالہ ''تاریخ'' کی علمی مساعی کے اعتراف میں ایک سو پچاس روپیہ ماہوار صلہ تصنیف و تالیف جاری فرمائی ہے اس کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ عطیہ بھی مرحمت فرمایا ہے۔ آئندہ سے حکیم صاحب کی جو کتابیں لکھی جائیں گی اُن کے لئے سرکاری امداد دی جایا کرے گی۔

حکیم صاحب کی یہ علمی خدمات کا حکومت کی جانب سے یہ اعتراف علمی حلقوں میں احساس تشکر کے ساتھ دیکھا جارہا ہے۔ حکیم صاحب کی اب تک کئی کتابیں جو تمام کی تمام تاریخ کے موضوع پر ہیں، شایع ہو چکی ہیں اور ملک میں تحقیق و استناد کے لحاظ سے بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔

حکیم صاحب کی تصویر اس رسالہ میں کسی اور مقام پر شائع کی جارہی ہے۔

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

دیگر مفید ایجادات کی طرح جن میں کہ اکثر ہوا کرتا ہے ہلت کوٹ کے حق ایجاد کے نسبت لوگ معترض ہوئے۔ حق ایجاد کے مفروضہ عدم جواز کی بنا پر جہالر سازوں نے BOBBIN-NET مشن کو اختیار کر کے موجد کو مقابلہ کا چیلنج دیا۔ لیکن ہلت کوٹ کی مشن میں خاص اصلاح ہونے سے جن لوگوں کو حق ایجاد دیا گیا تھا وہ واپس لیا گیا اور جب یہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور باہمی تنازع کی وجہ عدالت میں رجوع ہوئے تو عدالت نے ہلت کوٹ کے حقوق تسلیم کئے ہر صناع نے دوسرے کے مقابلہ میں اپنے حق ایجاد کی بد خلت کی نالش کی اس پر جوری نے مدعی علیہ کے موافق فیصلہ کیا اور منصف نے بتلایا کہ ہر دو مدعویہ کلوں سے ہلت کوٹ کے حق ایجاد کی خلاف ورزی ہوتی ہے دوران مقدمہ میں سر جان کوپلے جو (جو لندن میں لارڈ لنڈ ہرسٹ کے نام سے موسوم ہوئے ہیں) اور جو مسٹر ہلت کوٹ کی جانب سے وکیل مقرر ہوئے تھے ایجاد زیر بحث کے جملہ تفصیلی واقعات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے BOBBIN NETMACHINE کو چلانا سیکھا۔ خلاصہ مثل پڑھنے کے بعد انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مقدمہ کی اصلیت ان کے سمجھ میں نہیں آئی لیکن مقدمہ چونکہ انکی رائے میں نہایت اہم تھا اس لئے انھوں نے ناٹنگھم جا کر مشن کے بالمشافہ معائنہ کا ارادہ ظاہر کیا اور جب انھوں نے مشن کا معائنہ کر کے اس کی ساخت وغیرہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تو کہا کہ "میں تمہاری جانب سے حتی الامکان جواب دہی کروں گا" چنانچہ وہ اسی شب میل میں سوار ہو کر ناٹنگھم پہونچے۔ لایق وکیل نے کل کا معائنہ شروع کیا اور جب تک خود اپنے ہاتھوں سے BOBBIN-NET کا ایک ٹکڑا تیار نہ کیا اور مشن کے تمام پرزوں اور اس کی ساخت کے اصول سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کی وہاں سے واپس نہ ہوئے جس وقت مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لایق وکیل عدالت کے روبرو نہایت آسانی اور عمدگی سے BOBBIN-NET کا ایک نمونہ تیار کر دکھایا اور اس ایجاد کی اصلیت کو اس خوش اسلوبی اور عمدگی سے بیان کیا کہ منصف جوری اور تمام تماشائی محو حیرت ہو گئے نیز جس کامل دیانت داری اور راست بازی سے اس نے مقدمہ میں بحث کی اس کا عدالت کے

فیصلہ پر خوب اثر پڑا مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد ہلٹ کوٹ کو بعد دریافت معلوم ہوا کہ اس کے حق ایجاد کی وجہ تقریباً چھ سو شن پر سرکار ہو گئے ہیں مشنوں کے مالکوں سے ہلٹ کوٹ لحق ایجاد کے استعمال کا محصول وصول کرنا شروع کیا جو کافی مقدار میں وصول ہوا لیکن اس سے تور کے صناعوں کو جو منافع حاصل ہوا وہ بہت کثیر تھا اور یہ مشینیں بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگیں لیکن (۲۵) سال کے عرصہ میں تور کی قیمت پانچ پونڈ فی مربع گز سے گھٹ کر تقریباً پانچ پنس ہو گئی اسی زمانہ میں تور کی صنعت کا سالانہ اوسط منافع قریب قریب چار لاکھ اسٹرلنگ (ASTERLEN) ہوا اور تقریباً ۱۵ لاکھ مزدور اس کی وجہ برسر روزگار ہو گئے۔

اب مسٹر ہیت کوٹ کے ذاتی حالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۰۹ء میں ہم اس کو بمقام نوبرج بحیثیت تور کے صناع کے پاتے ہیں وہاں اس کا کاروبار کئی سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا اور کاریگروں کی ایک کثیر تعداد اس کے کارخانہ میں اپنا پیٹ پالتی رہی مزدوروں کو ہفتہ وار انکے کام کی نوعیت کے لحاظ سے پانچ تا دس پونڈ اجرت دیجاتی تھی جدید مشنوں کی ایجاد کی وجہ اگرچہ کہ تور کی صنعت کے کاریگروں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا تاہم کاریگر حلقوں میں یہ کانا پھوسی ہونے لگی کہ یہ مشینیں دستی صنعت پر غالب آگئی ہیں اس لئے ایک زبردست سازش اس مقصد سے کی گئی کہ جہاں کہیں یہ مشین پائے جائیں انھیں تباہ کر دیا جائے۔ سنہ ۱۸۱۱ء کے اوائل میں ناٹنگہم کے جنوب مغربی حصوں ڈربی شیر اور لیسٹرشائر کے اطراف واکناف اور قرب وجوار کے پاٹا بہ بافی کے کارخانوں اور تور کی صنعت میں کام کرنے والے مالکوں اور ملازمین کے مابین تنازعات پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرش فیلڈ میں بمقام ٹن ایک مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور دن دھاڑے صناعوں کی پاتا بہ بافی اور تور سازی کی قیمتوں کو توڑنا شروع کیا بعض سرغنے گرفتار ہوئے اور ان کو سزا دی گئی جس سے غیر متاثر اشخاص ایک حد تک باخبر ہو گئے لیکن جہاں کہیں موقع ہاتھ آیا مخالفین پوشیدہ طور پر مشنوں کو تباہ کرتے رہے مشنوں کی ساخت اس قدر نازک تھی کہ صرف ہتوڑے کی ایک ضرب میں وہ ناکارہ ہو جاتے تھے اور چونکہ مشنوں کی صنعت شہر سے دور علحدہ عمارات اور عموماً خانگی مقامات پر ہوا کرتی تھی اس لئے مخالفین کو ان کی تباہی کے موقع بہت آسانی سے ہاتھ آتے تھے۔ ناٹنگہم کے قرب وجوار میں جو شور وفساد کا مرکز بنا ہوا تھا سازشیوں نے اپنی باقاعدہ جماعتیں قائم کر لی تھیں اور راتوں میں پوشیدہ جلسے منعقد

کرکے مشنوں کی تباہی کے مختلف تدابیر سوچا کرتے تھے ۔ انھوں نے غالباً اعتماد پیدا کرنے کے خیال سے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ جنرل لڈ نامی رہنما کے ماتحت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لڈئیٹ کے نام سے موسوم ہیں ۱۸۱۱ء کے سرما میں بہت سارے مشین تباہ کر دیے گئے جس کی وجہ سخت پریشانی رونما ہوئی اور کاریگروں کی کثیر جماعتیں بے روزگار ہوگئیں اس اثنا میں مالکوں نے اپنی مشنوں کو دیہات اور تنہا مقامات سے شہر میں منتقل کرنا شروع کیا اور انکی مناسب حفاظت کے خیال سے انھیں شہر کے گوداموں میں رکھوایا۔

گرفتار شدہ مفسدین کو معمولی سزائیں دیجانے سے لڈئیٹ کی ہمت بڑھ گئی اور چند ہی روز بعد مشنوں کو برباد کرنے کا جنون از سر نو تازہ ہوکر بہت جلد شمالی اور وسطی صنعتی اضلاع میں پھیل گیا ۔ مفسدین کی جماعت خفیہ طور پر کام کرنے لگی اور اس جماعت کے ارکان سے اس امر کی قسم لیجاتی تھی کہ وہ سازش کے سرغنوں کے اجرا کردہ احکام کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے ۔ عہد شکنی کرنے والوں کو سزائے موت سنائی جاتی تھی ۔ تمام کلیں جن میں پارچہ بافی چھینٹ یا قور سازی کی مشنیں بھی شامل تھیں تباہ کر دی گئیں اور ہنگامہ اور پریشانی کا زمانہ دس سال تک جاری رہا۔ یارک شائر اور لنکا شائر کی گرنیوں پر مفسدہ پردازوں کے مصلح حملے ہوتے تھے اور اکثر موقعوں پر گرنیاں تباہ ہوئیں اور انھیں آگ لگا دی گئی اس لئے فوج اور YEO-MANRY کے ذریعہ انکی محافظت کی ضرورت لاحق ہوئی ۔ گرنیوں کے مالکوں کو موت کی دھمکی دی گئی اکثروں پر زبردست حملے ہوئے اور بعض قتل کر دیے گئے آخر کار قانون کا عمل سختی سے شروع ہوا اکثر مفسد لڈئیٹ گرفتار ہوئے بعضوں کو سولی دی گئی اور کئی سال کے زبردست شور و فساد کے بعد مشنیں توڑنے کے ہنگامے فرو ہوئے

جن صناعوں کے کارخانوں پر لڈئیٹ نے حملہ کیا ان میں BOBBIN-NET مشن کا موجد بھی شامل تھا ۱۸۱۶ء کے گرما میں ایک روز فتنہ انگیزوں کی ایک جماعت مشعلیں لیے ہوئے اس کے کارخانہ میں جو بمقام لوبرو واقع تھا گھس کر اس کو آگ لگا دی جس سے ۲۷ قور سازی کی مشنیں تباہ ہوئیں اور دس ہزار پونڈ سے زائد مالیت کا نقصان ہوا ۔ جماعت کے دس آدمی اس جرم میں گرفتار ہوئے اور آٹھ آدمی قتل کر دیے گئے ۔ مسٹر ہلت کوٹ نے قصبہ والوں کے مقابلہ میں نقصان کی تلافی کا دعویٰ کیا اس دعوے کی مخالفت ہوئی لیکن عدالت نے ہیت کوٹ کی موافقت میں مقدمہ کا تصفیہ کرکے

یہ فیصلہ صادر کیا کہ قصبہ کو ہیت کوٹ کے دس ہزار پونڈ کے نقصان کی تلافی کرنی چاہیے۔ منصفین نے نقصان کی تلافی کی ادائی کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ مسٹر ہیت کوٹ وہ روپیہ شہر تھاٹن میں صرف کرے لیکن ہیت کوٹ نے اس بات سے ناراضی ظاہر کی ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے کاروبار کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ڈیون شائر میں بمقام ٹیورٹن اس کو ایک بڑی عمارت دستیاب ہو گئی جہاں اس سے بیشتر ایک اونی پارچہ بافی کا کارخانہ قائم تھا لیکن ٹیورٹن کی پارچہ کی تجارت کو زوال ہونے سے عمارت خالی پڑی ہوئی تھی اور قصبہ بھی نہایت ابتر حالت میں پڑا تھا۔ مسٹر ہیت کوٹ نے قدیم گرنی خریدی اس کو از سر نو قائم کیا اور اس میں توسیع کر کے پہلے سے زیادہ وسیع پیمانہ پر فیتہ کی صنعت دوبارہ شروع کی اس مقام پر تین سو شخص پوری طرح چالو ہو گئے اور کاریگروں کی ایک کثیر تعداد برسر روزگار ہو گئی اور انھیں معقول اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس نے صرف فیتہ کی صنعت کو ہی جاری نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس سے متعلقہ YARN-DOU-BLING ریشم بافی (SILKSPI-NNING) جال بافی (NET-MAKING) اور FINISHING کی مختلف شاخیں بھی جاری ہو گئیں۔ اس نے بمقام ٹیورٹن ایک لوہا خانہ اور زرعی آلات سازی کے کارخانے بھی قائم کئے جو ضلع کے لئے بیحد مفید ثابت ہوئے۔ اس کا یہ خیال کہ تمام وزنی کاروبار اور ایسے کام جن میں شدید محنت درکار ہو بھاپ کی قوت کے ذریعہ انجام پا سکتے ہیں نہایت مبارک تھا ایک عرصہ تک ہیت کوٹ دخانی ہل ایجاد کرنے کی کوشش میں لگا رہا اور ۱۸۳۲ء میں اس نے اپنی ایجاد کو پایہ تکمیل کو پہنچا کر اس کا حق پیٹنٹ بھی حاصل کر لیا۔ ہیت کوٹ کا ایجاد کردہ ہل اگرچہ کہ اس سے قبل فولر نے دخانی ہل تیار کیا تھا ایسا بہترین آلہ مقرر کیا گیا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔

مسٹر ہیت کوٹ زبردست خداداد قابلیتوں کا آدمی تھا وہ فراست زود فہمی۔ اور اعلیٰ درجہ کی کاروبار میں قابلیت رکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذات میں دیانت اور راستبازی کے وہ صفات جمع ہو گئے تھے جو انسانی کردار کی حقیقی شان ہیں۔ جفاکش اور اپنا معلم آپ ہونے کی وجہ وہ اپنے ہونہار ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کے قابلیتوں کو ابھارا کرتا تھا مصروفیت کے زمانہ میں بھی اس نے فرانسیسی اور اطالوی زبانوں پر حاوی ہونے کی غرض سے تھوڑا وقت بچانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان زبانوں میں اسے کافی معلومات حاصل ہو گئے۔ علم ادب کے

گہرے مطالعہ کی وجہ اس کا دماغ وسیع معلومات کا مخزن بن گیا تھا اور بہت کم مضامین ایسے تھے جن کے ٹھیک اور کافی معلومات اس نے حاصل نہ کئے ہوں اس کے دو ہزار ماتحت کاریگر اس کو اپنا باپ تصور کرتے تھے اور وہ بھی ان کے عیش آرام اور فلاح و بہبود کے ذرائع بہم پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتا تھا۔ مرفہ حالی سے جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے نہ تو اس پر تباہی آئی اور نہ مفلس و جفاکش آدمیوں کے حقوق کی شنوائی کے لئے جنہیں اس کی ہمدردی اور معاونت کا ہمیشہ یقین رہتا تھا اس کے دل کا دروازہ بند ہوا۔ اپنے کاریگروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے اس نے تقریباً ۶ ہزار پونڈ کے صرفہ سے مدرسے تعمیر کروائے۔ نیز اس کی طبیعت فطرتاً زندہ دل اور بشاش واقع ہوئی تھی اور وہ سب میں ہر دلعزیز تھا۔ جو لوگ اس سے بخوبی واقف تھے اس کو بڑی قدر و منزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

۱۸۳۲ء میں ٹیورٹن کے انتخاب کنندوں نے جہاں مسٹر ہیت کوٹ خود کو ایک زبردست اور سچا محسن اور خیر خواہ ثابت کر چکا تھا پارلیمنٹ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا اور تقریباً تیس سال تک وہ ان کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس زمانہ میں لارڈ پامرسٹن اس کے شریک نائب تھے اور انھوں نے ایک سے زائد پبلک موقعوں پر ان کے معزز دوست ہیت کوٹ کی انکی نظر میں جو وقعت اور قدر تھی اس کا اظہار کیا۔ ۱۸۵۹ء میں پیری اور بڑھتی ہوئی کمزوری کی وجہ نمائندگی سے علحدہ ہونے پر اس کے تیرہ سو کاریگروں نے ایک نقروی دواستے اور طلائی قلم بطور تحفہ عطا کیا۔ صرف اور دو سال آرام سے بسر کرنے کے بعد ہیت کوٹ نے ۷۷ سال کی عمر میں جنوری ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا اور اپنی راستبازی صداقت شعاری۔ نیک روی۔ مردانگی اور مکان کی قابلیت کے کردار کی ایسی نظیر چھوڑی جس پر اس کی اولاد بجا ناز کر سکتی ہے۔

اب ہم مشہور لیکن بدقسمت جاکارڈ کی مختلف النوع طرز زندگی کے حالات قلمبند کرتے ہیں جس کی زندگی سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ ادنیٰ درجہ کے لیکن ذکی اور تیز طبع یا زود فہم اشخاص کا بھی قومی صنعت پر اثر پڑتا ہے۔ جاکارڈ لائنس کے محنتی والدین کا بیٹا تھا اس کا باپ ایک جلاہا اور اس کی ماں ایک (PATTERN READER) تھی انتہائی عسرت و تنگدستی کی وجہ ماں باپ جاکارڈ کو معمولی تعلیم دلانے سے بھی قاصر تھے جب اس کی عمر کام سیکھنے کے قابل ہوئی تو جاکارڈ کے باپ نے اس کو ایک صحاف کے پاس ملازم رکھوا یا ایک ضعیف العمر منشی نے جو صحاف کے ہاں محاسب کی خدمت

انجام دیا تھا جاکارڈ کو علم ریاضی کی کسی قدر تعلیم دی چندہی روز میں جاکارڈ کی طبیعت کا رجحان میکانکس کی طرف پایا گیا اور اس کے بعض تدابیر نے ضعیف منشی کو محو حیرت کر دیا منشی نے جاکارڈ کے باپ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی ایسی تجارت میں لگائے جس میں اس کو صحافی کی نسبت اپنی عجیب و غریب قابلیتوں کے اظہار کا موقع مل سکے چنانچہ وہ ایک لوہار (CUTLER) کے پاس بحیثیت کارآموز رکھوایا گیا لیکن اس کے استاد نے اس کے ساتھ ایسا برا برتاؤ کیا کہ جاکارڈ نے چندہی روز میں اس کی ملازمت ترک کر دی اس کے بعد وہ ایک (TYPEFOUNDER) کے پاس ملازم رکھوایا گیا۔

والدین کے انتقال پر جاکارڈ کو اپنے باپ کے پارچہ بافی کے دو (LOOMS) سے مجبوراً چلا ہے کا کام اختیار کرنا پڑا اس نے جلد پرچہ بافی کی مشینوں میں اصلاحات کیں اور اپنے ایجادات میں اس قدر محو ہو گیا کہ اس کے ذہن سے اس کا کاروبار فراموش ہو گیا اور ذرائع آمدنی بہت جلد مسدود ہو گئے۔ ادائی قرض میں اپنی بیوی کی پرورش کی غرض سے اس نے (LOOMS) فروخت کر ڈالے اس پر بھی اس کی مفلسی دور نہ ہوئی قرض خواہوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا پھر ملازمت کی کوشش کی لیکن محنت اکارت ہوئی کیوں کہ لوگ اس کو ایک کاہل شخص سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جاکارڈ اپنے ایجادات کے متعلق صرف خیالی پلاؤ پکانے یا ہوائی بنگلے بنانے میں مصروف رہا کرتا ہے آخر کار ایک (LINEMAKER) کے ہاں اس کو ملازمت مل گئی اور وہ اپنی بیوی کو لائنس میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں اس کی بیوی گھاس کی زنانی ٹوپیاں بنا کر ان سے جو کچھ غیر معین آمدنی وصول ہوتی اس سے زندگی بسر کیا کرتی تھی۔

اس کے بعد جاکارڈ کے چند سال کے حالات کا پتہ نہیں چلتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں وہ رنگین پارچہ کی مفید صنعت کی دہن میں اس کے (DRAWLOOM) کی اصلاح میں مصروف تھا کیوں کہ سنہ ۱۷۹۰ء میں تانے کے تاروں کے انتخاب کے لئے اس نے ایک آلہ تیار کیا جس کو مشین میں لگانے سے ایک (DRAWBOY) کا کام انجام پاتا تھا۔ اس مشین کا استعمال بتدریج لیکن مستقل طور پر ہوتا رہا اور اس کی ایجاد کے دس سال بعد لائنس میں ۴ ہزار مشین بر سر کار پائی گئیں جاکارڈ کی مصروفیتوں میں انقلاب فرانس سے بڑی مزاحمت واقع ہوئی اور سنہ ۱۷۹۲ء میں ہم اس کو لین کے رضاکاروں کے ساتھ کنونشن کی فوج کے مقابلہ میں جو ڈوباش کرانس کے زیر کمان تھی لڑائی میں مصروف پاتے ہیں شہر مفتوح ہونے پر

جاکارڈ وہاں سے روانہ ہوکر ہائن کی فوج میں داخل ہوا جہاں اس نے سرجنٹ کے عہدہ تک ترقی کی۔ وہ سپاہیانہ زندگی ہی بسر کیا ہوتا لیکن اس کا اکلوتا بیٹا گولی لگ کر فوت ہونے سے اس نے ملازمت ترک کی اور اپنی بیوی کی خبر لینے کی غرض سے لائینس کو واپس ہوا۔ گھر پہونچکر اس نے دیکھا کہ بیوی مکان کے بالائی حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہنوز گھاس کی زنانی ٹوپیاں بنانے کی قدیم صنعت میں مصروف ہے جس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا اس وقت اس کا دماغ اُن ایجادات کی جانب جن پر وہ اس سے قبل کئی سال تک غور کر چکا تھا دوبارہ متوجہ ہوا لیکن ان کی تکمیل کے لئے اس کے پاس روپیہ اور وسائل نہیں تھے۔ جاکارڈ نے اب اپنی گوشہ نشینی کی زندگی ترک کرکے کوئی ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کی ایک ہوشیار صناع کے ہاں اس کو ملازمت مل گئی وہ دن میں نوکری کرتا اور رات میں ایجادات پر غور کیا کرتا تھا اس کے دماغ میں یہ بات آگئی (LOOMS) میں منقش اور رنگین سامان کی تیاری کے لئے مزید اصلاحات کئے جاسکتے ہیں۔ ایکروز اتفاقاً اس نے اپنے استاد سے اس واقعہ کا ذکر کرکے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اس کے محدود ذرائع آمدنی اس کے خیالات کی تکمیل میں مانع و مزاحم ہیں۔ خوش قسمتی سے استاد نے اس کے تجویزوں کو پسند کیا اور نہایت فیاضی سے اس کو کچھ رقم دی کہ وہ اپنے فرصت کے وقت اپنے مجوزہ اصلاحات کو عملی جامہ پہنائے۔

تین مہینہ میں جاکارڈ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جو ایک کاریگر کا دشوار اور محنت طلب کام انجام دے سکتا تھا۔ ۱۸۰۱ء میں پیرس کی قومی صنعتی نمائش کے موقع پر یہ آلہ پیش ہوا جس پر جاکارڈ کو ایک پیتلی تمغہ انعام ملا وزیراعظم کارنٹ کی لائینس میں آمد کے وقت جاکارڈ کی اور عزت ہوئی کیونکہ وزیراعظم جاکارڈ سے بالمشافہ ملاقات کرکے اس کو اس کی ایجاد کی کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ آئندہ سال لندن کی آرٹس سوسائٹی کی جانب سے یہ اعلان شائع ہوا کہ جو شخص جہازوں کے لئے (FISHING-NETS) اور (BOARDIND-NETS) بنانے کی مشین ایجاد کرے اس کو ایک تمغہ عطا کیا جائے گا۔ جاکارڈ نے یہ خبر سنی اور ایک روز حسب عادت سیر و تفریح کرتے وقت اس نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا اور اس قسم کی ایک مشین تیار کرنے کی تدبیر سوچی اس رفیق صناع نے اس کے خیال کو عملی جامعہ پہنانے کی غرض سے دوبارہ ذرائع بہم پہنچائے اور تین ہفتہ کے اندر جاکارڈ کی ایجاد مکمل ہوگئی۔

جاکارڈ کے ایجاد کردہ مشین کی خبر جب اس محکمہ کے افسر کو ہوئی تو جاکارڈ کو محکمہ میں طلب کیا گیا اور جب اس نے مشین چلانے کی ترکیب بتلائی تو اس کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کی جاکر شہنشاہ کے پاس روانہ کی گئی جس کی بنا پر موجد کو معہ اس کی مشین کے پیرس طلب کیا جاکر شہنشاہ کے روبرو پیش کیا گیا شہنشاہ نے اس کے شایان شان استقبال کیا دو گھنٹہ تک جاکارڈ کی شہنشاہ سے گفتگو ہوتی رہی جس کے دوران میں شاہی مروت واخلاق کے برتاؤ کی وجہ جاکارڈ نے بادشاہ سے اُن اصلاحات کا تذکرہ کیا جو وہ رنگین سامان بننے کے لئے (LOOMS) میں کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو بمقام کنزرویٹری ڈس آرٹس اٹ میٹرس چند کمرے دے گئے جہاں وہ ان کمروں سے اپنے قیام کے زمانہ میں کارخانہ کا کام لیتا رہا نیز اس کو گذر اوقات کے لئے معقول الونس بھی ملتا تھا۔

کنزرویٹری میں اطمینان سے کاروبار قائم کرنے کے بعد جاکارڈ نے اپنے مرمہ (LOOMS) کے ضروری اشیاء کو مکمل کرنا شروع کیا وہاں اس کو مشین کے ان مختلف باریک اور نازک پرزوں کے گہرے معائنہ کا موقع ہاتھ آیا جو انسانی فراست کے اس بڑے خزانے میں موجود تھے۔ جن مشینوں کی جانب خاص طور پر اس کی توجہ مبذول ہوئی اور بالآخر وہ تحقیق میں مصروف ہو گیا اُن میں مشہور (AUTOMATON-MAKER) کے موجد واکان سن کی تیار کردہ پھول دار ریشم کاتنے کی مشین بھی شامل تھی۔

واکان سن ایک اعلیٰ درجہ کی ایجادی قابلیت والا آدمی تھا اس کی قوت ایجاد کا وہ عالم تھا کہ وہ ایک فطری جذبہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور کسی سبب سے رک نہ سکتی تھی یہ مقولہ کہ شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوتا ہے نہ کہ مشق کے ذریعہ اس موجد پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے جو اگرچہ کہ شکل دوسروں کے تربیت اصلاحات و ترقیات میں دوسروں کا رہین منت کیوں نہ ہو خاصکر اپنے ذاتی جذبہ کی تکمیل کے لئے سخت جدوجہد کر کے جدید مشین تیار کرتا ہے واکانس کی حالت بجنبہٖ ایسی ہی تھی کیوں کہ واکانس کی ایجادات جس قدر کہ ان کی عجیب و غریب ساخت اور عمدگی میں مشہور ہوئے اس قدر ان کے فوائد میں مشہور نہیں ہوئے بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ اتوار کا دعا سننے کے لئے گرجا جایا کرتا تھا تو آتشی دیوار کے شگافوں میں سے متصلہ حجرہ کی گھڑیال کی حرکتوں کو دیکھ کر جی بہلایا کرتا تھا اس نے ان حرکات کے سمجھنے کی کوشش کی اور کئی ماہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے بعد گھڑی کے پرزوں کا اصول دریافت کیا اس وقت سے واکانس میکانکی ایجادات کی دھن میں منہمک رہتا تھا خود کے تیار کردہ چند

بھدے اوزاروں سے اس نے ایک چوبی گھڑی تیار کی جو بالکل ٹھیک وقت بتلاتی تھی اس کے علاوہ اس نے ایک چھوٹے گرجا کے لئے چند فرشتوں کے اشکال تیار کئے جن کے بازو ہلا کرتے تھے اور بعض بلیوں کے مورتیں بھی بنائے بعض دیگر خود رو آلات تیار کرنے کے خیال سے جن کا خاکہ اس نے پیشتر ہی سے ذہن میں قائم کر رکھا تھا واکانس نے علم تشریح، علم موسیقی۔ اور علم جر ثقیل کا مطالعہ کیا جس میں اس کے کئی سال گزرے۔ تولیریں کے باغ میں بانسری نواز کو دیکھکر اس کے دل میں ایک ایسی ہی مورت تیار کرنے کا جوش پیدا ہوا اور کئی سال کے مسلسل مطالعہ اور محنت کے بعد اگرچہ کہ وہ بیمار ہوگیا حصول مقصد میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک (FLAGEOLOT-PLAYER) کی شکل تیار کی اور پھر ایک بطخ تیار کیا جو اس کی بہترین ایجاد تھی۔ یہ بطخ اصلی اور جاندار بطخ کی طرح تیرتی، غوطے مارتی۔ پانی پیتی اور بڑبڑاتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈکوری ایجاد کی جس سے کلوپٹرا کے غمناک واقعہ میں کام لیا گیا اور جو اژدہ اس کے پہلو میں اُچھلا کرتی تھی۔

واکانس نے اپنی کوششوں کو صرف خود رو آلات کی ایجاد تک محدود نہیں رکھا۔ اس کی فہم و فراست کی وجہ کارڈنل ڈی فلوری نے اسے فرانس کے ریشم کے کارخانوں کا ناظر (INSPECTIR) مقرر کیا اور جوں ہی اس نے اس شعبہ میں قدم رکھا اپنی ناقابل روک قوت ایجاد سے ریشم کی کلوں میں اصلاحات کرنا شروع کیا ان میں سے ایک اصلاح (THROWN-SILK) سے متعلق تھی اس سے لائینس کی کاریگر اس قدر مشتعل ہوگئے کہ انھوں نے اس ایجاد کی وجہ اپنی ملازمت ترک ہو جانے کے احتمال سے اسکو سنگ باری کی اور طرح طرح کے ایذائیں پہنچائے اس پر بھی اس نے اپنا کام جاری رکھا اور پھولدار ریشم بننے کی ایک مشن ایجاد کی جس میں دھاگہ صاف اور درست کرنے کے لئے ایک جدید پرزے کا اضافہ کیا گیا تھا تاکہ ریشم کا ہر لچھا مساوی موٹائی کا ہو۔

طویل علالت کے بعد ۱۷۸۲ء میں جب واکانس کا انتقال ہوا تو اس نے اپنی تمام مشین ملک کے لئے بطور ترکہ چھوڑیں ملک نے ان کی کچھ قدر نہ کی اس لئے وہ بہت جلد ابتر ہوگئیں لیکن خوش قسمتی سے اس کی پھولدار ریشم بننے کی مشن بمقام کنزرو ویٹری ڈس آرٹس اٹ میٹرس محفوظ رہ گئی تھی۔ اور وہاں واکانس کے دیگر عجیب و غریب اور مفید آلات کے ذخیرہ میں جاکارڈ کے ہاتھ لگی یہ مشن جاکارڈ کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئی کیوں کہ اپنی مرمہ مشن میں جاکارڈ جو خاص ترمیم کرنا چاہتا تھا اس

اس کو فوراً مہ دملی۔

واکانس کی مشین کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں ایک بیلن (CYLINDER) لگی ہوئی تھی جب اس کو گھمایا جاتا تو اس سے بعض سوئیاں حرکت میں آجاتیں اور تانے کے تار اس طرح چلتے تھے کہ اس سے ایک مجوزہ معمولی نمونہ تیار ہو جاتا تھا۔ جاکارڈ نے دلچسپی سے اس بات کو ذہن نشین کرلیا اور ایک سچے موجد کے سے جوش کے ساتھ فوراً اس کی اصلاح و ترقی دینے کی کوشش شروع کی ایک ماہ کے بعد اس کی پارچہ بافی کی مشین مکمل ہوگئی۔ واکانس کے بیلن (CYLINDER) میں جاکارڈ نے وصلی (PASTEBOARD) کے ایک لامتناہی (ENDLESS) ٹکڑے کا اضافہ کیا جس میں کئی سوراخ ہوتے تھے اور جس میں سے تانے کے تار چلائے جاتے تھے کو بہ آسانی دکھائی دیتے ہوتے تھے اور مشین کے دوسرے پرزے سے کام کرنے والے کو مشین چلتے وقت اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کس رنگ کا وقتاً فوقتاً (SHUTTLE) استعمال کرنا چاہیئے۔ اس طرح (DRAWBOY) اور (READER OF THE DESIGNS) کے کام پر مشین کو فوراً سبقت حاصل ہوگئی۔ جاکارڈ نے اپنی جدید پارچہ بافی کی مشین سے پہلا استعمال یہ کیا کہ اس سے کئی گز قیمتی پارچہ تیار کرکے ملکہ جوزفین کو بطور تحفہ پیش کیا۔ نپولین نے اس موجد کی کوششوں کے ثمرات سے بے حد خوش ہو کر حکم دیا کہ جاکارڈ کی ایجاد کردہ مشین کی سی کئی کلیں ماہر کاریگروں کے ہاتھ سے تیار کروائی جا کر اس کے روبرو پیش کئے جائیں اس کے بعد جاکارڈ لائنس روانہ ہوا۔

وہاں اس نے دیکھا کہ موجدوں کو قسمت آزمائی کا موقع شاذ و نادر ہاتھ آتا ہے لوگ انکو دشمن سمجھنے لگے اور جس قسم کا برتاؤ کے۔ ہارگریویس۔ اور آرک رائٹ کے ساتھ لنکا شائر میں ہوا تھا۔ اسی قسم کا برتاؤ یہاں جاکارڈ کے ساتھ کیا گیا۔ کاریگروں نے مشین کو اپنی صنعت کے لئے سم قاتل خیال کیا اور انھیں خوف ہوا کہ مبادا اس سے ان کا ذریعہ معاش فوراً مسدود نہ ہو جائے بمقام پلیس ڈس ٹیروکس ایک فتنہ انگیز جلسہ منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ کلوں کو تباہ کر دیا جائے لیکن فوج کے ذریعہ اس ہنگامہ کی روک تھام کی گئی اس پر بھی جاکارڈ کو لعنت ملامت کیا گیا اور اس کی ایک شبیہ تیار کیجا کر اس کو سولی دی گئی اور اس طرح جاکارڈ کو موت کی دھمکی دی گئی۔ کونسل کی جانب سے بھی اس فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بے فائدہ ثابت ہوئی کیونکہ کونسل پر بھی لعنت ملامت کی گئی۔ آخر کار مفسدوں نے جن میں اکثر کاریگر بھی شامل تھے جاکارڈ کی ایک مشین کو علانیہ پارہ پارہ کر دیا اس کے بعد ہنگاموں کا سلسلہ جاری رہا ایک ہنگامے میں ایک غضب آلود مجمع نے جاکارڈ کو غرق کرنے کے ارادہ سے سمندر کے

گھاٹ کی طرف گھسیٹا لیکن اس نے بڑی دقت سے اس مصیبت سے نجات پائی۔

جاکارڈ کے مشن کی عمدگی کے متعلق کسی کو انکار نہیں اور اس کی کامیابی محض ایک موقتی بات تھی
ریشم کی صنعت کے بعض انگریز صناعوں نے جاکارڈ کو انگلستان چل کر وہاں قیام کرنے کی ترغیب دی لیکن
شہر کے لوگوں کے سخت اور ظالمانہ برتاؤ کے باوجود اس نے یہ بات نہ مانی کیونکہ اس کی حب الوطنی نے اس کو
اس امر کی اجازت نہیں دی۔ غرض انگریز صناعوں نے اس کی مشن کو استعمال کیا جب باشندگان لائنس کو
اپنے کاروبار میں بیٹھے رہنے کا خوف ہوا تو انھوں نے جدید مشن کو نہایت مسرت کے ساتھ استعمال کیا اور تھوڑے
عرصہ میں جاکارڈ کی مشن تقریباً ہر قسم کی پارچہ بافی میں استعمال ہونے لگی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ
کاریگروں کے دلوں سے دہشت بالکل دور ہوگئی روزگار کو کم کرنے کے بجائے جاکارڈ کی مشن نے اس میں
دس گنا اضافہ کردیا۔ ایم لیون فاچر نے لائنس کے نقشی سامان کی صنعت کا کام کرنے والوں کی سنہ ۱۸۳۴ء میں
جو تعداد بتلائی ہے وہ ساٹھ ہزار ہے اس تعداد میں آئندہ معتد بہ اضافہ ہوا۔

جاکارڈ کی باقی زندگی امن و آرام سے بسر ہوئی۔ جن کاریگروں نے جاکارڈ کو غرق کرنے کی نیت سے
جس راستہ سے گھاٹ تک گھسیٹا تھا انھوں نے چند ہی روز بعد اس کی سالگرہ کی تہنیت میں تزک و احتشام کے ساتھ اسی
راستہ سے لیجانے کی خواہش ظاہر کی لیکن جاکارڈ کی (MODESTY) نے اس کو ایسے جلوس میں شرکت کی اجازت
نہیں دی۔ لائنس کی مجلس صفائی کی جانب سے اس کو ہدایت ملی کہ مقامی صنعت کو فائدہ پہنچانے کے
خیال سے وہ خود کو اپنی مشن کی اصلاح کے لئے وقف کر دے جس پر جاکارڈ نے ایک قلیل وظیفہ کے خیال سے
جس کی تعداد خود اس نے معین کر لی تھی رضامندی ظاہر کی چنانچہ جاکارڈ اپنی مشن کو مکمل کرنے کے بعد باقی
ماندہ زندگی بسر کرنے کی غرض سے اپنے باپ کے وطن آولین کو چلا گیا اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی
سنہ ۱۸۲۲ء میں اس کو لیجن آف آنر کا تمغہ ملا اور سنہ ۱۸۳۴ء میں فوت ہو کر وہیں مدفون ہوا۔ اس کی یادگار
میں ایک مورت (STATUE) تعمیر کی گئی اس کے پسماندے مفلسی کی حالت میں رہے اور جاکارڈ کی وفات
کے بیس سال بعد اس کے دو بھتیجوں کو مجبوراً اس طلائی تمغہ کو جو لوئی (۱۸ویں) نے ان کے چچا کو عطا کیا تھا چند
صد فرانکس کے معاوضہ میں فروخت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے کہ "لائنس کے
صنعتی حلقوں نے ایک ایسی ہستی کے ساتھ جس کا قصبہ لائنس اپنی شان و شوکت کے لئے رہین ہے ایسا سخت برتاؤ کیا
شہید موجدوں کے فہرست تذکرے کرتا اور مذکورہ بالا قسم کے دیگر ممتاز ہستیوں کے بے شمار نام گنواتا

جنھوں نے بلا کسی ذاتی مفاد کے اپنے زمانہ کی صنعتی ترقی میں حصہ لینا بہت آسان ہے کیوں کہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ قابل دماغوں نے کسی کام کی بنیاد قائم کی اور کاہلوں نے اسکے ثمرات سے فائدہ اٹھایا لیکن فی الحال حال کے ایک موجد کے کچھ مختصر حالات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ صنعتی کام کرنے والوں کو اکثر و بیشتر کن مشکلات اور ناکامیوں پر غالب آنا پڑتا ہے مثال کے طور پر (COMBING-MACHINE) کے موجد جوشوا ہیلمن کے حالات قلمبند کئے جاتے ہیں۔

ہیلمن السا کے کپاس کی صنعت کے خاص مرکز ملہاؤس میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا اس وقت اس کا باپ کپاس کا کاروبار کیا کرتا تھا جوشوا نے بھی پندرہ سال کی عمر میں یہی کاروبار شروع کیا۔ دو سال تک یہ کام کرتا رہا جس کے دوران میں اس کا فرصت کا وقت میکانکی نقشہ کشی میں صرف ہوتا رہا اس کے بعد اس نے دو سال اپنے چچا کے (BANKINGHOUSE) میں گزارے جہاں وہ شام کے وقت علم ریاضی کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس کے بعض رشتہ داروں نے بمقام ملہاؤز کپاس کاتنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا اس کارخانہ کا عملی کام سیکھنے کی غرض سے نوجوان ہیلمن پیرس میں مسرس لٹنٹ اینڈرے کے پاس چھوڑ دیا گیا اسی زمانہ میں وہ کنزرویٹری ڈس آرٹس اٹ میرز کا طالب علم بن گیا جہاں وہ لکچر سنا کرتا اور عجائب خانہ کی مشنوں کا معائنہ کیا کرتا تھا ایک کھلونے ساز سے اس نے (TURNING) کا عملی سبق بھی حاصل کیا اسطرح اس پیشہ پر پوری طرح حاوی ہو کر کچھ عرصہ بعد ویکس تھان کے نئے کارخانے کے لئے مشن کی تیاری کی غرض سے "السا" واپس ہوا یہ مشن چند ہی روز میں مکمل ہو گئی اور اس سے کام لیا جانے لگا اتفاق سے ایک تجارتی (CRISIS) رونما ہوا جس کا کارخانہ کے کاروبار پر گہرا اثر پڑنے سے کارخانہ دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا اور ہیلمن کو ملہاؤس واپس ہونا پڑا۔

اس اثنا میں وہ اپنا فرصت کا بہت سا وقت ایجادوں میں صرف کرتا رہا اور اس کی توجہ خاص کر کپاس بننے کی مشن اور کتائی کے رشتہ کی تیاری کی جانب مبذول رہی اس کے ابتدائی ایجادات میں سے ایک ایجاد (EMBRIDERING-MACHINE) سے متعلق تھی اس میں بیس سوئیاں لگائی گئی تھیں جو ایک ساتھ چلتی تھیں تقریباً چھ ماہ کی کوشش کے بعد ہیلمن اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اس ایجاد کے صلہ میں جسے اس نے ۱۸۳۴ء کی نمائش میں پیش کیا ایک طلائی تمغہ ملا اور لیجن آف آنر کا اعزاز بھی حاصل ہوا اس کے بعد ایک مرمہ (LOOM) پارچہ ناپنے اور تہ کرنے کی مشن۔ انگریز جلاہوں کی "BOBBIN-ANDFLY-FRAMES"

کا ایک مرمہ نمونہ اور بانا لپیٹنے کی مشن جس میں ریشم اور کپاس کاتنے۔ بننے اور تیار کرنے کے لئے کئی اصلاحات کئے گئے تھے۔ یہ تمام مشین بہت جلد معرض وجود میں آئیں اس کی بہترین ایجادوں میں سے ایک مشین وہ تھی جس میں مخمل یا دیگر لپٹنے دار پارچہ کے دو ٹکڑے ایک ساتھ بنے جا سکتے تھے اور جو مشن میں لگے ہوئے چاقو اور (TRAVERSING-) APPARATUS سے ہر دو پارچے بنے جانے کے بعد جدا ہو جاتے تھے۔ ہیلمن کی ایجادوں میں سب سے زیادہ خوش وضع اور قابل قدر ایجاد (COMBING-MACHINE) تھی جس کے حالات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

ہیلمن چند سال تک لمبے ریشے دار کپاس کی صفائی کے لئے ایک مشن کی ایجاد پر غور کرتا رہا کیونکہ کتائی کے لئے خام پیداوار اور صفائی کی معمولی مشن خاصکر عمدہ سوت کی تیاری کے لئے غیر موزوں ثابت ہوئی نیز اس میں بہت سا وقت ضائع ہوتا تھا ان تمام خامیوں کے رفع کرنے کے لئے السالک کے سوتی پارچہ بافوں نے اعلان کیا کہ ایک مرمہ (COMBING-MACHINE) تیار کرنے والے کو پانچ ہزار فرانکس کا انعام دیا جائے گا ہیلمن نے فوراً اس انعام کے حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اس کو اس کے ذریعہ نفع کی خواہش نہ تھی کیونکہ اسکے پاس اس کی بیوی کی معقول جائداد ہاتھ لگنے سے کافی روپیہ موجود تھا اس کا یہ قول تھا کہ "ایسا شخص جو ہمیشہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرے کہ فلاں کام سے مجھے کس قدر نفع حاصل ہوگا کبھی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتا" محض اس کے زبردست شوق ایجاد کا باعث تھا کہ ہیلمن نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اس کے شوق ایجاد کی یہ حالت تھی کہ جوں ہی کوئی صنعتی مسئلہ اس کے پیش نظر ہوتا وہ فوراً اس کا حل نکال لیتا موجودہ مسئلہ اس کی توقع کے خلاف نہایت پیچیدہ اور مشکل تھا کئی سال تک وہ اس مسئلہ کے گہرے مطالعہ میں مصروف رہا اور اس سلسلہ میں اس کو جو مصارف برداشت کرنے پڑے وہ اس قدر زبردست تھے کہ اس کی بیوی کی جائداد اس کے نذر ہو گئی اور مشن کو مکمل کئے بغیر ہیلمن مفلسی کا شکار ہو گیا۔ اس وقت سے اپنی ایجاد کی تکمیل کے لئے اس کو زیادہ تر اپنے دوستوں کی امداد پر بھروسہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

ہنوز مفلسی اور تکالیف کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی جس کو اپنے خاوند کی بربادی کا یقین ہو گیا تھا انتقال کر گئی اس کے بعد ہیلمن انگلستان روانہ ہوا اور کچھ دنوں مانچسٹر میں مقیم رہا۔ یہاں بھی وہ اپنی مشن کا کام کرتا رہا مشہور کل ساز شارپ رابرٹ کمپنی کے توسط سے اس نے اپنے لئے ایک مشن تیار کروایا لیکن اس سے بھی اطمینان بخش کام نہیں لیا جا سکتا تھا آخر میں وہ بالکل مایوس ہو گیا۔ اپنے خاندان سے ملنے کی غرض سے فرانس واپس ہوا اس کو ہنوز اپنے مشن کی دھن لگی ہوئی تھی اور اس کا دماغ بھی اسی میں محو رہا کرتا تھا ایک روز

جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا موجدوں کی بدنصیبی اور ان مصائب پر جن میں ان کے موجدوں کے خاندان اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں غور کر رہا تھا تو اس نے اپنی بیٹیوں کو اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کرتے اور انگلیوں میں کھینچتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے اس کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ اگر وہ لمبے بالوں میں کنگھی کرتے اور چھوٹے بالوں کو کنگھی الٹ کر پیچھے ہٹانے کی ایک مشین میں نقل اتارنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو دشواری سے نجات حاصل ہو جائے گی یہ امر قابل یادگار ہے کہ ہیلمن کی زندگی کے اس واقعہ کی مسٹر المور۔ آر۔ رے نے ایک خوبصورت تصویر اتاری ہے جو ۱۸۹۳ء کی رائل اکاڈمی کی نمائش میں بتلائی گئی تھی۔

وہ اسی ذہن میں لگا رہا حتیٰ کہ مشین کے ذریعہ (COMBING) کا طریقہ ایجاد کیا جو بظاہر آسان معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت میں نہایت پیچیدہ اور نازک تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ایجاد کی عجیب و غریب خوبی صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے مشین کو چلتے وقت دیکھا ہے مشین چلتے وقت اس کی حرکات جو بالوں میں کنگھی کرنے کے مشابہ ہیں اور جس کو دیکھکر ہیلمن کے دماغ میں مشین کے ایجاد کا خیال پیدا ہوا نظر آتے ہیں مشین کے متعلق کہا گیا ہے کہ "مشین بجنسہٖ انسانی انگلیوں کی سی نزاکت سے کام کرتی ہے"۔ مشین کپاس کے لٹ کو ہر دو کناروں پر صاف کرتی تاروں کو ٹھیک اور ایک دوسرے کے متوازی رکھتی لمبے تاروں کو چھوٹے تاروں سے جدا کرتی اور لمبے تاروں کو ایک (SLIVER) اور چھوٹے تاروں کو دوسرے (SLIVER) میں باہم جوڑ دیتی ہے حقیقت میں مشین صرف انسانی انگلیوں جیسی نفاست اور نزاکت ہی سے کام نہیں کرتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ نہایت پھرتی سے کام کر رہا ہے۔

اس مشین کی بڑی تجارتی خوبی یہ تھی کہ اس کی وجہ نہایت معمولی درجہ کا کپاس بھی نفیس کتائی (SPINNING) کے قابل ہو جاتا تھا اس کی وجہ وستکاران صناع قیمتی پارچوں کے لئے نہایت موزوں ریشے منتخب کرتے اور اعلیٰ درجہ کا سوت کثیر تعداد میں تیار کرتے تھے اس مشین کے ذریعہ دھاگہ ایسا عمدہ تیار ہوتا تھا کہ ایک پونڈ تیار شدہ کپاس سے ۳۳۴ میل لمبائی کا پارچہ بنا جا سکتا تھا اور اس ترکیب سے اعلیٰ درجہ کی قوم بننے کے بعد ایک شلنگ کی مالیت کا کپاس استعمال میں آنے سے قبل ۳۰۰ تا ۴۰۰ اسٹرلنگ کی قیمت کا ہو جاتا تھا۔

انگریز کپاس کاتنے والوں نے فوراً ہیلمن کی ایجاد کردہ مشین کی خوبی اور اس کے فوائد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا لنکا شائر کے چھ کارخانوں نے متفق ہو کر انگلستان کے واسطے کپاس کاتنے کی غرض سے ۳۰ ہزار پونڈ میں ایک مشین خریدی۔ اون کاتنے والوں نے اون کے کام میں استعمال کے خیال سے اتنی ہی قیمت پر

اس متن کو خریدا اور مسز مارشل لیڈیس نے سن کے کام میں استعمال کرنے کی غرض سے اس متن کے ۲۰ ہزار پونڈ ادا کئے اس طرح لیکا یک غریب ہیلمن کے پاس وافر دولت جمع ہوگئی لیکن اس سے مستفید نہ ہو سکا۔ اس کی طویل اور مسلسل محنت ہنوز بار آور ہونے نہ پائی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا بھی جو باپ کے مشکلات اور ناکامیوں میں شریک رہ چکا تھا باپ کی وفات کے چند روز بعد راہی ملک عدم ہوگیا غرض ایسی ہی ہستیوں کے ایثار کی بدولت تہذیب انسانی کے عجائب حاصل ہوئے ہیں۔

عشق ہے دل لگی نہیں

(مولانا عبدالقدیر حسرت صدر شعبہ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ)

جلوۂ حسنِ دلربا کوئی ہمیں دکھائے کیوں — لیکے ہمارے دل کو پھر پردہ میں منہ چھپائے کیوں

کس کو سکھا رہے ہو جاؤ، ہاں یہ ذرا مجھے بتاؤ — تم کو اگر نہیں لگاؤ، سامنے میرے آئے کیوں

کھو کے حواس اب ہوا تم کو یقیں مرا کہا — سامنے آئینہ کے تم دیکھنے خود کو آئے کیوں

عشق ہے دل لگی نہیں، کھیل نہیں ہنسی نہیں — دل کو خود اپنے ہاتھ سے دیکھیے یہ ہارئے کیوں

عشق ہے عیش بندگی، اس میں ہو سرفگندگی — یاں تو سوائے لفظ ہاں کوئی نہ لب پہ لائیے کیوں

سارے جہاں کو رو چکے، نام و نمود کھو چکے — جان سے جو گزر چکے، اس کو کوئی ڈرائے کیوں

حسرت بے نوا ہے یہ مورد صد بلا ہے یہ — ایسے ستم رسیدہ کو کوئی بھلا ستائے کیوں

فارسی ادب اور اس کا ایک گمنام شاعر

(از جناب محمد معین الدین صاحب جوہر فاروقی دارالعلوم ہائی اسکول حیدرآباد)

مضمون ذیل میں پہلے فارسی ادب کا مختصر ارتقاء ۔ اور اس کے بعد ہم ایک قدیم شاعر کو ناظرین سے روشناس کرائیں گے ۔

عموماً اہل مغرب کی نظروں میں اکثر مشرقی چیزیں بے وقعت و کم درجہ ہوتی ہیں ۔ ان کے خیال میں خود کی ادب و انشا کے سوا کسی زبان کے ادب و انشاء کی کچھ ہستی نہیں لیکن پھر بھی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ "فارسی زبان تمام مشرقی زبانوں میں نہایت وسیع اور شیریں زبان ہے"۔

بے شک اس زبان میں لاتعداد شعراء گزر چکے ہیں ۔ جتنے دواوین اس زبان میں مرتب کئے گئے ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں ۔ اور نہ آج تک اس کے شاعروں کا کوئی شمار ہے ۔

خاندان آل سامان کے عہد حکومت تک فارسی شاعری کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا فارسی ادب کے مورخوں کے بیان کے مطابق عباس مروزی اس زبان کا پہلا شاعر قرار دیا گیا تھا ۔ اور چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس نے خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں اپنا ایک قصیدہ پیش کیا تھا ۔ اور خود بادشاہ بھی کچھ کچھ فارسی حرف آشنا ہو گیا تھا ۔ اس لئے اس نے اس قصیدے کے صلے میں ایک ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے ۔

لیکن تحقیقات جدیدہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں فارسی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ابو حفص حکیم سغدی موجود تھا ۔ اور اس کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دودا ۔ وندارد و یار بے یار چگونہ بودا

ایران پر پرچم اسلام لہرانے کے بعد اس کے علم ادب میں ایک زبردست جزر پیدا ہوا ۔ رفتہ رفتہ عربی کا اثر پڑتا گیا ہے ۔ اور زبان ایک نئی صورت اختیار کرتی گئی ۔ یہاں کے گورنر عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ تمام عجمی زبان کی کتابیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور انھیں جلا دیا جائے ۔ اس لئے اہل فارس میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا نہ ہو سکا ۔ اور دو سو برس تک بالکل ہی مفقود رہی ۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اس پر کافی روشنی ڈالی ہے شعرالعجم کی پہلی جلد میں تذکرۃ الشعرا کی یہ عبارت نقل کی ہے " اور یہ کتاب شاہ نصیرالدین قاچار کے عہد حکومت میں تصنیف ہوئی تھی ۔"

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیان را عرب سوختند۔ از کتب قدیمہ خبرے بر جا نگذاشتند۔ الا قلیلے کہ پنہاں داشتند۔ چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدۂ سخن و شعر متروک شد۔ تا مدتے گذشت و اوضاع دیگر گشت"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دو سو برس تک شعر و شاعری کیوں بند رہی۔ ولید کے عہد حکومت میں لوازم سلطنت کی حیثیت سے اس نے پھر دوبارہ جنم لیا لیکن دارالسلطنت کی زبان عربی تھی اس لئے زیادہ تر عربی شاعری کا زور اور چرچا رہا۔

خاندان سامانیہ کی سرپرستی نے فارسی شاعری کو دفعتاً آسمان پر چڑھا دیا چنانچہ رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا پروردہ تھا۔ اب قدیم فارسی سے صرف ژند کے کچھ آثار باقی ہیں۔ یہ مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی۔ اس ژند زبان کی دو بولیاں تھیں۔ جو جناب رسالت مآب سے آٹھ سو برس پیشتر فنا ہو چکی تھیں۔ مگر چند عرصہ قبل کسی اطلاع سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بیتیوں پر اور دیگر مقامات پر اس کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں جو خط پہلوانی میں پتھروں پر کندہ کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلے جس ہستی نے فارسی زبان کو آمیزش سے پاک بنانے کی کوشش کی اور اس کو ایک مستقل زبان کی حیثیت دی وہ دقیقی کی ذات ہے اس کے کسی شعر میں کہیں عربی کا لفظ نہیں آیا۔ اس کے بعد فردوسی انوری و سعدی جیسی اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوئیں اور رفتہ رفتہ زبان بھی خوب ترقی کرتی گئی۔

مسلمان فاتحین جس وقت ہندوستان داخل ہوئے تھے۔ اُن کی زبان فارسی تھی رفتہ رفتہ انکے قدم جمتے گئے۔ اور مفتوحین کو بھی فاتحین کی زبان سیکھنی پڑی۔ دور مغلیہ میں اس زبان کو خوب عروج حاصل ہوا اور ایک دو صدی گزر جاتے تو ضرور بالضرور یہ زبان ہندیوں کے لئے بھی مادری حیثیت اختیار کر لیتی۔

مغلیہ تاجداروں کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ علاوہ ہند کے دربار ایران سے خوش گو اور باکمال شعراء جو نمود کے حاصل کرتے ہی ہندوستان کا رُخ کرتے۔ اور مغل شاہنشاہوں کی درگاہ بھی انکی قدر دانی کرتی تھی بیش بیش اور کثیر رقومات سے حوصلہ افزائی کیا کرتی۔ اسی عہد میں ایران میں صفوی خاندان برسر اقتدار تھا لیکن اس نے فارسی کی ترقی کی طرف ایسی دلچسپی نہیں لی۔ جیسا کہ ہندوستان میں لیجا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہو رہا تھا کہ ایران میں جہاں کہیں اچھا شاعر پیدا ہوتا ہند اس کو دربار عجم ہی سے نہیں بلکہ مملکت ایران سے چھین لیتا۔ اس زمانے کے خود ایرانی تذکرے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلسل تین چار

صدیوں تک یہی حالت رہی۔ ادھر ہندوستان میں فارسی دربار سے نکل کے عام کے زبان پر جاری ہو چکی تھی۔ سرکاری کاروبار اور امور مملکت کے علاوہ عوام کی ضروریات زندگی بھی اسی میں طے پاتی تھیں اس کو اس درجہ ترقی ہوئی کہ مسلمان تو مسلمان ہندوؤں نے بھی فارسی میں غزلیں لکھنی شروع کر دیں۔ اور ہزاروں نے اپنے دواوین مرتب کر کے فارسی علم ادب کے خزانے میں امانت رکھوا دیے۔

خاندان تیموریہ کے زوال کے ساتھ ساتھ اور مغربی اقوام کے ہند پر تسلط سے۔ اور اردو زبان کی ترقی سے اس کا اثر روز بروز گھٹتا گیا۔ یہاں تک کہ دربار سے نکلی۔ اور پھر دفاتر سے اور پھر عوام سے چھوٹ کے ہندوستان سے غائب ہو گئی۔ لیکن اب بھی کچھ کچھ نشان باقی ہیں۔

اور ہندیوں نے ابھی تک اس کا دامن پکڑے رکھا ہے۔ اس کو مدارس اور کالجوں کے کورس میں داخل کر لیا ہے۔ ہندوستان کا ایک فارسی ادیب اور ماہر آج ایران کی مروجہ جدید زبان کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ یہاں کے ماہر سعدی و حافظ کے زمانہ کی انشا پردازی و نظم و نثر کے مقلد ہیں اور وہ بالکل جدید ایرانی سے ناواقف ہیں۔ ایک ایرانی ہند کی مروجہ فارسی کو بمشکل سمجھ سکیگا۔ اور ایک ہندی مروجہ فارسی جدید کو ایک ایرانی سے یا اور کسی ذریعہ سے بغیر سیکھے ہوئے نہیں سمجھ سکتا۔

ایک مرتبہ مجھے رقعات عالمگیری کی ضرورت پڑی۔ اس کے لئے میں نے اپنے والد کی ساری کتابیں الٹ پھیر کیں۔ اثنا تلاش و جستجو میں مجھے ایک کتاب ملی۔

اس کتاب کے شروع صفحے پر "دیوان احسان" لکھا ہے۔ اور ایک صاحب کی مہر ہے۔ جس میں یہ نام لکھا ہے۔ محمد علی حسین خاں تاج الامرا اور اس پر ۱۲۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔ ہر غزل میں شاعر نے اپنا تخلص احسان ہی کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس کا پورا نام معلوم نہ ہو سکا۔

یہ دیوان مجلد اور اس کے ایک سو بیاسی صفحے ہیں۔ سارا دیوان خوشخط اور نہایت ہی تہذیب و ترتیب کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ شروع کے دو صفحوں پر بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب سنہری کام کیا گیا ہے۔ حاشیہ بھی سنہری بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد اس غزل سے کلام کا آغاز ہوا ہے۔

خدایا شور سرشاری بدہ دیوانۂ ما را	لبالب از می تحقیق کن پیمانۂ ما را
چو برگ تاک دل در سینہ ام از بیم میلرزد	نگہ دار از گزند زاہداں میخانۂ ما را
کسی تا کی بود در زیر بار منت ساقی	ز موج می پر و بالی بدہ پیمانۂ ما را

خوی خجلت نذارد بر جبینم مایۂ اشکی — مگر از ابر رحمت سبز سازی دانہ مارا
بہ بزم مردم دانا چہ نقصان رسد آخر — اگر یک پردۂ رسوا ترکنی دیوانہ مارا
بآب دیدہ پیمانہ تاثیری کرامت کن — میان بادہ نوشاں نالۂ مستانہ مارا
حجاب خود نمائی را اگر از پیش برداری — ز تار شمع نشناسی رگ پروانۂ مارا
نخواہد ماند احساس کرد خجلت بر جبین ما — اگر سیلاب می آید برد کاشانۂ مارا

اس شاعر کا دیوان خان زماں کے حکم سے لکھا گیا ہے، چنانچہ کتاب کے آخری صفحے پر یہ عبارت لکھی ہے:

"این مایدہ پر فائدہ کاتب الحروف عبدالکریم ابن حاجی یوسف۔ بنا بر حکم نواب خورشید منزلت گردون جناب المستغنی عن الالقاب بے مثل و نظیر دوران نواب خان زماں بر روئی صفا مذاقان سخن شناس چیدہ۔ ہر کہ چوں خامہ برو بگذرد بتفضیل دعائی خیریت داریں آں معالی شوکت ایں کس را یاد آرد۔ تم الکتاب فی تاریخ پانزدہم رجب ۳۵ جلوس معلیٰ در مقام قلعہ پرنالہ۔"

خان زماں ایک ذی عزت اور بلند مرتبت امیر تھا۔ ہمیشہ اہل علم کا قدرداں رہا کرتا۔ حتیٰ کمالوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ انھیں بیش بیش انعامات دیا کرتا اور اپنے گرد جمع رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ عدد رجہ کا قدرداں اور علم و فن کا بڑا شایق تھا۔ کتاب خود زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اُسے کس درجہ علمی شغف ہوگا۔

رقعات عالمگیری میں خان جہاں کا متعدد جگہ ذکر آیا ہے لیکن خان زماں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف اس کتاب سے قلعہ مذکور کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہ قلعہ ان دنوں بہت مشہور اور نہایت محکم و مضبوط قلاع سے تھا۔ اس قلعہ پر شاہنشاہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بغاوت ہوئی تھی۔ قلعہ سر کرنے کے لئے مقرب خاں سپہ سالار کی سیادت میں فوج بھیجی گئی تھی۔ جو چھوٹی سی زد و خورد کے بعد فتح کا نشان اڑاتی ہوئی دارالسلطنت کی طرف کوچ کی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو رقعات عالمگیری صفحہ (۲۲۶) رقعہ (۱۱۱)۔ مطبوعہ نولکشور پریس۔

"مقرب خاں بر تسخیر برنالا مامور شد۔ الخ"

اس قلعہ کو فتح کرنے کے بعد عہد عالمگیری میں اس کا نام بدل دیا گیا۔ چنانچہ خود بادشاہ جہاں پناہ اپنے رقعہ (۴۳) صفحہ (۱۱) میں یوں ارقام فرماتے ہیں۔

"قلعہ برنالا باسم نول تارا موسوم شد — تفصیل یورش از کنیزاں خود بپرسند"

ایسے بڑے نامور اور باکمال شاعر کا کلام آج تک قعر گمنامی میں اور کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔

اس کے سارے کلام کو دیکھا لیکن کہیں کچھ حالات معلوم نہ ہو سکے کہ یہ کہاں کا باشندہ تھا۔ اور اس کا پورا نام کیا تھا۔ صرف اس شعر میں یوں کہتا ہے کہ:۔

"شنیدہ ایم غیر تو احسان ز اصفہان — آید باختیار بہ دو عاقلی گردد"

شاعر نے متعدد مقامات پر صائب کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صائب کا ہم عصر تھا۔ اور اکثر اشعار سے شاگرد ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ ایک مقام پر یوں کہتا ہے۔

"ہر چند احساں وار دکمال معرفت — اما چوں صائب شاعرے پیدا نہ کرد سالہا"

یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

"احساں ز فیض صائب شیریں کلام بود — کہ ایں غزل بسمع دل دوستان رسید"

اب ہم ذیل میں صرف دو غزلوں کو لکھتے ہیں جس کو شاعر نے صائب کی غزلیات پر کہا ہے۔

تا دلم دیو ہوائی نفس را در شیشہ داشت — از خدا امید و ہم از مردماں اندیشہ داشت

ہم چو دل ہر قطرہ خونی کہ در تن داشتم — پیش ازیں از شوق او شغل محبت پیشہ داشت

داغ مسود ابر سرم گل میزد از آشفتگی — سنبل زلف پریشاں در دلم تا ریشہ داشت

زخم ناسور ا سیران تو اتش قسمت فزود — پیش ازیں اگر نہ اعتبار یشہ داشت

ایں جواب آں غزل احساں کہ صائب گفتہ است — ہر حبابی را کہ میدیدم پری در شیشہ داشت

دیگر

درمیان ما محبت جنگ پیدا می کند — از صفا آئینہ ما زنگ پیدا می کند

بس کہ بر معشوق عاشق سخت گیر د کارہا — عکس شیریں جلوہ گاہ از سنگ پیدا می کند

سینہ صافاں را چہ پروا از گزند مردم است — گوہر ما از شکستن رنگ پیدا می کند

چوں تواں دیدا ز نگاہی روئی زیبائی ترا — کز نزاکت ہر زماں صد رنگ پیدا می کند

ایں جواب آں غزل احساں کہ صائب گفتہ است — خون عاشق مدعی از سنگ پیدا می کند

سارا دیوان فصاحت و بلاغت سے آراستہ افراط و تفریط سے پاک ہے کلام میں ایسے جواہر پارے اور وہ اثرات ہیں کہ ہر ہر شعر پر دل کو چوٹ لگتی ہے۔ ہر جگہ اشعار کی سادگی عجب ہی مزہ دیتی ہے تخیل نہایت اچھوتا باندھتا ہے۔ اور حد درجہ کا نازک خیال شاعر ہے۔ الغرض اپنی کم فرصتی کے باعث اس کے

متعلق کافی معلومات مہیا نہیں ہو سکے۔ امید ہے کہ آئندہ کوششوں سے اِن باتوں کا بھی پتہ چل جائے گا۔

مدھوا

(از جناب جے شنکر صاحب)

"آج سات دن ہو گئے۔ پینے کی کون کہے۔ چھوا تک نہیں! آج ساتواں دن ہے سرکار!"

"تم جھوٹے ہو۔ ابھی تو تمہارے کپڑے سے مہک آ رہی ہے۔"

"وہ ...... وہ تو کئی دن ہوئے۔ سات دن سے اوپر ــــ کئی دن ہوئے ــــ اندھیرے میں بوتل انڈیلنے لگا تھا۔ کپڑے پر گر جانے سے نشہ بھی نہ آیا۔ اور آپ کو کہنے کا ...... کیا کہوں ...... سچ مانیئے۔ سات دن ...... ٹھیک سات دن سے ایک بوند بھی نہیں۔"

ٹھاکر سردار سنگھ ہنسنے لگے۔ لکھنؤ میں لڑکا پڑھتا تھا۔ ٹھاکر صاحب بھی کبھی کبھی وہیں آ جاتے۔ ان کو کہانی سننے کا چسکا تھا۔ تلاش کرنے پر یہی شرابی ملا۔ وہ رات کو، دوپہر میں کبھی کبھی سویرے بھی آ جاتا۔ اپنی لچھے دار کہانی سنا کر ٹھاکر کا دل بہلایا کرتا۔

ٹھاکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو آج پیو گے نا!" "جھوٹ کیسے کہوں۔ آج تو جتنا ملے گا سب ہی پیوں گا۔ سات دن چنے چبینے پر گزارے ہیں۔ کس لئے۔"

"تعجب! سات دن پیٹ کاٹ کر آج اچھا بھوجن نہ کر کے تمہیں پینے کی سوجھی ہے! یہ بھی ......"

"سرکار! موج بہار کی ایک گھڑی، ایک طویل دردناک زندگی سے بہتر ہے۔ اسکی خماری میں روکھے دن کاٹ لئے جا سکتے ہیں۔"

"اچھا آج دن بھر تم نے کیا کیا کیا ہے؟"

"میں نے؟ ہم چھپا سینئے ــــ سویرے کہرا پڑتا تھا۔ بھورے دھواں سے کمبل سا وہ بھی سورج کے اطراف لپٹا تھا ہم دونوں منہ چھپائے پڑے تھے۔"

ٹھاکر صاحب نے ہنس کر کہا۔ اچھا تو اس منہ چھپانے کی کوئی وجہ؟

"سات دن سے ایک بوند بھی حلق سے نہیں اتری تھی۔ بھلا میں کیسے منہ دکھا سکتا تھا۔ اور جب بارہ بجے دھوپ نکلی، تو پھر لاچاری تھی .... اُٹھا، ہاتھ منہ دھونے میں جو تکلیف ہوئی سرکار وہ کیا کہنے کی بات ہے!

پاس پیسے بچے تھے۔ چبا چبانے سے دانت بھاگ رہے تھے۔ کٹ کھی لگ رہی تھی۔ پڑانچے والے کے پاس پہنچا۔ آہستہ آہستہ کھاتا رہا اور اپنے کو بنکتا ہی رہا۔ پھر گومتی کے کنارے چلا گیا۔ گھومتے گھومتے اندھیرا ہو گیا۔ بوندیں پڑنے لگیں تب کہیں بھاگا اور آپ کے پاس آگیا۔"

"اچھا جو اُس دن تم نے گذرے والی کہانی سنائی تھی، جس میں آصف الدولہ نے اس کی لڑکی کا آنچل بھنے ہوئے بھٹے کے دانوں کے عوض موتیوں سے بھر دیا تھا! وہ کیا سچ ہے؟"

"سچ! ارے وہ غریب لڑکی بھوک سے اسے چبا کر تھو تھو کرنے لگی! ...... رونے لگی۔ ایسی تکلیف دہ لگی بڑے لوگ کر ہی بیٹھتے ہیں سنا ہے سری رامچندر جی نے بھی ہنو مان جی سے ایسی ہی......"

ٹھاکر صاحب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دم روکتے ہوئے سنبھل کر بولے۔ "ارے بڑپن کہتے کسے ہیں؟ کنگال تو کنگال! اگدی لڑکی! بھلا اس نے کبھی موتی دیکھے تھے، چبانے لگی ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ آج تک تم نے جتنی کہانیاں سنائیں۔ سب میں بڑی گپ تھی۔ شہزادوں کے دکھڑے۔ رنگ محل کی واہی تباہی۔ بیگمات کی لاحاصل محبت۔ لطف آمیز داستانیں اور دکھ سے بھری ہوئی کہانیاں ہی تمہیں آتی ہیں۔ پر ایسی ہنسنے والی کہانی اور سناؤ، تو میں تمہیں اپنے روپیہ دہی بڑھیا شراب پلا سکتا ہوں۔"

"سرکار! بوڑھوں سے سنتے ہوئے وہ نوابی کے سونے سے دن! امیروں کی رنگ رلیاں، دکھیاؤں کی درد بھری آہیں! رنگ محلوں میں گھل گھل کر مرنے والی بیگمات! اپنے آپ سر میں چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ انکی تکلیف سے رونے لگتا ہوں۔ امیر کنگال ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے گھمنڈ پاش پاش ہو کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ تب بھی دنیا بڑی پاگل ہے۔ میں اس کے پاگل پن کو بھولنے کے لئے شراب پینے لگتا ہوں۔ سرکار! نہیں تو یہ بری بلا کون اپنے گلے لگاتا؟"

ٹھاکر صاحب اونگھنے لگے تھے۔ انگیٹھی میں کوئلہ دہک رہا تھا۔ شرابی سردی سے ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ سینکنے لگا۔ دفعتہً نیند سے چونک کر ٹھاکر صاحب نے کہا۔

"اچھا جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ وہ دیکھو ایک روپیہ پڑا ہے اوٹھا لو۔ للو کو بھیجتے جاؤ۔"

شرابی روپیہ اوٹھا کر آہستہ سے کھسکا۔ للو تھا ٹھاکر صاحب کا جمعدار۔ اسے ڈھونڈھتے ہوئے جب وہ پھاٹک پر کی بغل والی کوٹھری کے پاس پہنچا۔ تو اسے دھیمی آواز سے سسکنے کی صدا سنائی دی۔ وہ کھڑا ہو کر سننے لگا۔

"تو سسور رو تا کیوں ہے کنور صاحب نے دو ہی لاتیں تا لگائی ہیں! کچھ گولی تو نہیں مار دی ہے؟"

گرج دار آواز سے للّو بول رہا تھا۔ مگر جواب میں سسکیوں کے ساتھ ایک آدھ ہچکی ہی سنائی دیتی۔ اب اور بھی کڑک کر للّو نے کہا۔ "مرہوا! جاسو۔ نخرہ نہ کر۔ ورنہ اٹھوں گا تو کھال اُدھیڑ دوں گا۔ سمجھا نا؟"

شرابی چپ چاپ سن رہا تھا۔ لڑکے کی سسکی اور بڑھنے لگی۔ پھر اسے سنائی دیا۔ "لے اب بھاگتا ہے کہ نہیں، لکیوں مار کھانے پر تلا ہے؟" خوف زدہ لڑکا باہر چلا آ رہا تھا۔ شرابی نے اس کے چھوٹے سے خوبصورت گورے چہرہ کو دیکھا۔ آنسوؤں کی بوندیں ڈھلک رہی تھیں۔ بڑے پیار سے اس کا منہ پونچھتے ہوئے اسے لیکے وہ پھاٹک کے باہر چلا آیا۔ دس بج رہے تھے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ شرابی کی خاموش ہمدردی کو اس ننھے معصوم دل نے منظور کر لیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ ابھی وہ ایک تنگ گلی پر رکا ہی تھا کہ لڑکے کے دوبارہ سسکنے کی اسے آواز سنائی دی۔ وہ جھڑک کر بول اٹھا۔

"اب کیا روتا ہے رے چھوکرے؟"

"میں دن بھر سے کچھ کھایا نہیں۔"

"کچھ کھایا نہیں۔ اتنے بڑے امیر کے ہاں رہتا ہے اور دن بھر تجھے کھانے کو نہیں ملا؟"

"یہی تو میں کہنے گیا تھا جمعدار کے پاس۔ مار تو روز ہی کھاتا ہوں۔ آج تو کھانا ہی نہیں ملا۔ کنور منا کا اوور کوٹ لئے کھیل میں دن بھر ساتھ رہا۔ سات بجے لوٹا۔ تو اور بھی نو بجے تک کچھ کام کرنا پڑا۔ آٹا رکھ نہیں سکا تھا۔ روٹی بنتی تو کیسے! جمعدار سے کہنے گیا تھا!" بھوک کا ذکر کرتے کرتے لڑکے کے اوپر اس کی بے بسی اور فاقہ نے ایک ساتھ ہی جیسے حملہ کر دیا ہو۔ وہ پھر ہچکیاں لینے لگا۔ شرابی اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ ایک گندی کوٹھری کا دروازہ ڈھکیل کر لڑکے کو لئے ہوئے وہ اندر پہنچا۔ ٹٹولتے ہوئے دیا سلائی سے مٹی کی ڈھبری جلا کر وہ پھٹے کمبل کے نیچے سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ ایک پراٹھے کا ٹکڑا ملا۔ شرابی اسے لڑکے کے ہاتھ میں دے کر بولا "اب تو اسے چبا۔ میں تیرا گڑھا بھرنے کے لئے کچھ اور لے آؤں۔ سنتا ہے رے چھوکرے! سونا مت۔ روئے گا تو خوب پیٹوں گا۔ مجھے رونے سے بڑا بیر ہے۔ پاجی کہیں کا۔ مجھے بھی رلائے گا......"

شرابی گلی کے باہر بھاگا۔ اس کے ہاتھ میں روپیہ تھا۔ "بارہ آنہ کا ایک دیسی ادھا اور دو آنے کا چاپ...... دو آنہ کی پکوڑی نہیں نہیں آلو مٹر...... اچھا نہ سہی۔ چار دن آنے کا گوشت ہی لے لوں گا پر یہ چھوکرا! اس کا گڑھا جو بھرنا ہوگا، یہ کتنا کھائے گا اور کیا کھائے گا۔ اوہ! آج تک تو کبھی میں نے دوسرے کے کھانے کی فکر کی ہی نہیں۔ تو کیا لے چلوں؟ پہلے ایک ادھا ہی لے لوں۔"

اتنا سوچتے سوچتے! اس کی آنکھوں پر بجلی کی روشنی کی جھلک پڑی۔ اس نے اپنے کو مٹھائی کی دکان پر کھڑا پایا۔ وہ شراب کا اڈھا لینا بھول کر مٹھائی پوری خریدنے لگا۔ نمکین لینا بھی نہ بھولا۔ پورا ایک روپیہ کا سامان لے کر وہ دکان سے ہٹا۔ جلد پہنچنے کے لئے ایک طرح سے دوڑنے لگا۔ اپنی کوٹھری میں پہنچ کر اس نے دو قطاروں میں لڑکے کے سامنے سجا دی۔ اِن کی خوشبو سے لڑکے کے حلق میں ایک قسم کی تازگی پیدا ہوئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ شرابی نے مٹی کی کلیا سے پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔ نٹ کھٹ کہیں کا ہنستا ہے۔ سوندھی بو ناک میں پہنچی نا! لے خوب ٹھونس کر کھالے اور ردیا کی پیٹا!

دونوں نے برسوں کے بچھڑے دوستوں کی مانند ساتھ بیٹھ کر پیٹ بھر کھایا۔ سیلی جگہ میں سوتے ہوئے لڑکے نے شرابی کا پرانا کوٹ اوڑھ لیا تھا۔ جب اُسے نیند آگئی۔ تو شرابی بھی کمبل تان کر بڑبڑانے لگا۔ سوچا تھا۔ آج سات دن کے بعد بھر پیٹ پی کر سوؤنگا! لیکن یہ چھوٹا سا دکھا پاجی نہ جانے کہاں سے آ دھمکا!

ایک متفکرانہ جھلک میں آج پہلے پہل شرابی نے آنکھ کھول کر کوٹھری میں غریبانہ زندگی کی چیزوں کو منتشر حالت میں دیکھا اور اُس گھٹنوں سے ٹھوڑی لگائے ہوئے بے طمع لڑکے کو بھی دیکھا۔ اس نے تلملا کر دل ہی دل میں سوال کیا۔ کس نے ایسے نازک پھولوں کو ستانے کی خاطر بے مہری برتی؟ آہ ری قسمت! پھر تو اس کو لیکر مجھے خانہ داری کرنی پڑیگی کیا؟ حرماں نصیب! جس کو میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میری اتنی مایہ ممتا۔ جس پر آج تک صرف بوتل کا ہی اقتدار رہا تھا۔ اس کی حمایت کیوں کرنے لگی؟ اس چھوٹے سے پاجی نے میری زندگی کے لئے کونسا اندرا جال بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے! پھر کیا کروں؟ کوئی کام کروں؟ کیسے دونوں کا پیٹ چلے گا! نہیں بھگا دوں گا اسے۔ آنکھ تو کھولے! لڑکا انگڑائی لے رہا تھا۔ اوٹھ بیٹھ شرابی نے کہا۔ لے اوٹھ کچھ کھالے۔ ابھی رات کا بچا ہوا ہے اور اپنی راہ دیکھ! تیرا نام کیا ہے؟

لڑکے نے تبسم کر کے کہا۔ مدھوا۔ بھلا ہاتھ منہ بھی نہ دھوؤں۔ کھانے لگوں! اور جاؤں گا کہاں؟

"آہ! کہاں بتاؤں اسے کہ چلا جائے! کہہ دوں کہ بھاڑ میں جا! لیکن وہ آج تک دکھ کی بھٹی میں جلتا ہی تو رہا ہے۔ تو۔۔۔۔۔۔۔" وہ چپ چاپ گھر سے جھلا کر سوچتا ہوا نکلا۔ او لے پاجی۔ اب یہاں لوٹوں گا ہی نہیں۔ تو ہی اس کوٹھری میں رہ!

شرابی گھر سے نکلا۔ گومتی کے کنارے پہنچنے پر اُسے یاد آیا کہ وہ کتنی ہی باتیں سوچتا آرہا تھا۔ مگر کچھ بھی سمجھ نہ سکا۔ ہاتھ منہ دھونے میں لگا۔ چمکدار دھوپ نکل آئی تھی۔ وہ چپ چاپ گومتی کے دھارے کو دیکھ رہا تھا

دھوپ کی گرمی سے آرام پاکر وہ فکر دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے پکارا۔

"بھلے آدمی رہے کہاں؟ برسوں میں دکھائی دیں۔ تم کو تلاش کرتے کرتے میں تھک گیا"

شرابی نے چونک کر دیکھا۔ وہ کوئی جان پہچان کا تو معلوم ہوتا تھا۔ مگر کون ہے، یہ ٹھیک ٹھیک نہ جان سکا۔

اس نے پھر کہا۔ تمہیں ہی سے کہہ رہے ہیں۔ سنتے ہو۔ اٹھالے جاؤ اپنی سان دھرنے کی کل، ورنہ سڑک پر پھینک دوں گا! ایک ہی تو کوٹھری جس کا میں دو روپیہ کرایہ دیتا ہوں، اس میں کیا مجھے اپنا کچھ رکھنے کے لئے نہیں؟

"اوہ! رام جی، تم ہو بھائی میں بھول گیا تھا۔ تو چلو آج ہی اسے اٹھالاتا ہوں" کہتے ہوئے شرابی نے سوچا۔ اچھی رہی، اس کو بیچ کر کچھ دنوں تک کام چلے گا۔ گومتی میں نہاکر رام جی اس کا ساتھی پاس ہی اپنے گھر پہنچا۔ شرابی کو کل دیتے ہوئے اس نے کہا۔ لے جاؤ کسی طرح میرا اس سے پنڈ چھوٹے۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کو کل ڈھونا پڑا کسی طرح اپنی کوٹھری میں پہنچکر اس نے دیکھا کہ لڑکا چپ چاپ بیٹھا ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے پوچھا کیوں رے۔ تونے کچھ کھالیا کہ نہیں؟

"بھر پیٹ کھا چکا ہوں اور وہ دیکھو تمہارے لئے بھی رکھ دیا ہے" کہہ کر اس نے اپنی قدرتی میٹھی ہنسی سے اس روکھی کوٹھری کو تر کر دیا۔ شرابی ایک لمحہ تک خاموش رہا۔ پھر چپ چاپ کھانے لگا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ یہ تقدیر کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟ چلوں پھر لیکر سان دینے کا کام چلاکر دونوں کا پیٹ بھرے گا۔ وہی پرانا چرخہ پھر سر پر پڑا۔ نہیں تو دو یا تین قصہ کہانی ادھر ادھر کی کہہ کر اپنا کام چلا ہی لیتا تھا! پر اب تو بغیر کچھ کئے گھر نہیں چلنے کا۔ پانی پی کر بولا کیوں رے مدھوا اب تو کہاں جائے گا؟"

"کہیں نہیں"

"یہ لو۔ تو پھر کیا یہاں جمع گاڑھی ہے کہ میں کھود کھود کر تجھے مٹھائی کھلاتا رہوں گا!"

"تب کوئی کام کرنا چاہیئے"

"کرے گا؟"

"جو کہو!"

"اچھا تو آج سے میرے ساتھ ساتھ گھومنا پڑے گا۔ یہ کل تیرے لئے لایا ہوں۔ چل آج سے تجھے

سامان دینا سکھاؤں گا۔ کہاں رہوں گا۔ اس کا کچھ ٹھیک نہیں۔ درخت کے نیچے رات بسر کر سکے گا یا
"کہیں بھی رہ سکوں گا پر اس ٹھاکر کی نوکری نہ کروں گا"، شرابی نے ایک مرتبہ اٹل نظر سے آسے دیکھا۔
لڑکے کی آنکھیں عزم بالجزم کا عہد کر رہی تھیں۔

شرابی نے دل ہی دل میں کہا بیٹھے بٹھائے یہ پاپ کہاں سے مول لیا۔ اب تو شراب نہ پیئے گا
مجھے بھی عہد و پیمان کرنا پڑا۔ وہ ساتھ لیجانے والی چیزوں کو جمع کرنے لگا۔ ایک گٹھر کا اور دوسرے کل کا دو بوجھ ہوئے
شرابی نے پوچھا تو کسے اوٹھائے گا؟

"جسے کہو"

"اچھا۔ تیرا باپ جو مجھکو پکڑے تو؟"

"کوئی نہیں پکڑے گا۔ چلو بھی۔ میرے باپ مر گئے"

شرابی حیرت سے اُس کا منہ دیکھتا ہوا گل اوٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے نے گٹھری لادی۔ دونوں
کوٹھری چھوڑ کر چل پڑے۔ (ڈاکس) (غلام رسول)

سائنس کا طریقہ تربیت

(از جناب رشید محمد صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ)

کوئی پندرہ برس ہوئے کہ میں پروفیسر اگاسر (PROF AGASIR) کے معمل میں داخل ہوا اور انھیں بتایا کہ
میرا نام مدرسہ سائنس میں طبعی تاریخ (NATURAL HISTORY) کے طلبا کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے مجھ سے
میری آمد کے مقصد، میرے گزشتہ حالات اور حصول علم کے بعد آئندہ طریقہ کار کے متعلق چند سوالات کئے اور
بالآخر پوچھا "تمہیں کسی خاص شاخ کے مطالعہ کا شوق ہے؟"۔ اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جہاں
میری خواہش ہے کہ حیوانیات (ZOOLOGY) کے تمام شعبوں میں مہارت حاصل کروں میرا ارادہ یہ بھی
ہے کہ حشرات کے مطالعہ میں خاص طور پر منہمک رہوں۔

انھوں نے سوال کیا "تم کب شروع کرنا چاہتے ہو؟"۔ میں نے کہا "ابھی"۔ اس جواب سے وہ بہت
خوش نظر آئے اور ایک موثر "بہت اچھا" کے ساتھ اس الکحل میں رکھے ہوئے منظوروں کی ______
بڑی بوتل کو الماری سے اٹھا لائے اور کہا "اس مچھلی کو لو۔ اور امتحان کرو۔ ہم اسے ہیمولن (HAEMULON)

کہتے ہیں، تھوڑی دیر بعد میں تمہارے مشاہدات پر سوال کروں گا۔" اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ گئے اور کچھ دیر بعد واپس ہو کر تفویض شدہ شئے کی احتیاط کے متعلق ہدایت دیں اور کہنے لگے" اگر کسی شخص کو منظور ہو کہ نگہداشت معلوم نہ ہو تو وہ فطریاتی (NATURALIST) بننے کے قابل نہیں۔"

مجھے مچھلی کو ایک چھوٹی کشتی میں رکھ کر اپنے سامنے رکھنے اور بار بار اس کی سطح کو الکوہل سے تر کرتے رہنے کا حکم تھا۔ علم الحشرات میں علم الحوت کے مقابلہ میں زیادہ صفائی کا لحاظ رہتا ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے بلا تامل بوتل کی تہ سے مچھلی کو پکڑ کر نکالا اور ان کی مثال قابل تقلید تھی۔ الکوہل بہت پرانی اور مچھلی کی سی بو رکھتا تھا مگر اس مقدس چار دیواری کے اندر میں کسی اظہار نفرت کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور میں نے الکوہل کو خالص آب کی طرح استعمال کیا۔ تاہم مجھے ایک شدید احساس بیزارگی سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ ایک جوشیلے حشریاتی کے لئے مچھلی کا مشاہدہ ہمت افزا نہیں تھا۔ میرے احباب بھی گھر پر مجھ سے دق ہو گئے کیوں کہ عطر کون کی کوئی مقدار بھی اس مہک کو دور نہیں کر سکتی تھی جو میرے ساتھ ہر وقت سایہ کی طرح لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ میں اس مچھلی میں دیکھ سکتا تھا دس دقیقوں میں میں نے وہ تمام دیکھ لیا۔ اور پروفیسر صاحب کی تلاش میں نکلا جو عجائب خانہ چھوڑ چکے تھے۔ جب میں بالائی حصے میں رکھے ہوئے بعض پرانے جانوروں کے پاس ٹھیر کر واپس ہوا تو میرا منظور وہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ میں نے اس پر مائع ڈالا تاکہ اسے غش سے ہوش میں لاؤں اور طبیعی ناگوار شکل کی واپسی کا اندیشہ مند رہا۔ اس تھوڑے سے اضطراب کے بعد اپنے بے زبان ساتھی کی طرف ایک ٹکٹکی باندھنے کے سوا میرے لئے کچھ نہیں تھا۔ نصف گھنٹہ گزر گیا۔ ایک گھنٹہ۔ دوسرا گھنٹہ۔ مچھلی ناگوار نظر آنے لگی۔ میں نے اسے اوپر نیچے الٹایا، اس کو غور سے دیکھا۔ ڈراؤنی دکھائی دینے لگی۔ اس کے بعد پیچھے سے، نیچے سے، اوپر سے، جانبین سے، سہ ربعی منظر سے دیکھا۔ لیکن وہ اسی طرح ڈراؤنی تھی۔ میں ہراساں تھا۔ میں نے وقت سے پہلے طے کر لیا کہ ناشتہ ضروری ہے۔ مچھلی کو بوتل میں دوبارہ رکھ دیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے آزاد تھا۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ پروفیسر اگاسز عجائب خانہ آکر گھر چلے گئے اور کئی گھنٹوں تک واپس نہ ہونگے میرے ہمجولی اتنے مشغول تھے کہ طویل گفتگو سے انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں تھا۔ آہستہ سے میں نے اس ہیبتناک مچھلی کو نکالا اور احساس ناکامی کے ساتھ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں تکبیری (MAGNIFYING)

شیشہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ تمام قسم کے آلات کا استعمال ممنوع کر دیا گیا تھا۔ اپنے دو ہاتھ، اپنی دو آنکھیں اور مچھلی، یہ بہت محدود میدان تھا۔ میں نے ایک انگلی اس کے حلق میں دانتوں کی تیزی معلوم کرنے کے لئے داخل کی۔ مختلف قطاروں میں چھلکوں کو گننے لگا۔ اور مجھے اس لغویت کا یقین ہو گیا۔ آخر کار ایک خوش کن خیال آیا کہ مچھلی کا خاکہ کھینچا جائے۔ اب میں حیرت کے ساتھ جانور میں نئے خد و خال معلوم کرنے لگا۔ اس موقع پر پروفیسر صاحب واپس ہوئے۔

انھوں نے کہا "بالکل ٹھیک!۔ ڈرائنگ (خاکہ کشی) ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ تم اپنے منظورہ کو نم اور بوتل کو کاک سے بند رکھتے ہو" ان ہمت افزا الفاظ کے بعد پوچھا "اچھا اس کی شکل کیسی ہے؟" ان حصوں کی ساخت کے متعلق جن کے نام مجھے اب تک نامعلوم تھے، میرے بیان کو انھوں نے توجہ سے سنا۔ جھالر دار گلپھڑی قطعات اور متحرک پٹھے، رنگے مسامات، پر گوشت ہونٹ اور بے پلک آنکھیں، بغلی لکیر، شوکے دار پر اور دو شاخی دم، کھنچا ہوا اور کمانی دار جسم۔ جب میں ختم کر چکا تو وہ اور سننے کے منتظر نظر آ رہے تھے اور ناراضی کے لہجہ میں کہا "تم نے غور سے امتحان نہیں کیا۔ تم نے جانور کی سب سے نمایاں خصوصیت کو نظر انداز کر دیا جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اس طرح موجود ہے جس طرح کہ خود مچھلی پھر دیکھو۔ پھر دیکھو!" اور مجھے اپنی مصیبت میں چھوڑ گئے۔

میں پریشان تھا۔ میں بیزار تھا۔ پھر وہی مکروہ مچھلی! مگر اب میں اپنے کام میں استقلال سے منہمک ہو گیا اور ایک ایک نئی چیز دریافت کرتا گیا اور مجھے اب معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کی رائے کتنی صحیح تھی۔ سہ پہر جلد گزر گئی اور اس کے ختم پر پروفیسر صاحب نے پوچھا "کیا تم نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا؟"

"نہیں مجھے یقین ہے کہ میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ پہلے میں نے کتنا نظر انداز کیا تھا"، میرا جواب تھا۔ انھوں نے جوش سے کہا "تو بہتر ہے۔ لیکن میں اب تمہارا بیان نہیں سنوں گا۔ مچھلی کو رکھ دو اور مکان چلے جاؤ شاید تم صبح بہتر جواب کے ساتھ تیار رہو گے۔ قبل اس کے کہ تم کل مچھلی کو دیکھو میں تمہارا امتحان لوں گا۔"

یہ بہت پریشان کن تھا۔ مجھے تمام رات مچھلی پر غور کرتے رہنا تھا کہ یہ نامعلوم مگر بالکل نمایاں خاصہ کونسا ہے اور نیز اپنی تحقیقات کی نظر ثانی کئے بغیر دوسرے دن ان کا صحیح بیان پیش کرنا تھا۔ میں دریائے چارلس پر سے ہو کر پریشان و مضطر مکان پہنچا۔

دوسری صبح پروفیسر صاحب کی پر خلوص کورنش میرے لئے پھر ہمت افزا تھی۔ وہ متمنی تھے کہ

میں بھی اپنے طور پر اس بات کو دیکھ لوں جو انھیں معلوم ہے۔ میں نے کہا "شاید آپ کا مقصد ہے کہ مچھلی سڈول جانبیں جوڑے دار اعضا کے ساتھ رکھتی ہے" ان کے بڑے مسرت افزا "ٹھیک ہے" نے بلاشک ہمارے گزشتہ شب بیداری کا صلہ دیا۔ جب وہ اس نکتہ کی اہمیت پر دلچسپی اور مسرت سے گفتگو کر چکے تو میں نے سوال کرنے کی جرأت کی کہ مجھے اس کے بعد کیا کرنا چاہیے۔ "ہاں۔ اپنی مچھلی کا امتحان کرو!" یہ کہا اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ گئے۔ ایک گھنٹہ بعد وہ واپس ہوئے اور میری نئی فہرست کو سنا اور کہا "بہت خوب! بہت خوب! لیکن ابھی پورا نہیں ہوا اور دیکھو" اور اس طرح تین دن تک انھوں نے اس مچھلی کو میرے سامنے رہنے دیا اور اس کے سوا کسی دوسری طرف دیکھنے یا کوئی مصنوعی سہارے کے استعمال کو منع کر دیا۔ "دیکھو! دیکھو! دیکھو!" ان کی یہی تاکید تھی۔

یہ بہترین حشریاتی سبق تھا جس کو میں نے اپنی عمر میں پڑھا۔ اس کا اثر بعد کے ہر مطالعہ کے جزئیات تک پہنچا۔ یہ ایک ترکہ ہے جسے پروفیسر صاحب نے اپنے شاگردوں کے لئے چھوڑا۔ اسے نہ ہم کبھی خرید سکتے ہیں اور نہ اس سے جدا ہو سکتے ہیں۔

چوتھے دن اسی گروہ کی دوسری مچھلی میرے سامنے رکھی گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ دونوں میں فرق و مشابہت ڈھونڈیں۔ اس کے بعد اور مچھلیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ پورا خاندان میرے سامنے آ گیا۔ اور بوتلوں کا ایک کامل دستہ میز اور اطراف کے ایستادوں پر رکھا تھا۔ ناگوار بو نفیس عطر بن گئی اور اب بھی ایک پرانی چھ انچ والی کرم خوردہ کاگ کو دیکھ کر خوش کن خیالات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے!

اس طرح ہیمولیس کا پورا گروہ مطالعہ میں آ گیا۔ واقعات، مشاہدات اور ان کی باقاعدہ ترتیب کے متعلق پروفیسر اگاسز کی تربیت اس تاکید پر مشتمل ہوتی کہ ان سے مطمئن مت ہو جاؤ۔ ان کا بیان تھا "واقعات بیکار چیزیں ہیں بشرطیکہ کسی عام کلیہ کے ربط میں لائے نہ جائیں۔"

آٹھ ماہ کے اختتام پر مجھے اپنے ان دوستوں کو افسوس کے ساتھ خیرباد کہنا پڑا اور کیڑوں کی طرف متوجہ ہوا لیکن جو کچھ میں نے اس تجربہ میں سیکھا وہ برسوں کی تحقیقات سے زیادہ قیمتی تھا۔

نورجہاں بیگم اور جہانگیر

(از جناب حسن قادری صاحب)

ہم میں سے کس نے نورجہاں اور جہانگیر کے زبان زدِ خاص و عام افسانۂ حسن و عشق کو نہیں سنا؟ درسی کتب میں اور دیگر مطالعہ کی کتابوں میں اس کی بابت مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو نورجہاں کی ولادت کی بابت کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور ذرا بڑے ہونے پر وہ آپ یہ پڑھتے ہیں کہ بادشاہ ہند نورالدین محمد جہانگیر نے شیر افگن خاں کی بیوی مہرالنسا خانم سے اس کی شادی سے پہلے عشق کیا تھا اور اسی عشق میں اس نے شیر افگن خاں کو مروا ڈالا اور مہرالنسا سے شادی کرلی۔ اس واقعہ کے بلا مبالغہ پر لگ گئے ہیں اور اس پر اردو لٹریچر میں کئی ایک ناولوں، ڈراموں اور کتابوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ایک مشہور ادیب و مورخ اور سوانح نگار محمد حسین آزاد مرحوم نے قصص ہند میں یہ چند سطور تحریر کی ہیں۔

"ایک دن مہرالنساء کہ نورجہاں کا اصلی نام یہی تھا مینا بازار میں پھر رہی تھی۔ جہانگیر دو کبوتر ہاتھ میں لئے ہوئے ادھر سے گزرا۔ اس سے کہا کہ ذرا یہ کبوتر تو لئے رہیو اور آپ کسی کام کو چلا گیا۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر نورجہاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جب شاہزادہ واپس آیا تو دریافت کیا کبوتر کیا ہوا۔ اس نے کہا وہ تو اڑ گیا۔ شاہزادہ نے پوچھا کیونکر۔ اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ اس طرح اڑ گیا۔ یہ بھولا پن شاہزادہ کو بہت بھلا معلوم ہوا اور تب ہی سے ایک خیال ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اکبر کو اس کی خبر ملی بہت خفا ہوا بیٹے کو خوب دھمکایا اور فوراً ہی مہرالنساء کی ایک نوجوان سے شادی کر دی۔

جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو دبے ہوئے عشق کی چنگاری چمک اٹھی نیت برگشتہ ہو گئی چنانچہ بہت سی تدبیریں کرنے کے بعد قطب الدین خاں کوکہ کو اس کے قتل کر دینے کا حکم دیدیا جس کی تعمیل کی گئی۔ اب گھر بار ضبط ہو کر دربار کو روانہ ہوا۔

بادشاہ نے اب پیغام دینے شروع کر دیئے کہ مجھ سے نکاح کر لو، اور اس طرح پر جانے کے بعد آخر سات سال گزرنے پر دونوں کا نکاح ہو گیا۔"

بے چارہ جہانگیر اس واقعہ کی بنا پر ایسا بدنام ہوا ہے کہ موجودہ نسلیں اکبر اعظم کے پرعظمت تذکرے کے

بعد جہانگیر کا نام لیتے شرماتی ہیں اور کچھ سرسری امور کے بیان کے بعد جلد ہی دوسرے بادشاہوں کے تذکرے شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس واقعہ کی کچھ اصلیت بھی ہے؟ بادی النظر میں اسکی بابت شک و شبہ کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی لیکن جب ذرا زیادہ شد و مد کے ساتھ سوالات کئے جاتے ہیں اور غور کیا جاتا ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔؟ کیا اس کے تاریخی ثبوت اس نوعیت کے موجود ہیں جن کی تصدیق ہو چکی ہے؟ کیا اس عہد کے معاصرین نے اس کی بابت کچھ لکھا ہے؟ کیا اس کو تاریخی تدقیق و تحقیق کی کسوٹی پر کسا گیا ہے؟ کیا اس کی تنقید ہو چکی ہے؟ تو پھر ان سوالات کی بابت جواب ذرا سوچ کر ہی دینا پڑتا ہے۔ اور آخر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ محض افسانہ ہی افسانہ ہے اور اس کو تاریخ سے کچھ بھی سروکار نہیں ہے۔

اہل ہند کو ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کے لئے یہ کام مادر وطن کے ایک لائق فرزند نے کر رکھا ہے۔ الہ آباد کے پروفیسر بینی پرشاد نے ہندوستان کے بہت بدنام بادشاہ جہانگیر کی سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس میں جہاں انھوں نے جہانگیر کی بابت اور واقعات اور احوال تحریر کئے ہیں وہاں انھوں نے اس مشہور اور پامال افسانہ حسن و عشق جہانگیری کی بابت بھی بحث کی ہے اور اصلی واقعات پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

نور جہاں بیگم کا دادا خواجہ محمد شریف تاتاری سلطان خراساں۔ بگ لر بیگ کا وزیر تھا۔ اس نے طہماسپ شاہ ایران کی بھی چندے وزارت کی۔ اس کی موت پر اس کے خاندان کو فلاکت سے دو چار ہونا پڑا جس سے مجبور ہو کر اس کے لڑکے یعنی نور جہاں کے والد مرزا غیاث الدین محمد المعروف بہ غیاث بیگ نے ترک وطن کا سامنا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو لڑکے اور اس کی حاملہ بیوی نے بھی سفر اختیار کیا۔ اور وہ ہندوستان کو جانے والے ایک قافلے میں شریک ہو گئے۔

بعد میں مرزا غیاث نے اہل و عیال کو ہمراہ لیکر قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا اور آگے نکل کر قندھار میں قیام کیا۔ اور وہاں اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن والدین کی فلاکت نے اس لڑکی کی پرورش اُن کے لئے دو بھر کر دی تھی۔ اسی اثنا میں وہ قافلہ بھی قندھار پہنچ گیا کہ جس کا ساتھ چھوڑ کر یہ آگے بڑھے تھے جس کی وجہ غالباً وضع حمل کا اہتمام کرنا تھا۔

ملک مسعود قافلہ سالار نے ترس کھا کر ان کی ضروریات پوری کیں۔ ہندوستان آنے کے بعد اس کی معرفت مرزا غیاث کو بمقام فتح پور سیکری دربار اکبر بادشاہ میں بار مل سکا۔ یہاں مرزا نے اپنے علم و فضل اپنی لیاقت کے باعث مراتب جلیلہ حاصل کئے اور روز افزوں ترقی پاتا رہا۔

قندھار میں پیدا شدہ لڑکی کہ جس کے سبب سے باپ کو ملک مسعود کی ہمدردی اور ملازمت حاصل ہو سکی تھی مہرالنساء کے نام سے موسوم ہو کر اسم با مسمیٰ نکلی۔ ۱۷ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک اور ایرانی جلا وطن مہاجر علی قلی خاں سے ہو گئی۔ وہ بھی مرزا غیاث کی طرح شاہان ایران کا ملازم رہ چکا تھا شادی کے بعد علی قلی خاں کو شاہزادہ سلیم کی مصاحبت میں مقرر کیا گیا اور وہ سلیم کی ہمراہی میں میواڑ کی مہم پر بھی گیا۔ وہاں شیر کا شکار کرنے پر شاہزادے نے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا جہانگیر نے جب باپ سے بغاوت کی تو شیر افگن نے چند دن اس کا ساتھ دیا اور پھر اکبر سے جا ملا۔

تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے علو حوصلگی سے کام لیکر اس کی خطا معاف کر دی اور بردوان کی حکومت عطا کی۔ بنگالہ ان دنوں مغل شہنشاہیت کے خلاف سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا بہت سے مغل امرا اور جاگیر داران سازشوں میں بے محابا شرکت کرتے رہتے تھے اور چنانچہ جہانگیر نے اس شبہ پر راجہ مان سنگھ صوبہ دار بنگالہ کو واپس طلب کر کے اپنے کوکے قطب الدین خاں کو اس کی جگہ روانہ کیا۔ قطب الدین خاں نے بنگالہ آنے کے بعد بہت سے جاگیرداروں کو بغاوت کے شبہے اور الزام پر اپنی خدمات سے ہٹانا شروع کیا اور اسی سلسلے میں شیر افگن خاں بھی دربار صوبہ داری میں طلب کیا گیا جب وہ آیا تو اس کے پاس کے دو سائیس اس کے ہمراہ تھے۔

اس کے کیمپ میں حاضر ہوتے ہی قطب الدین خاں نے نا عاقبت اندیشی سے فوجیوں کو حکم دیا کہ اسے گھیر کر گرفتار کر لیں۔ شیر افگن جسے ایسے سلوک کی امید نہ تھی اس پر آگ بگولا ہو گیا اور تلوار سونت لی! اس نے قطب الدین خاں سے سوال کیا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ قطب الدین خاں نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ غضبناک شیر افگن نے اپنی سونتی ہوئی تلوار سے اس کے کاری زخم لگا دیا۔ قطب الدین میں زخم کھانے کے بعد بھی اتنی سکت رہ گئی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے سکا کہ شیر افگن کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اس حکم کے پہلے ہی امبہ خاں کشمیری نے شیر افگن خاں کے ایک زخم لگا دیا تھا۔ بہرحال اکیلے شیر افگن خاں کے جلد ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ امبہ خاں نے اسی جگہ جان دی اور قطب الدین خاں نے بھی اس کے بعد جان دی۔ قطب الدین خاں کے سے عزیز کوکے کی موت نے جہانگیر کو بہت رنج دیا۔ چنانچہ اس رنج میں اس نے شیر افگن خاں کو خوب گالیاں دیں۔

شیر افگن خاں کی موت سے مہرالنساء اور لاڈلی بیگم اب اپنے والد کے پاس دربار چلی آئی جلد

ہی دستور کے مطابق مہرالنساء کو والدۂ سلطانہ سلیمہ بیگم کی مصاحبت کا اعزاز حاصل ہوگیا۔
۱۶۱۱ء میں بماہ مارچ ایک مینا بازار میں جہانگیر نے اتفاقاً اسے دیکھ لیا۔ بیوہ نے شاہ شاہان کے
دل میں جگہ پیدا کرلی۔ اور بالآخر ماہ مئی میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ (اقبال نامہ معتمدی)
یہ ہیں اصل واقعات۔ اجو بہت سے ناظرین کے لئے نئے ہیں ان کے مقابل جو واقعات تاریخی
افسانے اور واقعہ کے طور پر بیان ہوتے رہے ہیں ان کا کوئی تذکرہ اس عہد کے معاصرین نے نہیں کیا ہے
خود جہانگیر نے اپنی توزک میں اپنے دیگر حالات کے اقرار کے ساتھ اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ
کہا جائے گا کہ کوئی بھی کیوں کر اپنے شرمناک واقعہ کا تذکرہ کر سکتا ہے۔ لیکن توزک جہانگیری میں جہانگیر نے
سب امور بہت کھلے کھلے تحریر کر دیے ہیں اپنی شراب خواری۔ اپنی ابوالفضل کے خلاف سازش سب کا برملا
تذکرہ کیا ہے۔ اور زنجیر انگلن کی بابت خوب برائی کی ہے کوئی قاتل اپنے رقیب کو قتل کر کے اس پر علانیہ خوشی کا اظہار نہ کریگا۔
واضح رہے کہ توزک جہانگیری کی تکمیل معتمد خاں نے بزمانہ شاہجہاں کی۔ کامگار حسین نے جو تالیف کی
وہ شاہجہاں کے حکم سے کی۔ شاہجہاں کی نورجہاں سے موافقت نہ تھی اور نہ اس کو اس سے کوئی ہمدردی
تھی۔ اس کے عہد کے مورخوں نے جب شاہجہاں اور نورجہاں کی باہمی چپقلش کا تذکرہ کیا ہے جو جہانگیر کے
آخری ایام میں حصول اثر و اقتدار اور جانشینی کے لئے ہوتی رہی تو علانیہ شاہجہاں کی طرفداری کی ہے۔ اور
نورجہاں کی برائی کی ہے۔ اس پر بھی وہ کسی جگہ بھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں کرتے جس سے یہ افسانہ معتبر معلوم ہو
حالانکہ یہ واقعہ کہ نورجہاں نے اپنے پہلے شوہر کے قاتل سے بہ کمال بے اصولی و بے شرمی نکاح کر لیا تاکہ عروج و
مرتبہ حاصل ہو ان کے لئے ایک اچھا شگوفہ فنکاری کے لئے ہو سکتا تھا۔
کہا جا سکتا ہے کہ دربار کے ان مورخین نے اور خود شاہجہاں نے عمداً اس کا تذکرہ نہ کیا جہانگیر کی
بدنامی بھلا شاہجہاں کیونکر گوارا کرتا؟ اس کی بدنامی شاہجہاں کی اپنی بدنامی اور شاہی خاندان کی بدنامی
تھی!۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو درست بھی تسلیم کرلیں تو فوراً ہی عہد مغلیہ کے یورپی سیاحوں کا خیال آتا ہے
ان کو تو اس کا کوئی خوف اور لحاظ ہرگز نہ تھا۔ وہ علی العموم شاہان مغل کی بدگوئی ہی کرتے رہتے ہیں۔ کہنا
چاہیے کہ انھوں نے اس کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انھوں نے یہ تک کیا ہے کہ نورجہاں اور شاہجہاں
جہانگیر اور اس کی سوتیلی ماں کے مابین ناجائز تعلقات قائم رہنے کا حوالہ فراہم کیا ہے۔ باوجود اس دریدہ
دہنی کے انھوں نے ہرگز ہرگز جہانگیر کے اس افسانوی جرم کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ وہ یہ ضرور تحریر کرتے ہیں کہ

نورجہاں کون تھی؟ اس کا شوہر بنگال میں کیوں کر مرا کب اس کی بادشاہ سے شادی ہوئی اور اس نے کس طرح
اثر معاملات سلطنت پر حاصل کرلیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ نورجہاں سے جہانگیر کو عشق بادشاہزادگی
سے شروع ہوگیا تھا۔ ہاکنس طامس رو۔ اڈورڈ ٹری۔ ولیم فنچ پیٹر ڈیلاوالا کسی نے بھی اس افسانہ کا ذکر
نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس کے عہد کی بابت اقسام کی غلط سلط باتیں انھوں نے تحریر کی ہیں۔ ناممکن تھا کہ اگر
جہانگیر نے واقعتاً اس اپنے افسانوی جرم کا ارتکاب کیا ہوتا تو یہ یورپی سیاح خاموش رہتے۔ ایسے عظیم
واقعہ کا ان کے کانوں سے پوشیدہ رہنا بھی بعید از عقل ہے۔ شاہجہاں کے عہد کے اواخر میں ڈاکٹر برنیر ایک انگریز
وہاں آیا تھا اس نے جہاں آرا اور روشن آرا پر اقسام کے بہتان لگائے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں آرا کو شاہجہاں سے
ملوث ہونے کی بابت ذکر کیا ہے۔ ایسے بے اصول اور نمک حرام ملازم نے بھی گو نورجہاں اور جہانگیر کو ہر
طرح سے برا بھلا کہا ہے لیکن اس افسانوی عشق و محبت کا کوئی حوالہ بھی اس نے نہیں دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے تاریخی حوالوں سے بحث کی۔ اب عقلی اور منطقی دلائل سے اس کو پرکھا جائے گا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیونکر اکبر بادشاہ کا سا حاکم کہ جس کے تدبر نے اس کو یہ بات سمجھائی تھی کہ ازدواجی
تعلقات قائم کرکے ان سے سیاسی اور معاشری فوائد حاصل کئے جائیں جہانگیر و نورجہاں کے عشق کا حال
سنکر جب کہ وہ عنفوان شباب میں تھے بجائے ان دونوں کے نکاح کی منظوری دینے کے شیر افگن سے اس کا نکاح کرا سکتا تھا

اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی وجہ سے اپنے ایسا کر دیا تو پھر بھلا یہ امر ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ جہانگیر کے سے بد
مزاج لا اُبالی شاہزادے کی مصاحبت میں شیر افگن خاں اس کے رقیب کو متعین کرنے پر راضی ہوا ہوگا؟

پھر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر شیر افگن واقعتاً جہانگیر کا رقیب تھا تو اس نے اس کو اپنی مصاحبت میں امن
چین سے کیوں کر رہنے دیا ہوگا۔ اور کس طرح اس کو اس نے اپنی صید افگنی میں شرکت کا حق دیا اور اسے خطاب عطا کیا؟

فرض کیا کہ اسے باپ کی نارضامندی کا ڈر تھا تو وہ اپنی بادشاہت کے بعد یہ امر کر سکتا تھا کہ اس کے
رقیب کا چپکے سے خاتمہ ہو جائے لیکن نہیں اس نے اس کو ترقی دی۔ واضح رہے کہ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی
ایک بغاوت اس کے لڑکے خسرو نے برپا کی تھی اور اس میں شیر افگن خاں کی شرکت کا الزام ثابت ہوچکا تھا۔
جہانگیر نے اور سب باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی ہیں وہ شیر افگن خاں کو بھی اس الزام کی تحت ٹھکانے
لگا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور اس لئے نہ کیا کہ شیر افگن سے کوئی اور وجہ پرخاش ہی نہ تھی وہ اس کا
رقیب ہی نہ تھا اب خود نورجہاں کی بابت غور فرمائیے وہ ایک غیرت دار عفیفہ خاتون تھی نیک تھی شریف تھی

شریف زادی تھی جہانگیر کے مرتے ہی اس نے بقیہ تمام عمر عبادت میں صرف کی۔ اپنے اس عالی مرتبت شوہر کے مرنے کے بعد جیسے اسے ملکہ زمانی بنا دیا اس نے عیش و آرام اپنے پر حرام کر لیا۔ ایسی خاتون نے بھلا کس طرح اپنے خاوند کے قاتل سے عقد کر لیا ہوگا؟ ایسی خاتون کی بابت ایسا خیال کرنا شرافت اور نسائیت کو رذالت سے بدل دینا ہے۔

لیو نکر ممکن ہے کہ تاریخ ہند کے افسانہ نگار پدمنی کی بابت لکھ دیتے ہیں کہ اس نے غیر کے قابو میں نہ آنے کے خیال سے خود کو زندہ جلا دیا اور نورجہاں کو اس درجہ رذالت پر خاموش بتایا ہے وہ راجپوتی نسل کی تھی تو یہ ایرانی اور میرزادی تھی۔ مانا کہ انسان آخر انسان ہے اور اس سے سو طرح کی خطائیں سرزد ہوتی ہیں لیکن آخر اس کی کوئی حد بھی تو ہے۔ اگر تیر برائی پر راضی ہونے کے بعد انسان مشکل سے پھر اچھے کاموں کو کرنے کے قابل بنتا ہے اس کی زندگی اور دیگر خطاکاریوں سے ملوث نظر آتی ہے۔

پھر بھی ہم فرض کرتے ہیں کہ نورجہاں شریف اور غیرت مند سب کچھ تھی مگر اس کو کیا کرتی کہ جہانگیر نے اسے جبراً اپنی بیوی بنا لیا اور خود کشی کرنے نہ دی۔ پھر خود کشی حرام بھی تو ہے! لیکن اس معروضے کے ساتھ ساتھ یہ امر بالکل عیاں ہے کہ جہانگیر اور نورجہاں کے تعلقات بالکل مخلصانہ اور عاشقانہ تھے دونوں میں حد درجے کی گرویدگی تھی۔ زبردستی کے نکاح کے بعد اس طرح کی زندگی کی کم امید کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ شریف اور غیرت مند تھی تو کسی طرح وہ اپنی زندگی کے اس نئے دور سے خوش نہ رہتی!

اس کے بعد ذرا اس کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قطب الدین خاں کا بنگالے پر تقرر کیوں ہوا؟ بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنے ہمدم و ہمراز معتمد کوکے قطب الدین خاں کو اس لئے بنگالے کا صوبہ دار بنایا کہ وہ چپکے چپکے شیر افگن خاں سے اس کی بیوی کو طلاق دلوائے اور دربار کو روانہ کر دے ورنہ شیر افگن خاں کا خاتمہ کر دے۔ اس کام کے لئے معتبر آدمی کی ضرورت تھی اور تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قطب الدین خاں کا اس ناپاک غرض کے لئے بنگالہ روانہ ہونا تاریخی اور عقلی طور پر بالکل بے بنیاد امر ہے۔ مان سنگھ ناظم بنگالہ راجپوتوں کا مہرہ تھا اس نے خسرو کی بغاوت میں اس کا ساتھ دیا بنگالے میں اس کا رکھنا خلاف مصلحت تھا۔ بادشاہ سے اس کے تعلقات سرد ہو چکے تھے وہ اس سے بدگمان تھا لہٰذا بنگالے کے سے متمول صوبے سے جو وہاں کے افغان صوبہ داروں کی وجہ پر خطر بھی تھا اس کو ہٹانا اور اس کی جگہ اپنے معتمد علیہ شخص کا وہاں تعین عین مصلحت تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ شیر افگن پر یہ جو الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے بغاوت کرنی چاہی تھی محض الزام ہی ہے

اور محض بہانہ ہے لیکن جہاں اس کا تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہاں یہ امر بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس عہد میں کسی بھی امیر کا موقع پاکر سازش کرنا عجیب امر نہ تھا۔

لوگ شیر افگن خاں اور قطب الدین خاں کے ناگہانی قتل کو با معنی امر کہتے ہیں کیونکہ اس کا امکان ہے کہ قطب الدین خاں نے ملاقات وہی کا حرف مطلب کہکر شیر افگن کو مشتعل کر دیا اور لہذا اتنی خونریزی ہوئی۔ ہو نہ ہو ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ جب شیر افگن خاں الزامات بغاوت و سرکشی کی جواب وہی کے لئے لشکر میں آیا تو دونوں طرف سے دور اندیشی نہ ہوئی مصلحت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا۔ اشتعال طبع کی اور یہی وجوہات تھیں کہ الزام کی جوابدہی کو بلایا اور بغیر جواب لئے گرفتار کرنا چاہا مرنے مارنے پر ایسے وقت تیار ہو جانا عین مکر ہے

یہ غلط ہے کہ نورجہاں کو شیر افگن کے مرنے پر قیدی بنا کر دربار روانہ کیا۔ شوہر کے مرنے پر بیوہ کا والدہ کے پاس جانا ایک معمولی سا امر ہے۔ اور اسی طرح سے یہ واقعات بھی کہ نورجہاں نے والدہ سلطانہ کی مصاحبت کا اعزاز حاصل کر لیا مینا بازار میں بادشاہ سے دوچار ہوئی اس کی دلبری اور آخر ملکہ زمانی اور بادشاہ بیگم کا اعزاز حاصل کیا۔ اس روایت میں ہر امر ممکن معلوم ہوتا ہے۔

غرض یہ واقعہ کہ نورجہاں سے جہانگیر کو عالم شاہزادگی میں عشق ہوا لیکن اکبری احکام سے اس کا نکاح شیر افگن سے ہو گیا۔ جہانگیر نے اس کا برا مانا۔ بادشاہ ہو کر شیر افگن کو مروا ڈالا اور نورجہاں کو گرفتار کر کے محل شاہی میں طلب کیا اور ترغیب دی کہ وہ بادشاہ کی گود میں آ جائے۔ نورجہاں کے انکار پر بادشاہ نے اسے اپنی والدہ کی مصاحبت میں رکھوا دیا اور پرچاتے پرچاتے للچاتے للچاتے آخر اسے اپنا کر لیا محض بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے اور واقعتاً بھی محض نامعقول امر ہے جو افسانہ ہے اور بس۔

غور کیجئے کہ خود اس افسانوی واقعہ کا آخری انجام اس کے آغاز و ابتدا کے لحاظ کرتے کس طرح کا ہونا چاہئے تھا دنیا کے اخلاقی مذہبی اور معاشری قوانین کی رو سے یہ حرکت نہایت رکیک اور شرمناک ہے کہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے انسانی خون بہایا جائے۔ جو بندہ نفس اس کے لئے قتل و غارت گری پر اتر آئے گا وہ حد درجہ کا سیاہ کار ہو گا۔ اگر افسانہ نورجہاں و جہانگیر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ چونکہ وہ کسی اور مرد کی بیوی پر عاشق تھا اور بادشاہ بنجانے کے بعد اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنے اس غلام کو بے گناہ قتل کرواتا ہے کہ کسی طرح سے اس کی بیوی ہاتھ آئے۔ لہذا نورالدین محمد جہانگیر حد درجہ کا سیاہ کار اور سفاک تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے اس بیان کو درست خیال کرنے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے بے اصول شخص کا طرز عمل اس وقت کے لئے کیا ہونا چاہیئے کہ جب رقیب میدان سے اس کے منشا کے مطابق قتل ہو چکا ہے اور منظور نظر معشوق محل میں آ چکا ہے؟ جس کو ایک انسان کے قتل کرنے میں کوئی باک نہ رہا ہو وہ بے محابا اپنے مطلوب کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں اس نے ایک بے اصولی کر دی وہاں اس کو اور بھی بے اصولیاں کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ وہ فوراً ہی شب وصل کا سامان کرے گا اور اس کے لئے زبردستی کرے گا۔ اور دیگر جرائم کا بھی ارتکاب کرے گا۔ جہانگیر سے اگر شیر افگن کا قتل منسوب کیا جاتا ہے اور اسے اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہ امید کرنی چاہیئے کہ نور جہاں کے لئے وہ بہت بے چین تھا۔ اس نے اس کے دربار میں آنے کے بعد نہ تو عدت کا انتظار کیا ہوگا اور نہ نور جہاں کی مرضی دریافت کی ہوگی۔ حالانکہ خود روایت یہ کہتی ہے کہ بادشاہ نے پیغام دینے شروع کئے کہ مجھ سے نکاح کرلو اور اسی طرح پر چار جانے کے بعد آخر سات سال گزرنے پر دونوں کا نکاح ہوگیا۔

پس چونکہ مجرم کے مجرم قرار پانے میں اس کے الزام میں ایک طرح کی مطابقت ہونی ضروری ہے اور جہانگیر پر جو الزام عاید ہوا ہے اس کا آغاز اور انجام بالکل ایک دوسرے سے مطابق نہیں ہے انہیں کسی طرح کا انطباق نہیں ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہانگیر پر یہ الزام سراسر غلط اور افترا ہے کہ اس نے شیر افگن کے قتل کا حکم دیا کہ نور جہاں اسے حاصل ہو جائے پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ افسانہ ہی افسانہ ہے تو کس طرح اس کا تاریخ میں تذکرہ آگیا کیونکر اتنے سارے لوگ اس کی روایت کو نقل کرتے رہے۔ تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا ممکن ہے کہ اس سلسلے میں لوگ یہ بھی کہیں کہ "واقعہ نور جہاں اور جہانگیر کی شہرت ایسی عام ہے اور بچپن سے ہمارے کان اس واقعہ کے سننے کے ایسے خوگر ہیں اور ہو چکے ہیں کہ اگر کہیں یہ واقعہ اب غلط ثابت ہو جائے گا تو ہمیں ایسا صدمہ ہوگا جیسے کسی ہمدم دیرینہ کے بچھڑنے سے ہوتا ہے"۔ رہنے بھی دو کیا ہوا جو ہم نے ان کو عاشق و معشوق بنا لیا وہ ہمارے تمہارے کچھ نہ تھے۔"

اس آخری استدلال کا جواب تو خاموشی ہی سے دیا جائیگا لیکن اس کا جواب عرض کئے دیتے ہیں کہ دو نسلوں کے گزر چکنے کے بعد محمد صادق تبریزی خافی خاں رسوجن رائے نے اس افسانے کو اپنے تخیل سے پیدا کیا اور پھر دقلم کر دیا۔

دنیا میں اکثر واقعے جھوٹ سوٹ مشہور ہو جاتے ہیں اور بمشکل اس کا پتہ چلتا ہے کہ کس نے انکو شہرت دی کیوں دی گو بعد ازاں تحقیق اور دریافت سے انکو بے بنیاد مان لیا جاتا ہے بے فکری کا یہ مشغلہ ہے کہ واقعات گھڑے جائیں

افسانے لکھے جائیں پھر ان کو بے فکرے ہی شہرت دیتے ہیں یہی حال قصہ نور جہاں و جہانگیر کا بھی ہے۔

کیا کہیئے؟

(جناب محمد جمیل احمد خاں صاحب کوکب شاہجہان پوری)

دوا عبث ہے دعا بے اثر ہے کیا کہیئے
ستم ظریف سہی چارہ گر ہے کیا کہیئے

بہائے طاقتِ نظارہ نقدِ جاں بھی نہیں
متاعِ ہوش گراں کس قدر ہے کیا کہیئے

تری تجلّیٔ عریاں بھی بے حجاب نہیں
نقاب کثرتِ تارِ نظر ہے کیا کہیئے

ستائے نزع میں جی بھر کے مجھ کو موجِ نفس
سمجھ رہا ہوں کہ بادِ سحر ہے کیا کہیئے

تڑپ تڑپ کے دلِ مضطرب کو بہلایا
کسے فغاں پہ گمانِ اثر ہے کیا کہیئے

جہاں میں ہم کو بھی احساسِ رنج و راحت ہے
مگر سمجھتے ہیں یہ رہگذر ہے کیا کہیئے

ہوا خیال یہ پیری میں باعثِ تسکیں
کہ شمعِ عمر چراغِ سحر ہے کیا کہیئے

اگر نہیں اثرِ سجدہ اے جبینِ نیاز
یہ پائے ناز نہیں سنگِ در ہے کیا کہیئے

وفورِ ضعف سے غربت میں دوشِ ہستی پر
یہ جانِ زار گراں کس قدر ہے کیا کہیئے

وہ برقِ حسنِ جہاں سوز اور یہ آنکھیں؟
سوائے اس کے فریبِ نظر ہے کیا کہیئے

ستم کی حد ہے! میرے عرضِ حال پر کوکب
وہ بولے غیر سے شوریدہ سر ہے کیا کہیئے

دکن میں مسلمانوں کے قدم

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

ملک عبدالملک مروانی کے زمانہ سلطنت یعنی سنہ ۹۰ ہجری میں جب حجاج عرب وعجم کے صوبوں کا حکمراں ہوا تو بنی ہاشم کے شریف ونجیب لوگ جہاں مل جاتے ہر چھوٹا بڑا الزام لگا کر حجاج کے حکم سے قتل کر دیے جاتے اور ان کے گھروں میں آگ لگا دی جاتی۔ ایک زمانہ اس کے ان مظالم سے تنگ آگیا۔ جناب نبوت آب محمد مصطفےٰ صلعم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد اور دوستوں میں سے کثرت سے لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور سب اس کی بے پناہ زیادتیوں سے عاجز ہو کر نہایت پریشان حالت میں اپنے وطن اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ہاتھ اٹھا کر مال و دولت اور بیوی بچے ساتھ لیکر سات آٹھ جہاز دیگ جزائر عرب کے کنارے سے کنارے روانہ ہوئے۔ اور دکن کے ساحلوں کی طرف جو اس زمانہ میں۔ دابل چیول کنبائت، بھروچ، اور مچھلی بندر نام سے مشہور تھے۔ جہازوں کا رخ کر دیا۔ موافق و مخالف ہوا کی مدد سے ہر جہاز ایک ایک بندرگاہ پر جا پہنچا۔

جب جہازوں سے اترنے کا وقت آیا تو چونکہ ہر جگہ کے فرماں روا راجہ وزمیندار اسلام کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اس لیے ان لوگوں کا مزاحمت کرنا اور لڑنے پر آمادہ ہونا بالکل قدرتی تھا مجبوراً ان پریشان اور مصیبت کے مارے مسافروں نے عاجزی اور خوشامد درآمد سے کام چلایا اور بڑی مشکل سے ان کو منا کر عہد و پیمان کیا کہ ہم اپنے دین و مذہب کو چھپائے رکھیں گے اور اپنے اپنے گھر میں عبادت کر لیا کریں گے۔ اور ظاہرداری کے لئے اس ملک کے رسم و رواج کے موافق اپنی وضع قطع میں مناسب تبدیلی پیدا کر کے جہازوں سے اترے۔

دکن میں مسلمانوں کی بنیادی معاشرت۔ اس اجنبی ملک میں چونکہ مسلمانوں کے نئے نئے قدم آئے تھے اس لئے یہ زمانہ ان کے لئے بڑی ہوشیاری و احتیاط سے کام لینے کا تھا۔ اذان کہنے قرآن پڑھنے اور بعض عبادتوں کے بجالانے میں بڑی کوشش یہ کی جاتی تھی کہ دوسروں کے کان میں آواز نہ جائے ہر ایک نے دکنیوں کے پیشے اور کاروبار ان میں گھل مل جانے کے لئے اختیار کر رکھے تھے۔ بڑے صبر کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت

چھیلتے اور زندگی کے دن کاٹتے تھے۔ چنانچہ اس طرف کے اکثر مقامات میں اب تک مسلمان شرفا کی عورتیں جو قوم عرب اور نوائط کہلاتی ہیں اور اُن لوگوں کی بیویاں جو اپنے آپ کو حضرت زبیر طلحہ اور دوسرے اصحاب رسول کی اولاد ظاہر کرتی ہیں ہنود عورتوں کا لباس پہنتی ہیں۔

غرض اس طرح چھپ چھپا کر رہتے اور اپنے مذہب کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ شادی و کتخدائی میں بالکل اہل دکن کی رسوم اور آداب کی پیروی کرنا پڑتی تھی۔ مثلاً شوہر کے مرنے کے بعد جوان عورتیں مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور تمام روم و ایران و توران ممالک اسلام میں اب تک دوسری شادی کرتی ہیں بلکہ اُن کے ورثا مجبور کر کے اُن کا دوسرا نکاح کر دیتے ہیں لیکن ہندوستان میں مسلمان شریفوں کے یہاں جن سے مراد اہل عرب ہیں اس فعل کو برا سمجھ کر (حالانکہ یہ عین خدا کے حکم اور محمدی شریعت کے مطابق ہے) ترک کر دیا گیا ہے اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف چل رہے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ایک مدت تک ان گراہوں میں رہنے اور غربت و تکلیف کی حالت میں بسر کرنے کے بعد جب نئی نسلوں کی آمد شروع ہوئی اور دیکھا کہ ہندؤں کے تمام فرقوں میں جن کی کوئی تعداد نہیں ہے۔ پانچ قومیں یعنی برہمن۔ کھتری۔ راجپوت۔ بقال اور کائستہ شریف سمجھی جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ اپنی شیر خوار لڑکی کو بھی اگر کسی کے نکاح میں دیدیں۔ اور اُس کا شوہر پہلی رات ہی کو مرجائے تو بھی اس کا دوسرا نکاح نہیں کرتے۔ اور چونکہ ہر قوم کو شریف، ہر ملک کے دوسرے شریفوں میں اپنی شرافت کی آن رکھنا چاہتے ہیں اس لئے طبعی غیرت نے تقاضا کیا ہم کیوں ان قوموں میں سب سے زیادہ ذلیل سمجھے جائیں۔ اور بیوگان کا نکاح کرنے کی رسم غیرت و آبرو اور شرافت و خاندانی عزت کے خلاف سمجھ کر بالکل ترک کر دی۔ مذہب کے احکام اور بزرگوں کی پیروی کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ یہ بات عقل و شرع کے اعتبار سے اچھی نہیں۔ اور اس میں بہت سے ایسے فساد پیدا ہوئے ہیں جن کی تشریح نہ کرنا بہتر ہے۔

قدیم دکنی سلطنتوں کی خصوصیت | اس سلسلہ میں ان عربی النسل مسلمان دکنیوں کی یہ احتیاط تعریف کے قابل ہے کہ انھوں نے اہل عجم کے رواج کے خلاف جن کا عمل ہی اس پر ہے کہ "اضیعوا انسابہم" نسبوں کو بھلا دو اُن سے بے پرواہ ہو جاؤ۔ نسل کی شرافت اور کفو یعنی خاندانی پیوند کا دستور ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور اپنے ہی ہم قوموں یا ایسے سید کے سوا جو صاحب شجرہ ہو اور اُس کے ننھیال و دادیہال دونوں برابر کے شریف ہوں سخت سے سخت پریشانی کی حالت میں بھی بیٹی لینے دینے کے تعلقات نہیں رکھے۔ اب بھی

عرب نسل کے خاندان ان اصولوں کے بہت پابند ہیں وہ لونڈی یا ذلیل طبقہ کی فاحشہ عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوئی ہو اس کو کبھی اپنا وارث نہیں بناتے، اگر ان میں سے کوئی شخص اس قانون کے خلاف عمل کرتا ہے تو اس کو اپنی قومیت سے خارج کرکے شادی غمی کے موقعوں پر اس سے نہایت نفرت کے ساتھ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کی نسبت رکھنا نسل کی خرابی اور شرافت کی کمی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اسی طرح دوسری بری اور خلاف شرع و تہذیب رسمیں مثلاً گھر میں گانے ناچنے والی لونڈیاں تیار کرنا، خواجہ سراؤں سے پردہ نہ کرنا، شادی کے زمانہ میں گھر کے اندر مستورات کے سامنے نہایت بے غیرتی کے ساتھ رقص و سرود کے نام سے طرح طرح کی بیہودگی اور فحش گوئی روا رکھنا اس قوم میں بالکل نہیں حالانکہ آج کل غرور و دولت کے باتوں میں یہی باتیں دنیاوی لذتوں کا بہت بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔

اگرچہ ہندوستان کے تمام شہروں کے شرفاء دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسی لغویات کا ہم میں رواج نہیں ہے لیکن تاریخ اقوام کے مطالعہ و تفحص کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ دولت و تونگری کی آسائش یا دبار تنگدستی کی پریشانی میں کہ ان ہی دونوں حالتوں میں آدمی بالکل بے قابو ہو جاتا ہے۔ کوئی قوم لذت جسمانی اور عیش حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہیں رہتی اور ایسے موقع پر کفو و حفاظت نسل کا سوال عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے یہ بات صرف احمد آباد کے شیوخ اور خاندیس کے شرفاء میں جو ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں اور بعض مشرقی سندھ کے شرفاء اور مشائخ میں دیکھی گئی لیکن اب فساد زمانہ کی وجہ سے ان لوگوں میں بھی کفو کا لحاظ بہت کم ہوتا جاتا ہے۔[1]

القصہ ایک مدت کے بعد اسلام کی بنیادیں خفیہ طور پر دکن کے ساحلی مقاموں اور بندرگاہوں میں مضبوط ہوگئیں گو اس زمانہ میں سلطان محمود غزنوی نے اطراف ملک ہند میں جونا گڈھ سورٹھ تک پہونچکر حضرت سید المرسلین خاتم النبین محمد مصطفی صلعم و روحی فداہ کے مبارک مذہب کی دھوم مچادی۔ پھر غزنوی خاندان کے بعد سلطان معز الدین نے جو بعد میں سلطان شہاب الدین غوری غازی کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ ہندوستان اور اطراف دہلی کے بعض شہروں پر قبضہ کرکے بے دینی دور کرنے اور اسلام کو رواج دینے کی کوشش کی اور روز بروز مسلمانوں کی قوت و مضبوطی میں اضافہ ہوا لیکن اصل میں دکن کے شہر اس وقت تک آزادی کے ساتھ نور محمدی صلعم سے منور نہ ہوئے تھے۔

سنہ ۶۹۱ ہجری میں سلطان علاء الدین بن سلطان جلال الدین بادشاہ دہلی کا بھتیجا اپنے چچا کی اجازت حاصل کئے بغیر شہزادگی کے زمانہ میں بے شمار لشکر کے ساتھ دولت آباد دکھن آیا۔ جو اس زمانہ میں قلعہ دیوگیر کے

---

[1] یہ خافی خان نظام الملکی کی رائے ہے جو اپنے زمانہ کے حالات دیکھ کر قائم کی تھی۔ اب تو زمانہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ اس زمانہ میں کفو کا لحاظ بہت ہو چلا تھا تو اب اس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

نام سے مشہور تھا۔ اور چند ماہ کے محاصرہ کے بعد راجہ دیوگیر کو باج گزار بنا کر وہاں ایک مسجد تعمیر کرتا ہوا واپس ہوا پھر جب خود بادشاہ ہوگیا تو ایک بار پھر اور فوج بھیجی اور خود بھی ایک بڑے لشکر کے ساتھ اُس ملک کے بڑے بڑے بے دین اور نافرمان زمینداروں کو سزا دینے میں مصروف ہوا۔ اکثر جگہوں میں مسجدیں بنوائیں۔ اور بعض مقامات سر کرنے کے بعد مسلمان حاکم مقرر کئے۔ اور وہاں کا انتظام سپرد کر کے دہلی مراجعت کی۔ سلطان علاءالدین کے جانے کے بعد یہ ملک اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد تغلق کا زمانہ آیا جس نے سنہ ۷۲۵ھ ہجری میں تمام ممالک ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اور خود دکن میں آکر دیوگیر کو فتح کرنے اور وہاں کی گمراہیاں مٹانے کی کوشش میں مصروف ہوا اور بیجانگر تک جس کے بعض متعلقہ حصے کرناٹک بیجاپور کہلاتے ہیں اور وہاں کا راجہ مستقل و خودمختار تھا۔ حملہ کر کے علاءالدین کی تیار کی ہوئی مسجدوں کو پھر سے تعمیر کیا۔ اور تھوڑے عرصہ تک قلعہ دیوگیر کو اپنا پایہ تخت بنا کر دولت آباد کے نام سے موسوم کیا۔ اور دہلی میں اپنے آباد کئے ہوئے تمام وطن گزینوں کو زبردستی جلاوطن کر کے یہاں بسایا۔

اگرچہ ابتدائے اسلام سے دہلی کے کسی بادشاہ کو محمد تغلق کی طرح ملک گیری میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس کے مظالم کی کثرت سے ہندوستان کے مفتوحہ شہر پھر اس کے قبضہ سے نکل گئے ہر طرف بدامنی کی شکایت عام ہوگئی۔ ملک دکن میں سلطان علاءالدین گانگو بہمنی مستقل فرمانروا مقرر ہوا۔ اور اٹھارہ واسطوں تک اس کے خاندان میں دکن کی سلطنت منتقل ہوتی رہی۔ اس خاندان نے بیجانگر تک سے خراج لے کر حضرت خیرالانبیاء صلعم کے دین مبین کو رواج دیا۔ محمد تغلق کی بداعمالیوں سے دولت آباد جیسا شہر بالکل ویران ہوگیا۔ سوائے حوض تغلق کے جو اُس کے ظلم کی یادگار ہیں باقی ہر کوئی چیز سلامت نہیں

سکوتِ شب

(از جناب اکبر علی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کالج)

گھڑی نے ابھی ابھی دو بجائے ہیں جھلملاتی ہوئی شمع کا زرد رو شعلہ اونچا نیچا ہو رہا ہے۔ سنتری نیند کا متوالا ہو کر اپنے فرض کو بھول گیا ہے امیر اور مزدور خواب شیریں کے مزے لے رہے ہیں۔ زاہد و تفکر، جرم و عصیاں رندی و نومیدی کے سوا ہر چیز پر خواب طاری ہے۔ مے نوش اور ایک بار ہلاک کر دینے والا جام پُر کر رہا ہے۔ دزد جفاکار اپنے نصف شب کے چکر میں مشغول ہے۔ خودکشی کرنے والا اپنی گراں بہا زندگی کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔

مجھے ضرورت نہیں کہ گذشتہ المناک واقعات کا تذکرہ کروں یا اپنے ذی فہم ہمعصروں کی خامیوں کا راز افشا کروں بلکہ ایسے پرسکوت لمحات میں تو ہمیں اُن مقامات کی سیر کرنی چاہیئے جہاں کچھ عرصہ پیشتر ہر لمحہ بدلنے والی بیہودہ شان و شوکت اور خودنمائی سیر کر رہی تھی اور اب ایک ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر خاموش ہوگئی ہے۔

ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ قریب المرگ شمع سے زرد رو شعلے نکل رہے ہیں۔ اس سکوت کا اس میں یا تو گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے یا دور سے پہریدار کتے کے بھونکنے کی آواز۔ انسانی تمکنت کی تمام نمایش ماند پڑ گئی ہے۔ انسانی خودنمائی کی حقیقت کو تہی دامن ثابت کرنے کے لئے ایسا ایک پرسکوت لمحہ کافی ہے۔

وہ وقت بھی عنقریب آئے گا جب یہ عارضی سکوت دائمی سکوت بن جائیگا اور یہ عظیم الشان شہر اپنے زوال پر کی طرح صفحۂ دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا اور اپنی جگہ صرف ایک لق و دق میدان چھوڑ جائے گا۔

کسی زمانے میں لندن جیسے اور بھی شہر تھے جن کی شان و شوکت کی دھوم دور دور تھی جنھوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھی اور اپنی سرحدوں کو لامحدود بنا دیا تھا جن کو یقین تھا کہ اُن کی شان و شوکت فنا کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہے گی لیکن یہ ایک فریب تھا جس کے وہ شکار بن گئے اور آج دنیا نے دیکھ لیا کہ انہیں سے بعض کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا

الم زدہ مسافر اُن کھنڈرات کی سیر کرتا ہے ان سے حکمت و عبرت سیکھتا ہے اور بے ثباتی عالم کو محسوس کرتا مسافر نقش حیرت بن کر ان پسماندہ نشانوں کو دیکھ کر کہتا ہے یہاں انکا قلعہ تھا جو اب گھانس سے مستور ہے وہاں انکا دربار تھا جو اب حشرات الارض کا مسکن ہے ان کے معبد رقص گاہیں یہاں تھیں جو اب کھنڈروں کی صورت میں نظر آرہی ہیں وہ دنیا سے نیست و نابود ہو گئے۔ شب و روز کی عیاشی اور حرص و آز نے انھیں کمزور کر دیا۔ حکومت کا خزانہ عیش پرستی کے لئے وقف کر دیا گیا۔ نااہلوں کو اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا گیا اور سوسائٹی کے قابل افراد کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

انکی عیاشی اور روز افزوں دولت نے حملہ آوروں کو تسخیر مملکت کی ترغیب دی جنھیں پہلی دفعہ تو ناکامی ہوئی لیکن انھوں نے استقلال سے کام لیا اور متواتر حملوں سے ملک کو فتح کرکے چھوڑا۔ حامیان ملک کو نیست و نابود کر دیا۔ انکی مال و زر پر خود متصرف ہوگئے

انہی بازاروں میں جہاں چند گھنٹے قبل بھیڑ لگی ہوئی تھی اب بہت کم آدمی چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں اور جو نظر آ رہے ہیں وہ بھی بے حجاب ہوکر پھر رہے ہیں اور اپنے فسق و فجور، بے حیائی اور حرمان نصیبی کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔

وہ سامنے کون لوگ ہیں جنھوں نے فرش راہ کو اپنا بستر بنا رکھا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے غم و الم کو بھول گئے ہیں؟ یہ نووارد مسافر آوارہ گرد، لاوارث یتیم ہیں جن کی خستہ حالت اصلاح کی محتاج ہیں۔ جن کی داستان الم ہمدردی و چارہ سازی کی منت کش ہیں۔ دیکھنے والے انسے خوف کھاتے ہیں۔ بعض انمیں سے ایسے ہیں جن کے جسم عریانی کی حقیقی تصویریں ہیں، بعضوں کو متعدی امراض نے گھلا گھلا کر نحیف کر دیا ہے۔ دنیا نے اُن کو خیر باد کہہ دی ہے، سوسائٹی نے انسے بے اعتنائی اختیار کر رکھی ہے اور انکو برہنگی اور فاقہ کشی کے سپرد کر دیا ہے۔

ان تھرتھراتے ہوئے جسم والی عورتوں نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ انکے حسن و جمال کا شہرہ دور دور تھا۔ مطلب پرستوں نے انکو سبز باغ دکھا کر خوب خوب چکمے دئے، ہمیشہ انکے حسن سے مستفید ہوتے رہے اور جب انکی بہار جوانی ختم ہوگئی تو اُن عیاروں نے انکو گھروں سے نکال کھڑا کیا تاکہ یہ نازک بدن ٹھٹھرتے ہوئے جاڑوں کی سختیاں برداشت کریں اور فاقوں کا شکار ہو جائیں

اب شاید یہ مصیبت کی ماری اپنے بے وفا آشناؤں کے دروازوں پر پڑی ہوئی اُنسے فریاد کر رہی ہیں اور رحم کی طالب ہیں لیکن رحم کیسا! ان مطلب پرستوں سے سوائے طعن و تشنیع کے اور کسی بات کی امید نہیں۔ یہ عبرت کا مقام ہے۔

ہائے! میں کیوں انسان پیدا کیا گیا اس لئے کہ دوسروں کو رنج و مصیبت میں دیکھوں اور انکی مدد نہ کر وں!

اے خانماں برباد لوگو! دنیا تمہیں لعنت ملامت کریگی لیکن تمہارے درد کی چارہ سازی کیطرف مطلق قدم نہ اٹھائیگی۔ بڑے لوگوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ مصیبتیں اور امراکی موہوم سے موہوم پریشانیاں نہایت فصاحت و مبالغہ سے بیان کی جاتی ہیں تاکہ ہماری ہمدردی اور توجہ کو انکی طرف منعطف کیا جائے۔ لیکن جب غریب روتا ہے تو کوئی اس کا شریک درد نہیں ہوتا۔ اُن پر طرح طرح کے ستم ڈھائے جاتے ہیں اور ہر قانون جو دوسروں کو اپنی پناہ میں لیتا ہے اُن کے حق میں دشمن ثابت ہوتا ہے۔

خدایا میرا دل کیوں اتنا اثر پذیر واقع ہوا ہے اگر تجھے ایسا ہی منظور تھا تو میری قسمت بھی ایسی بنائی ہوتی کہ میں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو سکتا اور اُن کی مدد کر سکتا۔

کیا ہی بدنصیب ہے وہ انسان! جس کا دل تو دردمند ہو لیکن اسمیں اتنی قوت نہیں کہ دوسروں کو غم سے نجات دلا سکے۔ آہ ایسے موقعہ پر دردمند انسان کی حالت طالب رحم سے بھی زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔

دکن کا ایک قدیم اردو شاعر
قیس

(جناب سید امین الدین صاحب نظام آبادی)

راقم الحروف کا چند روز سے قصبۂ قلعہ بالکنڈہ میں عارضی قیام ہے جو تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد میں واقع ہے یہ ایک قدیم بستی ہے یہاں کے "دکنی سپاہی" دولت آصفیہ کے نہایت جاں نثار اور جانباز ملازم گزرے ہیں جنہوں نے متعدد معرکوں کے علاوہ کھرلا کی مشہور و معروف لڑائی میں خوب شجاعت دکھلائی تھی جن کے واقعات مستند مکاتیب پارینہ میں محفوظ ہیں۔

یہ قصبہ اور اس کے ساتھ دوسرے قصبے مقرب خاں سپہ سالار عساکر عالمگیری کے حصے میں آئے اورنگ زیب عالمگیر نے فتوحات کے سلسلہ میں اپنے محبوب و جانباز سپہ سالار کو دکن میں چند قصبے بطور جاگیر عطا کئے اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا جس میں یہ قصبہ بھی شامل تھا۔

سپہ سالار موصوف کے سایہ میں بہت سے سپاہی بیجاپور اور اطراف و اکناف سے آکر اس قصبہ میں جمع ہو گئے اس کے ساتھ ساتھ علمی مذاق رکھنے والے افراد کا بھی اجتماع ہوا۔ سپہ سالار موصوف کے جانشین نسلاً بعد نسلٍ اُن لوگوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ اُس زمانہ کی فضا اور ماحول کے نظر کرتے اگر ایک طرف یہاں کے لوگ "فن سپہ گری" میں نمایاں خصوصیت اور اپنی شجاعت کی بدولت ممتاز شان رکھتے تھے تو دوسری طرف علمی مذاق میں بھی کسی اور قصبے کے باشندوں سے کم نہ تھے۔ اب انقلاب دہر کی وجہ سے ہر چیز تہ و بالا ہو چکی اور امتداد زمانہ کے سبب عجیب کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اصلی باشندے "بے روزگاری" کے بھوت کے شکار ہو گئے۔ اِن مشکلات کی وجہ سے یہاں کے علمی کارناموں کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

دورانِ قیام میں چند معزز اصحاب سے ملاقاتیں ہوئیں چونکہ یہ علاقہ راقم الحروف کا آبائی وطن بھی ہے۔ بہت سے اصحاب سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ایک معزز صاحب نے اثنائے گفتگو میں چند قدیم کتب کا اشارہ کیا اور اپنی عنایت سے کہنہ ذخیرہ سے دو کتابیں بغرض مطالعہ مرحمت کیں۔ جن میں ایک قلمی دیوان قیس بھی تھا۔

خدا جانے کتنے ایسے قدیم جواہر پارے بے التفاتی سے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اکثر قدامت پرست حضرات اشیاء پارینہ کو بنظر احترام دیکھتے ہیں اور تبرک جانتے ہیں یہ پاکیزہ جذبہ اس حد تک جائز بھی تھا لیکن بڑھتے بڑھتے

بخل کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ تبرکات "زیب طاق اور لقمۂ دیمک ہو کر پیوستِ خاک ہو جاتے ہیں اور یہ تبرکات نہ خود کی ذات مبارک کے لئے فائدہ رساں ہوتے ہیں۔ اور نہ دیگر اصحاب یا آئندہ نسلوں کے لئے۔ جب یہ تبرک پسندی مٹ جائے گی تعصب کی ظلمت دور ہو جائے گی اور جدید علمی شعاعیں کہنہ ذخیرہ کی تاریکی کو دور کر دیں گی تو بہت سے مدفونہ اور پارینہ اوراق آسمان ادب کے ماہ پارے بن جائیں گے۔

"دیوان فیض" ایک قلمی نسخہ ہے اس کی تقطیع اوسط ہے مجلد اور محفوظ حالت میں ہے۔ کوئی جزو یا کوئی ورق ضائع نہیں ہوا۔ کاغذ دبیز اور سفید ہے۔ اس دیوان میں ایک منقبت اور تقریباً گیارہ قصائد اور تین سو کے قریب غزلیات ہیں۔ ریختی کا بھی کچھ حصہ ہے۔

افسوس کہ شاعر کی لائف (سوانح حیات) جزواً یا کلاً نہیں لکھی گئی۔ بلکہ قصبۂ بالکنڈہ کے ایک معزز صاحب کے علمی مذاق نے مجبور کیا کہ وہ اس کی نقل کریں چنانچہ تمت بالخیر پر لکھتے ہیں :۔

"تمت بالخیر والعافیہ من ید سید زین العابدین ابن سید شاہ بندگی بادشاہ قادری مشائخ سکنۂ قصبۂ بال کنڈہ فی التاریخ بست و چہارم محرم الحرام ۱۲۶۳ھ ہجری بروز دوشنبہ وقت دو دنیم پہر روز در بلدۂ حیدرآباد" چھان بین سے اتنا تو معلوم ہو سکا کہ اس شاعر کا اصلی نام محمد صدیق تھا اور تخلص فیض۔ مگر افسوس کہ شاعر کی "لائف" کا پتہ نہ چل سکا۔ اس دیوان کے ناقل سید زین العابدین نے ہی نقل کرتے ہوئے (۱۳۱) صفحہ پر جو وجہ نقل تحریر کی ہے بجنسہ اس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے :۔

"درحینیکہ عاصی خاکپای اہل دین تشفیع المذہبین سید زین العابدین مشائخ ساکن قصبۂ بال کنڈہ سرکار ناندیڑ صوبہ محمدآباد بیدر ہمراہ خواجہ غلام قادر خاں صاحب منصبدار نائب[1] غلام حیدر خاں بہادر المخاطب بتقریب جنگ جنگ الدولہ و حاکم قصبۂ مذکور کہ برای انفصال مقدمہ زرداں دانکہ انداختہ مکان راجہ سائی طوائف داخل بلدہ شدہ بودند۔ بہ بلدہ حیدرآباد رسیدہ در مکان نائب صاحب معزحد اقامت انداختہ بودچوں باستماع اوازہ اشعار ریختہ وصیت حلاوت ریختہ ملاے محمد صدیق صاحب المتخلص فیض از نزئے نائب صاحب ممدوح شعلۂ اشتیاق سرمایہ صبر و قرار خاکستر گردانیدہ بود۔

لہذا بخواہش طرفین دیوان مسطور گرفتہ بجلدی تمام نقش تعلش برنگین کاغذ بستہ و از نظر ثانی ہم فارغ گردیدہ بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشت ہمدرین ایام راجہ بلدے بخش موقوف گردیدہ سراج الدولہ مراج الملک بہادر بعہدۂ دیوانی باستعانت فریزر[2] صاحب رزیڈنٹ انگریز رکیشے سرفراز شدند وہر طرف زدو سرما از حد زیادہ جاریست"

---

[1] FRAZER ۔ [2] انگریزی لفظ رزیڈنٹ کا مفرس ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری میں اس شاعر کا بہت چرچا اور خاصی شہرت تھی اور خاص و عام اس کے مداح اور ثنا خواں تھے۔

اقتباس ہٰذا کے ذیلی ٹکڑے سے پتہ لگتا ہے کہ قیس کے اردو اشعار سے کس قدر دلچسپی .... لی جاتی تھی۔

"چوں باستماع آوازہ اشعار ریختہ و صیت حلاوت ریختہ ہائے محمد صدیق المتخلص بہ قیس ...شعلہ اشتیاق سرمایہ صبر و قرار خاکستر گردانیدہ........"

دیوان قیس میں حضرت عباسؓ کی شان میں ایک منقبت لکھی گئی ہے۔ زبان صاف و شستہ ہے روانی بھی ہے اور جوش بھی۔ ایک دریائے محبت موجزن ہے۔ اس کے بعد ایک قصیدہ جناب سید غلام علی شاہ صاحب نبیرۂ حضرت موسیٰ صاحب قادری کی توصیف و تکریم میں لکھا گیا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فلک پہ یہ دیکھتا کیا ہوں کہکشان بہار	پڑا ہے گردن مینا میں سوتیا کا ہار
نہ کیوں ستاروں سے ہو چرخ اطلسی کے بہار	بچی ہے یہ میں قبا اس نے آج بوٹی دار
غلط ہے قوس قزح یہ کہ خوش نویس ازل	لکھا ہے ابری زرکار پر خط گلزار
نہیں ہلال ہے یہ طائران ارض و سماں	نکالی بیضۂ گردوں سے نہیں نے منقار
بچشم غور تو خط شعاع کو دیکھ اے دل	غذا ہے جانی ہے یہ کس کا ہے جادۂ رفتار
کہاں ہے دانۂ شبنم پیالہ میں گل کے	دھرے ہیں کاسۂ یاقوت میں دُر شہوار
شفق ہے ہے بجہ خورہی نہ بچہ حنا آلود	کہ صبح نکلی ہی رکھ سر پہ چہرۂ گلنار
چمکتی دیکھتا بجلی کو جس طرف ہوں میں	تو یاد آتا ہے مجھ کو تبسم دلدار
نہ کیوں فلک کو ہو سرطان کی برج سے تشبیہ	اسی لئے اوسی کہتی ہیں چرخ کج رفتار
ہزار رنگ کے دیکھیں ہیں باغ دہر میں گل	سوائے ماہ کے دیکھا نہ کوئی گل بیخار

ان اشعار کی بجنسہٖ نقل کی گئی ہے البتہ گاف کی شناخت کے لئے گاف پوری شکل میں لکھا گیا ہے چونکہ اس دیوان کے رسم الخط میں گ اور ک میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ گ مثل ک کے لکھا جاتا تھا۔ بنظر سہولت ناظرین گ بنا دیا گیا۔ مگر "ے" اور "ی" کو اپنی اصلی شکل میں رکھا گیا۔ بجنسہٖ نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "اصلیت" اور "قدامت" کا نقشہ پوری طرح آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

سلہ۔ اس تمام دیوان میں یائے معروف و یائے مجہول میں امتیاز نہیں رکھا گیا۔ رسم الخط ایک ہی ہے۔

ایک دوسرے قصیدہ میں قیس گریز کرتا ہوا کہتا ہے کہ:۔

فائدہ کیا ہی غزل گوئی سی تجکو ای قیس | چھوڑ یہ مشغلہ تو وصف کیا کر اوس کا
ہی جو اسکندر دوراں کا وزیر اعظم | جس کی ہی سایہ الطاف میں عالم پلتا
کون آصف یعنی مہاراج کرہی چندو لعل | شرق سی غرب تلک ہی وہ جہاں میں یکتا
مدح غائب سی میری دل کو نہیں ہی تسکیں | مدح حاضر میں اسی واسطے اب ہوں لکتا

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ قیس مہاراجہ چندو لعل کی مشہور وزارت کے زمانہ میں موجود تھا اور اسکی نغمہ سرائیاں ایوان وزارت میں گونج رہی تھیں۔ اسی قصیدے میں شمس الامرا کے متعلق آخر میں کہتا ہے کہ:۔

نظر کی خانہ تثلیث اور تسدیس پر جس دم | تو ہر برج سعادت سی تھا اوس وقت قمر پیدا
نہو کیوں شمس الامرا شاد خلعت عہد میں تیرا | کہ شادی نی کیا خانہ شادی میں گھر پیدا
خدا نی جس طرح یہ روز ان آنکہوں سی دکہلایا | ایسے شوکت سی ہوا اوس ماہ کی نور بصر پیدا
خدا رکھی سلامت تجکو اور اولاد کو تیری | فلک پر جب تلک ہیں لعبتاں سیمبر پیدا
بحق پنجتن اب گلشن اُمید سی تیری | قیامت تک الٰہی ہو درخت بار ور پیدا

قصیدے کو دعا پر ختم کر قیس ہنر پرور
کہ مل سے اجابت کے ہو لیلائے اثر پیدا

قیس نے ایک اور قصیدہ لکھا ہے جو محتشم الدولہ کی مدح میں ہے کہتا ہے کہ:۔

تو صاحب ہمت ہی ای محتشم الدولہ | تو بحر سخاوت ہی ای محتشم الدولہ
شاہان دکن سی تو ہی سلسلہ اب تیرا | تو جان ریاست ہی ای محتشم الدولہ
جز دان بہ بغل آگی ہی تیری ارسطو بھی | وہ تجہ میں فراست ہی ای محتشم الدولہ

آخر میں ایک تہنیت تبسرۂ نواب شمس الامرا بہادر کی تقریب بسم اللہ میں لکھی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پری سامنے ہی میری کھڑی گل اندام | دل کو تسکیں ہوا اور جان کو جس سی آرام
مانگ کا اوس کی یہ عالم ہی نہ پوچھو مجہ سے | کلک تقدیر کو ہی دیکھ کے حیرت کا مقام

ان تمام قصائد کے آخر میں ناقل زین العابدین لکھتے ہیں کہ تاتمام رسید قصائد قیس ع اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

لہ وہ ۲ لکھتا ۳ وہ ۴ شمس الامرا کی پوتی

قیس کے اور بھی قصائد تھے۔ اس کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پہلی غزل پیش کی جاتی ہے تاکہ قیس کی غزل گوئی کا اندازہ ہو سکے۔

غزل قیس

آج وہ صحن گلستاں میں ہر عالم نور کا
ہر رگ گل میں جھمکتا ہی چراغ طور کا

کان کا ہلتا ہی دُر یوں اوس بت مغرور کا
جس طرح جھولی ہی گہوارہ میں بچہ حور کا

کشتۂ خط کی تیری دیکھا لٹکتا گور پر
بیضۂ فولاد کی جاگا تھا بیضۂ مور کا

شمع سی تشبیہ دوں میں کیونکہ اپنی یار کو
وہ تو ہی کوڑن سراپا یہ ہے پتلا نور کا

کون کہتا ہے کہ عارض پر ہی یہ خال سیاہ
صبح کے پہلو میں ہی بچہ شب دیجور کا

زلف میں الجھا ہے، جھمکا زمرد کا مگر
شاخ میں سنبل کی یہ خوشہ لگا انگور کا

خال و عارض کو تم اوس کی دیکھو تک غور سی
دانہ فلفل کو ہی ضامن رکھا کافور کا

پنجہ شانی میں یوں تھی زلف مشکیں رات کو
مہر کے پنجہ میں جیوں دامن شب دیجور کا

اس لئے کرتا نہیں میں قیس پہلو سی جدا
کیونکہ دل میرا ہی پروانہ چراغ گور کا

ریختی کی ایک غزل بھی جو قیس کی طبع آزمائی کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو۔

غزل ریختی

اتنے کیوں موتی لگائے اری نادان دوا
جھک گئے بوجھ سی بالی کی میری کان دوا

چٹکیاں لے کی میری ران میں کہتے تھی یوں
مجکو منگوا دی کوئی چٹکیا تو تہان دوا

ٹھنک میں مونڈ ہے تو اُس کرتی کی لیکن اتنا
تنگ ہوتا ہی گلی میں سے گریبان دوا

کون یہ ہیگا نگوڑا تلی کو مٹی کے کھڑا
گھورتی ہی حق کو میری دیکھ کر آن دوا

اس کی آنکھوں کو تلوو ونکی تلی مل ڈالوں
ہی کیدہر کا یہہ موا جان نہ پہچان دوا

شکل حوا کی بنا مجکو ڈرایا یوں قیس
اڑ گئے دیکھتے ہی بس میری اوسان دوا

اوس کی ہنسنے کو لگی آگ میں صدقے میں دوا
اب تلک میری نہیں جان میں ہے جان دوا

قیس نے قطعات بھی لکھے ہیں چند تاریخی قطعے بھی ہیں ایک فارسی قطعہ ملاحظہ ہو۔

طلوع نیر برج امارت جہاں را داد طرف زیب و زینی
خرد تاریخ ولادش رقم زد مبارک نور چشم نور عینی

آخری مصرع سے ۱۲۲۵ھ ہجری کی تاریخ نکلتی ہے۔ ایک سو بیس سال گزر گئے مگر اس کا کلام زمانے کے دست برد سے بچ گیا اب تک زندہ ہو نظر کے سامنے ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس کی شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔

مجلہ مکتبہ ۔ قیس کے حالات سب سے پہلے تاریخ گلزار آصفیہ میں ملتے ہیں۔ شعرائے دکن میں بھی حال ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ۔ آپ کے اکثر بزرگ سرکار نظام میں وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمت پر مقرر تھے، چنانچہ آپ کے نانا محمد عاقل خاں نائک مخبرین کے افسر تھے، شیر محمد خاں ایمان آپ کے خالو (ماموں) ہوتے ہیں جو دکن کے مشہور شاعر اور استاد تھے، کلام کی اصلاح انہی ماموئے بزرگوار سے لیا کی، ان کی شاعری خواجہ میر درد و میر تقی کی طرز و وضع کی ہے۔ دیوان کا نام "پیش کار" رکھا تھا، دیوان دکن مہاراجہ چندو لعل شاداں اور شمس الامرا امیر کبیر نے اپنی اپنی سرکار سے دو دو روپیہ یومیہ مقرر فرمادیا تھا۔ (گلزار آصفیہ صفحہ ۵۵۲ و شعرائے دکن صفحہ ۹۴۵ جلد دوم) دکن میں اردو اور تذکرہ ریختی کے مولفین نے بھی گلزار آصفیہ اور شعرائے دکن ہی سے حالات لے کر اپنی اپنی کتاب میں قیس کا حال لکھا ہے لیکن ان سے سنہ وفات میں نقلی غلطیاں ہوگئی ہیں، میرے پاس قیس کے ریختہ دیوان کے ساتھ ریختی دیوان بھی ہے جس کا انتخاب اپنے نمبر "بادۂ دکن" کے عنوان سے مجلہ مکتبہ میں چھپے گا اور میرے معلومات اسی وقت تفصیل کے ساتھ قیس کے متعلق معلوم ہوسکیں گے، یہ مضمون "ایک مخطوطہ" کے علم کی حد تک مفید ہونے کے علاوہ ملک کے نوجوان اہل قلم میں دکنی شعرا کی نسبت جو تلاش و جستجو پیدا ہو چلی ہے اُس کی یادگار کے طور پر طبع کر دیا جا رہا ہے کہ دوسرے نوجوانوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہو جائے تو رفتہ رفتہ یہ ادبی خدمت ایک دن مہتم بالشان صورت اختیار کر لے گی۔

(عمر یافعی)

مانٹی کارلو

(جناب جی - ایم - خان صاحب)

غالباً موناکو کی پہاڑی کو انھیں لوگوں نے بسایا ہوگا جو پہلے پہل بحیرۂ قلزم کے کناروں پر اقامت گزیں ہوئے لیکن کئی صدی تک یہ باور کیا جاتا رہا کہ اہل فینیشیا نے اس کی بنیاد ڈالی اور یہاں ایک مندر بھی بنایا تھا۔ یہ مندر "ملو کارٹ مینوناکہ" کے لئے تعمیر ہوا تھا اسی بنا پر بندرگاہ کا نام "پورٹس ہرکلی مونوسی" رکھا گیا اور رفتہ رفتہ تمام علاقہ کا یہی نام ہوگیا۔ بہر حال اس شہر کو آباد ہوئے مدت مدید گزر چکی ہے اور کثرت آبادی کے باعث کئی قصبات و مواضع بھی پیدا ہو گئے چنانچہ انھیں مواضعات میں سے ایک موضع لاٹربی کی بندرگاہ ہرکیولس پر آٹھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ آگسٹس نے الپائین قبائل پر فتح کی خوشی میں ایک دائمی یادگار قائم کی تھی۔

سنہ ۱۳۰۶ء میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ موناکو کے نامی گرامی بزرگ سینٹ ڈی آر دی کی شہادت ہوئی۔ یہیں سنہ ۱۰۰۰ء میں اوتوکیا نلا بانی فرقہ گریمالڈی کی ولادت ہوئی۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں باشندگان لاٹربی نے "سینٹ میری ڈیوپورٹ" نام سے عبادت گاہ اس جگہ قائم کی جہاں اب موناکو کا سب سے زبردست گیاس پیپا نصب ہے لیکن اس عبادت گاہ کو سنہ ۱۵۰۶ء کے محاصرہ موناکو میں اہل جنیوا نے منہدم کر دیا۔ سنہ ۱۲۱۵ء میں جمہوریہ جنیوا نے شہر موناکو کے اطراف ایک مضبوط فصیل مع چار برجوں کے بنوائی تاکہ شہر کی بخوبی حفاظت ہو۔

سنہ ۱۵۰۲ء میں جان دوم نے شہر موناکو اور منٹن کے فرسودہ محلات کو درست کرایا نیز ان شہروں کی خاطر خواہ حفاظت کا بندوبست بھی کیا۔ اس کے چار سال بعد ہی سنہ ۱۵۰۶ء میں اہل جنیوا نے پھر حملہ کیا اور موناکو کا محاصرہ کرلیا لوسین گریمالڈی برادر حقیقی و جانشین جان دوم نے مسلسل تین مہینے تک بہادرانہ ان کا مقابلہ کرکے فتح پائی۔ اس فیصلہ کن جنگ میں سینٹ میری ڈیوپورٹ کی قدیم گرجا بھی تباہ ہوئی سنہ ۱۵۶۱ء میں موناکو کے زبردست حکمراں انٹینی گریمالڈی کی موت واقع ہوئی۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں شہر موناکو کو ہر طرح سے مضبوط و مستحکم بنایا۔ شاہی محلات کی خاص طور پر دیکھ بھال کرتا رہا نیز ہرکیولس میں ایک مشہور تصویر خانہ بنوایا۔ موناکو کی تاریخ میں سنہ ۱۵۷۵ء سے سنہ ۱۵۸۰ء تک کے پانچ سال اس لئے

قابل یادگار ہیں کہ ہانوری اول نے جینیوا کے مشہور مصور لکاکو میاسو سے قدیم محل میں حسن کارانہ استرکاری کروائی۔ سنہ ۱۶۳۳ء میں ہانوری دوم نے محلات شاہی کی ازسرنو تعمیر کی اور اسی سال ملکہ آسٹریا کی آمد کی خوشی میں خاص کمرہ شاہی خاص و عام کے لئے بطور نمائش کھولا گیا۔

سنہ ۱۷۰۵ء میں فرانسیسیوں نے خواہ مخواہ اہل موناکو سے لڑائی مول لی اور بجائے فتح کے انھیں کو ہزیمت ہوئی۔ اس لڑائی میں ہمارا شہر موناکو کو بھی بہت نقصان پہنچا خصوصاً آسٹریا کی قدیم یادگاریں بہت کچھ خراب ہوگئیں لیکن اس کے دو سال بعد ہی سنہ ۱۷۰۷ء میں شہزادہ انٹونی نے شہر کی ازسرنو تعمیر کی اور قلعہ انٹونی بھی بنوایا۔ پھر اس کے چند سال بعد سنہ ۱۷۹۰ء میں فرانسیسیوں نے دوبارہ حملہ کرکے شہر اور خاص طور پر محلات شاہی کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ اس تباہی کے بعد سے پھر انیسویں صدی تک اس شہر کی تعمیر و ترمیم کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

سنہ ۱۸۶۱ء میں موناکو کے رئیس نے بہت سا علاقہ شاہ فرانس کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ مقام روز بہ روز رونق پکڑتا گیا۔ جنگیں اور معرکے ختم ہوگئے۔ شہر کی آرائش اور ترقی کی دن دونی رات چوگنی کوششیں شروع ہوئیں۔

چنانچہ سنہ ۱۸۶۸ء میں موناکو اور نائیس کے درمیان ریلوے قایم کی گئی۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں مانٹی کارلو کی سب سے بڑی سینٹ چارلس گرجا کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں موناکو سے نائیس تک پختہ سڑک ڈالی گئی۔ سنہ ۱۸۸۸ء موجودہ محل شاہی کے بڑے مینار کی ترمیم کی گئی۔ اور ۱۸۸۹ء میں عجائب خانہ بحری کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔

مشہور شاعر لیوکن نے اپنی نظم "فارسل" میں موناکو کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے یہ شہر عام طور پر پسندیدہ رہا ہے۔ اور اس کی بندرگاہ سارے ساحل پر محفوظ ترین سمجھی جاتی تھی۔ دوسرے قدیم شہروں کی طرح اس شہر کو بھی بارہا تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کی خوشگوار آب و ہوا اور خوبصورت مناظر کی کشش نے لوگوں کے دلوں کو کچھ ایسا لبھا لیا کہ ہزارہا صدمے سہنے پر بھی وہ اس کو خدا حافظ نہ کہہ سکے۔ آج وہی مظلوم شہر جنوبی یورپ کا "جنت نشان" مقام بنا ہوا ہے صرف یہی نہیں بلکہ بے نظیر منظر تہذیب جدید کے ہر قسم کی دلفریبیاں علم و ہنر کے بہتے چشمے اس چھوٹے سے خطے میں موجود ہیں یہ شہر سطح سمندر سے سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ جہاں سے ساحل کوہستان کیاپ ڈی ایل اور

اٹلی کے نظر فریب مناظر کی سیر کی جا سکتی ہے۔ یہاں بہترین نمونہ کی پیتل توپیں اور گولوں کے ڈھیر کے ڈھیر اب بھی پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ وہ سامان مدافعت ہے جو شاہ فرانس نے شہزادہ موناکو کو تحفۃً دیا تھا

موجودہ حکمران خاندان کے ابتدائی ارکان کی توجہ سے قصر شاہی کے روبرو جو عدیم المثال یادگاریں قایم کی گئی ہیں عجیب دلچسپ منظر پیش کرتی ہیں۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں یہاں کے قصر شاہی کو جو بھی صدمات پہنچے تھے انکی شاہ البرٹ اول نے خاطر خواہ تلافی کردی ہے۔ قصر کے اندر قابل دید عمارتیں یہ ہیں (۱) عظیم الشان دیوان عام جس کے بے نظیر زینے سترھویں صدی کے بنے ہوئے اب تک اسی حالت میں قائم اور باقی ہیں۔ (۲) تخت گاہ (۳) دیوان خانہ ڈیوک یارک (۴) وہ وسیع ہال جہاں ۱۷۶۷ء میں ڈیوک یارک نے انتقال کیا تھا۔ اب بھی بادشاہ کی عدم موجودگی کے زمانہ میں خاص اجازت حاصل کرنے کے بعد یہ سب ہال دیکھے جا سکتے ہیں۔

محل شاہی کے روبرو کے وسیع میدان سے چار تنگ راستے نکلتے ہیں ان پر حسب تفصیل ذیل چند مشہور عمارتیں ہیں صدر شفا خانہ، غرباکی قدیم گرجا، عدالتیں، کالج، ایوان حکومت، محل اسقف، دیگر سرکاری عمارات، بڑی گرجا جہاں شاہان موناکو مدفون ہیں، عجائب خانہ بحری جو پرانے بارودخانے کی جگہ واقع ہے اور انتہائی مشرقی سرحد پر باغ سینٹ مارٹن ہے عجائب خانہ بحری میں مختلف اقسام کی دریائی پیداوار موجود ہے یہ عجائب خانہ موناکو کے زبردست سائنس دان بادشاہ البرٹ کا بنایا ہوا ہے جس نے ۱۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہرائی کی کھوج لگا کر ملکی عجائب وغرائب دنیا کے سامنے پیش کیے سینٹ مارٹن کا پرفضا باغ بڑی پہاڑی کے جنوب میں پرانی فصیل کے کھنڈروں پر بنایا گیا ہے جس میں مختلف قسم کے درختوں اور پودوں کے درمیان اندر آنے اور باہر جانے کے لئے راہیں بنی ہوئی ہیں۔ اس قدیم فصیل کے بعض حصے اب تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہاں کیاپ ڈی ایل، کیاپ سخرا، نائیس اور انٹی بیس کی طرف نظر ڈالو تو نہایت خوشنما منظر دکھائی دیتے ہیں باغ سے سمندر تک سو فٹ کی ایک سیدھی ڈھلوان ہے۔

کنڈومائن۔ یہ مقام موناکو اور مانٹی کارلو کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ ۱۸۶۰ء کے آخر تک یہ ایک بالکل غیر آباد خطہ تھا لیکن اب اس مقام پر کنڈومائن کے مشہور آفاق ٹینس کورٹ واقع ہیں اور موسم گرما میں تماشائیوں کی وہ کثرت رہتی ہے کہ بس ایک میلہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی کافی تعداد میں ہوٹل وغیرہ موجود ہیں۔ جہاں اشیائے مایحتاج کی قیمتیں بہت ہی کواجبی لی جاتی ہیں۔

مانٹی کارلو، اب سے ستر سال پیشتر مانٹی کارلو محض ایک چٹیل چٹان سے بڑھ کر نہ تھا۔ ۱۸۵۸ء میں موجودہ خوبصورت عمارت کیاسنو کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس عمارت میں اس وقت سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ تعمیر و ترمیم ہوتی چلی آرہی ہے۔ مشہور ماہر فن تعمیر چارلس گارنیر جس نے فرانس کے بے مثل آپیرا ہوز کا نقشہ بنایا تھا اس عمارت کا معمار ہے۔ اس عالیشان عمارت میں بہت سی آرام گاہیں اور کئی کتب بینی کے کمرے ہیں جہاں ہر قسم کے تازہ انگریزی اور امریکی روزنامے ہفتہ وار اور ماہوار رسائل بلا کسی معاوضہ کے مطالعہ کے لئے دئے جاتے ہیں۔

یہاں دنیا کا سب سے بہتر ناٹک گھر بھی ہے جہاں موسم بہار میں مذاقیہ تماشے بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر دکھلائے جاتے ہیں نیز رومی رقص دسرود اور رنگا رنگ رقص کے مظاہرے بھی قابل دید ہوتے ہیں۔ عمارت کیاسنو کے بالمقابل نہایت خوبصورت تفریح گاہیں بنی ہوئی ہیں جن کے رخ جنوباً سمندر کی طرف ہیں۔ یہاں سے سمندر کی سیر کا وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو بیان سے باہر ہے علاوہ ازیں دھوپ تاپنے کے لئے مانٹی کارلو میں یہ مقام نہایت موزوں ہے نیز سیر کرنے والوں کے لئے آرام کرسیاں بھی مہیا کی جاتی ہیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ نہایت سہولت کے ساتھ بائیں طرف بورڈیگرا اور ساحل اٹلی تک اور دائیں طرف انیترے اور اس کے سربلند پہاڑوں اور سمندر میں جہازرانی کی سیر کرتے ہیں۔ اور جب کبھی مطلع صاف ہو تو ساحل کارسیکا جیسا دور دراز مقام بھی بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان تفریح گاہوں کا مغربی حصہ بچوں کے کھیل کود کے مشاغل کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں ہر قسم کے میدانی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ان تمام تفریح گاہوں میں کیاسنو آرکیسٹرا کی جانب سے ہر روز محفل رقص و سرود گرم ہوا کرتی ہے۔ مئی سے اکتوبر تک یہ محفلیں صرف رات میں ہوتی ہیں۔

اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ علاقہ ریویریا میں مانٹی کارلو سے بہتر آب وہوا اور کسی مقام کی نہیں ساحلی حصہ پر حرارت میں کمی زیادتی شاید ہی ہوا کرتی ہے بہر حال ان سب حالات کا لحاظ کرتے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنوبی ساحل فرانس پر مانٹی کارلو دنیا کی جنت ہے۔

کیاسنو کے باغ۔ ان خوشنما اور روح افزا باغوں میں روزانہ ہزارہا آدمیوں کی چہل پہل رہتی ہے۔ کھجور کے ہوادار درخت گرم ممالک کے کمیاب اور دیگر غیر ملکی پودے اقسام کے میوہ دار درخت اور پھولوں کے تختے سال بھر اس مقام کو بارونق رکھتے ہیں۔ یہاں داخل ہوتے ہی طبیعت کچھ ایسی بہل جاتی ہے کہ

لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

مانٹی کارلو کی متعدد خوشنما عمارات میں سے ایک کفے ڈی پیری بھی انہیں باغات میں ہے سردیوں کے موسم میں دھوپ تاپتے ہوئے رقص و سرود کے مزے اُڑانے کے لئے اس سے بہتر مقام نہیں اور گرمیوں کے لئے بھی یہ مقام ایسا ہی ہے لیکن صرف فرق یہ ہے کہ اس وقت بجائے دھوپ تاپنے کا لطف حاصل کرنے کے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے میٹھی نیند کے مزے ملتے ہیں یہیں عموماً ہر ملک اور ہر ملت کے سیاح یکجا ہو کر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

اس شہر کی آب و ہوا ایسی اعتدال پذیر اور صحت بخش ہے کہ سرد ممالک کے لوگ سردی کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر صحت کے لئے مانٹی کارلو میں پناہ لیتے ہیں۔ چنانچہ طویل علالت سے کچھ افاقہ کے بعد یورپ کے نامور ڈاکٹروں نے ملک معظم کو بھی یہی رائے دی تھی کہ وہ جلد از جلد کامل صحت یابی کیلئے کچھ دنوں مانٹی کارلو میں قیام فرمائیں۔ یہاں ایک بڑا اسپورٹنگ کلب بھی ہے جو دنیا کے مشہور اسپورٹسمنوں کا مرکز رہتا ہے۔

لارا وٹو میں سال تمام پیراکی ہوتی ہے اور بچے بوڑھے مرد عورت بلا امتیاز نہاتے اور تیرتے ہیں موسم سرما میں نومبر سے مئی کے مہینے تک .... پانی کا درجہ حرارت ۵۰ سے ۵۴ تک پہنچتا ہی اور مئی سے اکتوبر تک گرمی ہوتی ہے۔ طبی اصول پر پانی کے ذریعہ ہر مرض کا بخوبی علاج کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک بہترین رسٹوراں بھی ہے جہاں رقص و سرود کا شاندار اہتمام ہے۔ عام طور پر نہانے کے بعد لوگ کرایہ کی موٹر کے ذریعہ کیاسنو باغات کی سیر کرتے ہیں۔

مانٹی کارلو میں لافنسٹ نامی ایک زبردست ٹینس کلب بھی ہے جہاں دنیا کے مشہور کھلاڑی موقتی انعامی کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کلب کے تحت نو ٹینس کورٹ ہیں جن میں سے تین لافنسٹ کی باغات میں ہیں اور چھ کنڈومائن میں۔ علاوہ ٹینس کے گولف کا بھی اچھا انتظام ہے۔ گولف کا میدان سطح سمندر سے ۲۰۰۰ فٹ بلندی پر جہاں سے قدرت کے مناظر کا دور دراز مقامات تک نظارہ ہوتا ہے۔ اس میدان کو "مونٹ ایجل گولف کورس" کہا جاتا ہے۔ اس سطح مرتفع کے ایک طرف تو سمندر موجیں مارتا ہے اور دوسری طرف سر بہ فلک پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں چمکتی دکھائی دیتی ہیں یوں تو مانٹی کارلو میں سب کے سب مقامات قابل دید ہیں لیکن سیاح کو ان سب مقامات کی سیر کرنے کے لئے بہت وقت چاہئے ذیل میں صرف چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کیاپ ڈسی ایل آور کیاپ فلوری۔ مانٹی کارلو سے بذریعہ ٹرام پندرہ منٹ کی مسافت ہے۔ یہ خوشنما مقامات زیتون کے جھنڈ اور سرو کے درختوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ یہاں عالیشان ہوٹل اور خوشنما باغات اور تفریح گاہیں بھی ہیں

اینرے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۲۱۲ فٹ اونچا ہے۔ قصص میں مشہور ہے کہ یہ شہر بھی اہل فینیشیا نے ہی آباد کیا تھا جہاں پر انھوں نے آشس یا۔ اینرے کے نام سے ایک مندر قائم کیا تھا۔ یہاں رومیوں اور مسلمانوں میں بڑی جنگ ہوئی تھی۔ مانٹی کارلو سے بذریعہ ٹرام ۴۰ منٹ کا راستہ ہے۔

کیاپ فرا۔ یہاں سوائے پہلی اور نویں صدی عیسوی کے آثار قدیمہ کے اور کوئی چیز قابل دید نہیں۔

سینٹ جیس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں ماہی گیری بہ کثرت ہوتی ہے۔

پیرآکے وا۔ سطح سمندر سے ۵۰۱۰ فٹ بلندی پر مانٹی کارلو سے ۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مقام سرما کے کھیلوں کا مرکز ہے۔ مناظر کا لحاظ کرتے سوئیٹان کا مد مقابل ہے۔

سینٹ مارٹن ویسوبی۔ یہ مقام اہل روما کا بسایا ہوا اور ۳۱۴۹ فٹ بلندی پر واقع ہے بعض مورخین کے قول کے مطابق سینٹ مارٹن کے قریب میری کا معجز نما مجسمہ ایک گرجا میں جس کو سینٹ لک نے بنوایا تھا ابتک موجود ہے۔

سینٹ آگنس۔ ۲۰۵۱ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر ہے۔ انتہائے بلندی پر سینٹ آگنس کی گرجا کے قریب سینٹ سیباسٹن کی گرجا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اس شہر کو ایک مسلمان سردار نے آباد کیا تھا جس کے ٹوٹے پھوٹے محلات کی نشانیاں ابتک موجود ہیں۔

کیاٹلن۔ ۱۷۹۳ء میں فرانسیسیوں نے یہاں کے قلعہ کو مسمار کر دیا۔ لا آورسا اور گرگوٹاس کے شمال کی طرف نظر دوڑائیں تو برف پوش چوٹیاں اور ساپل کا سرکس دکھائی دیتا ہے۔

کیاٹلر۔ یہاں لا اور سا اور گرگوٹاس کے آبشار مشہور ہیں۔

ویلی فرانشے۔ مشہور بندرگاہ جہاں بین الاقوامی بیڑے یکجا ہو کر مصنوعی جنگی کرتب دکھاتے ہیں۔ یہ بندرگاہ ہرقل کی بنائی ہوئی ہے۔

راکیب برونے۔ یہاں صرف لاس کیرس کا قدیم محل اور سانتا مارگریٹا کی بڑی گرجا قابل دید ہے۔ جہاں ہر سال بہت جوش و خروش کے ساتھ مذہبی جلوس نکالا جاتا ہے۔ یہاں سے کیپ مارٹن کی خوب سیر ہوتی ہے۔

سینٹ روتمن۔ فرحت بخش اور خوشنما مقام ہے۔ یہاں کے چشمے قابل تعریف ہیں۔ مانٹی کارلو سے

بذریعہ ٹرام دس منٹ میں پہنچتے ہیں۔

لاگمپیٹ۔ یہاں قدیم زمانے سے ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے اور یہاں کے کتبے اور نقوش قابل تماشہ ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

لاٹربی۔ یہ مقام ۱۶۴۰ فٹ مانٹ آیگل ۳۷۷۳ فٹ اور ڈی ڈی نین ۱۸۷۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ یہ سب مقامات بذریعہ ریل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں یہاں متعدد قدیم و جدید عمارتیں اور منظر قابل دید ہیں۔

کال ڈی لیرا۔ ۱۹۰۴۲ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ گارجس ڈیو لوپ ۴۸ کیلو میٹر اور گارجس ڈی مرالائی مانٹی کارلو سے ۱۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔

یورپ میں مانٹی کارلو جیسے مقامات بہت کم ہیں جہاں ہر انسان کے مزاج کے موافق آب و ہوا مل سکے۔ ان تفریح گاہوں کے سوا بہت سے ہوٹل اور رسٹوران بھی ہیں جہاں رہنے سہنے کا معقول انتظام ہے۔ لطف یہ کہ شرح مصارف معمولی۔ ہر شخص آسانی سے سیر کر سکتا ہے۔ مانٹی کارلو اور اس کے مواضعات اور مقامات کی حقیقی تعریف سچ پوچھئے تو قلم کے بس کی بات نہیں یورپ میں اس کو فردوس بروئے زمین خیال کرنا چاہئے۔

(ماخوذ)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنی کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمایئے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) ۱۲ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔ خط و تار کا پتہ

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

منظرِ سحر

(از جناب حمید الدین صاحب قمر مولوی فاضل)

عجب دلکشا اور سہانا سماں ہے — کہ مخمورِ صہبائے لذت جہاں ہے
الم زارِ دنیا، خوشی کا مکاں ہے — بہشتِ بریں، ملکِ ہندوستاں ہے
کلی مسکراتی ہے، گل ہنس رہے ہیں
مسافر سفر کو، کمر کس رہے ہیں

کوئی مستِ ناز و ادا سو رہا ہے — کوئی جان بیٹھا ہوا کھو رہا ہے
نہ پوچھو! زمانہ میں کیا ہو رہا ہے؟ — کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے
عنادل کے گلزار میں چہچہے ہیں
لبِ غنچہ پہ باغ میں قہقہے ہیں

لطافت ہوتی ہے تخئیل میں پیدا — مسرت ہے ہر ایک شے سے ہویدا
مرا دل ہے اس پاک منظر کا شیدا — وہ ظاہر ہوا لو! سحر کا سپیدا
چمن کو جگانے صبا آ رہی ہے
نسیمِ سحر گیت سا گا رہی ہے

ترنم میں اس کے وہ جادو نہاں ہے — فدا جس پہ گلشن کا پیر و جواں ہے
چمن بھر میں دریا خوشی کا رواں ہے — رہینِ کرم اس کا کل بوستاں ہے
اسی پر ہے موقوف رونق چمن کی
اسی سے ہے آباد گلشن کی بستی

ہر اک شاخ رقصاں ہوا اس کے اثر سے — عیاں صورتِ وجد ہے ہر شجر سے
نمودار مستی ہے گلہائے تر... سے — گلے مل رہی ہے ہر اک برگ دبر سے
یہ پھولوں کا رس چوستی پھر رہی ہے
کہ لہروں پہ خوشبوؤں کی تیر رہی ہے

تنقیدیں

طرز زندگی | تالیف سید محمد نسیم صاحب انہونوی مدیر انکشاف چھوٹی تقطیع ضخامت ۱۶۸ صفحات قیمت ۱عہ
منتظم رسالہ انکشاف لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

نسیم صاحب انہونوی نے طرز زندگی لکھ کر ایک اچھی سماجی اصلاح پر قلم اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں ازدواجی زندگی جو اکثر بدمزہ اور زوجین کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے اس کے کیا اسباب و علل ہیں اور کس طرح اس کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے یہ اس دلچسپ کتاب کا موضوع ہے۔ مولف نے عرض حال میں اس پر غیر جانب دارانہ اور منصفانہ نظر ڈالنے اور حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ عرض حال کے بعد انہی خیالات کی اشاعت پر اصل کتاب یعنی ایک خاتون اختر جہاں کی داستان زندگی شروع ہوتی ہے ابتدا میں شوکت دلہن صاحبہ کا ایک مقدمہ بھی ہے جو فسانہ نگاری وغیرہ پر بحث کرتا ہے۔ نسیم صاحب کی کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ کیا مرد اور کیا عورتیں بہ امعان نظر اس کا مطالعہ کریں اور ملک کی سماجی زندگی کی اصلاح میں اپنا حصہ لیں۔ کتاب کو عورتوں کے ہاتھ میں دینے کے قابل بنانے کے لئے مولف نے ہر جگہ زبان و بیان پر احتساب کیا ہے۔

منکران خدا سے خطاب | از مولوی سید علی اختر صاحب اختر چھوٹی تقطیع ۸۴ صفحے قیمت درج نہیں۔
عہد آفرین پریس اسکیلر روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔ یہ پُر مغز مسدس ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی وحدانیت کو دل پذیر اسلوب بیان کیا گیا ہے۔ منکرین کے خیالات اور انکی گمراہی کی توضیح کرتے ہوئے انہیں توحید باری تعالیٰ کی تعلیم دی گئی ہے۔ شروع میں ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا مقدمہ بھی ہے۔

[illegible] | از مولوی محمد مہدی صاحب۔ ار میں انجمن اصلاح و ترقی محلہ دریا آباد الہ آباد سے طلب کی جائے
یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں مولف نے پردہ کے متعلق قرآنی احکام سے بحث کی ہے۔ پردے کے موافق اور مخالف دونوں فریق ان آیات سے جو معنے مراد لیتے ہیں اور جس طرح توجیہ و تشریح کرتے ہیں انکو گہری نظر سے جانچا گیا ہے۔ رسالہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

چاند "اُردو" میں

الہ آباد کے ہردل عزیز ہندی "چاند" کی چاندنی تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں۔ مگر اردو داں پبلک اس سے کیا نفع پا سکتی تھی۔

اردو داں پبلک کے واسطے یہ ضیافت طبع کا سامان کر دیا گیا۔ اور "چاند اردو" بھی نکل آیا۔ اردو چاند علمی ادبی اخلاقی تاریخی اور اصلاحی پرچہ ہے۔ ملکی اتحاد و اتفاق کی نور بیزیاں کرتا ہے۔

چاند اعلیٰ درجے کا غذ دیدہ زیب لکھائی اور اعلیٰ درجہ کی چھپائی کے ۱۲۵ سو اسو صفحوں سے زائد حجم پر مشتمل ہوتا ہے۔

چاند ملک کے تمام موجودہ ادبی اور اصلاحی رسائل سے بہت زیادہ رنگین و سادہ عکسی تصاویر اور دلچسپ و مفید کارٹون دیا کرتا ہے۔

چاند صنف لطیف کا حامی اور وکیل ہے ملک و قوم کو بری رسموں اور قبیح عادتوں سے پاک کرنے کا سب سے بہتر وسیلہ ہے اس کی تمام تر کوشش مجلسی سدھار اور ملک کی ہر گونہ ترقی پر مرکوز رہتی ہے۔

چاند ملکی تفریق مٹانے میں سرگرم ہے۔ اُس کی زبان بھی عام ملکی اردو زبان ہے یعنی محض وہ زبان رکھتا ہے جس کو ہر قوم کے خاص و عام بخوبی سمجھتے اور بولتے ہیں۔

چاند نخل ادب کی دونوں شاخوں نثر و نظم سے آراستہ رہتا ہے۔ وہ قدیم و جدید شاعری اور انشا پردازی کے گلہائے رنگا رنگ سے اپنے دامن پُر کرتا ہے۔ نکتہ چینی اور عیب بینی اس کی عادت نہیں۔ ضروری تنقید لٹریری خدمت کے طور پر کی جا سکتی ہے۔ شخصی مدح سرائی، ذاتی حملے اور مناظرہ کی اس میں گنجائش نہیں۔ صرف مفید عام باتیں درج ہوتی ہیں مذہبی اقوال اور مذہب کی خوبیاں تو بیان کرتا ہے لیکن مذہبی مباحثات سے کنارہ کش رہتا ہے۔ اُس کی پالیسی صلح کل ہے۔

چاند ظرافت کی پُر لطف چاشنی اُسی حد تک رکھتا ہے جس قدر کھانے میں نمک۔ دریدہ دہنی اور طعن و تشنیع شیوہ نہیں۔

چاند اردو ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ سے قبل شائع ہو جاتا ہے گویا یہ چاند ماہ کامل بنکر نکلتا ہے۔

ملک کے نامور اخبارات و رسائل اور معتدد اصحاب نے چاند اردو کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا ہے۔ اور اُس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ فرمائی ہیں اس لئے چاند کی سرپرستی اور کثرت اشاعت ہی سے اس کے فوائد کی عام اشاعت ہو سکتی ہے۔ علم و عمل کے شائق اصحاب کو بہت جلد اس رسالہ کی خریداری میں حصہ لینا چاہیئے۔ نام نامی بلا توقف فہرست خریداران میں درج کرائیے۔ اڈیٹر منشی کنھیا لال۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ الہ آباد

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا معقول وسیلہ ہے مفصل کیفیت منیجر دفتر چاند اردو ادیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے۔

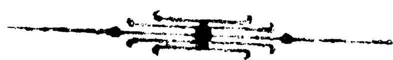
چندہ سالانہ	آٹھ روپے
ششماہی	پانچ روپیہ
فی پرچہ	ایک روپیہ

نمونہ بلا قیمت نہ ملیگا

ٹیلیفون نمبر ۲۰۵ تار کا پتہ: چاند

(خاص نوٹ رسالہ کیلئے ہر قسم کے مضامین بھیجنے کا پتہ: اڈیٹر چاند (اردو) الہ آباد ہے)

مجلہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ برہان سے یکمشت چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ
روپے کی عام ناشروں کی اور دوسری کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے ان کے
نام رسالہ سال بھر کے لیے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس
روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی دوسری کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید
کرینگے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت بھیجا جائیگا۔ یکمشت خریدنے والے
حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں لینگے
ان کو ایک رسید دی جائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔
خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو [illegible] جس وقت حسب الطلب
رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسید دفتر منتظم مجلہ مکتبہ کو بھیجدیں رسالہ ان کے نام جاری
کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص
مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

موصولہ ۱۵ محرم سنہ [illegible] یوسف

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ [illegible]

کا

ماہوار [illegible]



[illegible]

عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی

مشیرکار

سید محمد ایم اے

[illegible]

مجلّۂ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔
یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین
درج ہوں گے۔ حجم فہرست کے [illegible] صفحے ہوگا۔

خریداروں کو پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول
نہ ہو تو اسی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ: [illegible] مع محصول ڈاک پیشگی [illegible] کے لیے [illegible] فی پرچہ [illegible]
اشتہارات کی قیمت فی اشاعت پورے صفحے کے لیے [illegible] نصف کے لیے [illegible]
اور چوتھائی کے لیے [illegible] ہے۔ اگر ایک سال کی مدت کے لیے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ سے
۱۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلّۂ مکتبہ - مکتبۂ ابراہیمیہ
امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے۔



الہ آباد کے ہندی رسالہ چاند کا اردو ایڈیشن

چاند کی ٹھنڈی اور خوشگوار روشنی کی طرح اس کی پالیسی بھی گرما گرمی سے پاک ہے۔ روشنی عیوب اور خوبیوں کو یکساں دکھاتی ہے۔ چاند بھی تاریک اور چمکدار تمام اشیا کو روشنی میں لاتا ہے مگر محض اصلاح اور خیرخواہی کی ٹھنڈک کے ساتھ، عدالت اور اعتراض کی تیز فشانی اس میں نہیں ہوتی یہی سبب ہے کہ سبھی خواہاں ملک و قوم اور معاونین اصلاح و اتحاد اس نئے چاند کا بڑے تپاک سے خیر مقدم فرماتے ہیں اور بدل و جان سے اسکے مشتری بنے جاتے ہیں۔ اس ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج ہمارا بدقسمت ملک سیکڑوں مختلف خیالات کا اکھاڑا بنا ہوا ہے انسانی جماعتوں کا جداگانہ ہونا ایک قدرتی بات ہے لیکن یہ نیرنگی تعصب اور بداندیشی سے خالی اور خودپرستی اور خودغرضی سے عاری ہو تو باعث رحمت اور موجب [illegible] ورنہ شروع دعوت کا یہی گھر ہے اور اسی پر قوموں کا عروج و زوال منحصر ہے۔ چاند اس مشن کو لے کر جلوہ ریز ہوا ہے کہ ہندو مسلم اور دیگر اقوام ہند کو گنگا جمنا اور سرسوتی کے سنگم کی طرح باہم ملادے جو روانی میں ایک دوسرے سے ممتاز ہونے کے باوجود دور تک پہلو سے پہلو ملا کر بہتا اور باہم کوئی مزاحمت نہیں پیدا کرتا گویا یہ سنگم اس امر کا قدرتی سبق ہے کہ گنگا اور جمنا کا پانی رنگ و بو در مقدار و اثر میں مخالف مگر فیاضی اور سیرابی کے وصف میں یکساں ہے۔ اور آپس میں ملکر ایک دوسرے سے مخلوط ہو کر بغیر آشنائی اور محبت کے ساتھ بغلگیر ہو جاتا ہے۔ کیا غافل انسان اس سبق کو نہ سمجھیگا؟ چاند یہ چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت کا دائرہ جلد سے جلد اس کے ہندی ایڈیشن کی طرح وسیع ہو جائے اور اس کو اقطار ہند میں کامل نور افشانی کا موقع مل سکے اور وہ کسی قسم کی زوال کا نشانہ بننے سے محفوظ ہو جائے۔ اسکی یہ خواہش قدرتی اور جائز ہے اس لیے بار بار اہل ملک کے کانوں تک اپنی صدا پہنچاتا اور ان کی اعانت و سرپرستی کی امید کرتا ہے۔

سوا سو صفحوں سے زائد عمدہ کاغذ نفیس چھپائی و بکثرت رنگین و سادہ عکسی تصاویر اور کارٹونوں کے ساتھ ہر مہینے میں پندرہ تاریخ تک ایوان ہو کر چمکتا اور چندر لوک الہ آباد سے برآمد ہوتا ہے نمونہ کی رونمائی اور سالانہ زر اعانت آٹھ روپیہ ہے ششماہی پانچ روپے مقرر ہیں۔ کیا آپ نے ابھی اس کو نہیں دیکھا اگر زیادہ تامل نہ کر اور جلد سے جلد اس کو ملاحظہ فرمائیں پھر آپ خود ہی اس کی سرپرستی کے دلدادہ ہو جائینگے۔

مفصل کیفیت

ایڈیٹر منشی کنھیالال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ

چاند (اردو) میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرائیے

منیجر دفتر چاند (اردو ایڈیشن) چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجیے

(خاص نوٹ) مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی بابت مراسلات بنام ایڈیٹر چاند (اردو) ہونا چاہیے۔

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ امرداد ۱۳۳۹ف م جون ۱۹۳۰ء شمارہ (۲۶)

تصویر ــ مشاہیر مفکّرین عالم ۔

فہرست مضامین

شذرات

انجمن اساتذہ حیدر آباد کی چوتھی سالانہ کانفرنس کے اجلاس اس دفعہ امرداد کی آخری تاریخوں (۳۰ و ۳۱) میں سٹی کالج ہال میں منعقد ہوئے۔ صدارت نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت کوتوالی اور تعلیمات نے فرمائی۔ اسی سلسلہ میں نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔اے۔بی ٹی جو محکمہ تعلیمات کے دیرینہ تجربہ کار عہدہ دار ہیں صدر مجلس استقبالیہ منتخب ہوئے تھے۔ موصوف نے جو خطبہ پڑھا وہ انجمن کی ایک اجمالی تاریخ حیدر آباد ٹیچر کو ایک مرکزی تعلیمی رسالہ بنانے کی تحریک طلبہ کے سرپرستوں کے لئے نصیحتوں اور محکمہ تعلیمات سے متعلق چند مشوروں پر مبنی تھا۔

خطبہ صدارت مختصر مگر نظام تعلیم کی بہت سی ضرورتوں پر حاوی تھا۔ محترم صدر نے اساتذہ کے اصلی درجہ کو نہایت موثر طریقہ سے بے نقاب کیا۔ موجودہ نظام تعلیم میں مطمح نظر کے تعین پر زور دیتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ ہمارا نظام تعلیم ملکی ضروریات کی تکمیل نہ کرسکنے کی وجہ سے سقیم ہو رہا ہے پیشہ ورانہ اور صنعتی تعلیم کی ضرورت ظاہر ہے تعلیم سے ملک اور قوم کی سچی اور حقیقی خدمت کا ذوق بھی پیدا ہونا چاہیئے۔ اساتذہ کے انتخاب میں جن امور کو مد نظر رکھنا چاہیئے اُن کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کرکے آخر میں انجمن کارگذاری پر اطمینان ظاہر کیا۔

کانفرنس کے چار اجلاس وقفوں کے ساتھ ہوئے۔ پہلے جلسہ میں خطبہ صدارت اور صدر مجلس استقبالیہ کے خطبے کے علاوہ ڈاکٹر عبداللطیف سعید کا مضمون ''شخصی حفظان صحت'' پر خاص غور اور محنت کا نتیجہ تھا۔ ایک تحریک مدارس وسطانیہ میں معمل خانوں کے قیام اور قابل سائنس دان اساتذہ کے تقرر سے متعلق منظور کی گئی۔ دوسرے جلسہ میں دو اہم رپورٹیں پڑھی گئیں اور ایک تحریک منظور کی گئی۔ رپورٹوں میں سے ایک تعلیم جغرافیہ اور دوسری تعلیم تاریخ پر تھی۔ تحریک علوم اور السنہ مشرقیہ کے اساتذہ کے لئے ٹرینںگ کالج میں تربیت کے انتظام کی بابت تھی جو عمل میں لائی جائے تو یقین ہے کہ بڑے صحت بخش نتائج پیدا کرے گی۔ تیسرے جلسہ میں جو بروز جمعہ صبح کے ۹ بجے منعقد ہوا۔ اس کے منجملہ ایک تحریک

معذور بچوں کی تعلیم اور رہائش کے انتظام کے لئے مدرسہ اور اقامت خانہ کے قیام، دوسری تحریک معمر اشخاص کی تعلیم کے انتظام اور تیسری عثمانیہ میٹرک میں تجارت کو بطور مضمون اختیاری رائج کرنے سے متعلق منظور ہوئی۔ "جماعتی خود مختاری" کے عنوان پر تقریر اور "ریاضی کا تعلق عملی زندگی سے" کے عنوان پر ذیلی مجلس کی رپورٹ پڑھی گئی۔ چوتھے اور آخری جلسہ میں ڈرائینگ اور صنعت کاری کی تعلیم کو مدارس میں زیادہ وسیع پیمانہ پر رائج کرنے کے لئے اساتذہ کو برطانوی ہند میں بغرض تعلیم روانہ کرنے کی تحریک منظور ہوئی۔

مسٹر سید علی اکبر ام، اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے گذشتہ قرار دادوں کی حالت سنائی جس سے بخوبی یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ انجمن کس قدر سرگرم کار ہے اور انجمن کے کس قدر مطالبات محکمہ تعلیمات نے پورے کئے ہیں۔ اسی جلسہ میں مسٹر ڈبلیو منصرم پرنسپل نظام کالج نے "تعلیم اور شہریت" کے عنوان پر تقریر کی۔ آخر میں تقسیم انعامات اور صدارتی تقریر کے بعد اجلاس ختم ہوئے۔

انجمن اپنی کم عمری کے باوجود جس سرگرمی سے راہ ترقی میں گامزن ہے، وہ اطمینان بخش ہے اگر انجمن کے مطالبات جلد سے جلد پورے کئے جانے کی سبیل نکل جائے تو یقین ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام میں نمایاں ترقی صورت پذیر ہو سکے گی۔

گذشتہ جون کے مہینے میں اپنے سفر مدراس کے دوران میں مجھے جنوبی ہندوستان کی ایک قابل قدر درسگاہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مدرسہ جو "باقیات الصالحات" کے نام سے موسوم ہے، اسلامی علوم و فنون کا بڑا مرکز ہے۔ عموماً تمام ممالک ہند خصوصاً جنوبی ہند سے تشنگان علم یہاں آکر جمع ہوتے ہیں یہ مدرسہ جس کو "اورینٹل کالج" بھی کہتے ہیں مدراس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک خاموش قصبہ ویلور میں قائم ہے۔ مدرسہ کے بانی مبانی حضرت شمس العلما مولانا شاہ عبد الوہاب قادری تھے جنہوں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر اس کی بنیاد ۱۲۸۶ھ میں ویلور ہی میں رکھی تھی۔ مدرسہ کی ابتدائی حالت کو دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پون سو سال کے اندر اندر یہ اس قدر ترقی کر جائے گا۔ ابتدا میں مدرسہ کے بانی ہی اس کے تمام اخراجات کے کفیل تھے۔ لیکن اس کو قائم ہوئے ابھی چودہ پندرہ سال ہی ہوئے تھے کہ مدراس اور ویلور کے

مجیر مسلمانوں نے اس اسلامی درسگاہ کی کامیابی سے متاثر ہوکر اُس کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا مینمول تاجروں نے بڑے بڑے چندے عطا کئے۔ چنانچہ اب مدرسہ کا فنڈ نہایت اطمینان بخش ہوگیا ہے۔ اُس کی ایک بڑی اور شاندار عمارت ہے جس میں تعلیم اور رہائش کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہے ایک بڑی اسلامی درسگاہ کی ضروریات کے لئے جو جو ابواب درکار ہیں، سب فراخ حوصلگی کے ساتھ فراہم کئے گئے ہیں۔

مدرسہ کے فی الحال کئی شعبے ہیں (۱) ابتدائی اسکول (۲) کالج (۳) تعلیم گاہ صنعت وحرفت آخری شعبہ ملک کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے بڑی وسعت کی گنجائش رکھتا ہے۔

مدرسے کے لئے ایک ٹرسٹ قائم ہے جس کے اراکین ملک کے ذی اعتماد اصحاب ہیں۔ مدراس یونیورسٹی سے ملحق پندرہ ایسے کالج ہیں جن میں مشرقی علوم وفنون کی تعلیم ہوتی ہے۔ چودہ کالج سنسکرت اور تامل زبانوں سے مخصوص ہیں۔ صرف "باقیات الصالحات" ہی عربی اور فارسی تعلیم کا واحد اجارہ دار ہے۔ مدراس یونیورسٹی کے منشی فاضل اور افضل العلمار کی تعلیم کا انتظام یہاں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ اس درس گاہ کو اورینٹل یونیورسٹی کے پایہ تک پہنچانے کی کوشش ہورہی ہے۔ گورنمنٹ خود اس کی امداد کے لئے تیار ہے۔ اگر مدرسے کے ارباب حل وعقد اس تجویز کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا سکیں تو یقین ہے کہ جنوبی ہند میں اسلامی علوم وفنون کی احیار کا سہرا اس درسگاہ کے سر رہیگا۔

میجر اے۔ لانگڈن، نے اپنی ان تھک کوششوں سے اس سال کے شروع میں اطالوی حسن کاری کی جو نمایش منعقد کی تھی، اس کی غیر معمولی کامیابی نے آئندہ سال (۱۹۳۱ء) میں ایران قدیم اور جدید کے بہترین حسن کاری کے نمونوں کی نمایش کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اگر میجر کے خیالات عملی جامہ پہن سکیں تو یقین کیا جارہا ہے کہ شاہ ایران بھی اپنے ذاتی شاہی خزانوں اور دیگر عام محفوظات میں سے، ایک بڑی قابل قدر تعداد آثاری اشیاء کی روانہ فرمائینگے۔ یورپ کے عام اور خاص محفوظات میں ایرانی حسن کاری کے بہت سے قابل قدر کارنامے موجود ہیں۔ اگر میجر لانگڈن نے ان قابل قدر آثار کی فراہمی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، تو یہ نمایش ایرانی حسن کاری کی تاریخ میں یادگار ثابت ہوگی۔ نمایش "برلنگٹن ہوز" لندن میں منعقد ہوگی۔

ہندوستان اور اسکی زبانیں

یہ درحقیقت کوئی مستقل مضمون نہیں۔ بلکہ اف۔ اے۔ کی کتاب "ہندی لٹریچر کا پہلا باب ہے جس کی نے سرجارج گریرسن کی معرکتہ الآرا تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" سے زیادہ تر مدد لے کر ہندی زبانوں میں سے بعض کے ادب اور ان کے درمیانی تعلقات پر ایک چھوٹی کتاب شایع کی ہے۔ کتاب "سلسلہ ہری ٹیج آف انڈیا" میں شایع ہوئی۔

کچھ مہینے پہلے جب ہمارے مکرم دوست مولوی ابوالفخر عبدالوحید صاحب ام۔ اے، ال ال بی (عثمانیہ) جو آجکل جامعہ لندن میں ال ال ڈی کی تعلیم کی تکمیل میں مصروف ہیں، چھٹیوں میں ہندوستان آئے تو اس کا ترجمہ "مکتبہ" سے شایع کرنے کے لئے روانہ فرمایا۔ اور چونکہ یہ ترجمہ موصوف نے ام اے کی تعلیم کے دوران میں کیا تھا، اس لئے اس پر نظر ثانی کرنے کی خدمت میرے سپرد فرمائی۔ بعض حصے اس کے مفقود بھی ہو چکے تھے، جن کا ترجمہ بھی کرنا تھا۔ پہلے باب اور بعض حصص کا اولین وقت میں ترجمہ تو کر لیا۔ لیکن نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اب فرصت ملی۔ اس کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ابوالفخر صاحب نے جو ترجمہ کیا تھا، وہ امتحان کی سہولت کی خاطر سے تھا۔ اس لئے اکثر مقامات میں حذف و اسقاط بھی کیا گیا ہے۔

چونکہ ترجمے کے شایع ہونے میں تاخیر تھی، اس لئے وہ حصے جن پر مجھے اطمینان ہے "مکتبہ" میں شایع ہو رہے ہیں ان سے زبان اردو کی بہن یعنے ہندی زبان کے متعلق اجمالی معلومات حاصل ہو جائینگی ضمناً ہند آریائی زبانوں اردو ہندی کے تعلقات، اردو اور ہندی رسم الخط کی ابتدا اور ضرورتوں پر بھی روشنی پڑ جائیگی۔

(عبدالقادر سروری)

ہند آریائی زبانیں ہند آریائی زبانیں، وسیع ہند یورپی خاندان کی زبانوں کی ایک شاخ ہیں جو اب یورپ اور مغربی اور جنوبی ایشیا کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی سرحد کے قریب ہی وہ لوگ رہتے تھے جن کی زبان سے مختلف زبانیں پیدا ہوئیں۔ انہیں لوگوں کی ایک بڑی جماعت، جو آریا کے نام سے موسوم ہے، مشرق اور جنوب کی طرف منتقل ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اس کی دو شاخیں ہو گئیں جن کی زبانیں بھی مختلف صورتیں اختیار کرنے لگیں۔ انہیں دو زبانوں میں سے ایک زبان، ایرانی خاندان کی زبانوں کی ماں بنی جن میں میدی پہلوی، اور فارسی زبانیں شامل ہیں۔ آریائی کی دوسری شاخ کابل کی وادیوں میں گھس گئی، اور وہاں سے بڑھکر شمالی ہند کے میدانوں میں آ رہی۔ ان لوگوں کا عمل توطن ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں آ رہے تھے، ہند۔ آریا کہلانے لگے۔ ہند آریائی شاخ کی زبان نے قدیم ترین زمانے ہی میں

ادبی خوبیاں حاصل کرلیں، اور اس کی ادبی صورت سنسکرت یعنے (مُصفّا) زبان کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ شستہ ادبی بولی معین ہوگئی لیکن وہ زبان جس کو عوام استعمال کیا کرتے تھے اور جو پراکرت یعنی "فطری" یا "غیر مصنوعی" کہلاتی تھی بدلتی رہی۔ خفیف اور کرخت آوازوں کے اجتماع میں کمی ہوگئی لیکن زبان ابھی مثل سنسکرت کے ترکیبی ہی رہی۔ مختلف صوبوں کی زبانوں میں اختلافات روز بروز زیادہ ہوتے گئے۔ پراکرت کی انہیں شاخوں میں سے بعض مثل سنسکرت کے مستقل ہوگئیں۔ اور انہیں ادبی تہذیب عطا ہوئی جن میں سے ایک زبان پالی ہے۔ پراکرتوں کے آخری دور میں موجودہ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا پا جانے سے قبل یہ اپابھرسہ کے نام سے موسوم تھیں۔ یہی زبانیں موجودہ شمالی ہند کی مروجہ زبانوں کا ماخذ ہیں۔ جن میں ہندی، پنجابی، مرہٹی وغیرہ شامل ہیں۔ ان زبانوں کی پیدائش ....اعیسوی کے قریب ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے ہر زبان کی پیدائش کی یہی تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی۔ موجودہ زبانوں کی حیثیت اب ترکیبی نہیں رہی۔ بلکہ تحلیلی ہوگئی ہیں۔

ہندی ہندی سے ہم جو مطلب لے رہے ہیں اس کو نہایت غور سے ذہن نشین کرنیکی ضرورت ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مبہم معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثال کی طور پر اس کو ملاحظہ کیجئے۔ تمام شمالی ہند یعنے مغرب کی طرف پنجاب اور سندھ اور مشرق کی طرف بنگال تک کے وسیع رقبے میں جسقدر بولیاں بولی جاتی ہیں، ان سب کے لئے یہ لفظ ذرا وسعت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے لیکن بعض لسانی علما جیسے سرجارج گریرسن وغیرہ نے جو تحقیقات کی ہے اس کی رو سے اس کل رقبے میں در حقیقت صرف چار زبانیں رائج ہیں جن کے نام راجستانی، مغربی ہندی، مشرقی ہندی پوربی اور بہاری ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اصل جدا ہے، بہاری کا تعلق اصل میں اُن زبانوں کے گروہ سے ہے جس کی ایک شاخ بنگالی بھی ہے۔ مغربی ہندی اپنی اصل کے لحاظ سے پنجابی سے بہت ملی ہوئی ہے۔ ہندی کا لفظ موجودہ ہندی بھاشا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے اس کو اردو زبان سے ممیز کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اردو اور ہندی بھاشا دونوں کی دونوں مغربی ہندی ہی کی ایک بولی سے نکلی ہیں۔ اس کی تفصیلی بحث نیچے آئیگی۔ ہندوستان یعنے پنجاب، سندھ اور بنگال کے درمیانی خطے کی تمام زبانوں کے لئے بعض وقت ہندوستانی کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال کبھی کبھی اس سادہ زبان کے لئے بھی کیا گیا ہے، جو موجودہ ہندوستان کی مشترکہ زبان یا "لنگوافرانکا" ہے۔ اور جس کی شائستہ ادبی صورتیں ہندی بھاشا اور اردو ہیں۔

کتاب کے حدود ادبیات جس کی تاریخ اس کتاب میں بیان کی جائیگی، راجستانی، مغربی ہندی، پوربی اور بہاری زبانوں پر مشتمل ہوگی اردو اس سے خارج ہے۔ ممکن ہے کہ ان زبانوں کو ایک گروہ میں شامل کرنیکی تجویز سرسری نظر میں خود رایانہ معلوم ہو۔ کیونکہ یہ عام خیال ہے کہ یہ زبانیں اپنے نشو و نما میں بالکل مختلف ہیں۔ نیز مغربی ہندی اپنی اصل کے لحاظ سے پنجابی سے اور

بہاری، بنگلہ سے ملی ہوئی ہے۔ نہ کہ ان زبانوں سے جن کی یہاں گروہ بندی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو جس کا ادب اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، مغربی ہندی کی ایک شاخ سے نکلی ہے۔ لیکن ان زبانوں کے ادب کو ایک گروہ میں شامل کرنے کیلئے ہمارے پاس ایک وجہ موجود ہے۔ جہاں پنجابی، بنگلہ اور اردو نے اپنا اپنا ادبی سرمایہ الگ پیدا کرلیا ہے، جو اپنی خاص طرز پر نشوونما پا رہا ہے، وہ زبانیں جن کے ادب کی تاریخ اس کتاب میں شامل ہے، اپنے ادبی نشوونما میں ایک دوسرے سے بہت متحد ہیں۔ ان رقبوں میں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں عام طور سے وہ لوگ جو اردو کو استعمال نہیں کرتے ہندی بھاشا کو ادبی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگرچہ قدیم زبانیں اب بھی نظموں کے لئے اختیار کی جاتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کی نثر نشوونما نہ پا سکی۔ اس کے علاوہ، یہ بھی ہمارا مؤید ہے کہ، گو محققین نے ان کے اختلاف پر زور دیا ہے۔ تاہم یہ زبانیں آپس میں قریبی تعلق رکھتی ہیں، اور ان کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا رہا ہے۔ اور ان میں سے کسی زبان کا ادب چاہے کیوں نہ ہو، لیکن ان کی دوسری زبانوں کے بولنے والے اس کو بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے زیادہ ہے۔

ان صفحات میں جس ادب کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ متجانس مگر مختلف زبانوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کو "ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا ادب" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ لیکن سہولت کے اور طوالت سے بچنے کے لئے اس کو "ہندی ادب" ہی سے موسوم کرینگے۔ اس سرمایہ میں زیادہ حصہ یا تو مغربی ہندی کا ہے یا پوربی کا۔ بہاری ادب بہت وسیع نہیں۔ اور اگر ودیاپتی کی عشقیہ نظموں کو اس میں سے خارج کر دیں، تو بہت کم اہم حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ راجستانی زبان کا سرمایہ زیادہ تر بھاٹوں کے وقائع پر مشتمل ہے۔

اردو بحیثیت ایک ادبی زبان کے ہندی سے ایک اہم نقطے میں مختلف ہے۔ یہ اس کی خاص بحریں اور اوزان ہیں۔ یہ فارسی بحروں کی تقلید ہیں۔ اور اردو زبان کی شاعری کا بڑا سرمایہ بھی فارسی موضوعات پر مشتمل ہے۔

بولیاں راجستانی زبان کی بولیاں حسب ذیل ہیں موٹی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی، ان سب میں مارواڑی بڑی اور ادبی بولی ہے۔ اس کا دوسرا نام ڈنگل ہے۔ جو مغربی ہندی کی شاخ برج بھاشا کے راجپوتانی نام پنگل سے اس کو ممیز کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ کیونکہ برج بھاشا بھی ان مقامات میں مثل ایک ادبی بولی کے مروج تھی۔

مغربی ہندی:— اس کی بڑی بولیاں یہ ہیں بانگڑو، جو گنگا کے مغرب یعنے جنوب مشرقی پنجاب کی ارتفاع میں بولی جاتی ہے۔ برج بھاشا، وہ زبان ہے جو متھرا، اور اس کے نواح میں مستعمل ہے۔ یہ مغربی ہندی کی بڑی شاخ شاعری کے لئے ہے۔ قنوجی (جو برج بھاشا سے بہت مشابہ ہے) یہ درمیانی دوآبے کے زیریں حصوں اور شمالی مقامات میں بولی جاتی ہے بندیلی۔ بندیل کھنڈ اور وسطی صوبہ ہند کی وادی نربدا کے بڑے حصے میں مروج ہے۔ ایک اور شاخ بھی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے

نواح میں بولی جاتی ہے۔ دہلی مغل تاجداروں کی راجدھانی تھی، اس لئے اسی کے نواح کی بولی سے مغلوں کے لشکر کی مشترک زبان (لنگوا فرانکا) وجود پذیر ہوئی۔ اس میں پنجابی اور راجستھانی میں بہت سے فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے۔ اور چونکہ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان کا مہذب رسم الخط فارسی یا نستعلیق تھا، اس لئے یہ زبان اسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی "اردو" کے لفظی معنی "لشکر" کے ہیں۔ گویا اردو لشکری زبان تھی۔ مسلمانوں کے اثرات نے اس زبان کو بہت وسعت دی اور رفتہ رفتہ یہ ایک ادبی زبان بن گئی۔

مروجہ ہندی زبان، اردو ہی سے نکلی ہے۔ اس میں سے فارسی اور عربی الفاظ کو خارج کر کے ہندوستانی ٹھیٹھ یا سنسکرت الفاظ داخل کر دئے گئے ہیں۔

اس بولی کے لئے جو ابتداً دہلی اور میرٹھ کے نواح میں مروج تھی۔ اور موجودہ ادبی ہندی کے لئے جس کی ترقی للوجی لال کے ہاتھوں ہوئی۔ بعض ہندی محققین نے کھڑی بولی (ستھری زبان) کا نام تجویز کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ اسکی تفصیل بعد میں آئیگی۔ جہاں موجودہ ہندی کے بننے کے حالات لکھے گئے ہیں۔

مشرقی ہندی:—— کی شاخیں شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ اودھی باگھیلی اور چھتیس گڑھی۔ ان میں سب سے بڑی شاخ اودھی ہے جو اجودھیا دیش (اودھ) میں رائج ہے اودھی کا دوسرا نام بیساواڑی ہے۔

بہاری — کی تین بڑی شاخیں ہیں میتھلی، بھوج پوری، ماگھی، ان میں میتھلی سب سے بڑی ادبی بولی ہے عموماً تمام کارنامے جو ہمارے دسترس میں ہیں۔ وہ اسی زبان میں ہیں۔ یہ ان قطعات میں بولی جاتی ہے، جہاں قدیم زمانے میں متھیلا سلطنت قائم تھی۔ یہ بہار اور گنگا کا شمالی علاقہ ہے۔

ہندی ہجا اور رسم الخط | ہجا یا الف، بے، تے، جو ہندی اور اس کتاب کی دوسری زبانوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ سنسکرت کے ہیں۔ اور ان کی ترتیب بھی وہی ہے۔ یہ ترتیب صوتی اصول پر مبنی ہے۔ صرف ایک دو حروف ایسے ہیں جو ہندی میں رائج نہیں۔ رسم الخط وہ ہے جس کو دیوناگری یا ناگری کہتے ہیں۔ یہی سنسکرت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری صورتیں بھی ہیں۔ مہاجنی (یا صرافی) بنیادتی صرف معاملات، تجارت وغیرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ دونو کایتھی (یا کیتھی) کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ یہ لفظ کایتھ یا کایستھ سے بگڑا ہوا ہے۔ جو ہندوؤں کے ایک محرر فرقے کا نام ہے کایتھی رسم الخط اصل میں دیوناگری ہی کی تبدیل شکل ہے، جو تحریری ضرورتوں کو مدنظر رکھکر بنائی گئی تھی۔ اس میں سرعت اور آسانی تحریر ملحوظ ہے۔ یہ رسم الخط زیادہ تر اس رقبہ کے مشرقی حصوں میں رائج ہے، جس کی حدیں ہم نے اوپر بتادی ہیں۔

لیکن اس کا استعمال دیوناگری کے مقابلے میں یہاں بھی شاذونادر ہی ہوتا ہے۔

لفظیات اس زبان کے بہت سے الفاظ وہ ہیں جو ان کی ماخذی زبان ہند آریائی، سے سالہاسال کی ہیرپھیر کے بعد نکلے ہیں لیکن مروّجہ زبانوں میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جو سنسکرت سے براہ راست لئے گئے ہیں۔ آخری قسم کے الفاظ "تت سمہ" (یعنی وہی) کہلاتے ہیں۔ اور ان سے ممیز ہیں، جو "تت بھوا" (اسی قسم کے) کہلاتے ہیں۔ اور جو نشوونما کے دوران میں بدلتے گئے ہیں۔ اکثر مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں تت سمے تت بھوے انہیں الفاظ یا ان کی اصل سے بنائے جاتے ہیں جو زبان میں دوش بدوش موجود ہیں جیسے یوگی اور جوگ۔ (قابل، لائق) فارسی سے بھی بہت سے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں تلسی داس جیسے بلند پایہ مصنفین نے بھی انہیں استعمال کیا ہے۔ گو حال کے بعض مصنفین "ستھری ہندی" لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ لیکن شاید ہی کوئی کتاب ایسی ملے جس میں کچھ نہ کچھ فارسی الفاظ نہوں۔ کچھ پرتگالی، اور اکثر انگریزی الفاظ بھی اب اس میں راہ پا رہے ہیں۔

ہندی عروض بہت کم ایسی زبانیں ہیں جن میں عروض کے اصول اس قدر خوبی کے ساتھ مدون کئے گئے ہونگے جیسے ہندی میں ہیں۔ یہ نظام ان اصول سے ماخوذ ہے جو سنسکرت شاعری پر حکمران ہیں۔ اس کا انحصار اتار چڑھاؤ پر نہیں، بلکہ یہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح بول کی تعداد اور مقدار پر مبنی ہے، خواہ وہ طویل ہوں یا خفیف۔ قافیہ ضروری ہے۔ ہندی میں قافیہ صرف یہی نہیں ہے کہ مصرعہ کے آخری دو بول موافق ہوں۔ بلکہ اس میں کم سے کم دو بولوں کے مطابق ہونے کی ضرورت ہے۔ بیجا بلکہ قواعد زبان سے انحراف بھی جایز ہے لیکن بحروں کے اصول بے حد پیچیدہ ہیں۔ اچھے اور باکمال شاعر کے ہاتھ سے یہ چیزیں ایسے نتیجے پیدا کرتی ہیں کہ جس کی شکل اور موسیقی، دونو حیرت زا اثر مرتب کرتے ہیں۔ اور جس کی مثال شاید ہی کسی زبان میں دستیاب ہو سکے بحروں کا شمار جو ہندی عروض کی کتابوں میں مسلم ہیں، لاتعداد ہے۔ لیکن بعض زیادہ اہم اور مروج حسب ذیل ہیں۔

دوہا۔ (یا دوہرا) وہ شعر ہے جس کے ہر مصرعے میں چوبیس ماترے، ایک معین ترتیب سے جوڑے گئے ہوں۔ ماترا۔ حقیقت میں وہ عرصہ ہے، جو خفیف حرف علت کے ادا کرنے میں صرف ہو۔ طویل حرف علت اور لفیف میں دو ماترے شمار ہوتے ہیں دوہا بے حد مقبول اور مروج بحر ہے۔ قدیم اردو شعرا نے بھی اس کو بلا تکلف استعمال کیا ہے۔

سورٹھا۔ الٹا دوہا ہوتا ہے۔ جس میں دوہے کے ہر مصرعے کا نصف آخر، نصف اول بن جاتا ہے۔

چوپائی، مقبولیت میں دوہے کے برابر ہے۔ اس میں چار مصرعے ہر ایک سولہ ماترے کے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری مروج بحریں یہ ہیں۔ کنڈلیا، چھپّائی، کادیہ، سویّا، کوِیتا وغیرہ۔ بہت سی بحریں ایسی ہیں جو صرف گیتوں کی نظموں

میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں قافیہ عموماً شعر کے ہر مصرعے میں قائم رکھا جاتا ہے۔

ہند آریائی زبانوں کا خاندان

ہند آریائی زبانیں: پراکرت (بول چال کی) ، سنسکرت (ادبی)

(اپبھرنش)	موجودہ زبانیں۔
نامعلوم	کشمیری
نامعلوم	کوہستانی
نامعلوم	لہندا (مغربی پنجابی)
وڑاچڑی	سندھی
گوجری	گجراتی
سورسینی	(پنجابی، مغربی ہندی)
آونتی	(راجستانی، پہاڑی)
اردھماگدھی	مشرقی ہندی
مگدھی	(بہاری، بنگالی، اڑیہ، آسامی)
مہاراشٹری	مرہٹی۔

پریتم

(ڈاکٹر اعظم کریوی سابق اڈیٹر اکبر الہ آباد)

پریتما اور ترنگنی میں بہت پریم تھا ۔ آپس میں ان کا برتاؤ سکھیوں کا سا نہیں تھا ان کے خطوط عاشقانہ ہوتے جن میں پیار و محبت ۔ شکوہ و شکایت کے سوا اور کچھ نہ ہوتا ۔ پریتما بیاہی اور ترنگنی کنواری تھی ۔ جب یہ آپس میں ملتیں تو کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر راز و نیاز کی باتیں کرتیں اگر وہاں اتفاق سے کوئی پہنچ جاتا تو ان کی گفتگو کا سلسلہ بند ہو جاتا ۔ ترنگنی اکثر اپنی باہیں پریتما کے گلے میں ڈال کر پوچھتی ۔ "پیاری ! سچ بتا تو سب سے زیادہ کس کو پیار کرتی ہے مجھ کو یا اپنے پتی کو ؟" پریتما جواب دیتی "تم کو ! میری پیاری ترنگنی تم کو ۔" ایک دن پریتما نے کچھ ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو اپنے پتی سے زیادہ محبت ہے ۔ اس دن ترنگنی کو اتنا صدمہ ہوا کہ دن بھر اس نے کھانا نہ کھایا بڑی مشکل سے پریتما ترنگنی کو منا سکی بس اسی دن سے پریتما کے دل میں کچھ رنجش کی بنیاد پڑ گئی ۔

پریتما ترنگنی کی پڑوسن تھی دونوں کا مکان ملا ہوا تھا چونکہ پریتما زیادہ تر اپنے میکہ ہی میں رہتی تھی اس وجہ سے وہ جب چاہتی ترنگنی کے مکان پر چلی جاتی لیکن ترنگنی پریتما کے مکان پر بہت کم آتی تھی کیونکہ وہ کنواری تھی اس کے ماتا پتا اس کو کہیں جانے کی بہت کم اجازت دیتے تھے ۔ اس ممانعت کی ان دونوں کو کوئی پرواہ نہ تھی پریتما کے مکان سے ترنگنی کا مکان زیادہ کشادہ اور عالیشان تھا وہاں دونوں سکھیوں کو آپس میں باتیں کرنے کا خوب موقع ملتا تھا ۔

جب تک پریتما کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ترنگنی پر دل و جان سے فدا تھی لیکن شادی ہوتے ہی اس کی محبت تقسیم ہو گئی مگر ترنگنی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اس کا پریم روز بروز بڑھنے لگا ۔ وہ بسا اوقات جوش محبت میں جب پریتما سے کوئی شکایت کرتی تو پریتما ہنسی میں اڑا دیتی اور اپنے دل میں سوچتی ۔۔۔ مجھ کو پیار کرنے کیلئے تو میرا پتی ہے ۔ مگر ترنگنی تو کنواری ہے ۔ محبت کی بھوکی ہے مجھے اس کی شکایتوں پر کچھ برا نہ ماننا چاہیئے ۔" یہی سوچ کر پریتما دل نہ چاہتے ہوئے بھی ترنگنی کو پیار کرتی اور اس کی ناز برداری کرتی ۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ترنگنی کا بیاہ اس کے دیور رام موہن کے ساتھ ہو جائے ۔ لیکن اب تک اس کے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی ۔ جب دن رات سے گلے ملتا تو دونوں اپنے کوٹھوں پر کھڑی ہو کر ایک دوسرے کو اپنی محبت کی کہانی سناتیں پھر بھی ترنگنی کا جی نہ بھرتا ۔ اور وہ پریتما کو روزانہ ایک خط بھی لکھا کرتی تھی ۔

ایک مرتبہ جب پریتما اپنے سسرال میں تھی تو وہاں اس نے اپنے پتی کے ساتھ تھیٹر میں "مرنا لنی" کا تماشہ دیکھا تھا جب

وہ سسرال سے واپس ہوئی تو اس نے ترنگنی کو "رلنا" کا قصہ سنایا اس کے بعد پریتما اکثر ترنگنی کے گلے میں بانہیں ڈالکر گانے لگتی
— "میرے پریم کی نیا کس نے ڈالا بھنور میں"
پریتما ترنگنی کو بہت پیار کرتی تھی پھر بھی ترنگنی کا جی نہ بھرتا جس طرح ترنگنی بات بات پر روٹھ جاتی اس طرح پریتما کو بھی خواہ مخواہ روٹھنا پڑتا۔ اگر پریتما کبھی ایسا نہ کرتی تو ترنگنی کو سخت ناگوار ہوتا اور وہ کہتی "ہاں! ہاں! تم مجھے کیوں پیار کرنے لگیں تم کو تو اپنے پتی کے سوا کسی سے محبت ہی نہیں ہے۔ کیا تم مجھ کو پیار کرتی ہو۔ جو بات بات میں روٹھوگی —" شروع میں یہ باتیں پریتما کو مذاق معلوم ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہو گئی۔ اور جھوٹ موٹ ترنگنی سے روٹھنے لگی لیکن وہ اس سے بے خبر تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

(۲)

ترنگنی اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی گنگنا رہی تھی۔

"جھوٹا وعدہ پیا مو سے کر گیو ری۔"

جس طرح ستار کے زمزمے ہوا میں گونجنے لگتے ہیں اسی طرح ترنگنی کے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔ اس کی آواز میں درد بھرا تھا۔ آج سویرے جب پریتما ترنگنی سے ملنے آئی تو ترنگنی نے پریتما سے اچھی طرح سے باتیں نہ کیں۔ ترنگنی کے اس برتاؤ سے پریتما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ترنگنی سے بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر واپس چلی گئی اور حسب معمول شام کے وقت بھی اپنے کوٹھے پر نہ آئی۔ ترنگنی تمام دن اپنے کوٹھے پر رہی لیکن وہ ایک مرتبہ بھی پریتما کو نہ دیکھ سکی جب رات ہو گئی تو وہ مایوس ہو کر نیچے اتری اور اپنے کمرے میں پہنچکر گنگنانے لگی "جھوٹا وعدہ پیا مو سے کر گیو ری" ترنگنی نے ہر طرح سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کی لیکن اس کی الجھن بڑھتی ہی گئی آخر اس نے سوچنا شروع کیا "کیا میں پریتما کو خط لکھوں؟ نہیں نہیں میں اس کو ہرگز خط نہ لکھوں گی۔ اس نے میرے کل والے خط کا جواب اب تک نہیں دیا۔ اور اسی وجہ سے تو میں آج صبح اس سے اچھی طرح سے نہیں بولی تھی — میں نے سنا ہے کہ آج اس کا پتی آیا ہے۔ — تو کیا اس نے پریتما کو تھوڑی دیر کے لئے بھی کوٹھے پر جانے کا موقع نہیں دیا — ممکن ہے کہ یہی بات ہو — اور ہاں میں نے جو آج صبح اپنے غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اس میں کس کی خطا ہے؟ — یہ بھی تو پریتما ہی کا قصور ہے۔ اس نے وقت پر میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ کیا اس کے پتی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ یا قلم توڑ دیا یا دوات کی روشنائی گرا دی — آخر ہوا کیا؟ —"
اماوس کی اندھیری رات تھی ترنگنی کے سینے میں اس وقت خیالات کی پرشور لہریں اٹھ رہی تھیں جو آپس میں

ٹکراتیں اور اینٹھتی ہوئی غایب ہو جاتی تھیں ۔۔۔۔ کہاں ؟ ۔ تاریکی میں جہاں کچھ بھی نہ تھا ۔
وہ کچھ سوچ کر پلنگ سے اٹھی صندوق سے ایک خوبصورت رنگین کاغذ اور لفافہ نکال کر پریتیا کو خط لکھا اس نے لفافہ پر پریتیا کا نام لکھا اور کھڑی ہو گئی ۔ لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا ۔ وہ کمرہ میں ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی " اس خط کو بھیجوں یا نہیں ۔ خط بھیجنے سے پریتیا کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے دب گئی ہوں اور خوشامد کرتی ہوں ۔۔۔ " وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا سر گھومنے لگا ۔ زیادہ لکھنے پڑھنے یا رنج و غم سے اکثر ترنگنی کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا ۔ ترنگنی نے اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور بیہوش ہو کر پلنگ پر گر پڑی لفافہ ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ کے نیچے گر پڑا ۔
گرنے کی آواز سن کر ایک خادمہ دوڑتی ہوئی کمرہ میں آئی اور ترنگنی کو بیہوش دیکھ کر گھر والوں کو خبر دینے کے لیے الٹے پاؤں واپس ہوئی ۔ ترنگنی کی ماں محلہ میں کسی کے یہاں گئی ہوئی تھی گھر میں صرف اس کی چچی تھی جو کل ہی اپنے شوہر کے ساتھ میرٹھ سے آئی تھی وہ خادمہ کے ساتھ فوراً ترنگنی کے کمرہ میں پہنچی ہسٹریا کا دورہ اس کی ایک بہن کو بھی ہوتا تھا اس وجہ سے وہ ضروری تدابیر سے جو ایسے وقت کارآمد ہوتی ہیں خوب واقف تھی وہ ترنگنی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی ۔ جب وہ ترنگنی کو پنکھا جھل رہی تھی تو اتفاقاً اس کی نظر ترنگنی کے اس خوشنما لفافہ پر پڑی جو ترنگنی کے ہاتھ سے پلنگ کے نیچے گر گیا تھا ۔ لفافہ بند نہیں تھا اس کی چچی نے خط نکال کر لیمپ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا ۔ " پریتم ! " اتنا پڑھتے ہی اس کی چچی کے ہوش اڑ گئے اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اس نے خادمہ سے کہا کہ تو پنکھا کر میں ابھی آتی ہوں ' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی ۔ اس کے پتی ہردے ناتھ جو میرٹھ کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے گھر پر موجود نہ تھے ۔ ان کے کمرہ میں پہنچ کر ترنگنی کی چچی اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی ۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ڈاکٹر ہردے ناتھ باہر سے واپس آئے تو ان کی بیوی نے آگے بڑھ کر ترنگنی کا خط دے کر کہا " ذرا اس کو تو پڑھو "
ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار کر بیوی کو گہری نظر سے دیکھا اور کہا ۔ " کیا بات ہے یہ کس کا خط ہے ؟ "

" پڑھو سارا حقیقت ابھی معلوم ہوئی جاتی ہے "

ڈاکٹر ہردے ناتھ خط کو بلند آواز سے پڑھنے لگے ۔۔۔ " پریتم ! تم کیسے کٹھور ہو ۔ کیا یہی تمہارا پریم ہے اگر میں غصہ کروں تو کیا تم مجھے مناؤ گے نہیں بلکہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ۔ کل جو خط میں نے تم کو لکھا تھا آخر تم نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا ۔ اسی وجہ سے میں آج صبح کو تم سے اچھی طرح سے نہیں بولی تھی ۔۔۔ ہردے کشور ! میں تم سے کیوں

خفا تھی؟ کیا تم کو معلوم نہیں تھا۔ اگر معلوم نہیں تھا تو پھر دریافت کیوں نہیں کیا مجھ سے روٹھ کر بغیر بات چیت کئے چلے کیوں گئے تم نے مجھے منایا کیوں نہیں۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں بہت روئی دن بھر کوٹھے پر تمہارا انتظار کرتی رہی لیکن تمہارے درشن نہ ہوئے تمہاری پیاری موہنی صورت ایک دفعہ بھی نہ دکھائی دی۔ اچھا تم جیتے میں ہاری لو اب تو آکر مجھے اپنا درشن دو۔ پریتم! سوچو تو سہی اس دنیا میں تمہارے سوا میرا اور کون ہے اگر تم میری دلشکنی کرو گے تو میں اس دنیا میں جی کر کیا کروں گی۔ میرے ہردئیشور! اپنی پران پیاری ترنگنی سے اتنی جلدی نہ روٹھ جایا کرو۔۔۔ تمہارے چرنوں کی داسی ترنگنی"

"خط پڑھ کر ہردے ناتھ نے پوچھا۔۔۔ یہ خط کس کا ہے"

"نام بھی پڑھ لیا اور کہتے ہو کس کا؟ یہ خط آپ کی لاڈلی بھتیجی کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے"

میری بھتیجی کا۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آتا؟

"جی ہاں یقین کیوں آئے گا۔ ہائے ہمیں کیا معلوم تھا کہ انٹرنس پاس کر کے ترنگنی اتنی آزاد ہو جائے گی۔ اور ہمیں معلوم بھی کیسے ہوتا ہم لوگ تو میرٹھ میں رہتے ہیں یہ سب قصور اس کی ماں کا ہے جس نے کنواری لڑکی کو آزاد رکھا میں تو جب سے یہاں آئی ہوں ترنگنی کے رنگ ڈھنگ مجھے اچھے نظر نہیں آئے ہائے اس نے تو خاندان میں کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔ کنواری لڑکی اور اس آزادی سے خط و کتابت کرے۔۔۔ ٹھیک اسی وقت خادمہ گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔۔۔ "چھوٹی ماں جی جلدی چلو۔ بچی کی طبیعت بہت خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

ترنگنی کی چچی نے اپنے شوہر سے کہا۔ "چلو تم بھی ذرا دیکھ لو"

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے کہا۔ تم چلو میں ابھی آتا ہوں"۔

بیوی کے جانے کے بعد ڈاکٹر ہردے ناتھ نے سوچنا شروع کیا۔۔۔ "بھائی صاحب سے کہنا ٹھیک نہیں۔ ابھی ترنگنی کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے۔ لیکن یہ بات چھپ نہیں سکتی اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہم لوگ سماج میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ لڑکے اور لڑکیوں کا بیاہ کرنا دشوار ہو جائے گا۔۔۔ کیا ترنگنی کو اپنے ساتھ میرٹھ لے جاؤں؟ نہیں نہیں وہاں بھی لے جانا فضول ہے جہاں جائے گی وہ اپنی عادت سے باز نہ آئے گی ہائے میں ترنگنی کو کتنا نیک سمجھتا تھا۔ میں اسے کتنا پیار کرتا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدچلن ہو جائے گی۔۔۔" اس عرصہ میں ترنگنی کی ماں کمرہ میں گھسی اور کہنے لگی۔ بھیا تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ تمہاری ڈاکٹری کس دن کام آئے گی میں ابھی باہر سے واپس آئی ہوں ترنگنی بے سدھ پڑی ہے اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے چلو جلدی چلو دیر کیوں کر رہے ہو

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اٹھ کر دوائیوں کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک دوا کی شیشی نکال کر جیب میں رکھ لی اور ترنگنی کے کمرہ میں پہنچے۔ نبض وغیرہ دیکھ کر ڈاکٹر ہردے ناتھ نے کانپتے ہاتھوں سے جیب سے شیشی نکالی اور اس سے چند قطرے اپنی بھتیجی کے منہ میں ڈالدئے۔

(۳)

پرتیما کے پتی کا نام اننگ موہن تھا وہ جمال پور میں اسسٹنٹ سرجن تھے اور آج کل چھٹی لیکر اپنے سسرال میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ان کو پہلے ہی پرتیما کے خطوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ ترنگنی پرتیما کی سہیلی ہے۔ اب کی جب وہ پرتیما سے ملے تو انہوں نے کہا۔ "ذرا اپنی پیاری سہیلی ترنگنی کے خطوط تو دکھاؤ"۔

پرتیما نے ہنس کر کہا۔ "واہ جی واہ! میں ان کو کیسے دکھا سکتی ہوں اس نے تو کسی کو بھی اپنے خطوں کو دکھانے کی اجازت نہیں دی"۔

"تو کیا میں بھی "کسی" کی گنتی میں آگیا ہوں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا"

"میں پہلے ترنگنی سے پوچھ لوں تو دکھاؤنگی"۔

"اگر اس نے اجازت نہ دی؟ —"

"تو میں نہ دکھاؤنگی"

موہن کو یہ جواب سن کر رنج معلوم ہوا اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے نہ دکھاؤ میں تمہارا کوئی نہیں ہوں ترنگنی ہی سب کچھ ہے۔ پرتیما نے اس کا جواب کچھ نہ دیا دوسرے دن جب اس نے ترنگنی سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔ "پرتیم پیارے! میرے خطوط ان کو ہرگز نہ دکھانا"

رات کو جب موہن نے پرتیما سے پوچھا۔ "کہو جی تمہاری سہیلی نے کیا کہا"۔

"اس نے خط دکھانے کی اجازت نہیں دی"

موہن سمجھتا تھا کہ ترنگنی اجازت دے دیگی لیکن پرتیما سے صاف جواب سن کر اس کو سخت صدمہ ہوا یہانتک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی یہ حالت پرتیما سے دیکھی نہ گئی اس نے اپنے صندوق سے خطوں کا پلندہ نکال کر موہن کے سامنے رکھدیا۔ اور کہا۔ "لیجئے رونے پیٹنے سے کیا فائدہ —"

موہن نے ہاتھ میں خطوں کے پلندے کو اٹھا کر ایک طرف پھینکدیا اور کہا۔ "ہٹاؤ ان خطوں کو..... اب ان کو نہ پڑھوں گا"

موہن کے اس برتاؤ سے پربتیا کے دل پر چوٹ لگی اب اس کے رونے کی باری تھی چنانچہ وہ منہ پر آنچل رکھ کر آنسو بہانے لگی ان آنسوؤں نے موہن کے غصہ کو دور کر دیا اور وہ پربتیا کی خوشامدیں کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ پربتیا کو منا سکا اس نے خطوں کے پلندے کو کھولا اور اس میں سے ایک خط نکال کر پڑھا اور کہنے لگا۔ "نرنگنی تو بہت خوشخط لکھتی ہے"۔

پربتیا نے مسکرا کر کہا "جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اگر میرے دیور کے ساتھ اس کا بیاہ ہو جائے تو کتنا اچھا ہو"

"وقت آنے دو دیکھا جائے گا"

جب موہن نرنگنی کے تمام خطوط پڑھ چکا تو وہ کچھ اُداس سا ہو گیا۔ پربتیا نے کہا "اُداس کیوں ہو گئے؟ کس سوچ میں ہو!

"دیکھو اب تم کو اپنی سہیلی سے دوستی چھوڑنی پڑیگی ورنہ یہ خط و کتابت کا سلسلہ بند کر دو"

"کیوں؟"

"کیونکہ اگر میں تمہارے تعلقات سے واقف نہ ہوتا اور ان خطوط کو پڑھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ پریم پتر ہیں"

"جب مردوں میں اس قسم کے خطوط معیوب نہیں سمجھے جاتے تو پھر سہیلیوں کا آپس میں پریم کرنا کیوں برا سمجھا جاتا ہے؟"

"برا ہے یا نہیں اس پر اس وقت بحث کرنے کی ضرورت نہیں بس تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تم میرے سوا اور کسی سے پریم نہیں کر سکتی ہو میری محبت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"

پربتیا نے ہنس کر کہا "وہ کیسی باتیں کرتے ہو اس وقت آپ کا خیال کدھر ہے"

"ہنسنے کی بات نہیں ہے ان خطوں کو پڑھ کر میرے دل میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ سہیلیاں آپس میں ایسے عاشقانہ خطوط لکھا کرتی ہیں"

"نرنگنی تو مجھے روزانہ ایک خط لکھتی ہے اگر جواب نہیں پاتی تو ناراض ہو جاتی ہے"

"ناراض ہو جاتی ہے تو ہو جانے دو کوئی پرواہ نہ کرو"

"میں اس کی ناراضگی کا حال آپ سے کیا بتاؤں وہ تو بات بات میں روٹھ جاتی ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ اس نے مجھے ایک خط بھیجا اتفاق سے مجھے فرصت نہ ملی اور میں اس کا جواب نہ دے سکی آج جب میں اس سے

صبح کے وقت ملی تو اس نے بگڑ کر کہا ۔ "ہاں جی ہاں میں خوب جانتی ہوں کہ تم مجھ سے فرصت نہ ملنے کا بہانہ کرتی ہو اصل بات کیوں نہیں کہتی ہو کہ تم کو اپنے پتی ہی سے فرصت نہیں ملی" مجھے ترنگنی کی یہ بات بہت بری معلوم ہوئی. اور میں وہاں سے فوراً اٹھ کر چلی آئی چنانچہ اس غصہ میں آج شام کو بھی میں اپنے کوٹھے پر نہیں گئی وہ سمجھتی ہے کہ میں غصہ کرنا نہیں جانتی ہوں"

دونوں اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ پریتیا کی ماں نے باہر سے آکر آواز دی ۔۔۔ پریتیا نے باہر نکل کر کہا "اماں کیا بات ہے"

"ترنگنی بہت بیمار ہو گئی ہے اس کی خادمہ تمہیں بلانے آئی ہے ۔ سنتی ہوں کہ وہ بیہوش ہو گئی ہے ۔ جب کبھی اسے ذرا ہوش آتا ہے تو تمہارا ہی نام لیتی ہے ۔" اتنا سنتے ہی پریتیا بے چین ہو گئی اس نے اننگ موہن سے جا کر کہا ۔۔۔ "ہائے میری ترنگنی بہت بیمار ہے ذرا چل کر اس کو دیکھ تو لو ۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر میری ترنگنی کو ۔۔۔۔" پریتیا کا گلا بھر آیا وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ۔

(۴)

ڈاکٹر اننگ موہن جب پریتیا کے ساتھ ترنگنی کے یہاں پہنچے تو آدھی رات گذر چکی تھی ۔ ترنگنی کے پلنگ کے چاروں طرف فرش پر گھر کی عورتیں بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر ہردے ناتھ چپ چاپ ایک طرف سر جھکائے کھڑے تھے ترنگنی کے گلے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی گلا گھوٹتا ہو ۔ اس کے بدن میں تشنج تھا ۔ اننگ موہن نے مریضہ کو بغور دیکھا ۔ نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا ۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے کہ ترنگنی نے زہر کھا لیا ہے ۔ مگر بہت دیر نہیں ہوئی میں ابھی دوا لاتا ہوں امید ہے کہ اچھی ہو جائے گی ۔" یہ کہہ کر اننگ موہن جھپٹ کر کمرہ سے نکل گئے زہر کا نام سنتے ہی ڈاکٹر ہردے ناتھ کا منہ فق ہو گیا ان کے ماتھے پر پسینہ آگیا لیکن کسی نے ان کی طرف نہیں دیکھا پریتیا کی قابل رحم حالت تھی وہ بیتاب ہو کر ترنگنی پر گرنے چلی لیکن سب نے پکڑ کر اس کو فرش پر بٹھا دیا اتفاقاً پریتیا کی نظر اس لفافہ پر پڑی جس میں سے ترنگنی کی چچی نے خط نکال لیا تھا اور جواب پلنگ کے نیچے پڑا ہوا تھا پریتیا نے لفافہ اٹھا لیا اور چلّا اٹھی ۔۔۔ "ہائے میری ترنی ! تو نے مجھ کو خط لکھنا چاہا مگر خط پورا نہ کر سکی ہائے مجھے اپنا درد دل تو بتا دیتی ۔۔۔۔" ڈاکٹر ہردے ناتھ کانپ اٹھے انہوں نے آگے بڑھ کر پریتیا کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور اپنے جیب سے ایک خط نکال کر تحریر کا مقابلہ کیا اور پریتیا کے ہاتھ میں وہ خط دے کر کہا ۔ "کیا یہ خط ترنگنی نے آپ کو لکھا تھا"

پریتیا نے خط پڑھ کر کہا ۔۔۔ "ہاں ہاں یہ خط میری پیاری سہیلی نے مجھے لکھا تھا ۔ آپ کو یہ خط کہاں ملا ۔

آپ نے اسے میرے پاس کیوں نہیں بھیجا؟"

ترنگنی کی ماں نے بھی خط دیکھ کر کہا۔ "بھیا! یہ تو میری ترنی کا خط ہے۔ تم کو کہاں سے ملا۔ میری ترنی اور پربتیا میں بہت پریم ہے یہ دونوں اسی قسم کے خط لکھا کرتی ہیں۔ تم تو میرٹھ میں رہتے ہو تم کو کیا معلوم کہ ان دونوں میں کتنا پریم ہے"

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "افسوس میں یہ پہلے سے نہ جانتا تھا" ترنگنی کی ماں نے حیرت سے اپنے دیور کو دیکھ کر کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟" ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا وہ دوڑتے ہوئے اپنے کرہ میں گئے اور وہاں سے کوئی دوا لا کر ترنگنی کے منھ میں ڈال دی جس سے ترنگنی کو فوراً قے ہوئی اس عرصہ میں ڈاکٹر اننگ موہن بھی دوا لے کر آ گئے تھے انہوں نے ڈاکٹر ہردے ناتھ سے آنکھیں ملا کر کہا "کیا میں دوا پلا سکتا ہوں؟"

"جی نہیں! اب آپ کی دوا کی ضرورت نہیں رہی میری ہی دوا سے مریضہ تندرست ہو جائے گی۔" یہ کہکر ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اننگ موہن سے آنکھیں ملانے کی انہیں جرأت نہ ہوئی۔ پربتیا اور ترنگنی کی ماں ایک دوسرے کا منھ تکنے لگیں یہ معمّا ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

متواتر قئیں ہو جانے سے ترنگنی کی حالت سدھرنے لگی صبح ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ آہستہ آہستہ رو بہ صحت ہونے لگی اور ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ بالکل اچھی ہو گئی۔

(۵)

اس واقعہ کے دو مہینے کے بعد پربتیا کی کوشش سے ترنگنی کی شادی اننگ موہن کے چھوٹے بھائی رام موہن سے ہو گئی۔ اب پربتیا اور ترنگنی ساتھ ساتھ رہتی ہیں وہ بہت خوش ہیں لیکن اب وہ پریم پتر نہیں لکھتیں اب ان کا برتاؤ آپس میں دیورانی اور جیٹھانی کا ہے کبھی کبھی رام موہن کی طرف اشارہ کر کے پربتیا ترنگنی سے ہنس کر مذاق میں کہتی ہے "اب اس نئے پریتم کے سامنے بھلا تم پرانے پریتم کو کیوں پیار کرنے لگیں۔ ترنی! اب وہ تمھارا پہلا پریتم کدھر گیا؟ تم تو پریتم کو پا کر اپنی پربتیا کو بالکل بھول گئیں" اس پر ترنگنی شرما جاتی ہے اور دزدیدہ نظروں سے پربتیا کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "پریتم اور پربتیا میں کوئی فرق نہیں میری نگاہوں میں تو دونوں ایک ہیں؟ کیوں ٹھیک ہے نہ؟"

سُنہری ندّی

(از جناب عبدالحمید صاحب شوق بی۔ اے (آنرز) صدر مدرس مدرسہ احمد پور)

باب اول

کالا جوڑا۔ اور جھکڑ شاہ صاحب

ظالمو، رحم کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر ٭ لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر لئے۔

ملک کشمیر میں ایک وادی تھی جس میں ہر طرف سبزہ زار اور قدم قدم پر گلزار تھا۔ چاروں طرف پہاڑ برف کی سفید پگڑیاں باندھے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ جن سے صاف شفاف پانی کی ندیاں ہر طرف کو بہتی تھیں۔ ان ندیوں کا پانی چٹانوں پر سے چادریں بن بن کر گرتا تھا۔ آبشاروں کا نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ دل ہر وقت اسی کو دیکھتے رہنے کو چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک ندی غروب آفتاب کے رُخ کو تھی۔ شام کو جب سورج کی سنہری کرنوں کا عکس اس کی بلورین سطح پر پڑتا تھا تو بالکل ایک سونے کا دریا لہریں لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس سبب سے لوگوں نے اس کا نام ہی سنہری ندی رکھدیا تھا۔

وادی کی آب وہوا اس قدر خوشگوار اور روح افزا تھی کہ بوڑھا بھلے نوجوان ہو جائے نیم جان بیمار کو لیجائیں تو تندرست ہو جائے۔ موسم گرما میں جب تمام ہندوستان کرۂ نار بنجاتا ہے وہ وادی رشک جنت بنجاتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی بارش ہلکی ہلکی پھوار وہ لطف دیتی کہ بایدو شاید۔ زمین اس قدر زرخیز کہ سیب۔ انگور۔ ناشپاتی۔ انار غرض۔ ہر قسم کے پھل۔ ہر قسم کے پھول اور بے انتہا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ اور لوگ اس کو وادی دولت کہتے تھے۔ یہ وادی تین بھائیوں کی ملکیت تھی۔

دونوں بڑے بھائیوں کے نام رزیل اور ذلیل تھے۔ یہ دونوں نہایت ہی بدصورت۔ اور بدباطن تھے۔ ان کی ترش روئی۔ سنگدلی۔ طمع۔ لالچ۔ اور حرص کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے دونوں کا نام کالا جوڑا۔ رکھ چھوڑا تھا۔ کیونکہ وادی کے غریب باشندوں پر وہ نہایت سخت ظلم کرتے تھے۔ اُن سے سارا دن تو اپنی بیگار لیتے اور شام مزدوری کی بجائے گالیاں دیتے اور تھپڑ مارتے تھے۔ بلبل۔ کوئل۔ اور قمری

جیسے معصوم پرندوں کو وہ غلیل سے تاک کر نشانہ کرتے تھے کیونکہ اُن کے جان فزا نغموں سے اُن کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور اُن کے خیال میں وہ اُن کے پھولوں اور پھلوں کو خراب کرتے تھے کھیتوں کا غلہ کھلیانوں میں خوب بھر رکھتے۔ اور اس وقت بیچنے کو نکالتے جب بازار میں خوب مہنگا ہو جاتا۔ اس طرح انہوں نے ڈھیروں سونا چاندی جمع کر رکھی تھی۔

اس کالے جوڑے کو خدا نے اس قدر تو نعمتیں دی تھیں۔ مگر یہ دونوں کبھی پاک پروردگار کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ اس کی راہ میں کسی بیکس فقیر محتاج کو کچھ دینا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ بلکہ اُن کی بدکلامی اور ترش روئی سے ڈر کر کوئی فقیر اُن کے دروازہ پر آتا ہی نہ تھا۔

ہمہ آدمی زادہ بوند لیکن ۔ چو گرگاں بخونخوار گی تیز چنگی۔

تیسرے اور سب سے چھوٹے بھائی کا نام جمیل تھا۔ جو ایسا پیارا خوبصورت اور بھولا بھالا بچہ تھا کہ ہر شخص اُس کو پیار کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کوئی دس برس کا تو سن ہوگا مگر نہایت ہی ذہین اور سمجھدار تھا۔ بچپن ہی میں چونکہ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اس لئے اس کالے جوڑے کے پالے پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں اس غریب کے خون کے پیاسے تھے۔ اس سے گھر کا سب کام کاج کراتے۔ برتن یہ دھوتا۔ گھر میں جھاڑو یہ دیتا۔ کھانا یہ پکاتا۔ مگر ذرا ذرا سی بات پر اس کو اس قدر مار پڑتی کہ معاذ اللہ اور پھر اُن ظالموں کا جھوٹا بچا کچا کھانے کو ملتا۔

ایک سال ملک کشمیر کے سب علاقوں میں بیوقت بارش سے فصلیں برباد ہو گئیں اور غلہ سڑ گیا۔ آندھیوں نے انگور کی بیلیں تباہ کر دیں۔ بھو سے چارے تک کا ستیاناس ہو گیا اور آدمی اور مویشی سب بھوکوں مرنے لگے۔ مگر وادی دولت میں وہی اگلی سی بہار تھی۔ وقت پر اور مناسب مقدار میں پانی برسا۔ غلہ۔ پھل پھول۔ ہر چیز نہایت افراط سے ہوئی اب تو کالے جوڑے کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ ہر طرف سے غلہ کے واسطے لوگ اُن کے پاس آنے لگے۔ اُنہوں نے منہ مانگے دام لئے۔ مگر جو لوگ روپیہ نہ خرچ کر سکتے اُن کے دروازہ پر سسک سسک کر جان دیتے تھے مگر اُن ظالموں کو رحم نہ آتا تھا کہ اُن کی کچھ مدد کریں اور جان بچائیں۔

ننھا جمیل اُن ظالموں کے ہوتے کیا کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اُن کی نظر بچا کر کسی کو پھل کسی کو روٹی دے ہی دیتا تھا۔ مگر اُس کے ظالم بھائیوں کو اگر اس کا پتہ لگ جاتا تھا تو غریب اس قصور پر خوب پٹتا تھا

وہ خدا ترس بچہ خود تمام مصیبت برداشت کرتا تھا مگر لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر جس طرح بن پڑے اُن کی مدد کرتا تھا ۔

ایک دن رزیل اور ذلیل حسب معمول جمیل کو گھر چھوڑ کر اپنے کام کاج کو گئے جمیل اُن کے کھانیکو کباب بنا رہا تھا ۔ اُس نے اندر سے مکان کی کنڈی لگا رکھی تھی اتنے میں ہوا زور سے چلنے لگی ۔ بوندیں پڑنے لگیں بارش موسلا دھار ہونے لگی ۔ سردی غضب کی ہوگئی ۔ مگر جمیل کے پاس انگیٹھی میں آگ خوب روشن تھی ۔ بھونتے ہوئے گوشت کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا ۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ خدا نے اس قدر نعمتیں میرے بھائیوں کو دی ہیں مگر افسوس کہ وہ ایک دانہ کسی کو نہیں دیتے ۔ لوگ بھوکے مرتے ہیں اور ہم مزے کرتے ہیں ۔ کاش میں کسی کی مدد کر سکتا " جمیل انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی ۔ جمیل چونکا ۔ پھر خیال کیا کہ ہوا سے شاید دروازہ ہلا ہوگا ۔ بھلا ہمارے پاس کون آتا ہے ۔ مگر دروازہ پھر کسی نے کھٹکھٹایا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت جلدی میں ہے ۔ جمیل نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو ایک عجیب و غریب شکل کا آدمی دکھائی دیا ۔ ٹھگنا سا قد طوطے کی سی سُرخ ناک ۔ نانبا ؤ کی طرح پھولی ہوئی گالیں ۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں ڈھیلے نہایت جلد جلد حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے ۔ بڑے بڑے گلپھے اور موٹی موٹی چڑھی ہوئی مونچھیں ۔ سر پر ایک اپنے قد سے بھی لمبا نوکدار ٹوپ ۔ اس پر چیل کے پروں کی کلغی ۔ ڈھیلا ڈھالا سا چغہ پہنے زور زور سے دروازے کو تھپک رہا ہے۔

جمیل اس بونے کو حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ بونے کی نظر اس پر پڑی اور اُس نے کہا " واہ میاں ۔ واہ مجھے تو سردی لگ رہی ہے اور تم دروازہ نہیں کھولتے ۔ بچّے نے جواب دیا ۔ نہ باباجی میرے بھائی آکر مجھ کو اور تم کو دونوں کو مارینگے میں دروازہ نہیں کھول سکتا ۔

بونے نے نہایت عاجزی سے کہا بیٹا کھول دو ۔ ذرا سی دیر آگ تاپ کر چلا جاؤں گا ۔ دیکھو سردی سے مرا جا رہا ہوں جمیل کو اس پر رحم آگیا ۔ اُس نے دروازہ کھول دیا اور بونا اندر آگیا ۔

بونا ۔ شاباش بیٹا شاباش ۔ بھائیوں سے مت ڈرو میں اُن کو سمجھا لوں گا ۔

جمیل نے کہا حضرت آپ میرے بھائیوں کو کیا سمجھائینگے ۔ آپ آگ تاپئے اور جلد چلے جائیے ورنہ وہ آکر بھرکس ہی نکال دیں گے ۔

بونا ۔ تو بیٹا میں کتنی دیر یہاں ٹھہر سکتا ہوں ۔

جمیل۔ جب تک یہ کباب تیار ہو جائیں ۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک چوکی بونے کو دی۔ اُس نے بیٹھ کر وہیں کپڑے نچوڑنے شروع کر دئے ۔

جمیل۔ حضرت کپڑے باہر نچوڑئے آگ بجھ رہی ہے ۔

بونا۔ اچھا ہے آگ بجھنے دو ۔ کباب دیر میں تیار ہوں گے تو مجھ کو جلدی نہ جانا پڑے گا ۔

جمیل بیچارہ اُس کی وحشتناک صورت سے ڈرتا تھا۔ اُس کے مُنھ سے لفظ نہ نکلتا تھا ۔ اِدھر بھائیوں کے خوف کے مارے الگ مرتا جا رہا تھا ۔

بونا پھر بولا ۔ بیٹا کئی دن کا بھوکا ہوں ۔ خدا کے واسطے مجھ کو کچھ کھانے کو دو ۔

اُس نے یہ الفاظ ایسی عاجزی سے کہے کہ جمیل کو بیحد ترس آیا ۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے طشتری میں دو کباب رکھ کر اُس کو دئے اور کہا "لیجئے یہ میرا حصہ ہے"۔

اتنے میں پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ جمیل نے جھپٹ کر دروازہ کھولا دیکھا تو دونوں بڑے بھائی ہیں ۔ بچارے کے قدموں کے تلے سے زمین نکل گئی ۔ ایک بھائی نے زور سے تھپڑ جو مارا تو بچارا تیورا کر گرا ۔ اور کالا چوڑا یہ کہتا ہوا اندر آیا کہ ہم تو سردی میں باہر کھڑے ہیں اور یہ دروازہ ہی نہیں کھولتا لیکن اُن کے غصے کی کچھ انتہا نہ رہی جب انہوں نے باورچیخانے میں بونے کو دیکھا ۔ دونوں چلائے اے کمبخت یہ کون ہے ۔

بونا ۔ اجی کوئی نہیں ۔ پھر اُس نے اپنا ٹوپ اتار کر زمین پر رکھدیا اور دونوں کو کھڑے ہو کر بہت ہی جھک کر سلام کیا ۔

رزیل جو غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا اُس نے جمیل کو سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور جھنجلا کر کہا ۔ ارے یہ کون ہے ۔ اور یہاں کیوں آیا ہے ؟

جمیل نے چیخ کر کہا ۔ بھائی جان مجھے معلوم نہیں

رزیل ۔ اے کمبخت یہ مکان میں کیسے آیا ؟

جمیل ۔ بھائی جان یہ سردی میں بھیگ رہا تھا اور . . . . . .

رزیل ۔ بچہ اور کا ۔ یہ کہہ کر اُس نے غریب بچہ کو مارنے کو چھڑی اٹھائی مگر بونے نے اپنا ٹوپ آگے کر دیا ۔ اور چھڑی جمیل کی بجائے اُس پر لگی ۔ چھڑی تو اُس پر پڑتے ہی ٹوٹ گئی ۔ لیکن اس میں سے

پانی کی دھاریں ہر طرف کو نکل کر بہنے لگیں۔

اب تو رزیل اور ذلیل دونوں اس کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے اجی تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟

بونا۔ غریب مسافر ہوں۔ سردی سے اکڑ رہا تھا۔ آگ روشن دیکھکر تاپنے آگیا۔

ذلیل۔ چل یہاں سے بدمعاش۔ تمام گھر پانی سے بھر دیا۔

بونا۔ قدم درویشاں رد بلا۔ عاجز ہوں مسکین ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔

رزیل۔ نکل یہاں سے۔ بڑے درویش بنکر آئے ہیں حضرت!

بونا۔ اچھا بابا جاتا ہوں۔ مگر کچھ کھانے کو ملجائے۔ بھوک سے بیتاب ہوں۔

ذلیل۔ ارے تیرے واسطے یہاں کھانا تیار رکھا ہے۔ دور ہو۔ ورنہ کچا ہی چبا جاؤں گا۔

بونا۔ ایک پیسہ ہی دیدو۔

اس پر ذلیل کو بہت غصہ آیا۔ اور اس نے لپک کر بڈھے کو گلے سے پکڑ لیا۔ اور باہر دھکیلنے کو ہی تھا کہ خود ٹھنی کھا کر گرا۔ اور لڑھک کر کونے میں جا پڑا۔ اب تو رزیل کو اور بھی تاؤ آیا۔ مگر جب اس نے بھی بونے کو گلے میں ہاتھ دیکر نکالنا چاہا تو لڑھک کر ذلیل کے پاس جا پڑا۔ اس کا سر دیوار سے دھم کر کے جا ٹکرایا۔ بونے خاں نے اب تو مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ٹوپ اٹھا کر سر پر رکھا۔ اور کھانسکر کہا۔ "اہاں۔ اہوں۔ آدھی کو رات پھر ملیں گے اب تو جاتے ہیں" بونا گھر سے نکلا تو اس نے کواڑ اس زور سے بند کئے کہ گھر کے درو دیوار تک ہل گئے۔ اس کے جاتے ہی بارش پھر زور سے ہونے لگی۔

رزیل نے جمیل کو طنزاً کہا واہ صاحب آج تو آپ نے بڑا کام کیا۔ یہ آپ کے دوست کون تھے۔ اب کھانے کو۔ اتنے میں دونوں کی نظر طشتری والے کبابوں پر پڑی اور انہوں جھڑک کر پوچھا۔ ابے یہ کیا ہے۔

جمیل۔ میں اپنے حصے کے کباب بڈھے کو دیرہا تھا۔

یہ سنتے ہی وہ دونوں غصہ کرکے مارے اپنے سے باہر ہو گئے۔ اور غریب کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ بیچارہ روتا دھوتا کسی کوٹھری میں بھوکا پڑ رہا۔ اور یہ دونوں خوب کباب کھا کر اور

شراب پی کر بدمست ہو گئے ۔ اور پھر اپنے اپنے بچھونوں پر جا لیٹے ۔

ٹھیک آدھی رات کے وقت دونوں کی آنکھ یکایک کھلی ۔ اور ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مکان کی سب چھتیں گر رہی ہیں ۔ کمرہ پانی سے بھر رہا ہے ۔ اور وہی بونا پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے ۔ اور گا رہا ہے ۔ ان کو دیکھ کر اُس نے کہا ۔ معاف کیجئے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی ۔ اچھا اب ہم جاتے ہیں ۔ باورچیخانہ کی چوکی پر ہم نے اپنا پتہ لکھ کر رکھ دیا ہے ۔ اور جمیل کا کمرہ گرانے سے بچا دیا ہے ۔ اور یہ کہکر وہ چلدیا ۔ جانے کہاں غایب ہو گیا ۔

وہ رات ایک آفت کی رات تھی ۔ آندھی ۔ مینھ ۔ طوفان ۔ بجلی کا کوندنا ۔ رعد کا کڑکنا ۔ بادل کا گرجنا ۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی ۔ دونوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ وادی جو کل بہشت کا ٹکڑا تھی اب بالکل اجاڑ ہو رہی تھی ۔ فصلیں برباد ۔ مکانات شکستہ ۔ وادی دولت وادی نحوست بنگئی تھی ۔ روپیہ ۔ پیسہ ۔ کپڑا لتّا ۔ برتن ۔ بلکہ مویشی تک پانی بہا لے گیا ۔ اور یہ دونوں حسرت سے ہاتھ ملتے رہ گئے ۔ باورچی خانہ میں چوکی پر ایک کاغذ پڑا ملا جس پر لکھا تھا ۔ میرا پتہ یہ ہے :-

"سائیں جھکڑ شاہ صاحب ۔"

باب دوم

عجیب و غریب لوٹا

حاصل ہوا ہے ہم کو یہ مضمون چراغ سے ‏ ‏ روشن اسی کا نام ہے جو کہ جلائے دل

سائیں جھکڑ شاہ صاحب کا نام سن کر تعجب ہوا ۔ اُن کو ہر جگہ تلاش کیا گیا ۔ مگر کہیں پتہ نہ ملا ۔ ہر شخص کو اس خدائی تنبیہ سے عبرت ہوئی مگر کالے جوڑے کا تو دل بالکل سیاہ ہو گیا تھا ۔ چند روز کے بعد وہ پھر ویسے ہی ہو گئے ۔ مگر اب وادی دولت سچ مچ وادی نحوست ہو گئی تھی ۔ نہ وہ پہلی سی بارش ہوتی تھی ۔ نہ اگلی سی زرخیزی اور سرسبزی کا پتہ تھا ۔ ہر جگہ تباہی اور بربادی کے آثار نمایاں تھے ۔ تمام باشندے مکانات چھوڑ چھاڑ کر دوسرے مقامات پر آباد ہو گئے ۔ اور کوئی ہوتا تو اب خدا سے ڈرتا توبہ کرتا ۔ اپنے گناہوں پر شرمسار ہوتا ۔ خدا سے مغفرت مانگتا ۔ مگر رذیل اور ذلیل

اس قماش کے نہ تھے ۔ وہ اب خدا کو ۔ زمانے کو قسمت کو فلک کو گالیاں دیتے تھے ۔ جو منہ آتا تھا بکتے تھے ۔ جب وادیِ دولت میں گذارہ نہ ہوا تو پاس کے کسی گاؤں میں جا بسے ۔ اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے ۔ جاتے ہوئے مکان کے ایک کونے میں ان کو تین ڈلے سونے کے ملے ۔ جو اتفاقاً طوفان سے بچ گئے تھے ۔ انہی کو غنیمت سمجھ کر لے گئے ۔ اور ایک چھوٹی سی سرافی کی دکان کھول لی ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں گاہکوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ سونے میں ملاوٹ کرتے ہیں ۔ اس لئے دکان چلنے سے رہ گئی ۔ اور اب فاقوں کی نوبت آ گئی ۔ لیکن اس پر بھی جب کبھی کچھ پیسے ہاتھ لگ جاتے تو شراب ضرور پیتے ۔ آخر کار گھر میں سوائے ایک لوٹے کے کچھ نہ رہا ۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت لوٹا جمیل کو اس کے چچا نے بچپن میں کھیلنے کو دیا تھا ۔ گھر سے چلتے وقت وہ اس کی نظر پڑا تو بیچارا اس کو ساتھ اٹھا لایا تھا ۔ اس لوٹے کا منھ انسانی چہرہ کی صورت کا بنا تھا ۔ ناک سرخ پتھر کی تھی ۔ آنکھوں میں یاقوت جڑے تھے ۔ اور جب اس میں ڈال کر کچھ پیو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوٹا پینے والے سے آنکھیں ملا کر ہنستا ہے ۔

جب گھر میں اور کچھ نہ رہا تو کالے جوڑے نے اس لوٹے کو غور سے دیکھا ۔ معلوم ہوا کہ خالص سونے کا ہے ۔ بس جمیل کو حکم دیا کہ ہمارے باہر سے آنے تک اس کو آگ میں پگھلا رکھو ۔ جمیل اس لوٹے کو جو اس کے چچا کی نشانی تھی نہایت عزیز رکھتا تھا مگر ان ظالموں کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی ۔ قہر درویش برجان درویش اس نے لوٹے کو آگ پر رکھ کر دھونکنا شروع کیا ۔ گرم ہو کر لوٹے کی آنکھیں اور ناک اور بھی سرخ معلوم ہونے لگے ۔ بیچارا دھونکنے سے سر اٹھا کر ذرا باہر دیکھنے لگا ۔ تو بہت فاصلے پر وہی پرانی وادیِ دولت پر نظر پڑی ۔ اب وہی ندی اس کی آنکھوں سے سامنے تھی جس کو لوگ سنہری ندی کہتے تھے اور اس وقت تو سورج کے عکس سے وہ بالکل سونے کی معلوم ہوتی تھی ۔ جمیل بچہ تو تھا ہی اس کے دل میں خیال گذرا کہ "کاش یہ ندی واقعی سونے کی ہوتی تو میرا لوٹا بچ جاتا" ۔

ادھر اس کے دل میں یہ خیال آیا ادھر اس کے کان میں یہ آواز آئی ۔ "ہو جائے گی ہو جائیگی" جمیل کو بہت تعجب ہوا ۔ ادھر ادھر دیکھا تو مکان میں کوئی نہ تھا سمجھا کہ یوں ہی وہم ہو گیا ۔ پھر وہ اسی خیال میں ڈوب گیا کہ کاش یہ ندی سچ مچ سونے کی ہو جائے ۔ یہ خیال اس کے دل میں آتے ہی پھر وہی آواز سنائی دی "میاں ندی سونے کی ہو جائے گی" ۔ اب تو بچہ بہت ڈرا ۔ اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ کہ شاید کوئی دکان میں چھپا ہے ۔ لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ آواز لوٹے میں سے آ رہی ہے

بلکہ اب تو ایک قسم کی گھنٹی سی سا تھ بج رہی تھی ۔ اور لوٹا یہ گیت گا رہا تھا ۔

آہا ۔ آہا میرے مولا + آہا ، آہا مورے مولا ۔

جمیل پر اس قدر خوف طاری تھا کہ بچارا چیخ مارنا چاہتا تھا تو منہ سے آواز نہ نکلتی تھی ۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا ۔ حیران تھا کہ پگھلتے ہوئے لوٹے میں گانے بجانے کا کیا کام تھوڑی دیر میں گانا بند ہوا تو اُس نے صاف صاف یہ الفاظ لوٹے میں سے سنے کہ بیٹا ڈرو مت مجھ کو باہر نکالو" اب تو بچہ اور بھی ڈرا خوف کے مارے ہاتھ تک نہ ہلا سکتا تھا ۔ لیکن آخر کار اُس نے ہمت کر کے ایک لکڑی سے لوٹے کو آگ کے باہر نکال کر الٹ دیا تو اُس میں سے ایک صاحب بر آمد ہوئے ۔ جن کی چھوٹی چھوٹی سنہری ٹونٹنگریاں تھیں ۔ اور ایک نیلا کوٹ زیب بدن تھا جمیل کے دیکھتے دیکھتے اُس کا قد ایک بالشت سے بڑھکر قریب دو فٹ کے ہو گیا ۔ اور وہ جمیل سے یوں مخاطب ہوا ۔ " شاباش بیٹا شاباش ہم تم سے بہت خوش ہیں" یہ کہہ کر بونا اپنے کپڑوں کو سنوارتا ہوا کمرہ میں اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا ۔ اُس کا مخمل کا نیلا کوٹ ۔ اُس کے نیچے ایک شاندار واسکٹ ۔ سر کے بال گھونگریالے ۔ سفید ڈاڑھی تقریباً زمین کو چھوتی ہوئی ۔ چہرہ تانبے کا سا سُرخ مگر نہایت بارُعب اور پُرہیبت ۔ کپڑے وغیرہ درست اور ٹھیک ٹھاک کر کے کہنے لگا ۔ " میں ندی کو سونے کی بنا دوں گا ۔"

اب تو جمیل کو بھی اس سے سوال کرنے کی جرات ہوئی ۔ اور اُس نے پوچھا " حضرت آپ میرے لوٹے میں رہتے ہیں" ؟

اب تو بڈھے میاں اُس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے " دیکھو بیٹا میرا نام خواجہ خضر ہے ۔ مگر تمہارے بھائی مجھ کو سائیں جھکڑ شاہ صاحب " کے نام سے پہچانتے ہیں ۔ میں سب دریاؤں اور سمندروں کا بادشاہ ہوں ۔ تم بہت نیک بچے ہو اس لئے میں تمہارے لوٹے میں آگیا تھا ۔ مجھ کو سب معلوم ہے کہ تمہارے بھائی تم سے کیا سلوک کرتے ہیں ۔ دیکھو یہ ندی سونے کی ہو جائے گی اگر تم سو دفعہ سورہ فاتحہ پڑھ کر مسجد کے کنوئیں کا پانی اس ندی میں ڈالدو گے ۔"

یہ کہہ کر خواجہ خضرؑ نے پھر آگ کی بھٹی میں قدم رکھا اور نظروں سے غائب ہو گئے اور اُن کے غایب ہوتے ہی لوٹا بھی غایب ہو گیا ۔ جمیل بھائیوں کے ڈر سے ہائے ہائے میرا لوٹا ۔ ہائے میرا لوٹا کہہ کر رونے لگا ۔

باب سوم

ذلیل کی ناکامی

جو کہ ظالم ہے کبھی وہ پھولتا پھلتا نہیں + سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھی شمشیر کا؟ (میرؔ)

خواجہ خضرؑ کے نظروں سے غایب ہوتے ہی کالا جوڑا شراب سے بدمست اور مخمور آ پہنچا اور سب سے پہلے جمیل سے یہی سوال کیا کہ لوٹا کہاں ہے۔ جب اُس نے ڈرتے کانپتے ہوئے خواجہ خضرؑ یا جھکڑ شاہ صاحب کی دوبارہ تشریف آوری کی کہانی سنائی تو دونوں نہایت برافروختہ ہوئے اور بیچارہ کو اس قدر مارا کہ بیہوش ہوگیا۔ مگر خود بھی چونکہ نشہ میں تھے اس لئے اس کو مارپیٹ کر چوکیوں پر لیٹ رہے۔ جب نشہ اترا اور جمیل سے بار بار پوچھنے پر اُس نے وہی کہانی سنائی تو اب اُن کو اُس کی بات کا یقین سا آنے لگا۔ اور ہر ایک کے دل میں یہ لالچ پیدا ہوا کہ وہی ندی کو سونے کی بناکر اس کا مالک بن بیٹھے۔ اب دونوں میں اس بات پر تکرار ہونے لگی کہ پہلے کون جائے۔ جب باتوں سے فیصلہ نہ ہوا تو جوتی پیزار کی نوبت پہنچی۔ شور و غوغا سن کر لوگ جمع ہو گئے پولیس آگئی۔ پولیس کے لوگوں کو آتے دیکھ کر میاں ذلیل تو کہیں جا چھپے۔ اور میاں رزیل نقض امن کے جرم میں حوالات میں بند کر دئے گئے۔ ذلیل کو جب بڑے بھائی کے حوالات میں جانے کی خبر لگی تو باچھیں کھل گئیں۔ فوراً قسمت آزمائی کرنے کو تیار ہوا۔ مگر اس میں شرط تھی سو دفعہ فاتحہ پڑھ کر دم کئے ہوئے پانی کی۔ اور اس کو کلمہ طیب تک نہ آتا تھا۔ برائے نام مسلمان تھا۔ ورنہ اسلام سے یا اسلامی اخلاق سے اس کو اور اس کے بڑے بھائی کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ماں باپ نے جو تعلیم بچپن میں دی تھی وہ سب بداعمالیوں میں بھول گئی تھی۔ اور اب یہ دونوں محض وحشی کافر تھے۔ آج جو ضرورت پڑی تو چلے مسجد کو۔ ملّاں جی کو حیرانی ہوئی کہ یہ شرابی بدمعاش آج مسجد میں کیسے۔ اُس نے نہایت عاجزی سے اپنا مطلب عرض کیا۔ مگر ملّاں بھی لالچی تھا۔ اُس نے بغیر کچھ لئے کے سو دفعہ الحمد کی سورۃ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تھے میاں ذلیل بھی بڑے دُھن کے پکے مغرب کی نماز کے وقت مسجد کے دروازہ پر گلاس میں پانی لے کر کھڑے ہو گئے۔

جو نمازی گذرتا اس سے دم کراتے گئے جب اس طرح مسجد کے کنوئیں کا دم کیا ہوا پانی ملگیا تو اگلے دن صبح نور کے تڑکے اُٹھ کر روانہ ہوا۔ ایک بوتل میں پڑھا ہوا پانی۔ دو بوتلوں میں شراب اور کچھ کھانا لے کر ایک ٹوکری میں رکھا۔ اور اس کو کمر پر لٹکا کر ہاتھ میں ڈنڈا لے کر چلدیا۔ رستے میں میاں رزیل کی حوالات پڑتی تھی اُس کے چڑانے کو سلاخوں کے دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر خدا حافظ کہا اور روانہ ہوا۔ اُس کو دیکھ کر رزیل خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

صبح کا سہانا سماں تھا۔ ہری ہری گھاس پر شبنم کے قطرے پڑے تھے گویا کہ سبز مخمل پر موتی جڑے تھے۔ پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں برف سے ڈھکی تھیں۔ اُن پر آفتاب کی سنہری کرنیں پڑ کر ہر طرف سنہرا سماں نظر آتا تھا۔ دھوپ سے ہلکے ہلکے بخارات اُٹھتے تھے۔ اور سورج کی کرنیں ان میں ہزاروں رنگوں کی جھلک دکھاتی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہوا کی نرم و لطیف موجیں غنچہ و گل کو چھیڑتی ہوئی آتی تھیں۔ اور شام جان کو معطر کر رہی تھیں۔ غرضکہ عجب دلچسپ اور دلفریب وقت تھا۔ اور عجیب وجد آور نظارہ تھا چنار اور شاہ بلوط کے اونچے اونچے درخت حیران کھڑے جھوم رہے تھے۔ اس نظارہ کو وہی شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہو جس نے کشمیر جنت نظیر کی کبھی سیر کی ہو۔ اگرچہ ابھی تک سنہری ندی پر دھوپ نہیں آئی تھی مگر اُس کے آبشار کا جھرنا عجب لطف دیتا تھا۔ ذلیل اپنی نظر اسی پر جمائے جا رہا تھا۔ اس دُھن میں اُس کو فاصلہ کا بھی کوئی خیال نہ رہا۔ جلد جلد قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔

جب سورج ذرا اونچا ہوا تو اُس کو اپنے آگے ایک بڑا بھاری برف کا ٹیلہ نظر آیا۔ جو اس کے اور سنہری ندی کے درمیان حائل تھا۔ بھلا اس وادی کی کونسی جگہ اور کونسی چیز تھی جس سے وہ واقف نہ ہو مگر اس برف کے ڈھیر کو تو اُس نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس پر تعجب یہ کہ برف کے نیچے سے نہایت عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی تو خوشی اور مسرت کے نعرے کبھی رونے اور چیخنے کی بھیانک پکار۔ ذلیل بہت ڈرا۔ مگر تھا دھن کا پکا جو قدم اٹھا آگے ہی پڑا۔ رستہ پتھریلا اور خطرناک تھا برف پاؤں کے نیچے ٹوٹتی اور پھسلتی معلوم ہوتی تھی۔ مگر یہ چلتا ہی گیا۔ برف میں سے ایک روشنی نکلنی شروع ہوئی جو کبھی تو اس کو بالکل چندھیا دیتی اور کبھی یک لخت ایسی غائب ہو جاتی تھی کہ یہ بالکل اندھیرے گھپ میں ٹکرا رہ جاتا تھا۔ آوازیں جو برف کے نیچے سے آ رہی تھیں نہایت درجہ خوفناک اور ڈراؤنی ہوتی جاتی تھیں۔ بالکل بھونچکا اور مخبوط الحواس ہو رہا تھا۔ کئی دفعہ پھسل کر منہ کے بل گرا۔ مگر ایک تو سونے کی لالچ،

دوسرے ناکام واپس جانے پر بڑے بھائی کے ہنسنے کا خیال اس کو کشاں کشاں آگے ہی لئے جاتا تھا۔ اب تو کھانے کی ٹوکری اُٹھانی بھی مشکل ہو گئی حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پیاس سے بیتاب ہو کر برف کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر چوسنے لگا۔ جب آگے جانا مشکل ہوا تو ایک جگہ بیٹھ کر ستایا۔ کھانا کھایا۔ شراب پی اور ذرا سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو پھر چلا۔ مگر اب کھانا ختم تھا۔ شراب کی بوتلیں خالی تھیں ان کو وہیں چھوڑا اور صرف پڑے ہوئے پانی کی بوتل بغل میں دبا کر چلا۔ آگے ایک دیوار کی طرح سیدھا پہاڑ تھا اس پر چڑھنا تھا دھوپ تیز ہو گئی۔ سایہ کا کہیں نام نہ تھا۔ پھر منہ خشک ہونے لگا۔ اُس نے سوچا کہ بھری بوتل پاس ہے۔ ندی میں صرف چند قطرے ڈالنا ہے اس لئے گھونٹ پی لینے سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔ یہ سوچکر اُس نے بوتل کا ڈاٹ کھولا اور بوتل منہ کو لگائی۔ مگر اسی وقت ایک کُتے کا پلا نظر پڑا۔ جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے زمین پر پڑا سسک رہا اور جان توڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ذلیل کی بوتل پر جمی تھیں۔ مگر اُس سنگ دل میں اس قدر رحم کہاں کہ اُس کے منہ میں چند قطرے ٹپکاتا بلکہ الٹا اُس کو ٹھوکر مار کر آگے چلدیا۔ اور غٹ غٹ دو چار گھونٹ پانی کے آپ چڑھا لئے۔

اُسی وقت آسمان پر ایک نیلے رنگ کا بادل چھا گیا۔ راستہ پہلے سے زیادہ ڈھلوان اور دشوار گذار ہو گیا۔ ہوا نہایت گرم اور جھلسنے والی چلنے لگی۔ پہاڑی ندیوں کا شور اور آبشاروں کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اب ذلیل کو پیاس نے پھر ستایا۔ بوتل کو دیکھا تو ابھی اس میں کافی پانی تھا۔ لگا پینے۔ عین اسی وقت ایک ننھا بچہ نظر پڑا۔ جو نہایت ہی خوبصورت تھا۔ مگر پیاس سے بیتاب۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ناک کا بان پھر گیا تھا۔ لبوں کی رنگت نیلی پڑ گئی تھی۔ دم گلے میں اٹک رہا تھا۔ اُس کی قابل رحم حالت کو دیکھ کر پتھر کا کلیجہ بھی پانی ہو جاتا مگر ذلیل کو ذرا ترس نہ آیا۔ خود دو گھونٹ پانی کے پیئے۔ بچہ کو ٹھوکر مار کر رستے سے پرے کیا۔ اور اپنے رستے سے چلا گیا۔ اُس وقت ایک بالکل سیاہ بادل آفتاب کے آگے چھا گیا۔ اور ایک بادل سیاہ رنگ کی طرح بل کھاتا ہوا اُس کے پاس سے نکل کر آسمان پر چلا گیا۔

مگر اُس کی منزل مقصود بالکل قریب آ گئی تھی۔ سنہری ندی چند قدموں کے فاصلہ پر سامنے نظر آتی تھی۔ ذلیل ذرا دم لینے کو بیٹھا تو پاس ہی کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ دیکھا کہ ایک پتھر کی اوٹ میں ایک ضعیف العمر بڈھا شخص پڑا ہے۔ چہرہ پر موت کے آثار نمایاں ہیں۔ آنکھیں بے نور ہو گئی

تھیں۔ زبان کو بار بار لبوں پر پھیر کر کہتا تھا۔ "پانی۔ ہائے پانی" ذلیل کو اسے دیکھ کر رحم کی بجائے غصہ آگیا دو چار گالیاں دیکر کہا۔ ارے کمبخت۔ بہت جی چکا۔ اب کہیں مرمی۔ کیا قیامت کے بورے بٹورے گا اور بمصداق موئے پر سو درے۔ بڈھے کو اس نے ایک لات رسید کی اور چلا آگے۔

اس وقت جانب شرق سے بجلی کوندی۔ آسمان پر تین دفعہ تلوار کی شکل میں چمکی۔ سیاہ بادل ہر طرف چھا گیا۔ سیاہ بادل کے نیچے سورج ایک سرخ آتشی گیند کی طرح غروب ہونے لگا۔ مگر اب ذلیل عین سنہری ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کی لہریں بھی آگ کی لپیٹیں معلوم ہوتی تھیں۔ آبشاروں کی آواز ایسی وحشت ناک تھی کہ کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ قریب تھا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائے۔ مگر اس نے ذرا جی کو کڑا کیا۔ دل کو سنبھالا۔ تونبل کو کھولکر ندی میں انڈیل دیا۔ پانی کے ندی میں گرتے ہی ایک سرد ہوا کے جھونکے نے اس کو بھی ڈھکیل دیا وہ خود بھی ندی میں گرا۔ گرتے وقت ایک چیخ اس کے منھ سے نکلی۔ اسی وقت سورج غروب ہو گیا۔ ندی میں ایک خوفناک گرج پیدا ہوئی۔ اور رات کی تاریکی میں اس کی شکل کا ایک بت سیاہ پتھر کا ندی کی سطح پر نمودار ہوا۔ اور پانی اس کے گرد چکر کھا کر بہنے لگا۔

باب چہارم

رزیل کی ناکامی

عنایت بیکسوں پر ہے کلید رحمت باری ‌‌ ‌ بھلا کیا مارنا ہوتا ہے اک اللہ مارے کا
(شوق)

کئی دنوں کے بعد رزیل حوالات سے چھوٹ کر گھر آیا تو جمیل کو اکیلا پایا۔ ذلیل کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جو گیا ہے تو اب تک نہیں لوٹا۔ بہت خوش ہوا سمجھا کہ وہیں کہیں مر گیا۔ مگر جمیل جو قدرتاً بہت رحم دل اور پیارا بچہ تھا۔ اس کو یاد کر کے روتا تھا۔ اگرچہ ذلیل نے ہمیشہ اس پر ظلم و ستم کیا تھا مگر یہ اس کی سب باتیں بھولکر اپنے بھائی کی محبت میں بیتاب تھا اور اس کی تلاش میں جانا چاہتا تھا۔ رزیل نے اس کو تو نہ جانے دیا۔ آپ ادھر ادھر سے کچھ کھانے پینے کا سامان کر جانے کو تیار ہوا۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ ذلیل پانی پڑھوا کر نہیں لے گیا تھا۔ اس نے ملا کو کچھ دے

دلاکر پانی پر الحمد تو سو دفعہ پڑھوالی ۔ اور اگلے دن علی الصباح ایک ٹوکری میں کچھ کھانا اور شراب کی دو بوتلیں رکھ پڑھتے ہوئے پانی کی بوتل ہاتھ میں لے چل کھڑا ہوا ۔

جب وہ بھی برفانی پہاڑ کے پاس آیا تو اُس کے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آیا جو ذلیل کو پیش آیا تھا ۔ اُس کو بھی اپنی ٹوکری وہاں چھوڑنی پڑی ۔ اور وہ بھی صرف پڑھتے ہوئے پانی کی بوتل لے کر آگے چلا ۔ جب دیوار کی مانند سیدھے پہاڑ پر چڑھا تو اُس کو بھی سخت پیاس لگی ۔ اور جب وہ پانی پینے لگا تو اُس کو بھی پہلے تو ایک کتے کا پلا ۔ پھر ایک خوبصورت بچہ اور بالآخر ایک ضعیف العمر شخص پیاس سے بیقرار اور جاں بلب نظر پڑا ۔ یہ بھی اسی طرح اُن کو ٹھکراتا ہوا اور اپنی پیاس بجھاتا ہوا آگے بڑھا چلا گیا ۔ قریب دریا کے پہنچا تو اُس کو اُس کا بھائی ذلیل پیاس سے بیقرار اور ہائے پانی پانی چلاتا ہوا نظر پڑا ۔ اُس نے اُس کو بھی ایک زور سے لات ماری اور گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا ۔ مگر جب مڑکر دیکھا تو ذلیل غائب تھا ۔ اب ندی اُس کے بالکل سامنے تھی ۔ وہی سیاہ بادل آسمان پر چھا رہا تھا ۔ بجلی کوندرہی تھی ۔ بادل گرج رہا تھا ۔ دریا کی لہریں شور مچا رہی تھیں آفتاب سُرخ گیند کی مانند غروب ہو رہا تھا ۔ ندی کو اور آبشار کو آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ خوفناک آوازیں اور وحشت ناک نظارے اُس کی آنکھوں کے سامنے تھے ۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا ۔ دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اُس نے ایک دفعہ سنبھل کر بوتل کا باقی پانی ندی میں انڈیل دیا ۔ ساتھ ہی وہ بھی پھسل کر دھڑام سے ندی میں گرا ۔ اور نہایت ہی دل دہلانے والی آوازوں کے درمیان وہ غرق ہو گیا اور اُس کا سیاہ بت پتھر کا بنا ہوا اپنے بھائی کے پاس نمودار ہو گیا ۔ خس کم جہاں پاک ۔ کالا جوڑا اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا ۔

باب پنجم

جمیل کی کامیابی

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر ۔ خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

کئی دن تک جمیل بیچارا بھائیوں کا انتظار کرتا رہا ۔ مگر وہ نہ آئے ۔ پر نہ آئے ۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اُن پر کوئی مصیبت آگئی ۔ مگر کیا کر سکتا تھا ۔ ایک سنار کے پاس نوکر ہو گیا ۔ سارا دن اُس کا

کام کرتا۔ رات کو ایک مولوی صاحب سے مسجد میں کچھ پڑھنا لکھنا سیکھتا وہ بھی اُس کو پیار اور شفقت سے پڑھاتے تھے کیونکہ یہ اُن کی بہت خدمت کرتا تھا۔ اُس کی مصیبت میں کبھی کبھی خواجہ خضرؑ اُس کے خواب میں آکر اُس کو حوصلہ دیتے اور اس کو ڈھارس بندھا جاتے۔ مگر چند روز کے بعد پھر بھائیوں کو یاد کر کے اور اپنی تنہائی اور بیکسی کا خیال کر کے رونا۔ آخر کار اُس نے بھی اپنے بھائیوں کی تلاش میں جانے اور اپنی قسمت کو آزمانے کی ٹھان لی۔ مولوی صاحب نے جب اُس کا یہ ارادہ پایا تو نہایت محبت سے پانی پڑھکر دیا۔ اور دعائیں دیکر رخصت کیا۔

اول اول اُس کا رستہ بھی ویسا ہی صعب اور دشوار گذار تھا۔ وہ تو بھلا جوان ہٹے کٹے تھے یہ بچہ گرتا پڑتا جا رہا تھا۔ برف کا ڈھیر آیا تو اُس کو بھی بہت ڈر اور خوف معلوم ہوا۔ تھک کر یہ بھی لیٹا۔ اپنا سب کھانا وغیرہ وہیں چھوڑ کر یہ بھی پانی کی بوتل لیکر چلا۔ پیاس اُس کو بھی ایسی لگی کہ بے اختیار بوتل کھول منہ کو لگانے لگا۔ مگر اسی وقت اُس کو ایک پیرمرد پہاڑ سے ہانپتے کانپتے اترتے نظر پڑے۔ پیاس سے بیقرار تھے۔ اُس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر بولے "بیٹا پانی" جمیل نے فوراً بوتل اپنے لبوں سے ہٹا کر اُن کے منہ کو لگادی انہوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور دعائیں دیتے ہوئے آگے چلے۔ خُدا کی قدرت دیکھئے۔ اب جمیل کا رستہ بہت خوشگوار اور سہل ہو گیا لیکن پھر بھی دھوپ کا وقت تھا۔ جمیل کو پیاس پہلے سے جو تھی وہ تیز ہو گئی۔ مگر بوتل میں پانی اب بالکل تھوڑا رہ گیا تھا اُس سے ذرا زبان ہی تر کرنا چاہتا تھا کہ زمین پر ایک نیم جان بچہ سسکتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کی نظر اُس کی بوتل پر تھی۔ اور ننھے ننھے ہاتھ جن میں کوئی سکت باقی نہ تھی اُس کی طرف کو اُٹھے تھے۔ اُس کے نیلے ہونٹ۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ لپکتا ہوا تالو دیکھ کر جمیل کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آئے۔ فوراً اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کو اُٹھا کر گود میں لیا اور بوتل کا منہ کھولکر اُس کے منہ کو لگادی۔ اور بچہ غٹ غٹ پانی پی گیا۔ اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ اُس نے یہ دیکھا وہ بچہ اُس کی گود میں سے کودا اور ہنستا ہوا پہاڑی سے نیچے بھاگ گیا جمیل اُس کو جاتے دیکھتا رہا جب وہ عین پہاڑی کے نیچے جا پہنچا تو جمیل کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ ایک ستارہ بنکر آسمان کی طرف چڑھ گیا۔ وہ اپنے اس وہم پر ہنستا ہوا آگے چلا۔

اب اُس کا رستہ تو گویا ایک باغ میں سے تھا۔ ہر طرف پھولوں کی مہک پرندوں کے چہچہے

بادِ صبا کے جھونکے دل کو تروتازہ کر رہے تھے ۔ یہ سماں دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا ۔ مگر پیاس جو صبح سے لگی وہ ابھی تک نہ بجھی تھی ۔ باغ میں سب کچھ تھا مگر پانی کہیں نظر نہ آتا تھا ۔ بوتل کو دیکھا تو اس میں بھی ایک ہی گھونٹ پانی ہوگا اب صبر ناممکن تھا اور بوتل خود بخود منہ کو لگ چکی تھی کہ ایک کتے کا پیاسا سسکتا اور جان توڑتا ہوا دکھائی دیا ۔ بیقرار ہوکر جمیل نے بوتل کا تمام پانی اس کے منہ میں نچوڑ دیا ۔ پانی پی کر کتا تو غائب ہوگیا مگر وہی خواجہ خضرؑ اس کے پاس کھڑے تھے اور فرما رہے تھے "شاباش بیٹا شاباش میں بہت خوش ہوں میں اس ندی کو حکم خدا سے خالص سونے کی کردوں گا میں تجھ کو بادشاہ بنادوں گا ۔ دیکھ تیرے دونوں ظالم اور بے رحم بھائیوں کے جسم سیاہ پتھر کے ہوگئے ۔ دیکھ تو ہمیشہ خدا کی مخلوق پر رحم کرنا"

جمیل نے دیکھا تو اب وہ خواجہ خضرؑ کے ساتھ سنہری ندی کے کنارہ کھڑا تھا ۔ اس کے دونوں بھائیوں کے بت سیاہ پتھر کے اس کے سامنے تھے ۔ اس کا دل بھر آیا ۔ اور روتا ہوا حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور عرض کی ان کے لئے دعا کیجیے کہ خدا ان کا قصور معاف کردے اور ان کو زندہ کردے ۔ مگر خواجہ خضرؑ نے کہا کہ نہیں اب قیامت تک وہ اسی طرح رہیں گے ۔ تو اپنا پانی ندی میں ڈال دے ۔

جمیل یہ پانی تو میں نے کتے کو پلایا تھا ۔ اس کا جھوٹا ہے ناپاک ہوگیا ہے ۔ خواجہ خضرؑ ۔ بیٹا جو پانی پیاسوں کو پلایا جائے وہ ناپاک نہیں ہوتا ۔ یہ کہہ کر اپنے پاس سے دو پھول اس کو عنایت فرمائے جمیل نے وہ دونوں پھول اور بوتل میں جو چند بوند پانی تھا دریا میں ڈالا پھر کر دیکھا تو خضرؑ غائب تھے ندی تمام پھولوں سے بھری ہوئی تھی ۔ نہایت دلکش آوازیں چنگ و سرود کی اس میں سے آرہی تھیں وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ پھر حضرت خضرؑ کی آواز کان پڑی کہ وادی کے دوسری طرف جاؤ ۔ اس ٹیلے کے جس کے پاس وہ کھڑا تھا ۔ دوسری طرف گیا تو دیکھا کہ وادی دولت میں ہر طرف پھر اگلی سی بہار لوٹ آئی ہے ۔ ندی کا تمام پانی سچ مچ سونے کی چادر ہوگیا ہے ۔ وہ جب اپنے پرانے مکان کی طرف آیا تو ہر چیز کو ویسے ہی صحیح سلامت پایا جیسی کہ وہ سائیں جھکڑ شاہ صاحب کے اول مرتبہ آنے سے پہلے تھی ۔ ندی کا تمام سونا وہ مزدوروں سے اٹھا کر اپنے گھر لایا ۔ اس کو لوگوں پر خرچ کیا ۔ غریبوں کے لئے لنگر جاری کئے مدرسے قائم کئے مسجدیں بنوائیں ۔ تالاب کھدوائے ۔ اور جس طرح ہوسکا مخلوق خدا کی خدمت کی ۔

اب وہ ایک امیر کبیر ہوگیا تھا ۔ اُس کی دولت کے سب لوگوں میں چرچے تھے اس کی نیکی اور شرافت زبان زد خاص و عام تھی ۔ شدہ شدہ ۔ یہ خبریں بادشاہ کشمیر تک بھی پہنچیں ۔ اُس کی ایک اکلوتی بیٹی تھی اس کے لئے بر کی ۔ اس کو تلاش کی جمیل کی شکل عقل ۔ دولت شرافت کو دیکھ کر اُس نے فوراً ہی اُس کی شادی کردی ۔ اور چونکہ اُس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے جمیل ہی اُس کے بعد بادشاہ ہوا ۔ اُس نے بادشاہ ہوکر زین العابدین جمیل کا لقب اختیار کیا ۔ اُس کی نیکیوں کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں ۔ اُس کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں ثبت ہیں ۔

اُس کے دونوں بڑے بھائیوں کے بت آج بھی ایک ندی کے عین منجدھار میں قائم ہیں جو لوگ اُدھر سے گذرتے ہیں اُن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں اور اُن کی حرکتوں پر نفرین کرتے ہیں

خدا ہم سب کو نیک اعمال کی توفیق دے ۔ آمین ۔

(ماخوذ از کنگ آف دی گولڈن او " جان ایسن)

مرگ آرزو

(از مولانا عبدالقدیر حسرت صدر شعبہ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ)

اے دلِ شیدا تجھے کیا چاہیئے	کچھ نہیں دیدارِ لیلیٰ چاہیئے
اے خیالِ روئے جاناناں تو آ	کچھ تو جینے کا سہارا چاہیئے
چاہنے والا کہیں ملتا بھی ہے	چاہنے والے کو چاہا چاہیئے
وہ نہ آئیں گے نہ آئیں گے مگر	آرزو میں اُن کی مرنا چاہیئے
جان دینے کا محبت نام ہے	عشق کرنے کو کلیجا چاہیئے
کیا ڈرانے ہو گناہوں سے مجھے	بخشنے والے کو حیلہ چاہیئے
وقت آخر حسرت بیچارہ کے	سامنے شاہِ مدینہ چاہیئے

انتظارِ دوست

(از جناب محمد معین الدین رہبر فاروقی دارالعلوم ہائی اسکول حیدرآباد)

خُدا جانے تو کہاں چلدیا۔

میں مدت سے تیرے انتظار میں چشم براہ ہوں۔ مگر تو نہیں آتا صبح سے شام تک میں تیرے انتظار میں رہتا ہوں جبکہ آسمان کے نیلے سمندر سے ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی روشنی کی ایک لہر کنارۂ مشرق سے اُٹھتی ہے اور آہستہ سے اُبھرتی ہوئی آگے کو بڑھتی آتی ہے۔ سجادہ نشین ماہ بھی ستاروں کی تسبیح ختم کر کے عبادت خانۂ مغرب میں مُنہ چھپا رہا ہے۔ دوشیزۂ صبح اپنی شرمگیں نگاہوں کے ساتھ فلک کے پردے سے جھانک رہی ہے۔ ستارے چاند کی طرف رقیبانہ نظر ڈالتے ہوئے غائب ہوتے جاتے ہیں۔ اور صبح کا ستارہ اپنی البیلی اور مستانہ اداؤں سے بام آسمان سے سر نکالے کسی کی دید کا نظارہ کر رہا ہے لیکن شاہنشاہ جہاں تاب خسرو خاور کی آمد آمد کے خوف سے تھرا تھرا کر چپکے چپکے روپوش ہوا جاتا ہے صبح ہو چکی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، بادِ صبا سمندِ ناز پر سوار ہو کر محوِ خرام ہے مدّتی دم بدم صحنِ عالم میں پھیلتی جاتی ہے۔

اے دوست تو بھی آ۔ اور اس جنت نشان منظر کو دیکھ میں اکیلا ہوں، میں تنہا ہوں، دیکھ یہ پیارا پیارا نورانی وقت گذر رہا ہے۔ یہ سب چیزیں تجھ بن بے مزہ نظر آتی ہیں۔ اگر تو نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو مجھے کچھ رنج نہیں، تو اپنے کھیلنے کا مقام بتلا تا کہ میں وہیں آ کر تیرے ساتھ کھیلوں، تیرے ساتھ ہنسوں، تیرے ساتھ بولوں، کیا تو میری آواز کو نہیں سُن رہا ہے؟ دیکھ! تیری فرقت میں میری روح سُوگوار ہے آنکھیں اشکبار ہیں چشمِ حسرت تیری دید کے لئے وا ہیں۔ آ، ذرا دیکھ کچھ تو تسلی دے۔

میں پُرنم چشم سے اس نور بھرے عالم کی دید میں محو تھا، کہ یکایک جس طرح ماں اپنے بلکتے ہوئے بیمار بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے۔ اور اُس کا رونا کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جو رحمت کے خاص پر لگا کر فردوسِ بریں کی سیر کرتے دور دراز فاصلوں سے پرواز کرتے ہوئے آیا تھا، مرے افسردہ دل اور سُست رگوں میں جان ڈالتے ہوئے پیشانی پر ایک نرم نامحسوس

تھپک کا نشان چھوڑ کر چلا گیا، میں چونک کر بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور مسکرایا۔
میں پھر بھی تیرا انتظار کرنے لگا۔
خدا جانے تو کہاں چلا گیا؟
دیکھ! میں تیری یاد میں تڑپ رہا ہوں۔ ابھی تک تیرا انتظار باقی ہے۔
فلک پر اُودی اُودی گھٹائیں بھی چھانے لگیں، کالے کالے بادل ایک خاص شان سے فلک پیمائی میں مصروف ہیں، اونچے اونچے پہاڑ جو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کس قدر دلفریب مناظر پیش کر رہے ہیں۔ اُن کی چوٹیوں پر کی برف ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا کہن سالگی کی وجہ سے کسی کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، ہوا خراماں خراماں، ننھے ننھے درختوں سے ٹکراتی ہوئی گذر رہی ہے۔ فضائے زمین خاموشی کا تصور کیا چاہتی ہے، شجر و حجر مست اور کسی سوچ میں چپ چاپ کھڑے ہیں۔
میں اس وقت اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا، سورج کی کمزور کرنیں مجھ پر پڑ رہی تھیں، صبح سے میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پُر حسرت ماضی کی یاد اور ایک دھندلے ناقابلِ اعتماد مستقبل کی امید نے (جو نا امیدی سے بدتر ہوتی ہے) دن بھر کے مطالعہ کی کلفت اور زیادہ بڑھا دی تھی اب میں نے ایک لمبی سانس لی۔ اور کتاب کو آہستہ سے بند کر کے تھکا ہوا، پژمردہ چھت پر نکل آیا۔
میں نے اپنی افسردہ آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں، دامنِ مقصد پھیلا کر عرش ہلا دینے والی دعاؤں کا تانتا باندھ دیا۔ میرے پُر ارمان چشم سے اشک حسرت رواں ہو کر میرے دامن پر گر رہے تھے میری مضطر آنکھ پھر کسی کے دید کی مشتاق تھی۔ گریاں و نالاں جناب ایزدی میں یہ التماس کرنے لگا۔
اے میرے پیارے خدا! بجلی میں چمکنے والے۔ چاندنی میں جھلکنے والے۔ رات کے اندھیرے دن کے اُجالے، سورج کی روشنی آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی خاموشی دلگیری و دلداری کے مالک! بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج میں اپنی عظمت و بزرگی کی شان دکھلانے والے، تجھے کچھ میرا احساس ہے کہ نہیں؟ کیا میرا دوست پھر مجھ سے نہ ملے گا، آہ! وہ کدھر چلا گیا۔ وہ کہاں مقیم ہے۔ میں پھر اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا میری گریہ، وزاری، آہ و بکا فضول ہے۔؟
تھوڑی دیر بعد، معلوم نہیں کہ یہ آواز میرے کان میں کدھر سے آئی؟ اور کہنے والے نے

یہ کہا -

اے نادان لڑکے تو کس کا انتظار کرتا کھڑا ہے؟ تجھے کس کی یاد ستا رہی ہے؟ وہ ایک نامعلوم سرزمین کو چلا گیا، اور کبھی نہیں آئے گا" وہ آواز یہ کہتی ہوئی مدھم پڑ گئی۔

"وہ جو موت کی پُرامن سرزمین میں داخل ہو چکا ہے کبھی دنیا کے شور و شر اور ہنگاموں اور بکھیڑوں میں پھر داخل نہ ہوگا"۔

جذبات ماہر

(از جناب محمد عبدالکریم صاحب ماہر)

(۱) اغیار کی بہی خواہی

پردے میں سپیدی کے سیاہی تو نہیں
بالغ نظری میں نقص کم نگاہی تو نہیں۔
اغیار بہی خواہ نظر آتے ہیں
منظور کہیں میری تباہی تو نہیں

(۲)

الٰہی کشتِ غم کا کیوں مجھے حاصل نہیں ملتا
ہوئی مدت کہ مضطر ہوں مہِ کامل نہیں ملتا
وہ ملتا ہے کبھی تو کیا نگاہیں تک نہیں ملتیں
نگاہیں مل بھی جاتی ہیں تو ماہرؔ دل نہیں ملتا

(۳) عید

لیکے مژدہ خوشی کا آئی عید
سب نے جی کھول کر منائی عید
جملہ سامانِ عید غیروں کا
عید اپنی تو ہے پرائی عید

(۴) وصل

فرقت میں کسی کے روتے رہنا اچھا
منھ اشک سے اپنے دھوتے رہنا اچھا
ممکن ہو اگر خواب میں وصلِ محبوب
واللہ! ہمیشہ سوتے رہنا اچھا

(۵) مذہب و عقل

کیوں غیر کی اتباع کرنا سیکھیں؟
کیوں دانش حاضرہ پہ مرنا سیکھیں؟
مذہب کو جو زیر عقل رکھنا چاہیں
وہ نفس کو زیر عقل کرنا سیکھیں۔

(۶)

ممکن ہے کہ حق بات کہوں سن لیجئے
دِق جائیں اگر پھول کہیں چن لیجئے
منظور ہے مذہب کی تمھیں گر اصلاح
تو پہلے ذرا عقل کے ناخن لیجئے

قوم تو ارج

(عورت کا درجہ اُن کی معاشرت اور ادب میں)

(از جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل ہائیکورٹ)

تو ارج کے ممالک ۔ طبقات ۔ حروف ابجد ۔ ادب ۔ حیات ۔ معیشت ۔

قوم توارج شاید دنیا کی نادر اقوام میں سے ہے جو جنوبی جزائر اقصیٰ میں رہتی ہے ۔ اور اس میں بیحد وحشت و ندرت پائی جاتی ہے ۔ اس قوم کے ایسے عادات و اخلاق ہیں جو میرے خیال میں کسی اور قوم میں نہیں پائے جاتے ۔ اصل و نصل کے لحاظ سے یہ ایک بربری قوم ہے لیکن بلاد مغرب کے تمام بربری قبائل سے علیحدہ ہے ۔ یہ قوم مسلمان ہے اس کا مذہب اسلام ہے باوجود اس کے مسلمانوں سے علیحدہ اور مختلف ہے یہاں تک کہ یہ اختلاف اصول دین میں بھی پایا جاتا ہے ۔

بلاد اسلامی میں ہم تمام اہل فکر کو مسلمان عورتوں کے پردہ کے قضیہ میں مصروف پاتے ہیں لیکن یہ چیز توارج کے پاس بالکل برعکس ہے اُن کے پاس مرد پردہ دار و غیر آزاد ہیں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور عورت مطلق العنان ہے جہاں چاہے جا سکتی ہے مردوں کا یہ پردہ اور خاموشی بعض دفعہ ہمارے مفروضہ ادب و لیاقت کی حد سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے ۔ اگر توارج جزائر کا کوئی شعبہ ہوتے تو ضرور اُن کو اس کا علم ہوتا لیکن یہ ممکن ہے کہ یا تو اُن کو اپنے جزائری ہونے کا علم نہیں ہے یا وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے ہیں ۔ فی الحقیقت بجز جغرافیائی تعلق کے اس قوم کو جزائر سے کوئی علاقہ نہیں ۔ اُن کی زبان شلحی ہے جو موجودہ حالت میں اس بربری زبان کے لہجہ سے بہت دور ہے جس کو بربری قبائل جزائر میں استعمال کرتے ہیں ۔ اُن کے چہرے مستطیل ۔ لاغر ۔ گندم رنگ مائل بہ نیلگوں ہیں جو دوسرے بربری قبائل کے چہروں سے مشابہت نہیں رکھتے ۔ اُن کے قد سیدھے اور سوتواں ہیں دوسرے بربری قبائل کے قدوں کے مشابہ نہیں ۔

بعض لوگوں نے تاریخ توارج کی بلالحاظ خطا و صواب نشر و اشاعت کی ہے اور کئے سال

سے امریکہ کا علمی مشن ان کے ممالک میں گشت کرتے ہوئے بحث و تنقید کر رہا ہے اور اس نے اُن کے بعض پادشاہوں کے اہم ترین علمی و تاریخی آثار کا پتہ چلایا ہے۔ میں نے کسی کو تواریخ کی موجودہ حالت مکمل طور سے بیان کرتے نہیں دیکھا اس لئے مناسب سمجھا کہ ممکنہ کوشش سے تواریخ کی موجودہ اور سچی حالت اس طور سے بیان کی جائے جس سے امر واقعی کا اظہار ہو۔

(اس باب میں میری سند معلومات)

تواریخ کے متعلق میرے معلومات بالکل معمولی تھے اس لئے میں نے اُن کے واقعی حالات معلوم کرنا چاہا میں نے دیکھا کہ فرانسیسی ان ممالک کی گذشتہ حالت لکھتے ہیں لیکن موجودہ حالت نہیں لکھتے اور اگر لکھتے بھی ہیں تو بالکل قلیل اور سطحی ہوتی ہے اور یہ بھی جہت ہجار پر منحصر رہتی ہے اور یہی وہ جہت ہے جو فرانس کے زیر اقتدار ہے۔ بعض دفعہ فرانسیسی کاتب کسی چیز کے متعلق ایک یا دو تواریخ سے پوچھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں حالانکہ وہ بالکل خلاف واقعہ جواب دیتے ہیں کیونکہ تواریخ اجنبی یوروپین سے عداوت رکھتے ہیں اور اُن کو غیر ملکی اور سنگدل خیال کر کے قابل اعتبار نہیں سمجھتے تاریخی بیان کرتے ہیں کہ فلاں فلاں یوروپین نے ہم سے یہ باتیں دریافت کیں اور فخریہ طور سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان یوروپینوں نے اُن پر اعتبار کیا لیکن انہوں نے اُن کو دھوکہ میں رکھ کر تمام غلط اور ملتبس جواب دئے۔ پھر فرانسیسی وہاں تھوڑے ہی روز ٹھہرتے ہیں اس قلیل مدت میں اُن کی حالت کا کافی مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے اکثر اُن کی خبروں پر بھروسہ نہیں کیا۔ البتہ اس بارے میں میرے فاضل دوست سید یحییٰ ابوثمن کے بیان پر اعتماد کیا جو جزائر کے ایک نوجوان ہیں اور بحث و تلاش کے بڑے دلدادہ ہیں۔ انہوں نے تواریخ میں کامل پانچ سال گذارے اس مدت میں ان کے احوال سے خوب واقفیت پیدا کی۔ پہلے انہوں نے اُن کی زبان سیکھی اور ان سے میل ملاپ کر کے ان کے عادات و کردار بھی اپنے میں پیدا کر لئے اور اُن کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ پھر تو یہ اُن کے پاس قابل اعتماد ہو گئے وہ اُن کو چاہتے ہیں اور یہ اُن کو۔ ہمارے دوست کا ارادہ ہے کہ تواریخ کے متعلق اپنے معلومات کو جمع کر کے فرانسیسی زبان میں شائع کرے اگر کوئی دوسرا شخص تواریخ کی نسبت ظن و تخمین سے کوئی خبر بیان کرتا ہے تو ہمارے یہ دوست اس خبر کو اپنی ذاتی

واقفیت اور مشاہدہ سے بیان کرتے ہیں۔

(توارج اور اُن کے ممالک)

توارج کے ممالک جزائر افقطے کے جنوب اور صحرا رطرابلس کے غرب میں واقع ہیں یہ شہر بہت ہی پتھریلے اور غیر شاداب ہیں۔ باعتبار قومیت کے یہ شہر دو حصوں میں منقسم ہیں یعنے بلاد ہکار یا ہجار اور بلاد آزجر۔ ہکار کے رہنے والے غربی توارج اور آزجر کے باشندے شرقی توارج ہیں۔ قدیم زمانے میں اُن دونوں شہروں میں باہم جنگ وجدال تھا جس کا سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔ توارج کا نام لفظ تارجا سے مشتق ہے جو صحرا رفزاں باغات کا نام ہے جس کا پایہ تخت مزرک ہے۔ یہ اب تک آزاد ہے اور آزجر کے شرق میں واقع ہے۔ توارج اس نام سے اپنے آپ کو موسوم نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنا نام ایماقن رکھا ہے جس کے معنے لڑنے والے یا لوٹنے والے کے ہیں ہم اسی نام سے ان کی نفسیت کو سمجھ سکتے ہیں اس لئے کہ اُن میں طبعاً لوٹ مار کی عادت ہے۔ دراصل یہ اُس بربری قوم کا ایک شعبہ ہے جو قدیم زمانہ میں لیبیا سے جزائر میں آئے ہیں جیسا کہ اکثر مورخین کا بیان ہے اور اُن کی رایوں کی تائید کافی دلائل سے ہوتی ہے جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے یہ رمانی نہیں ہیں کیونکہ کوئی دلیل اُن کے رمانی ہونے کی تائید میں نہیں ہے۔

(اُن کی حیات ومعیشت)

عام طور سے اُن کی زندگی اچھی ہے کیونکہ اس میں کوئی غم یا برائی نہیں ہے یا یہ کہ وہ زندگی کے غم وبرائی سے واقف نہیں ہیں اُن کی یہ زندگی ساری اور فی الجملہ اخلاص وایثار پر مبنی ہے ان میں کا ہر فرد قبیلہ کے افراد کے لئے اپنے آپ کو فنا کرتا ہے اس اعتبار سے وہ اپنے ذات کے لئے نہیں بلکہ فی نفسہ اپنے قبیلہ کے لئے زندہ رہتا ہے اور اسی وجہ سے ان میں کا ہر فرد مفید وغیر آزاد ہے لیکن اس تقیید کے مراتب کے لحاظ سے ہر شخص اپنے میں رشک وسعادت ضرور پاتا ہے اُن کی معیشت بہت ہی تنگ ہے اس میں بجائے آسانی وملائمت کے سختی وخشونت ہے۔ جوار اُن کی بہترین غذا ہے۔ اسی کو عام طور سے کھاتے ہیں اور اسی کو باورچیخانوں میں بھر کر رکھتے

ہیں اور احتیاط سے آہستہ آہستہ کھاتے ہیں۔ اُن کی مرغوب ترین غذا ستو ہے جو جوار۔ کھجور۔ پنیر سے بناکر پانی یا دودھ میں ملاتے ہیں اگر یہ غذا اُن کے مسافرین کو ہے تو اُس کو سواری پر بیٹھے ہوئے کھاتے اور خوشی سے گاتے ہیں نیز اُس کو نعمت سمجھ کر خدا کا بیحد شکر بجالاتے ہیں۔ یہ لوگ بنظر اقتصاد گیہوں نہیں کھاتے کیونکہ اس میں مصالح اور خوشبودار چیزوں کے مصارف عائد ہوتے ہیں باوجود اس سخت زندگی کے بعض دفعہ یہ انتہائی فاقہ کشی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسا قحط آتا ہے کہ غذا نایاب ہوجاتی ہے۔ جوار گیہوں۔ جو کچھ نہیں ملتے اور نہ کوئی کھانے کی چیز دستیاب ہوتی ہے پس بصورت مجبوری پالک اور بعض دوسرے نباتات اور درختوں کے جڑ کھاتے ہیں اور کھجور کی گٹھلیاں جلاکر پیستے ہیں اور اُس کو مستعملہ پانی اور پیاز میں ملاکر استعمال کرتے ہیں اس زمانہ میں اُن کی حالت بہت خراب ہوجاتی ہے اور بڑی تکلیف و مصیبت میں رہتے ہیں اُن کا یہ قابل رحم اور حسرتناک حال دیکھ کر کلیجے پاش پاش اور دل پانی پانی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تنگ حالی کو اپنے لئے باعث خوبی سمجھتے اور اس پر بہتر طریقہ سے صبر کرتے ہیں خوشحالی میں کم کھانے کی عادت اور عرصہ تک بھوکے رہنے کی مداومت رکھتے ہیں اور یہی چیز اُن کے لئے باعث فخر ہے۔

اُن کی بسر برد کا ذریعہ گیہوں۔ جو۔ جوار۔ بعض میوہ جات اور ترکاریوں کی زراعت ہے۔ بجز کھجور کے ان تمام چیزوں کو چھوٹے حوضوں میں بوتے ہیں اور اُن کو کوؤں سے پانی دیتے ہیں۔ مرد ڈول سے پانی کھینچ کر جھاڑوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس پانی کو ایک حوض سے دوسرے حوض میں پھیرتی ہے اُن کے بعض شہروں میں بہتے چشمے ہیں لیکن یہ اُس قوم میں شادابی اور ارزانی پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ لوگ شکار کے بڑے گرویدہ ہیں اور اُس کو انہوں نے حرفہ قرار دیا ہے ٹڈی کا خشک و تازہ گوشت کھجور کے بدلے اور کٹائی کے زمانہ میں جوار کے معاوضہ میں فروخت کرتے ہیں یہ بھی اُن کا ایک ذریعہ بسر برد ہے۔

جس فصل میں یہاں شادابی اور ارزانی ہوتی ہے وہ فصل خریف ہے جبکہ کھجور کے درخت پھولتے اور پھلتے ہیں اور جوار تیار ہوتی ہے اور اُس کے کاٹنے کا زمانہ آپہنچتا ہے اس فصل میں یہ لوگ خوب سیر ہوتے ہیں اور اسی میں تجارت ہوتی ہے۔ غربی سوڈان۔ تورت و ہگار سے کپڑے۔ کتان۔ چادر۔ شکر لیکر قافلے آتے ہیں۔ اسی فصل میں اُن کے پاس شادیاں اور خوشیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

(اس قوم کے طبقات)

اس کے تین طبقے ہیں جو ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔ (۱) آمنوکال - یہ بادشاہاں ہیں (۲) ایہگاروں - یہ جنگجو اور اشراف ہیں (۳) ایمغاد - یہ بازاری اور عام لوگ ہیں۔

آمنوکال یہ ایسا لفظ ہے جس میں مفرد و غیر مفرد دونوں برابر ہیں۔ اس کے معنے صاحب بلاد یا صاحب نقارے کے ہیں کیونکہ ان کے بادشاہ ایک بڑا نقارہ رکھتے ہیں جو ضرورت کے وقت دو اونٹوں پر اٹھایا جاتا ہے ان پر دو حبش ہوتے ہیں جو عوام کے اجتماع کے لئے اس نقارہ کو بجاتے ہیں۔ ان میں بادشاہت وراثتاً چلتی ہے ولی عہد بادشاہ کا بھانجہ ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ بادشاہ کے قبیلہ کے سوا کسی اور قبیلہ کا کیوں نہ ہو لیکن بادشاہ کا بیٹا ولی عہد نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کی وراثت یا قبیلہ کی سرداری وراثت میں ایک دوسرے مسئلہ کی تابع ہے وہ یہ کہ ان کے پاس شرعی وارث بھانجہ ہے جو اپنے ماموں کے ملک و اسباب کا وارث ہوتا ہے۔ بیٹا اپنے باپ کا وارث صرف اثاثہ اور جانوروں کی حد تک ہے۔ اس وقت ان کے ملک پر دو حاکم ہیں ایک قبائل ہگار پر ہے۔ یہ قبیلہ بڑا ہے اور کیل غلا کے نام سے موسوم ہے اس کا پایہ تخت تمنغست ہے یہ ان دنوں فرانس کے تقریباً زیر حمایت ہے۔ دوسرا حاکم قبائل آزجر پر ہے۔ یہ قبیلہ ایوراغن اور آواغ سے ہے اس کا پایہ تخت غات ہے اس کے ممالک اب تک آزاد ہیں۔ قدیم زمانہ میں قبیلہ ہگار و آزجر میں جنگ و دشمنی تھی جو آج تک باقی ہے۔ قبیلہ ہگار تعداد اور سامان کے لحاظ سے بڑا ہے قبیلہ آزجر کے لوگ لڑائی میں بڑے ہی صبر سے مقابلہ کرنے والے ہیں۔

آزجر کی غربی جہت میں ایک تیسرا قبیلہ آمنوکالیہ ہگار تھا جسکو فرانس نے آمنوکالیہ ہگار میں ضم کردیا ہے کیونکہ آمنوکال فرانسی حمایت سے راضی نہیں تھے یہی بنی ایمنان کی آخری اولاد ہیں جنہوں نے اسی قبیلہ آمنوکالیہ پر تین قرنوں تک حکومت کی ہے۔ اور بعض دفعہ پورے ممالک تواریح پر ان کا اقتدار رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے شہر اجانت کو بنایا جو آمنوکالیہ کا پایہ تخت ہے یہ شہر خوشنما پہاڑوں اور سرسبز و بارونق وادیوں اور اپنے قدرتی لطیف منظروں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں اور آنکھوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ تواریح کے تمام شہروں میں یہی ایک شہر اچھا ہے۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ کھجور کے تمام درخت جو شہر جانت میں ہیں سب وقف ہیں جن کی بیع و شرے نہیں کیجا سکتی۔ شہر والے کھانے کے لئے لے لیتے ہیں۔ (ان درختوں کو

بھیجتے ہیں اور نہ پھل کو) جس کو غلہ کی ضرورت ہو بلا معاوضہ ان درختوں کے کھجور لے لیتا ہے اُن باغوں کی زمین جن پر یہ درخت ہیں آج تک آمنوکال ہگار کی ملک ہے۔ جانت کا حاکم ان درختوں کی نگرانی کرتا ہے اور شہر والوں میں سے جس کو چاہتا ہے کھجور دیتا ہے اور جس سے چاہے واپس لیتا ہے لیکن اس حاکم کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی ذات کے لئے یا آمنوکالیہ کے واسطے کھجور لے۔ یہی حال بنی ایمنان کے عہد میں بھی تھا اور گمان یہ ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے جانت اور آہریر کے کھجور کے درختوں کو انہی دو شہروں کے باشندوں کے لئے جو اُن کے حلیف تھے مخصوص کر دیا تاکہ اُن کو بے بہرہ کر کے اُن کے مال و متاع کو چھین نہ لیا جائے۔ یا اس خوف سے کہ اگر یہ اُن کے کھجور کے درخت بیچ ڈالیں تو فاقہ کشی کی وجہ سے قتل و غارت نہ کریں۔ قوم ایمنان کا ذکر یہ لوگ بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ آمنوکال جانت کے بادشاہ کو اگرچہ فرانس نے نکال دیا ہے اور اُن کو ہگار سے ملحق کر دیا ہے۔ تاہم یہ لوگ باعتبار عصبیت اور حلیف ہونے کے خود کو قوم آزجر سے سمجھتے ہیں اور آمنوکال غات کے ساتھ بڑی عاجزی سے پیش آتے ہیں اور ایمنان کے بعد انہی کو آمنوکالیہ شرعی شمار کرتے ہیں۔

طبقۂ ایہگارن: یہ جنگجو لوگ ہیں جو شخصی سلطنت میں بادشاہوں کی طرح ہیں۔ یہ بہادر لوگ ایمغاون کو جو بازاری اور عام طبقہ سے ہیں اپنے غلام سمجھتے ہیں ان کے متعلق کسی ذمہ کا پاس نہیں رکھتے۔ یہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں اُن کی زندگی کا دار و مدار ایمغاون پر ہوتا ہے یہ لوگ بزرگی کے لحاظ سے نہیں بلکہ بادل ناخواستہ اُن کی ضروریات کی مال و متاع وغیرہ سے خبرگیری کرتے ہیں۔ ایہگارن بازاریوں کے اونٹ غصب کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور ان کو جبراً اپنے ساتھ تجارتی سفر کو لیجاتے ہیں یہ بہادر لوگ کوئی پیشہ یا زراعت نہیں کرتے اور نہ کوئی ملک یا زمین کے یہ مالک ہیں بلکہ یہ تمام چیزیں انہوں نے بازاریوں کے لئے چھوڑ دی ہیں جن میں یہ لوگ محنت و مشقت سے کام کرتے ہیں۔ جب درخت بار آور ہو جائیں تو بلا کسی محنت و معاوضہ کے حسب ضرورت بطور غنیمت کے لے لیتے ہیں ان مظالم سے یہ لوگ تنگ آ گئے ہیں لیکن اب تک ان کے لئے اس سے کوئی مفر نہیں۔ فرانس اگرچہ تمام ہگار اور آزجر کے آمنوکالیہ جانت کا مالک ہے مگر اپنے مفاد کے خیال سے ان بدیہی مظالم کو رفع نہیں کر سکتا کیونکہ اگر یہ توارج پر سختی کرے تو تمام لوگ شہروں کو ویران چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

تمام بہادر لوگ جنگل میں رہتے ہیں اُن کے نزدیک تمام شہری لوگ بازاری ہیں جنگل کے

بازاری لوگ شہریوں سے زیادہ بہادر ہیں۔ ان جنگجوؤں میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو چند اونٹ اور دیگر جانوروں کے مالک ہیں اس لئے کہ کسب پیشہ۔ بلکہ ان بہادروں کے نزدیک عار عظیم ہے البتہ ایک پیشہ ہے جس کو وہ ذرا بھی خوار نہیں سمجھتے اور وہ لوٹ وغارتگری ہے جس کو وہ اپنے بزرگوں سے وراثتاً کرتے چلے آتے ہیں۔ اگر کسی کا باپ بڑا غارتگر اور لٹیرا ہو تو اُس کے بیٹے پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی مشابہت میں خود بھی لٹیرا اور غارتگر بنے اُس کے سوا باپ کی کسی اور صنعت کی اتباع نہ کرے کیونکہ لڑکا شرافت و رذالت میں اپنے باپ کا نہیں بلکہ اپنی ماں کا تبع ہوتا ہے جس کی ماں بہادر اور شریف ہو اُس کا لڑکا بھی بہادر اور شریف ہوگا اگرچہ اس کا باپ حبشی اور رذیل کیوں نہ ہو اسی طرح جس کی ماں رذیل ہو اس کا بیٹا بھی رذیل ہوگا اگرچہ اس کا باپ بہادر یا آمنوکال کیوں نہ ہو۔ اُن کے پاس نسبی شرافت و رذالت کا اعتبار صرف ماں کی طرف سے ہے یہ اپنا انتساب باپ کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف کرتے ہیں اور اپنے ماں ہی پر فخر کرتے ہیں جیسا کہ عربی شاعر فخر کرتا ہے۔ فرزدق کا قول جس میں وہ اپنے آبا پر فخر کرتا ہے اُن کے نزدیک بالکل بیکار ہے۔

بعض فرانسیسی علما کا بیان ہے کہ پہلے تواج میں جنسی تعلقات ایسے تھے جن میں باپ متعین طور سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسی کے آثار باقیہ میں سے ایک اثر یہ ہے کہ اب بھی تواج ماں سے انتساب کرتے ہیں لیکن اس دعوی کے ثبوت میں کوئی ایک بھی علمی دلیل بیان نہیں کی گئی میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی البتہ افسانوں کے سوا حیوانات کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے جن میں بچہ باپ کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف منسوب ہوتا ہے لیکن ہم مستقبل میں اس امر کا انتظار نہیں کر سکتے کہ یہ بچہ بجائے ماں کے باپ کی طرف منسوب ہو۔ تاریخ تواج میں فرانسیسی عالم کے اس بیان کا کہیں پتہ نہیں چلا بلکہ ہم نے تواج کا گذشتہ زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہونا تاریخ میں دیکھا ہے سچ تو یہ ہے کہ مرد پر عورت کے حاکم ہونے اور تمام دنیا کی اقوام کے خلاف امر و نہی عورت کے ہاتھ میں ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اُن کے پاس کوئی قبیلہ آبا و اجداد میں سے کسی ایک کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ اُس پہاڑ یا وادی کی طرف منسوب ہوتا ہے جو اُن کا وطن ہے جیسے (کیل زواواتن) اُس کے معنے وادی زواواتن کے ہیں اسی طرح (کیل اھیرو) اُن کے پاس تمام قبائل و شعوب کے اسمار کا بھی یہی حال ہے۔

(اُن کے حروف ابجد اور آداب)

اُن کے خاص حروف ابجد ہیں جن سے شلحی زبان میں مکتوب لکھتے ہیں اور اُس کا نام (تفناق) ہے یعنی (فنیقیہ) یہ خاص فنیقیہ کے حروف ابجد ہیں مگر ان میں طبعاً کچھ کمی زیادتی یا تغیر ہوا ہے وہ اس سے واقف نہیں ہیں بلکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں اُن کی ایک شاعرہ عورت نے یہ حروف ابجد اختراع کئے ہیں۔ یہ لوگ لفظ (تفناق) کا مفہوم اپنی زبان کے حروف ابجد کا علم سمجھے ہوئے ہیں۔ اس حروف ابجد کو عربی کی طرح سیدھی جانب سے بائیں اور بائیں جانب سے سیدھے جانب یا دونوں طریقہ سے ایک ساتھ لکھتے ہیں جیساکہ اس کی مثال آئیگی یہ کتاب ایک سطر ہوتی ہے جو صفحہ میں سیدھی جانب ہوکر بائیں جانب لوٹتی ہے یا اسی طرح اوپر سے نیچے یا بالعکس یا ایک ساتھ دونوں طریقوں سے لکھتے ہیں عورتیں ہی ان حروف کو لکھتی پڑھتی ہیں اور اُن کی ہر عورت تفناق سے بخوبی واقف رہتی ہے بخلاف اس کے آپ اُن کی کوئی عورت ایسی نہ پائیں گے جو عربی پڑھتی یا گفتگو کرتی ہو۔ عورتوں کی توجہ عربی کی طرف نہیں بلکہ اپنی بربری زبان کی طرف زیادہ ہے۔ مردوں میں بہت ہی کم لوگ تفناق جانتے ہیں مرد ہی عربی زبان سے واقف ہیں یہ ہی قرآن پڑھتے ہیں اور مسائل دین سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

کوئی کتاب اُن کی زبان اور اُن کے حروف میں لکھی ہوئی نہیں ہے جس کو یہ پڑھتے یا پڑھاتے ہوں البتہ بعض رسائل جو فصاحت وبیان کے اعلیٰ مثال ہیں بطور تناقل استعمال کرتے ہیں اور انہی کے اسلوب بیان کو نمونتاً کام میں لاتے اور انہی کے طرز وطریقہ کو اپنی گفتگو میں جگہ دیتے ہیں یہ مخصوص رسائل وہ ہیں جن کو اُن کی عورتوں نے اپنے معشوقوں کو لکھا ہے جن میں اپنے دلوں کی آشفتگی اور اس کی تکلیف واضطراب کی شکایت ہے۔ ان رسائل کا اسلوب بالکل فطرتی ہے اُن کی ابتدا لکھنے والی کے نام سے ہوتی ہے اُس کے بعد مکتوب الیہ کا نام درج ہوتا ہے۔ اُن کی بلاغت میں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جس کلمہ کے معنے کی تاکید مراد ہوتی ہے اُس کی تکرار کرتے ہیں اور جس کلمہ کی تکرار کی جائے وہ تاکید میں بہت ہی ابلغ ہوتا ہے۔ اسی قسم کی تاکید کے لئے بعض دفعہ کلمہ کی دس سے زیادہ مرتبہ تکرار کیجاتی ہے اُن کے پاس اور بھی اعتبارات ہیں جن سے کلام کے مدارج میں امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔ بمقابل نثر کے نظم کا حصہ اُن کے پاس زیادہ ہے۔ اُن کے شعر چند ابیات کے مقطوعات اور طویل قصائد او منظومہ

رواتیوں کے خرافات ہوتے ہیں اُن کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سادے اور فطری ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں ہوتی اُن کے اشعار اُن کے نفوس اور مختلف تاثرات اور جذبات واحساسات کے واضح تصویر ہوتے ہیں اُن کے پاس شعر کے اہم ترین اغراض دلیری۔ مدح، غزل تشبیب ہیں تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غزل و تشبیب عورتوں کے ہوتے ہیں اور عورتیں ہی مردوں سے تشبیب کرتی ہیں اور عورتیں ہی عورتوں کی مدح کرتی ہیں۔ میں آپ کو ایک نادر بات کہتا ہوں وہ یہ کہ تمام قبائل کے خلاف ان میں صرف عورتیں ہی شاعر ہیں کوئی ایک مرد شاعر نہیں پایا جاتا۔ شاعر عورت کا اُن کے پاس بڑا مرتبہ ہے۔ یہ جہاں جائے اس کو سب آگھیرتے ہیں اُس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور اُس کی تعظیم و تکریم میں جلسے کئے جاتے ہیں۔ اشعار کی قدر و منزلت کے لحاظ سے ہر شاعرہ کے کلام کی روایت کرنے والی عورتیں ایک یا دو یا اس سے زیادہ ہوتی ہیں۔ ہر قبیلہ اپنی شاعرہ عورتوں پر فخر کرتا ہے۔ بعض دفعہ مختلف قبائل کی شاعرات جمع ہو کر اشعار پڑھتی ہیں اور فصاحت و بلاغت پر باہم فخر کرتی ہیں اُن کے پاس اسباب فخر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شاعرہ اپنے شعر میں غریب و نادر الفاظ کثرت سے استعمال کرے جس سے اپنے ساتھیوں پر تفوق و فضیلت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ اُن کے نزدیک بلاغت و معجز بیانی کی ایک دلیل ہے اور شاید یہی صرف اُن کے اشعار کی صنعت ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اُن کی زبان میں فاطمہ بنت انغنس نے شعر کہا اور اسی نے حروف ابجد سب سے پہلے (تفناغ) سے کتابت شروع کی یہ وہ عورت ہے جس کی کمر کو کوئی شخص سولہ قرش مہر دئے بغیر نہیں چھو سکتا۔ کمر چھونا اُن کے پاس کنایتاً شادی کرنے کو کہتے ہیں کیونکہ اُن کے عرف میں مرد سب سے پہلے عورت کی کمر چھوتا ہے اُن کے پاس اس مقدار کا مہر پیش کرنا اسی طرح ممکن نہیں جس طرح ہم میں سے کسی شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی زوجہ کے مہر میں کوئی سلطنت دیدے۔

تارجی زبان اور اس کا ادب۔ اسلوب۔ خیال سب محض بربری ہیں برخلاف اس کے جزائر کے دوسرے بربری قبائل کی زبان میں عربی کا بہت بڑا حصہ شامل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ایک بگڑی ہوئی عربی زبان بن گئی ہے۔ گو آپ بربری زبان سے واقف نہ ہوں تاہم اگر اُس زبان کو سنیں تو پوری طرح سے سمجھ جائیں گے کیونکہ اس میں عربی اور بربری الفاظ عام عربی ترکیب میں مستعمل ہوتے

ہیں ۔ بربریوں کا جس قدر امتزاج عربوں سے بڑھتا جائے گا اسی لحاظ سے تھوڑے دنوں میں زبان پر بربریت کا اثر باقی نہیں رہے گا ۔ تارجی زبان ترکیب اور حروف معانی کے لحاظ سے عربی سے علیحدہ اور مستقل زبان ہے ۔ اس میں اکثر اسماء اشخاص اور اسماء عدد ایک سے ہزار تک سب بربری ہیں ۔ یہ لوگ عربی لفظ کو استعمال نہیں کرتے مگر ضروری صورت میں مسلمان کلمہ شہادت وغیرہ بربری تلفظ میں ادا کرتے ہیں یہ لوگ (سیدنا محمد) خامغمہ سے کہتے ہیں لیکن اس سے مراد (سیدنا محمدؐ) ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے الفاظ ہیں ۔

توارج کے حروف ابجد جس کے مقابلہ میں عربی حروف ابجد لکھے ہوئے ہیں ۔

	ا
D	ب
+	ت
ﻻ	ج
::	خ
ە	ر
X	ز
#	ز (زاء معجمہ)
E	ط
٧	و
⁛	ک
॥	ل

C	م
ا	ن
آ	ن (یہ شلحی نون ہے جس کے مقابل عربی میں ایسا نون نہیں ہے)
ⵜ	ظ
⁝	غ
I / JC	ف (ف کے دو شکل ہیں)
...	ق
٥	س
٤	ش
⁝	ھ
⁝	و
ا	ی
ہ	ج

روپیہ کی سرگذشت

(از جناب عبدالمجیب صاحب صدیقی)

انگلستان کا مشہور انشا پرداز و مضمون نگار جالسف ایڈیسن کے مضمون (Adventure of a Shilling) کو پڑھکر یہ مضمون لکھا گیا ہے اس میں اس مضمون کے خلاف مشرقیت کو پیش کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ ایڈیسن کے مضمون میں مغربیت ہے اور یہاں مشرقیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔" (عبدالمجیب)

"انسانوں کا خیال ہے اور خیال باطل ہے کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ اگر میں اپنی سرگذشت شروع سے اخیر تک سناؤں۔ اپنی سوانح حیات پیدائش سے اب تک بیان کروں تو حضرت انسان انگشت حیرت در دہاں ہو جائیں تمام شیخی کرکری ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ میں نے انسان کے مقابلہ میں کتنے مہم طے کئے ہیں کتنے سفر کئے ہیں اور کتنے اچھے اور برے کام کر گذرا ہوں۔ اگر کچھ شک ہو تو چلئے سن لیجئے۔

"میں ۱۳۱۲ھ میں بمقام حیدرآباد فرخندہ بنیاد پیدا ہوا۔ کچھ دنوں خاموش اس ہی مکان کے ایک حصہ میں جس میں میں پیدا ہوا تھا پڑا رہا پھر وہاں سے بہت جلد ایک دوسرے مکان میں نہایت احتیاط و کافی سے زیادہ حفاظت کے ساتھ منتقل کردیا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میرے کئی ہم جنس قید کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں میں بھی اُن میں شریک ہوگیا لیکن نہیں جانتا تھا کہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی گئی ہے اور نہ کوئی ساتھی ہی جانتا تھا پھر بھی میں اس وجہ سے فخر کرتا تھا کہ یہ شاہی خزانہ تھا۔ فوجی سپاہی میری پاسبانی کرتے نظم جمیعت کے عرب چوکی دیتے۔ پولیس باری باری پہرہ دیتی صبح و شام سلامی ہوتی اور میں یقین رکھتا تھا کہ ایک دن بڑی شان کے ساتھ یہاں سے روانگی عمل میں آئیگی اللہ اللہ کر کے شمسی مہینہ شروع ہوا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں تقسیم ہونے لگیں وظائف بٹنے لگے میری قسمت میں یہ نہ تھا کہ تنخواہ یا وظیفہ میں دیا جاؤں لیکن یہ کیا کم تھا کہ میں ایک منصبدار کی منصب میں اور دس ساتھیوں کے ساتھ دیا گیا۔

"میری سرگرمیوں کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے منصبدار اور دار و دار مشہور ہیں حضرت نے جیسے ہی منصب پائی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے روانہ ہوئے گھر نہ گئے سیدھے سیندھ خانہ پہونچے مجھ کو کلال کے ہاتھ میں رکھا کچھ پیٹ بھرا کچھ جیب بھرا وہاں سے روانہ ہوئے میں اس رات وہیں رہا دوسرے روز صبح میں قصائی کی دوکان گیا ۔ وہاں سے مختلف ہاتھوں میں پہونچا کبھی تاجر پارچہ کے یہاں گیا تو کبھی جنرل مرچنٹ کے غلہ میں پہنچا کبھی باغبان کے پاس گیا تو کبھی میوہ فروش کی دولت میں اضافہ کیا کبھی دال کی قیمت بنا تو کبھی چاول مجھ سے خریدے گئے شراب مجھ سے پی گئی دیسی شراب کا مزا چکھا ولایتی شراب کے مزے اڑائے کوئی رسٹورنٹ ۔ کوئی ہوٹل ۔ کوئی کنٹے ایسی نہ تھی کہ میں نے اس کے لذیذ کھانے نہ اڑائے ہوں اور عمدہ عمدہ شربت و کول ڈرنک نہ پئے ہوں غرض تین سال کے اندر اندر میں نے ملک کا پورہ دورہ کر لیا کبھی اسپشل ٹرین میں رہا تو کبھی میل میں کبھی اسپرس میں سفر کیا تو پاسنجر گاڑی میں ۔ بہرحال دورہ کیا سفر کیا ۔ سیر کی اور ایک حبہ بھی جیب سے نہ خرچا اور خرچنا کیوں میں ایک ننھی سی جان کسی کی جیب میں بیٹھ جاتا کسی کی صندوقچی میں جگہ پاتا کسی کے بٹوے میں ہوتا کسی نے تھیلی میں رکھا کسی نے پگڑی میں باندھ سر پر چڑھایا کسی نے ساڑھی کے پلو میں باندھا ہندوستانی مزدور بھی کس قدر غلیظ ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں پیٹ بھر کھانے نہیں ملتا تو صفائی کا کیا انتظام کریں گے نہ نہانے کی فرصت نہ کپڑے دھونے کی رخصت مفلسی کا یہ عالم کہ صابن تو کجا دو پیسے کے ریٹھے تک تو نصیب نہیں ہوتے کہ کپڑے دھولیں جب میں اس کے پاس پہنچا تو گھبرا اٹھا وہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگا اس بیچارہ غریب کے پاس کوئی محفوظ جگہ نہ تھی کہ مجھ کو رکھتا بس ہر وقت ساتھ کمر سے باندھے لئے پھرتا بس اس کے پسینہ کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا ۔ اور کلیجہ منہ کو آتا تھا ۔ اس طرح پھرتا رہا تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ اور میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ کبھی ایک جا چین نہ لی ۔ موٹر سواری کے مزے لوٹے ۔ بیل گاڑی کے ہچکولے کھائے ٹانگہ جھٹکہ پر سوار ہوا ۔

"اس سلسلہ میں ایک سفر کا حال کسی قدر تفصیل سے سُن لیجے ایک زمیندار نے تعلقہ کی تحصیل میں مجھ کو محاصل سرکاری میں ادا کیا میں تحصیل کے خزانہ میں عربوں کی نگرانی میں رہا ۔ وہاں سے ایک روز بند میں لد کو تو الی اضلاع کے سپاہی نظم جمعیت کے عروب اور تحصیل کے چپراسیوں کی حفاظت میں ضلع کی راہ لی ۔ بنڈی کا سفر ہر دیہات پر بہار اپر جوش استقبال کیا جاتا خیر مقدم ہوتا "حضور سرکار سلامت" اور

سرکار نظام کی جے، کے نعرے بلند ہوتے رات ایک قصبہ میں قیام رہا گاؤں میں ایک دھوم اور ہل چل تھی صبح دم نکل کھڑے ہوئے دوپہر ہوتے ہوتے ضلع کے خزانہ میں داخل ہوئے وہاں سے چند روز بعد ایک واگن میں پھر ایک طویل سفر کے بعد خزانہ عامرہ میں داخل ہو گئے پھر وہاں سے ایک ملازم کی تنخواہ بن کر نکلا لیکن افسوس کہ میری زندگی نے پلٹا کھایا اور میں ایک کنجوس کے ہاتھ پڑا۔

"مجھ کو ایک تھیلی میں رکھا گیا جس میں میرے ہم جنس اور نو سو ننیانوے تھے پھر ایک تجوری میں جگہ پائی حبس بیجا میں بلا جرم پڑا زندگی کے دن کاٹنے لگا۔ اگر وہاں کوئی خوش قسمتی کی بات تھی تو بس یہ کہ ہم صبح شام باہر نکالے جاتے ترازو میں تولے جاتے پھر وہیں رکھ دئے جاتے بس یہی ایک وقت ہوتا کہ ہم بے چینی سے اس کا انتظار کرتے اور تازہ ہوا کھانے کے منتظر رہتے نہ معلوم میں اس قید میں کب تک پڑا رہتا اگر ایک واقعہ پیش نہ آتا ایک رات ہم نے باہر سے بڑے بڑے ہتھوڑوں کے پڑنے کی آواز سنی پہلے تو ڈرے سہمے لیکن کسی قدر مسرور ہوئے جب یہ دیکھا کہ ہم کو اس طرح رہائی ہوگی ہم منتشر ہوئے میرے اور دوسرے ساتھیوں کا حال تو میں نہیں جانتا۔ میں ایک شوخ طبیعت شوقین مزاج ناعاقبت اندیش عیاش نوجوان کے ہاتھ پڑا میں شرم کے ساتھ اظہار کرتا ہوں کہ میں نے اس کو ایک مذہبی گناہ کے کرنے اور قانون اخلاق کے جرم کے مرتکب ہونے میں مدد دی اور اسی طرح میں ایک بازاری عصمت فروش کوٹھے والی عورت کے پاس پہنچا رات بڑی بے چینی سے کاٹی وہاں سے بہت جلد اور میں بہت خوش ہوں کہ مجھ کو بہت جلد رہائی ہوئی۔ میں نکلا اور ایک عطار کے پاس پہنچا۔

"عطار نے مجھ سے عطر تول کر بیچا۔ سونار نے سونے کے تولنے میں مجھ سے باٹ کا کام لیا چاندی کے وزن کرنے میں میں کام آیا۔ ایک شخص نے مجھ کو جیسے ہی اپنی جیب میں ڈالا فوراً میں زمین پر تھا اب میں وہاں پڑا انتظار کی گھڑیں کاٹ رہا تھا ہر آنے جانے والے کی صورت کو للچائی ہوئی نظروں سے اس امید میں دیکھتا کہ وہ مجھ کو اٹھالے اور میں پھر سیر و سیاحت کی زندگی بسر کرنے لگوں۔ لیکن وہ وقت بڑی دیر میں آیا جب کہ میری شکل مرور زمانہ کی وجہ سے یا پاداش عمل کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی تقریباً مسخ ہوگئی تھی نشان مٹ گئے تھے میل کچیل بہت جم گیا تھا۔ ایک رات سویرے ہی سے بادل گھرے، گھنگھور گھٹا چھائی خوب گرجا بجلی چمکائی اور گرجنگا تو برسنگا کیا اور بوبنگا تو کرنگا کیا، کے خلاف برسا گلیوں میں نالے اور سڑکوں پر ندیاں بہا دیں پتھر کنکر روڑا اڑی حرکت میں آئے مٹی پہ نکلی پھر اللہ گا

اور میں لڑکتا پڑکتا منظر عام پر آہی گیا صبح دم ایک کی نظر مجھ پر پڑی خدا کا شکر ادا کیا مجھ کو اٹھایا بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا اور کیوں نہ رکھتا بیچارہ بھوکا تھا۔ آہ! کیا ہمارے ملک کا دولتمند اور خوش باش طبقہ اس بات سے واقف ہے کہ ملک میں اُن کے بعض بھائیوں پر دن دن بھر کا فاقہ گذرتا ہے۔ اور بعض کو دن میں صرف ایک وقت کا کھانا میسر آتا ہے وہ بھی آدھا پیٹ اگر وہ یہ جانتے ان کے پہلو میں حساس دل ہوتا اور بنی نوع انسان کی ہمدردی ان میں ہوتی تو میں کبھی سینما نہ جاتا تھیٹر جا کر ڈرامے نہ دیکھتا سرکس سے مسرور نہ ہوتا منشیات مجھ سے نہ خریدی جاتیں۔ بیڑی چٹا سگریٹ سگار کی قیمت نہ بنتا رنڈی کے ناچ سے دل نہ بہلاتا جیسے ہی اُس نے مجھ کو پایا کسی رسٹورنٹ یا ہوٹیل نہیں بلکہ سیدھے بھٹیار خانہ کی راہ لی چار پیسے کا کلیجہ اور دو پیسہ کی نہاری سے اپنی دوزخ کی آگ بجھائی۔

"اب میری زندگی پھر نئے سرے سے شروع ہوئی پہلے کی طرح اب پھر میں سیر و سیاحت میں مصروف ہوا لیکن چند ہی روز گذرے تھے کہ قسمت کا مارا ایک بیچارہ تلبیس سکہ کے جرم میں ماخوذ ہوا پولیس نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا اپنے ذہن رسا کی داد حاصل کرنے کی دھن میں میرا انتشار کھوٹے سکوں میں کیا اس طرح میں کترا گیا لیکن سانچ کو کیا آنچ میں کھرا کا کھرا ہی رہا۔ مادہ مختلف شکلیں بدلتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ میرے دو ٹکڑے کر دئے گئے لیکن میں فنا نہ ہو سکا مگر افسوس! میں کام کا نہ رہا تھا میں بھٹی میں ڈالدیا گیا۔ گلایا گیا دوبارہ ڈھالا گیا اس طرح میں نے نیا جنم لیا۔ لیکن مجھ میں تھوڑا فرق پیدا ہو گیا تھا ایک طرف چارمینار اس ضرب اور نظام الملک آصفجاہ بہادر اپنی حالت پر تھے دوسری طرف ' ایک روپیہ ' جلوس میمنت مانوس ضرب فرخندہ بنیاد حیدرآباد حسب حال صرف فرق اس قدر ہوا تھا کہ پہلے چارمینار کے قلب میں ' م ' تھا تو اب ' ع ' ہوا اس کے سوا کوئی فرق نہ آیا میں نے پھر اپنی زندگی شروع کی اب میں اُس کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کیا کیا گذرا بس وہی کولھو کے بیل کی چال پھر ملک میں گشت لگانا شروع کیا اس نئی زندگی کے صرف دو واقعات سن لیجے پھر میں بتلاؤں گا کہ میں موجودہ حالت میں کس طرح پہنچا۔

"پہلا یہ کہ ایک صاحب نے سنٹ جارجس گرامر اسکول کی تعلیم ختم کی اور یورپ کی ڈگری کے شوق میں چل کھڑے ہوئے ملکی یادگار کے خیال سے مجھ کو بھی ساتھ رکھ لیا میں نے جہاز کے سفر کا مزا چکھا عدن پورٹ سعید اور جبل الطارق کی سیر کی نہر سویز میں سے گذرا اس طرح یورپ پہنچا وہاں

میں صرف اس کام کا تھا کہ ہر وقت ان حضرت کے دوست و احباب کے سامنے میری نمایش کی جائے۔ میری عبارت پڑھی جائے اس کا ترجمہ اُن کی زبان میں حسب قابلیت سنایا جائے اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔

"دوسرا یہ کہ ایک شخص نے ذاتی خصومت اور شخصی منافرت کی بنا پر ایک نوعمر اکیس سالہ جوان کو قتل کر ڈالا۔ پیچھے ایک نوجوان بیوہ اور ایک ننھا بچہ بیوگی اور یتیمی کی تلخیاں چکھنے مصیبت کے دن کاٹنے اور حسرت کی زندگی بسر کرنے رہ گئے۔ عدالت فوجداری میں چارہ کار اختیار کیا گیا تمام روئداد مقدمہ بتلاتی تھی کہ قاتل کو سزا ہوگی اگرچہ مظلومہ اور مظلوم کو کوئی نفع نہ پہنچتا تاہم کچھ تو ٹھنڈک ہوگی لیکن جیسے ہی میں خفیہ طور پر اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ حاکم عدالت کے پاس پہنچا تو نہ پوچھیے کہ میں نے کیا کیا ظاہر کرنے شرم آتی ہے لیکن حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آئندہ ایسی بدعنوانیاں نہ ہوں اور مظلوموں پر مزید ظلم نہ ہو میں نے جاتے ہی حاکم کی ہتیلی گرم کی اور جیب بھاری کیا بس مجرم جرم منسوبہ سے ایسا بری ہوا جیسے مسکہ میں سے بال نکل آتا ہے یہ ایک بڑا گناہ میں نے کیا تھا جس کے کفارہ کی فکر تھی۔

"ایک بزرگ دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہوئے۔ دنیوی جھگڑوں سے پیچھا چھوٹا لڑکے بال سیانے ہوئے دولت وافر ہوئی دنیا سے جی بھرا عاقبت کی سوجھی بمصداق بلی سات سو چوہے کھاکر حج کو چلی"۔ چلو حج کے لئے نکل کھڑے ہوئے مجھ کو برکت کے خیال اور تلک کی یادگار کے لئے ساتھ رکھ لیا اس طرح میں نے حج کیا عمرہ ادا کیا عرفات میں کھڑا رہا۔ صفا و مروا کے درمیان سعی کی رمی جمار کی خطبہ سُنا بیت اللہ میں نماز ادا کی میرا کوئی خاص مذہب نہیں جس کے پاس جاتا ہوں اس مذہب کا ہو جاتا ہوں اس ہی لئے میں مندروں میں بھی چڑھایا گیا۔ قبروں کی نذر ہوا۔ پادریوں کا نذرانہ بنا بہرحال بعد حج حاجی بنکر وطن لوٹا لیکن دیکھیے کم بختی کہ میرے سر میں گنڈا لگایا گیا میں ہنسلی میں لٹکایا گیا اور اب ایک معصوم بچہ کے گلے کا ہار ہوں۔ بچّہ کے والدین مجھ کو باعث برکت خیال کرتے ہیں اور میں قید میں پڑا دن کاٹ رہا ہوں۔ اور حج کی وجہ سے یہ عزت نصیب ہوئی اور اسی عزت پر خاتم۔

ممالک محروسۂ سرکارِ عالی
میں
صنعتی ترقی کا امکان

(از جناب عبدالقادر صاحب مینائی)

اپنے مبحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ ایک اجمالی نظر ملک ہندوستان پر ڈال لیں ملک ہندوستان قدرتی عطیات سے مالا مال ہے۔ کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک قدرت نے ہر جگہ کم وبیش اپنی فیاضی تقسیم کردی ہے۔ اس ملک میں بڑے بڑے اور ہمیشہ بہنے والے دریا موجود ہیں۔ ساتھ ہی عمدہ عمدہ لق ودق جنگل کوسوں تک چلے گئے ہیں۔ زمین ایسی زرخیز ہے کہ گویا سونا پیدا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی خام پیداوار سارے ملک کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ لوہا۔ سونا۔ چاندی۔ کوئلہ ہر چیز کافی موجود ہے گویا اگر ہندوستان والے چاہیں تو دیگر ممالک سے قطع تعلق کرکے بھی ایک مہذب شائستہ اور متمدن زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ یورپ کی طرح ان کو یہ مجبوری بھی نہیں ہے کہ اگر دوسرا ملک مصنوعات کے معاوضہ میں اشیاء خوردنی پختہ وخام نہ دے تو بھوکوں مریں۔ ہندوستان اگر مغرب کے لئے خام پیداوار فراہم نہ کردے تو اپنی تمام صنعتی ترقی کے باوجود بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہرحال ایک بڑی حد تک ہندوستان کو استغنا ضرور حاصل ہے۔ ملک ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو اپنی قدرتی خصوصیات کے لحاظ سے اپنی ایک علحدہ زندگی قائم نہ کرسکتا ہو۔

اس لحاظ سے گویا اس متمدن زمانہ میں ملک ہندوستان کو دیگر ممالک کے مقابلہ میں آزاد رہنے کا زیادہ حق حاصل ہے۔ اور ترقی کے میدان میں آج کل کے معیار کے لحاظ سے سب سے پہلے رہ سکتا ہے لیکن اس اجمال کے بعد بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تمام اسباب کے باوجود یہ ترقی کے میدان میں کیوں پیچھے رہ گیا۔ اس کے جواب میں گذشتہ تاریخ پر نظر ڈالکر آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ ترقی ملک میں شروع ہوچکی تھی اس کی سیاسی آزادی سلب ہوگئی اور وہیں سے ترقی کے دروازے میں قفل لگ گئے۔

اس کے بعد ہم اب ان چیزوں پر نظر ڈالیں گے جو کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہیں
(۱) سب سے اہم اور لابدی چیز خام پیداوار ہے اگر ملک میں خام پیداوار موجود ہے تو پھر صنعت کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ اور صنعت اسی قدر عمدہ پیمانہ پر پہنچتی ہے جس قدر عمدہ خام پیداوار دستیاب ہو سکے مثلاً اگر کسی ملک میں نیشکر کثرت سے اُگتا ہے تو بھی اسی قدر کثرت سے اور کم لاگت سے ہم شکر تیار کر سکتے ہیں۔ رہا اب یہ سوال کہ خام پیداوار تو موجود ہے لیکن ایسے مزدور یا کاریگر کہاں سے لائے جائیں جو شکر تیار کر سکتے ہوں۔ اس مقام پر ہم کو یہ تو ضرور مان لینا چاہیئے کہ جب نیشکر پیدا ہو رہا ہے تو اس مقام پر کم سے کم گُڑ بنانے والے جو بیلوں کے کولھو کی مدد سے گُڑ نکالتے ہونگے ضرور موجود ہونگے اور اصول فطرت کے لحاظ سے موجود ہونا چاہیئے۔ تو اب یہاں پر حکومت کا کام ہے کہ اس چیز کو ترقی دینے کے لئے اول تو اُن کی مختلف طریقوں پر ہمت افزائی کرے۔ دوسرے اچھی صحت اور دلچسپی رکھنے والے کاریگروں کو چُن کر خاص اس کام کی تربیت کے لئے باہر بھجوائے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ لوگ بھی بجائے گُڑ کے شکر تیار کر لیں۔ اگر اُن کے پاس سرمایہ نہ ہو تو حکومت کو سرمایہ فراہم کر دینا چاہیئے تاکہ اس سے وہ لوگ مشین وغیرہ بھی خرید سکیں۔ خیر یہ تو میں نے ایک مثال پیش کی اور اسی طرح ہر شئے کے واسطے قریب قریب ممکن ہے۔ اور جب اس طرح صنعت میں کچھ جان آجائے تو فوراً امداد دیدینی چاہیئے تاکہ مسابقت سے بچے۔ ورنہ شروع شروع میں بھی اگر مسابقت کرنا پڑے تو صنعت پھر مشکل سے ہی ترقی کر سکتی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس صورت میں ملک کو حاصل ہو سکتی ہیں جب کہ حکومت دیسی ہو۔ ورنہ غیر قوم کی حکومت میں اس قسم کے خلوص اور ہمدردی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد اب ہم ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی کے متعلق بحث کریں گے جو ہمارا اصل مبحث ہے۔ خدا کے فضل سے اس خطۂ ملک پر دیسی حکومت ہے اور ہم کو وہ تمام مراعات حاصل ہو سکتی ہیں جو برطانوی ہند میں میسر نہیں ہیں۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں کافی خام پیداوار موجود ہے اگر اُس کو توجہ سے کام میں لایا جائے تو بہترین صنعتی ترقی ہو سکتی ہے۔ یہ ملک مختلف اضلاع میں تقسیم ہے۔ اور ہر ضلع آب وہوا اور پیداوار کے لحاظ سے علیحدہ خصوصیات رکھتا ہے۔ اضلاع تلنگانہ کی آب وہوا مرطوب ہے۔ یہاں چاول

روئی۔ مکئی۔ نئے شکر۔ سفید جوار خوب پیدا ہوتے ہیں۔ ان اضلاع میں پانی کافی مقدار میں موجود ہے تالاب بڑے بڑے پائے جاتے ہیں۔ اکثر مقامات سے کوئی نہ کوئی ندی بھی ہو کر گذرتی ہے۔ لہٰذا اُن اسباب کی وجہ سے زراعت نفع بخش ہے دوسرے گنے کی پیداوار کی وجہ سے شکر سازی کے کارخانے بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تالاب کے شکم میں گنا بہت عمدگی سے پیدا ہو سکتا ہے اور آج کل جو بڑے فرازعین گنے اگا رہے ہیں وہ بہت نفع میں ہیں۔ آب وہوا کے مرطوب ہونے کی وجہ سے کپڑے کی گرنیاں بھی قائم ہو سکتی ہیں لیکن روئی کی زیادہ اور کامیاب کاشت نہیں ہے۔

اس کے بعد اضلاع مرہٹواڑی ہیں ان میں تیل کے بیج مثلاً مونگ پھلی۔ السی۔ سرسوں۔ کرڑ۔ روئی۔ سفید جوار وغیرہ بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں روئی اور تیل کے بیج قابل ذکر ہیں کہ اُن سے کافی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بات البتہ ضرور ہے کہ بارش اُن مقامات پر بہت ناکافی ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ پانی اور ذرائع آب پاشی کا جلد سے جلد انتظام کرے۔ یہاں کی زمینات بہت عمدہ ہیں اور ریگڑ (سیاہ زمین) بہت ہے ریگڑ کی زمین بہ نسبت چلکہ (سفید زمین) اور لال مٹی کی زمین کے افضل ہے۔ اور پودے کی غذا کے لئے اپنے اندر زیادہ اجزا رکھتی ہے۔

اس کے بعد اضلاع کرناٹک ہیں اُن اضلاع کی آب وہوا گرم اور خشک ہے۔ اُن اضلاع میں بھی اکثر غلے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی چیز غیر معمولی نہیں ہے جس سے کوئی بڑا کام لیا جا سکے۔ اُن مقامات کی آب ہوا ناقابل برداشت ہے۔ خصوصاً موسم گرما میں تو دوزخ کا لطف آتا ہے۔ اس مختصر حال کو چھوڑ کر اب ہم فرداً فرداً اُن مقامات کا تذکرہ کریں گے جہاں احصار صنائع کی صورت موجود ہے۔

سب سے پہلے اور قریب تر جو مقام کہ دارالسلطنت سے اور احصار صنائع کی صورت رکھتا ہے وہ سنگاریڈی ہے۔ یہاں کی حالت یہ ہے کہ یہ ضلع کا مستقر ہے اول تعلقدار۔ ناظم ضلع۔ مہتمم پولیس وغیرہ بہرحال اعلیٰ عہدہ دار قیام پذیر رہتے ہیں۔ آب وہوا بری نہیں ہے۔ چونکہ تلنگانہ کا حصہ ہے اس لئے چاول اور دیگر غلے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین ایسی بری نہیں ہے۔ ریگڑ (سیاہ زمین) اور چلکہ (سفید زمین) دونوں قسم کی زمین موجود ہے۔ جو بات قابل ذکر اور سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک زمانہ دراز سے ریشمی کپڑا بنا جا رہا ہے۔ لیکن اس کپڑے کو گرگھ پر ہاتھ سے بنتے ہیں۔ لیکن صاف اس قدر ہوتا ہے کہ مثل مشین کے کپڑے کے معلوم ہوتا ہے۔ تمام تھان میں کہیں بھی چک یا موٹا باریک ریشم

نہیں ہوتا ۔ کپڑا اس قدر گراں بھی نہیں ہے کہ اوسط طبقے کے لوگ نہ پہن سکیں ۔ لیکن ان کاریگروں کی کارگذاری صرف اس قدر ہے کہ وہ ریاست میسور سے یا ولایت سے ریشم منگا کر کپڑا بن دیتے ہیں یوں سمجھئے کہ اُن کی محنت اور کارکردگی اس فن میں شامل ہے ۔ اگر ریشم کی پیداوار کا انتظام مناسب کر دیا جائے اور اُن کو کچھ تربیت سرکاری طور سے دلائی جائے ۔ تو یہ صنعت اپنے اندر ترقی کی کافی گنجائش رکھتی ہے ۔ یہاں ایک سرکاری مزرعہ بھی قائم ہے ۔ ایک عملہ اس میں کام کرتا ہے لیکن زراعت پیشہ طبقہ کو اس سے مطلق فائدہ نہیں ہو رہا ہے ۔ اس مزرعہ میں شہتوت کے درخت لگائے گئے ہیں لیکن بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر گو تجربتاً یہ کیا جا رہا ہے کہ ریشم کے کیڑے پالیں اور اُن سے ریشم نکالیں لیکن اسقدر چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کرنے سے ہم صحیح اندازہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ آیا یہ ریشم سازی ہو سکتی ہے یا نہیں اس لئے کہ بہت امکان ہے کہ مسلسل حادثات کی وجہ سے یا چھوٹے پیمانہ کی وجہ سے کوئی فائدہ نظر نہ آئے ۔ دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ کامیاب ہی ہو ۔ غالباً ممالک محروسہ میں وقار آباد سے زیادہ ریشم کی کاشت کے لئے کوئی موزوں مقام نہیں ہو سکتا ۔ یہ بہت ٹھنڈا مقام ہے دوسرے اور بھی بہت موزوں نیت کے وجوہ ہیں ۔

بہرحال ریشم سازی اور ریشم بافی اعلیٰ پیمانہ پر صنعت یہاں کامیاب ہو سکتی ہے اگر کاریگران کو مشین سے کام لینے پر مجبور کیا جائے تو صنعت اور سستی ہو جائے گی ۔ اور ہمارے ملک میں مال پھیل جائے گا ۔ یہ لوگ کافی مالدار ہیں سرکار کو اُن کے کام میں روپیہ صرف کرنا نہ پڑے گا ۔ صرف ترغیب و تحریص اور تھوڑے اثر سے کام لینا ہوگا ۔

اس کے بعد اس سے قریب ایک اور تعلقہ ہے جسے سدی پیٹ کہتے ہیں یہاں پیتل کی صنعت بہت عمدہ ہے پیتل کے آفتابہ ۔ کشتیاں و دیگر ظروف کافی مقدار میں تیار ہوتے ہیں اگر ان کاریگروں کو مدد دی جائے تو یہ بھی صنعت کا مرکز بن سکتا ہے اس کے اطراف کے مقامات میں بھی یہ کام جاری ہے لیکن سدی پیٹ میں مرکزی مقام بننے کی صلاحیت ہے یہ کاریگر ایسے مالدار نہیں ہیں کہ اپنے سرمایہ سے اس کام کو بڑے پیمانہ پر بھی چلا سکیں ۔ ہر کاریگر علحدہ علحدہ یا دو چار آدمیوں کو اپنی امداد میں لیکر مختصر سامان تیار کر لیتا ہے ۔ جس کی اُجرت اُس کی ضروریات کی کفیل ہو جاتی ہے ۔ بہرحال حکومت کو جلد اس طرف توجہ کرنا چاہیئے تاکہ یہ صنعتیں زوال پذیر ہونے سے قبل ہی روبہ ترقی ہو جائیں ۔

اس کے بعد ایک چھوٹی سی صنعت میدک میں بھی جاری ہے۔ یہ صنعت کپڑے چھاپنے کی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے خوشنما دسترخوان پردے چادریں وغیرہ چھپتی ہیں۔ اُن کے رنگ عموماً پختہ اور بہت کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے بیل بوٹے آسانی سے یہ لوگ چھاپ دیتے ہیں۔ اگر اس صنعت کو امداد دی جائے تو رفتہ رفتہ ترقی کرکے یورپ کے امی ٹیشن چھاپوں کا آسانی سے مقابلہ کرلیں گے ابھی تک تو صرف موٹے کپڑوں کھادیوں وغیرہ پر چھاپ رہے ہیں کیونکہ ایسے ہی کپڑے پہننے والے چھپواتے بھی ہیں۔ تھوڑی سی نفاست اور ملک کی قدردانی درکار ہے۔ اس کے بعد میں بیدر کا ذکر کرونگا۔ بیدر میں ایک سیاہ دھات برآمد ہوتی ہے جو لوہے کے مشکل ہے اس دھات پر یہاں کے لوگ سونے چاندی کا کام کرتے ہیں یہ کام اس قدر صاف اور نفیس ہوتا ہے کہ بالکل ولایتی مال معلوم ہوتا ہے۔ ٹین، صراحیاں۔ کشتیاں۔ ڈبیاں وغیرہ اس قسم کی چیزیں بہت کثرت سے تیار ہوتی ہیں۔ شوقین لوگ اپنے تصاویر وغیرہ بھی بنواتے ہیں لیکن کسی قسم کے کام میں بھی ہم غیر متناسبی بات نہیں پاتے اور بالکل سائنٹفک طریقہ پر کیا ہوا کام معلوم ہوتا ہے۔ یہ دھات نرم قسم کی ہوتی ہے اس وجہ سے تراش خراش میں اور آسانی ہوتی ہے لیکن بس دستکاری ہے بہت دیر میں اور بڑی محنت کے بعد اور گراں لاگت پر اشیار تیار ہوتی ہیں۔

تیسرا مقام کریم نگر ہے۔ یہاں سونے چاندی کا کام بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے جالدار ظروف تیار کرتے ہیں۔ نیز صندوقچے۔ ڈبیاں۔ عطردان۔ کشتیاں تھالیاں تیار ہوتی ہیں ان پر بیل بوٹے ہمہ قسم کے ہوتے ہیں۔ بیل بوٹوں کا تناسب بہت ہی موزوں اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے

(باقی آئندہ)

قاآنی کا عروج

اور

اعزاز

(از جناب عبدالقفار صاحب فانی۔ ایم اے، لکچرار فارسی لکھنو یونیورسٹی)

قاآنی کی شاہی دربار میں باریابی اور مجتہد الشعرا کا خطاب

پروفیسر فانی نے قاآنی پر تحقیقات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ سلسلہ لکھنو کی کسی علمی مجلس میں پڑھا گیا تھا۔ گذشتہ دسمبر میں جب میں لکھنو گیا تو ڈاکٹر بدل الرحمن (حال پرنسپل اسماعیل کالج اندھیری) کی توسط جناب فانی سے ملاقات ہوئی اس سلسلہ مضامین کا ذکر آیا تو میں نے اس کو مکتبہ کے لئے مانگ لیا۔ فانی صاحب نے پہلا حصہ جو بڑی کوشش اور محنت سے لکھا تھا میرے نام روانہ فرمایا لیکن افسوس کہ وہ مجھے نہ مل سکا اور گم ہوگیا معلوم نہیں اس کی تدوین پھر کس طرح ہو سکے گی۔ فانی صاحب بکمال مہربانی یہ دوسرا حصہ بھی مکتبہ کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ جس کا مکتبہ بے حد ممنون ہے۔

(عبدالقادر سروری)

شاہزادہ شجاع السلطنت کی سرکار میں قاآنی نے خوب ترقی کی، اور ایک مدت تک وہ اس کی شاہانہ فیاضیوں سے مستفید ہوتا رہا۔ چنانچہ رضا قلی ہدایت لکھتے ہیں۔[۱]

"در خراسان و کرمان سالیان دراز بتربیت صاحت شجاع السلطنت برآمد تا در کمالات مرتبۂ عالی حاصل کردہ در شاعری بمقامات اعلیٰ واصل آمدہ"

دس[۲] سال کے بعد جب شاہزادہ کی خراسان سے رے[۳] میں طلبی ہوئی شاہزادہ نے فتح علی شاہ قاچار سے قاآنی کی شاعری کی تعریف کی، شاہ کو جو خود بھی ایک بلند رتبہ اور اچھا شاعر تھا خاقان تخلص کرتا تھا قاآنی کے اشعار سننے کا شوق پیدا ہوا۔ قاآنی کو شاہی دربار میں حاضری کا حکم ہوا تعمیل حکم کے ساتھ ہی قاآنی نے ایک عمدہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے صلہ میں بادشاہ کی سرکار سے علاوہ خلعت کے مجتہد الشعرا کا خطاب ملا اور شاہی درباریوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔

(۲)

---

[۱] مجمع الفصحا صفحہ ۴۲۲، جلد دوم [۲] دیوان قاآنی، دیباچہ [۳] اس زمانہ میں ایران کا پایہ تخت تھا طہران سے ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔

حسان العجم کا لقب

جب فتح علی شاہ نے ۴۰ برس سلطنت کرکے ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا محمد شاہ غازی سریر آرائی دولت ایران ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت فقیر دوست ہنر پرور اور فیاض تھا۔ انھیں خوبیوں کا نتیجہ تھا کہ بقول مصنف گنج شائگاں۔

"دران چند سال نقد ہنر و جنس کمال بدانگونہ رواج یافت کہ معارف اہل حال و مشاہیر ارباب کمال از فارس و عراق و سائر ممالک آفاق طے مسافت کردہ در پایۂ سریر خلافت بہر عرض ہنر حاضر گشتند۔ از ہجوم آن نجوم و اجتماع آن کواکب و تراکم آن ثواقب آستان معلیٰ چون راہ مجرہ نمودے و حکیم قاآنی در آن جمع کالقمر البازغ فی النجوم بودے۔"[1]

قاآنی کو بادشاہ کی مدح سرائی کے صلہ میں حسان العجم کا لقب عطا ہوا اور ذات ہمایونی کے ساتھ رہنے کا حکم صادر ہوا اور ایک معقول وظیفہ بادشاہ کی سرکار سے مقرر ہوگیا چنانچہ ایک قصیدہ[2] میں اسی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے۔

خداوندا شنیدم مر مرا حسان لقب دادی	بلے حسان بود ہر کو تو باشی زا حسانش
کدامی فخر ازیں برتر کہ گوید آصفی چوں تو	محمد شہ محمد ہست و قاآنیست حسانش

قاآنی نے اپنی کتاب[3] "پریشان" جو سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی ہے اسی بادشاہ کو نام سے معنون کی ہے۔

ملک الشعرا[4] کا خطاب

۱۲۶۴ھ میں ۴۰ برس کو محمد شاہ غازی نے ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ تخت نشین ہوا۔ شاہزادہ علی قلی میرزا اعتضاد السلطنۃ وزیر معارف قاآنی کا ممدوح اور نہایت قدردان تھا اس کی مربیانہ پرورش اور توسط سے اسی زمانہ میں جبکہ ناصر الدین شاہ ولیعہد سلطنت سے قاآنی کی رسائی ان کے دربار تک ہو چکی تھی اور سرکار ولیعہدی سے قصیدوں کے صلہ میں اس کو برابر اکرامات و انعامات عطا ہوتے رہتے تھے۔ ناصر الدین شاہ کے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی قاآنی کو اور بھی زیادہ عروج حاصل ہوا

---

[1] دیوان حکیم قاآنی۔ دیباچہ [2] دیوان قاآنی ص ۲۰۵ [3] پریشان ص ۵ [4] دیوان حکیم قاآنی۔ دیباچہ

وہ حسب دستور شاہ کی مدح سرائی کا فرض ادا کرتا رہا اور میرزا آقا خاں[١] صدر اعظم اور شاہزادہ علی قلی میرزا کی سفارش کے اثر سے ملک الشعرا کے معزز خطاب سے ممتاز ہوا۔

اس زمانے میں فرقۂ بابیہ کی تحریک زوروں پر تھی اور حکومت ایران اس کے فرو کرنے میں ہمہ تن مشغول تھی۔ ١٥ اگست ١٨٥٢ء میں تین[٢] بابیوں نے ناصر الدین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر اتفاق سے وہ بچ گیا۔ اسکی خوشی میں قاآنی نے ایک زبردست قصیدہ[٣] لکھ کر نذر کیا جس کا مطلع یہ ہے۔

ساقی امشب مے بیا پے دہ کہ من بر جائے آب نذر کردستم گزیں پس می ننوشم جز شراب

اس کے صلہ میں بادشاہ نے قاآنی کا ایک معقول وظیفہ عمر بھر کے لئے مقرر کر دیا۔

(٤)

سیاحت ہند کا شوق

قاآنی کو حافظ شیرازی رح کی طرح ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا تھا لیکن بعض موانعات کی وجہ سے دشت ارژن ہی سے واپس جانا پڑا۔ چنانچہ قاآنی نے "پریشان[٤]" میں اپنے اس ارادہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

"در عشر آخر صفر و غالباً اول بہار و تساوی لیل و نہار بود کہ از شیراز با طایفۂ از دوستان بعزم ہندوستان برآمدم و قضارا چوں دو سہ فرسنگ از دشت ارژن شیراز گذشتیم۔ ...... معاودت بشیراز اتفاق افتاد۔"

(٥)

وفات

قاآنی کی عمر کا زیادہ حصہ خراسان کرمان شیراز اور طہران میں بسر ہوا۔ چنانچہ رضا قلی خاں ہدایت کی اکثر ملاقاتیں قاآنی سے انھیں تین موخر الذکر مقامات میں ہوئی تھیں جن کی نسبت وہ لکھتا ہے[٥]۔

"در شیراز و کرمان و طہران فقیر سالہا بصحبت وی رسیدہ و اشعار نیکو از وی شنیدہ۔"

لیکن ان مقامات میں سے قاآنی کا زیادہ زمانہ شیراز میں گزرا جو اس کا وطن تھا۔ پروفیسر براؤن[٦] بھی جب ١٨٨٨ء کی فصل بہار میں شیراز گئے تو نواب میرزا حیدر علی خاں بہادر کے محل کے اسی خاص کمرہ میں ٹھیرے تھے

---

[١] منتخبات قاآنی مقدمہ مطبوعہ حبل المتین پریس کلکتہ بسنہ ١٩٠٧ء [٢] تاریخ ادبیات فارسی ص ٣٢٩ جلد چہارم۔ براؤن۔ [٣] دیوان قاآنی ص ٤٣۔ [٤] پریشان ص ٣٢ [٥] مجمع الفصحا ص ٤٢ جلد دوم [٦] تاریخ ادبیات فارسی عہد جدید ص ٢٢٢ جلد چہارم

جو قاآنی کا مسکن تھا۔ چونکہ وہ شاہی درباری شاعر تھا اور شاہی دربار سے قائم ہو چکے تھے اس لئے اس کا آخر زمانہ طہران ہی میں بسر ہوا اور وہیں ۱۲۷۰ہجری میں اس کی وفات ہوئی۔

ناصر الدین شاہ کو قاآنی کی وفات کا بہت افسوس ہوا اور تجہیز و تکفین کے تمام مصارف شاہ نے اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔ مدفن دار الخلافہ طہران میں ہے۔

خود[1] قاآنی کے بیان کے بموجب حساب لگانے سے اس کی تاریخ پیدائش ۲۰ رمضان یا ۸ شوال ۱۲۲۲ھ مطابق ۲۱ نومبر یا ۲۰ دسمبر ۱۸۰۷ء قرار پاتی ہے۔ سنہ وفات جس پر اکثر سوانح نگار متفق ہیں ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء ہے البتہ ماہ وفات کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا اور نہ اس کا پتہ چلتا ہے۔ مگر قیاس چاہتا ہے کہ اس کی وفات سنہ متذکرہ بالا کے ماہ محرم یا صفر یا ربیع الاول مطابق ماہ اکتوبر یا نومبر یا دسمبر میں ہوئی ہوگی۔ قمری حساب سے اس کی عمر ۴۸ سال ۴ مہینے کی ہوتی ہے اور شمسی حساب سے ۴۵ برس ۱۱ ماہ کی۔ دونوں میں کچھ دن بڑھتے ہیں جو نظر انداز کر دئے گئے ہیں اور اس حسابی اندازہ میں اوسط کا خیال کرتے ہوئے ماہ صفر مطابق ماہ نومبر کا بطور ماہ وفات لحاظ رکھا گیا ہے۔

مرزا فرصت اپنی کتاب آثار عجم میں سنہ وفات ۱۲۷۲ھ لکھتا ہے اور صاحب مجمع الفصحا ۱۲۷۰ھ۔ پروفیسر براؤن کی تحقیق کے مطابق قاآنی کا سنہ پیدائش ۱۸۰۸ء اور سنہ وفات ۱۸۵۴ء[2] ہے جو علی الترتیب ۱۲۲۳ھ اور ۱۲۷۰ھ کے مطابق ہیں۔

محمد کاظم[3] شیرازی لکھتے ہیں کہ جب مرض الموت کی شدت ہوئی اور قاآنی کے احباب جو اس وقت اس کے پاس جمع تھے اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تو اسے توبہ و استغفار کی تلقین کرنے لگے اور خدا سے لو لگانے کی تاکید کی۔ قاآنی نے با چشم پر نم اسی حالت میں یہ شعر پڑھا۔

شرمندہ از آنیم کہ در روز مکافات — اندر خور عفو تو نکردیم گناہے

شاعر کہتا ہے کہ ہم اس بات سے شرمندہ ہیں کہ اس بدلے کے گھر یعنی دنیا میں ہم نے کوئی گناہ تیری بخشش کے شان شایاں نہیں کیا ہے۔

یہ شعر زبان پر جاری ہوتے ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آیا اور روح اور طبیعت ہلکی ہو گئی اور قاآنی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی مضمون کا ایک شعر حضرت شیخ مصلح الدین شیرازی کا ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] پریشان صفحہ ۹ مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۳ھ۔ [2] منتخبات حکیم قاآنی، مقدمہ، مطبوعہ حبل المتین پریس کلکتہ ۱۹۰۷ء

ہمی شرم دارم ز لطف کریم	کہ خواہم گنہ پیش عفوش عظیم

اسی مضمون کو حضرت نظامی نے ایک دوسرے انداز سے ادا کیا ہے :

گناہ من ارنامدے در شمار	ترا نام کے بودے آمرزگار

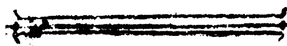
حکیم عمر خیام نے بھی اسی خیال کو مختلف انوکھے اندازوں اور طرزوں میں ادا کیا ہے، ہر انداز اور طرز میں ایک نئی بات ایک نیا رنگ اور ایک نیا اثر ہے، نمونتاً ہم تین رباعیاں لکھتے ہیں۔

(۱) من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست	تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی	آن بیع بود لطف وعطائے تو کجاست

(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو	صد سالہ شدم بناز در نعمت تو
صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد	تا جرم من است بیش یا رحمت تو

(۳) ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو	وان کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی	پس فرق میان من و تو چیست بگو

طلب مغفرت کے ان روح افزا اشعار سے ان شعرا کے لطیف جذبات اُخروی کا ایک گونہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خدائے غفور الرحیم کی شان ستاری اور کریمی پر کتنا بھروسہ اور یقین تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خود رب العالمین بھی اپنے بندوں پر اپنی رحمت کا دروازہ بند نہیں کرتا ہے بلکہ ٹوٹے ہوئے دلوں اور مایوسوں کو بشرطیکہ ان کے دلوں میں گناہوں کا احساس اور کچھ ندامت موجود ہو اپنے کلام پاک میں یوں ڈھارس بندھاتا ہے۔ لا تقنطو من رحمۃ اللہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اب یہ ذوق سلیم کا کام ہے کہ وہ دیکھے اور پرکھے کہ کس کا انداز بیان زیادہ مؤثر جامع لطیف اور عبدیت و معبودیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔



تنقیدیں

تاریخ الامت حصہ ہفتم | از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری ۔
بڑی تقطیع (۱۲۰) صفحات ۔ صاف کتابت وطباعت قیمت عہ
مکتبہ جامعہ' قرول باغ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ' اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے ساتھ ہی حافظ صاحب نے اردو میں تاریخ اسلام پر کسی مفید اور متوسط درجے کا بسیط سلسلے کے فقدان کو محسوس کر کے تاریخ الامت کی بنیاد ڈالی اور مسلسل کئی برس کی کوشش کے بعد بحمد اللہ یہ سلسلہ اپنی حد تک مکمل ہوگیا تاریخ الامت کا ساتواں حصہ آل عثمان کی مختصر سی تاریخ ہے ۔ آل عثمان کی ابتدا سے لیکر ترکی میں جمہوریہ کے قیام اور غازی مصطفے کمال پاشا کی صدارت کے حالات وواقعات اجمالاً نہایت سلیس اور سادہ زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں ۔ آخر میں تاریخ ترکی کے اتار چڑھاؤ اور حالات کے ردوبدل پر ایک سرسری نظر واپسیں بھی ڈالی گئی ہے ۔ جگہ جگہ علمی ترقیوں' سیاسی تحریکوں اور معاشی حالات کا بھی ذکر ہے مختصر طور پر ترکی کے موجودہ دستور حکمرانی کے کچھ اصول بھی درج ہیں ۔

اردو دنیا کو حافظ صاحب نے اس بیش بہا سلسلے کی تالیف سے جو فایدہ پہنچایا ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اردو میں اُن کی کوشش سے عام مطالعے کے لئے ایک اچھی تاریخ اسلام مدون ہوگئی ۔ اگرچہ یہ کتاب جامعات کے اونچے نصاب تعلیم کی ضرورت کما حقہ پوری نہیں کرسکتی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ کالجوں کے طلبائے تاریخ اسلام اس کے غیر درسی مطالعے سے بہت کچھ فایدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ اس سلسلے کی زبان کو بطور خاص سلیس اور سادہ رکھا گیا ہے جس سے اُس کا افادہ بہت زیادہ ہوگیا ۔ اس سلسلے کی تکمیل حافظ صاحب قابل مبارکباد ہیں اور ان کا یہ کارنامہ اُردو دنیا میں ہمیشہ اُن کے نام کو زندہ رکھے گا ۔

ہمارے رسول | از مولانا خواجہ محمد عبد الحی صاحب فاروقی ۔ چھوٹی تقطیع (۸۰) صفحات صاف کتابت وطباعت ۔ قیمت ۲ر مکتبہ جامعہ' قرول باغ دہلی اور

مکتبہ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اردو میں سیرت نبوی پر متعدد چھوٹے رسالے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں "ہمارے رسول" بھی ایک ایسا ہی مفید اور بہت اچھا رسالہ ہے۔ آسان زبان میں آنحضرت صلعم کی پاک زندگی کے واقعات اور حالات صحیح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تالیف کا مقصد کم سواد لوگوں اور نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے سلیس اور سادہ پیرایۂ بیان میں اسوۂ حسنہ کی تعلیم دینا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ مولف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور اُن کا مقصد پورا ہوگیا۔ میسور میں اس رسالے کو نصاب تعلیم میں شریک کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح صوبجات متحدہ پنجاب کے مدارس اسلامی میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔

صاحبان قلم کیلئے زرّین موقع

اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے

ہزاروں روپئے کے انعام

چاند اُردو قیمت سالانہ آٹھ روپیہ
ششماہی پانچ روپیہ فی جلد ایک روپیہ

چاند میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے
مینجر اُردو چاند، چندر لوک الہ آباد

تمام ہندوستان کے مشہور اہل قلم "چاند" میں اپنے اپنے مضامین بھیج رہے ہیں آپ بھی جلد روانہ فرمائیے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ چاند جس آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ ویسا اُردو میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے اسلئے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی اشاعت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو گئی ہے اور مشہور اہل قلم اپنے مضامین چاند میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چاند ایک ماہواری علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی رسالہ ہے۔ اس میں مختلف قسم کی عمدہ سے عمدہ تصاویر بھی شائع ہوتے ہیں تصاویر کا مجموعہ کیا ہے گویا ایک مصور کا البم ہے۔

چاند سال میں کئی مرتبہ خاص نمبر کی حیثیت سے شائع ہوگا۔ حال ہی میں اسکا اسپیشل نمبر شائع ہونیوالا ہے۔ اسکے لئے جلد از جلد مضامین بھیج جاویں مضمون نگاران کیلئے اچھا موقع ہے، انکو اختیار ہے کہ جس سبجکٹ پر چاہیں مضمون لکھیں اس شخص کو جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا انعام دیا جاویگا۔ تین انعام ہونگے۔ (۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم۔ ہر ایک مصنف کو بلحاظ مضمون کے اعتبار سے سو روپے تک کا نقد انعام دیا جائیگا

اس کے علاوہ

سال بھر تک جن اصحاب کے سب سے اچھے مضامین (نثر ہو یا نظم) چاند میں شایع ہونگے انکو بھی بہترین مضمون پر انعام دیا جائیگا۔ اسمیں بھی تین انعام ہونگے (۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم۔ سو روپئے تک کا انعام اسمیں بھی ہوگا مضامین، افسانہ اور نظمیں ان شرائط کی پابندی

(۱) مضامین علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، تاریخی یا تحقیقی ہوں
(۲) افسانوں میں کوئی خاص جدّت ہو
(۳) نظم کسی خاص مضمون پر ہو۔ قواعد عروض اور زبان کی غلطیاں نہ ہوں
(۴) سب مضامین صاف و شستہ زبان میں لکھے جاویں اور ان میں اُردو کے لطیف یا دقیق مضمون ہوں
(۵) مضامین غیر مطبوعہ اور نئی طرز کے ہوں
(۶) جتنے مضامین ہوں نظم ہوں یا نثر یا افسانے انکو مضمون نگار کسی دوسری جگہ پر بھیجنے کا مجاز نہ ہوگا جملہ حقوق کا مختار ایڈیٹر ہو جائیگا بغیر مضمون نگار کی اجازت کے کوئی تبدیلی نہ کی جائیگی
(۷) مضامین زیادہ طویل نہوں حشو و زوائد سے پاک ہوں
(۸) اگر کوئی مضمون نگار چاہے تو ایک سے زائد بھی مضمون افسانہ یا نظم بھیج سکتا ہے
(۹) ایڈیٹر کا فیصلہ آخری ہوگا کسی طرح مسترد نہ ہو سکیگا اور یہ فیصلہ قانوناً قابل تسلیم ہوگا
(۱۰) اسپیشل نمبر کیلئے ماہ اگست تک تمام مضامین نظم و نثر و افسانے بھیج دئے جانا چاہئیں۔ دیگر مضامین ماہ بماہ آتے رہینگے
(۱۱) وہ مضامین جن کو مقابلہ میں انعام نہ دیا جائیگا۔ اگر وہ پسند آئینگے چاند میں شایع کر دئے جائینگے لیکن وہ مضامین جو چاند میں نہ شایع ہو سکینگے۔ وہ اسی شرط پر واپس ہو سکتے ہیں کہ مضمون نگار حضرات اپنا پتہ صاف لکھیں۔ اور واپسی کے لئے مہر کے ٹکٹ روانہ کریں
(۱۲) ہر مضمون نگار کو چاند کا خرید فرمانا ضروری ہے۔

جملہ مضامین وغیرہ حسب ذیل پتہ سے بھیجنا چاہئے۔

منشی کنہیالال ایڈیٹر "چاند" الہ آباد ٹیلیفون نمبر ۲۰۵ تار کا پتہ "چاند"

مجلہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں پچاس روپے کے مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ یا پچاس روپے کی عام مذاق کی اور کسی کتابیں بقیمت یکدفعات نقد خرید فرمائینگے ان کے نام رسالہ سال بھر کے لیے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اسی طرح جو حضرات بھی چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ یا پچیس روپے کی دیگر کتابیں یکدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات یکدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دی جائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیے کہ وہ ان رسیدوں کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اجمال بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیج دیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی آدمی مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

موصولہ ۱۵ر مہر سنہ ۱۳۳۹ف
یوسف

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے — عمر یافعی

مجلّہ مکتبہ

یہ ادارہ اشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو مہربانی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (ستا) فی پرچہ ۶ ر

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (ست) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلّہ مکتبہ ـ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

لیجئے نکل آیا

اردو "چاند" الہ آباد

ہندی "چاند" کی خدمتوں کو مقبول و مشہور پاکر ہم نے اس کا ایک
اردو ایڈیشن بھی نکالا ہے یہ رسالہ تصاویر کی تعداد اور عمدہ لکھائی چھپائی
اور بہترین کاغذ کے ساتھ سوا سو صفحہ ماہوار سے بھی زیادہ ضخامت اور
۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع پر نکلتا ہے تاریخ اشاعت ہر مہینہ کا دوسرا ہفتہ ہے یعنی چاند
دو ہفتہ ہونے کی کوشش کر رہا ہے اگرچہ بعض حضرات اس کو ابھی سے
بدر مانتے ہیں لیکن ہم اس منزل کو ابھی دور خیال کرتے ہیں کیونکہ آغاز کار ہے اور پبلک
کا اقبال ورنہ کارکن اپنی طرف سے ہر ایک خوبی کی تکمیل پر مخلصانہ جد و جہد ہو گی
لیکن پبلک کی سرپرستی اور اپنا ملک و قوم کی عادت کے بغیر یہ بیڑا پار کیونکر لگیگا نمونہ کی
تقسیم اور معاصرین کی امداد سے جس قدر مستقل معاون ہم پہنچے ہیں وہ رسالہ کی ضروریات
زندگی کے کفیل نہیں ہو سکتے ایسے اعلیٰ درجے کے میگزین کی اشاعت کم ہے تو یہ کیا
کام کر سکیگا اس کو اپنے پاؤں ہی پر کھڑا ہونا مشکل ہو گا یہ آگے کیا چلیگا اس لئے علم و ادب کی اشاعت
اور اتحاد و اتفاق کی تعلیم اور ہر گونہ ترقیوں کے دلدادہ پبلک سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ
چاند (اردو) کا دائرہ وسیع اور وسیع تر بنانے اور اس کے خریدار بن کر ہمیں شکر گزاری کا
موقع دیں۔

ایڈیٹر منشی کنھیالال ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ

چندہ سالانہ	آٹھ روپیہ
ششماہی	پانچ روپیہ
فی جلد	ایک روپیہ

کاپی نمونہ بلا قیمت نہ جاری ہو گی۔
نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرائیے۔

—(×)—

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت مینیجر دفتر "چاند" اردو ایڈیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے ٹیلیفون نمبر (۲۵) تار کا پتہ "چاند"

—(×)—

خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر "چاند" اردو ہونا چاہیے

گلشن گفتار

(الفریشن (امرتسر) کی رائے)

مرتبہ مولوی سید محمد ایم اے دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ کی علمی مطبوعات کے سلسلہ کی ایک نئی کتاب ہے اور حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ یہ شعرائے اردو کا اولین تذکرہ ہے۔ اس میں قدیم دکنی شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے صرف وہی شعرائے اردو مذکور ہیں جو ۱۱۶۵ھ میں وسیع شہرت کے مالک تھے اور جن کا کلام شمالی ہند سے گذر کر دکن میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ متعلمین تاریخ ادب کے لئے ہر شاعر کے ساتھ دوسرے قدیم تذکروں کے بیانات بھی من و عن نقل کر دئے گئے ہیں جن سے معلومات میں خاص اضافہ ہوتا ہے شعرائے اردو کے تذکروں میں یہ تذکرہ ایک نہایت مفید و اہم اضافہ ہے اور قابل قدر ہے۔

رہنمائے تعلیم (لاہور) کی رائے

یہ شعرائے اردو زبان کا اولین تذکرہ ہے جس میں قدیم دکنی شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے صرف انہیں شعرا کا ذکر ہے جو اپنے وقت میں وسیع شہرت کے مالک تھے اور جن کا کلام شمالی ہند سے گذر کر دکن کی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ متعلمین تاریخ ادب کی سہولت کیلئے ہر شاعر کے ذکر میں دیگر قدیم تذکرہ جات کے بیانات بھی دئے گئے ہیں جو معلومات میں خاص اضافہ کا موجب ہوں گے۔ اور ان کے متضاد بیانات سے جن غلط فہمیوں کا شائبہ ہو سکتا ہے دور ہو جائینگی فی الحقیقت یہ تذکرہ شعرائے اردو کے تذکروں میں ایک نہایت مفید اور اہم اضافہ ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کی علمی خدمات کا بہترین شاہد ہے شائقین اردو زبان اس سے خاص طور پر مستفید ہو سکتے ہیں اور اردو زبان کے امتحانات کے امیدواران بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت صرف ۱۲ر

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ

(حیدرآباد دکن)

ملنے کا پتہ

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ شہریور ۱۳۳۹ف م جولائی ۱۹۳۰ء شمارہ (۴)

تصاویر
(۱) حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم
(۲) مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب
ام-اے، ال ال بی عثمانیہ، بارایٹ لا، ڈی فل، بی سی ال (آکسن)

فہرست مضامین

شذرات

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ اجلاس میں مولوی عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ اور صدر جلسہ نے جو خطبہ دیا تھا کچھ عرصہ پہلے لکھا جا چکا تھا، لیکن چونکہ ہم اس کو صدر صاحب کی تصویر کے ساتھ شایع کرنا چاہتے تھے، اس لئے وہ رکا رہا، بلا کا ابتک وصول نہیں ہوا۔ اس لئے مزید تاخیر کو مذموم سمجھکر ہم خطبہ کو شائع کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ ملک کی گذشتہ تعلیمی ترقی کے متعلق ملک کے ایک دیرینہ تجربہ کار معلم اور تعلیمی خدمت گذار کے خیالات ہیں، اس لئے یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔

گذشتہ ماہ میں حیدرآباد کے لئے ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ مولوی سید اشرف صاحب شمسی، سابق مددگار پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ، جو عربی علوم کے متبحر عالم اور فارسی کے قابل شاعر اور ادیب تھے، انتقال کر گئے۔ مولوی صاحب کی پبلک زندگی جس قدر شاندار تھی، اسی قدر خانگی زندگی بھی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ مولوی صاحب کا ملک بھر میں بڑا احترام تھا۔ آپ کے انتقال پر کئی پبلک جلسے منعقد ہوے۔ مولوی صاحب کا "مکتبہ" سے بھی ایک خاص تعلق تھا۔ جامعہ عثمانیہ کی بی، اے کی جماعتوں کے لئے جو فارسی کورس پچھلی دفعہ تیار ہوا تھا، اور مکتبہ کی طرف سے شایع ہوا تھا، اس سے متعلق ایک دارالتصنیف قایم کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب ملک کے کئی اور علماء کے ساتھ مؤلفین میں شامل تھے۔

ہمارے پاس مولوی صاحب کی زندگی اور علمی خدمات سے متعلق کئی مضامین اور نظمیں ابتک وصول ہو چکی ہیں۔ ہم ان میں سے ایک اچھا انتخاب کر کے ستمبر (آبان) کے رسالہ میں ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اتفاق سے مولوی صاحب کی ایک تصویر بھی دستیاب ہو گئی ہے۔ جو اسی رسالے میں چھپے گی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل طیلسانی، مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب

جو جامعہ عثمانیہ سے ام، اے اور ال ال بی کے امتحانات بیک وقت امتیاز کے ساتھ کامیاب کرنے کے بعد سرکاری وظیفہ سے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے، غالباً آگسٹ کے آخر میں ہندوستان واپس ہونگے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلیل قیام انگلستان کے زمانے میں جو کام کئے وہ شاید قدیم سے قدیم جامعہ کے لئے بھی مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔ دو سال ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب نے آکسفورڈ سے ڈی فل (پی اچ، ڈی) کی ڈگری قانون میں امتیاز کے ساتھ حاصل کی تھی۔ اس سال آپ نے (بی، سی، ال) کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ کامیاب کر لیا۔ یہ امتحان آکسفورڈ یونیورسٹی کا سخت ترین امتحان ہے۔ اور اسی لئے کسی متعلم کو، جب تک وہ بی، اے آنرز کامیاب نہ ہو، اس میں داخلہ کی اجازت نہیں ملتی۔ مگر چونکہ ڈاکٹر سیادت علی خاں صاحب نے ڈی، فل، آکسفورڈ ہی سے امتیاز کے ساتھ کامیاب کر لیا تھا۔ اس لئے باستثنائے خاص، بی، سی، ال میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اور امتحان اس سال آپ نے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مغربی علوم کے ساتھ مشرقی علوم کے بھی جامع ہیں۔ آپ نے مولوی فاضل کا امتحان بھی "ڈبل فرسٹ" یعنی سرفہرست کامیابی حاصل کی تھی۔ آکسفورڈ میں ڈی، فل، اور بی، سی، ال، کے ساتھ ساتھ آپ نے بیرسٹری کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

ان خصوصیات کے حامل حیدرآباد میں تو خیر، شاید ہندوستان میں بھی بہت کم ہی نظر آئیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ حیدرآباد آپ کی شاندار کامیابیوں کا اعتراف، انہیں کے شایان شان کرے گا۔

گذشتہ رسالے میں مولوی کامل میر مظہر علی صاحب کے مضمون "قوم توارج" سے متعلق چند فروگذاشتیں رہ گئیں۔ مضمون کے آخر میں "ترجمہ از المقتطف" لکھا ہوا تھا، چونکہ پتھر پر لکھا گیا تھا، اس لئے طباعت میں اڑ گیا۔ کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں بھی رونما ہو گئیں۔ ہم مولوی صاحب سے عذر خواہ ہیں۔

جناب راز چاندپوری، جن کی نظمیں اکثر "مکتبہ" میں شایع ہوتی رہتی ہیں، اپنی قدیم اور جدید دونوں طرز کی نظموں کا مجموعہ "دنیاے راز" کے عنوان سے عنقریب شایع کر رہے ہیں۔ راز صاحب کو نظم میں ایک خاص ذوق ہے۔ شمالی ہند اور دکن کے اکثر رسالوں میں آپ کی نظمیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔

یہ مجموعہ ہماری ادبیات میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہوگا ۔

قرونِ وسطیٰ کی ایک تاریخی کتاب "بڈفرڈ بک آف اورس" کا نایاب مخطوطہ ابھی ابھی برٹش میوزیم میں داخل کیا گیا ہے ۔ لیکن قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کی قیمت سترہ ہزار پونڈ یعنے دو لاکھ روپیہ سے زیادہ دینی پڑی ۔ اسی رقم کی پابجائی کچھ تو عوام کے چندہ، کچھ نیشنل آرٹ کلکشن فنڈ کی امداد اور باقی میوزیم کی رقم سے کی گئی ۔ یہ ایک معمولی سی مثال ہے ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برٹش میوزیم کے سرمایہ کی کیا قدر و قیمت ہے ؟

ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کنچن جنگا پر چڑھ کر اُس کے رازوں کو فاش کرنے کے لئے، جو مہم چند جرمن محققین اور دیگر علماء نے ترتیب دی تھی، آخر کار ہار مان کر واپس ہوگئی ۔ اس میں دشواریوں کو بڑا دخل ہے ۔ بہرحال کچھ ہو اب ہمالیہ کے متعلق بہت سے نظریہ قایم ہونے لگے ہیں ۔ اسی مہم کے ایک فرد پروفیسر ڈی رن فرتھ نے کچھ روز پہلے بمبئی کے جرمن کلب میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمالیہ کی چوٹیاں ابھی ابھی سمندر کے عمق سے بلند ہوئی ہیں اور یہ بلندی روز افزوں ہے ۔ ممکن ہے کہ پروفیسر کا یہ خیال صحیح ہو کیونکہ جغرافیائی اور ارضیاتی انقلابات اس قدر تدریجاً رونما ہوتے ہیں کہ ان کا نظر آنا محال ہے ۔ چنانچہ موجودہ کوہ آتش فشاں "وسوبیس" کی آتش فشانی اور اطالیہ، ایران اور برما میں زلزلہ، ایسے واقعات ہیں، جن سے قدیم تاریخ ناواقف معلوم ہوتی ہے ۔ بعض لوگ ہندوستان کے متعلق یہ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم کے مقابلہ میں یہاں گرمی اب کم پڑتی ہے ۔ گذشتہ بیس سال کے اندر ہی اندر نمایاں فرق محسوس ہونے لگا ہے ۔ اگر یہ بھی درست ہے تو پھر ہندوستان آب و ہوا کے لحاظ سے بھی بود و باش کا بہترین ملک بنجائے گا ۔ لیکن ابھی یہ صرف نظر ہی نظریہ ہیں ۔

طرزی افشار

از
(جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب شاہین)

تمہید سرزمین ایران بھی عجب مردم خیز ہے۔ کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی زمانہ شاید ہی ایسا ہوگا جس میں اہل کمال کا قحط ہو ممکن ہے یہ دعویٰ صحیح ہو اور کسی زمانے میں ان میں کمی واقع ہوئی ہو اور کسی میں زیادتی۔ لیکن ان کا اوسط دیگر ممالک کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ ہی رہا۔ دنیا میں اس بات کا فخر (اگر ہم یہاں مبالغہ نہ کرتے ہوں) خطۂ ایران ہی کو حاصل ہے کہ جہاں اس نے بلند پایہ سنجیدہ سے سنجیدہ مذاق کے ادیب و شاعر پیدا کئے ہیں وہیں آتش زبان ظریف سے ظریف ادبا و شعرا دنیا کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دئے۔ اشتہا اصفہانی، سگ قزوینی، عبید زاکانی، عرب مشہدی، خضر سبزواری، عالی شیرازی، فتحی ہراتی، قلندر کاشی، کافر اصفہانی، مولانا ادیبا نوری مشہدی۔ . . . . . . وغیرہ کو لیجئے یہ افراد کچھ کم تفنن گو ظرافت نگار شاعر ہوئے ہیں جن کے انفاس شعریہ نے ظرافت و فکاہت کی فضائے بسیط کو جان نواز و روح پرور نغموں سے بھر دیا۔ طرزی افشار بھی انہیں تفنن گو شعرا میں سے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی کے تذکرہ نویسوں نے ان کی شرح حال سے اپنے تذکروں کو زینت نہیں دی۔ اور نہ ان کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ ہم اس کمی کو محسوس ہی کر رہے تھے۔ کہ مولانا عبدالباری آسی نے حال میں اردو و فارسی زبان کے ظریف شعرا کا ایک تذکرہ بنام "خندۂ گل" لکھکر اردو ادبی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ کیا چنانچہ وہ طرزی افشار کے کلام کے متعلق مختصر مگر جامع الفاظ میں اظہار رائے فرماتے ہیں:-

"طرزی۔ ان کی ظریفانہ شاعری کا بہترین جوہر لطافت و ظرافت یہ ہے کہ انہوں نے

دعوی کیا تھا کہ زبان فارسی بھی اس قابل ہے کہ عربی زبان کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے اسمار کو بھی مصادر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے مختلف صیغوں کا اشتقاق بوجہ احسن ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کی بنا پر انہوں نے اپنی زبان اور شاعری کو اس خیال اور صنف پر مبنی کر دیا تھا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کمالات اور خیالات ارباب ادب کے نزدیک ظرافت بن گئے۔ اور ان کی شاعری سے ظریف شاعروں میں ایک فرد کا اضافہ ہوگیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ طرزی ایک خوش طبع ظریف المزاج، بذلہ سنج شاعر تھے۔ رندان بادہ نوش اور سرمستان امارد پرست کیلئے شعر کہتے تھے۔ اور اسی مذاق کے لوگ اس کو گلی گلی اور کوچے کوچے گاتے پھرتے تھے" (صفحہ ۲۰۵)

ذیل کا مقالہ آقا میرزا محمد تمدن کے کاوش قلم کا نتیجہ ہے جو مجلہ "ایران شہر" شمارہ (۱۲)، سال سیم" بابتہ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ میرزا تمدن کی تحقیق اس وجہ سے قابل اعتماد ہے کہ وہ ایران کے قصبۂ ارومی کے (جو جھیل ارومیہ کے قریب واقع اور اسی نام سے موسوم بھی ہے) رہنے والے ہیں۔ چونکہ طرزی افشار کے حالات زندگی اور ان کے نمونۂ کلام سے اردو خواں اصحاب بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لئے براہ راست فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

(ابوالمحاسن متین)

طرزی افشار دسویں صدی ہجری کے آخری زمانہ کے شعرا میں بڑا ہی آتش زبان و فصیح اللسان ادیب گزرا ہے۔ یہ بلیغ البیان شاعر شاہ عباس صفوی کا معاصر و ہمعہد اور اس کے دربار سلطنت میں رتبہ عالی رکھتا تھا۔

وہ افشار کے جلیل القدر قبیلہ سے تھا۔ اس کا تولد ارومی کے ایک قریہ میں ہوا۔ اس کا نام طرزی تھا۔ ارومی کے شعر پرور ماحول میں جو اس ..... نواح کے مخصوص فطری ودائع میں سے ہے شعور پیدا کیا اور ننانوے ادب بھی وہیں کے ادبا کے آگے طے کئے بعد ازاں

مسافرت اصفہان میں ایک عرصہ تک وہیں پر اقامت اختیار کی۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اتبک اس کی شرح حال اور تاریخ حیات کے خصوص میں کوئی اہم چیز کتب تذکرہ وغیرہ میں نظر سے نہیں گزری البتہ "مجمع الفصحا" میں طرزی افشار کے نام کے نیچے اس عبارت پر قناعت کی گئی ہے :"وہ ایک ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج، روشن فکر اور عہد صفویہ کے شعرا میں سے گزرا ہے، اس نے طرز سخن گوئی میں عجیب اختراع کی ہر اور یہ طرز ادا بھی اسی کا شیوۂ خاص رہا ہے۔ پھر چند اشعار اس کے کلام سے نقل کئے گئے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

مبادا کہ از ما ملولیدہ باشی   حدیث حسوداں قبولیدہ باشی
چو درس محبت نخواندی چہ سودار   فروعیدہ باشی اصولیدہ باشی
بروطرزیا، زلف خوباں بہ چنگ   زمانے بیفتد کہ پولیدہ باشی

اُس کا دیوان فی الوقت موجود ہے۔ اور مثل شعرا کے تمام دواوین کے اس کی غزلیں حرف الف سے شروع ہو کر حرف یا ر میں تمام ہوتی ہیں۔ اس کے دیوان کے آخر میں چند رباعیاں اور بحر طویل میں مذاقیہ اشعار ہیں۔ اس کی غزلوں سے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں بعض حالات، شاہ عباس صفوی کے دربار میں رسائی اور دربار سلطنت میں رتبہ عالی کا حاصل کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی پہلے پہل تحصیل علوم کے ارادے سے اصفہان کی مسافرت اور اس کے تمام سفروں کا حال پورے طور پر اس کے اشعار سے ملتا ہے۔

اُس کا ایک جلد گرانقدر اور مکمل دیوان راقم الحروف کے پاس موجود تھا جو رمضان ۱۳۳۵ھ ہجری میں شہر ارومی کے بازاروں کو روسی عساکر کے آگ لگا دینے کے باعث بہت سی قیمتی کتابوں کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس وقت اس کے دیوان کا ایک نسخہ راقم کے پاس موجود مگر ناقص ہے، لیکن چونکہ اس کے دو تین کامل نسخے خود ارومی میں موجود ہیں۔ لہذا میں ان کے حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں و یسے تو طرزی کی بعض غزلیں اور متفرق اشعار جو پریشان اوراق میں اور بعض مختلف اشخاص کی زبان

پر ہیں۔ جمع کرکے اس کی تکمیل میں مصروف ہوں۔

طرزی کی مختصر شرح حالات اور تاریخ حیات اس کے بعض اشعار کے ساتھ تاریخ افشا اور بعض اردومی سے متعلق مختلف تاریخوں میں مندرج و مذکور ہیں، لیکن یہ تاحال طبع نہیں ہوئے ہیں۔ اوران کے دو تین مخطوطے بعض قدیم الخاندان اشخاص کے پاس موجود ہیں جنہیں میں فراہم کرنے کی کوشش میں ہوں اور کوشش جاری رکھوں گا۔ اس کے حالات زندگی اس کے بعض اشعار اور غزلیں، جنہیں اس کے دیوان سے اقتباس کیا گیا ہے، ذیل میں بغرض ملاحظہ درج ہیں۔

سیاحت عراق عجم کے بعد اس نے اپنی اصفہان کی مسافرت کے خصوص میں کہا ہے:

از بلدۂ قزوین بصفاہاں سفریدم — بیخرجی و بے اسب خراماں سفریدم

یاراں سفر بدیذ بہ جمعیت و من ہم — یک قافلہ با جان پریشاں سفریدم

دارم طمعے آں کہ بہیچم نہ فروشند — ہر چند کہ چون زیرہ بکرماں سفریدم

اس کو اصفہان میں عرصہ دراز تک سکونت پذیر ہوکر تحصیل علوم میں مشغول رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بحر طویل میں جس کو ذیل میں درج کیا جائے گا۔ اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جبکہ ابتدا میں اس نے شہرت نہیں حاصل کی تھی اور نہ بلند رتبہ کو پہنچا تھا جیسا کہ وہ خود اپنی ایک غزل کے ضمن میں کہتا ہے:

ال عجب وریا دماغیدند — من فقیریدم و حقیریدم

ہرگز از کس نہ خواستم چیزی — گر قلیلیدم ار کثیریدم

پشت بر منصب جہانیدم — نے امیریدم نے وزیریدم

ہمہ از پیش شاہ میرشدند — من ہم از پیش خویش میریدم

یار رانیست قید من طرزی — او حریریدہ من حصیریدم

اس کے بعد اس نے دربار سلطنت میں رسوخ حاصل کیا اور اس طرح سے اپنے فضل و کمال کے سایہ میں مقام بلند کا مالک ہوگیا جیسا کہ وہ خود اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے:

اسی دیوان میں ایک غیر منقوط بند ملتا ہے۔

کرم الٰہ کا حائل ہوا ہمارا واہ   کرو کلام کہ وہ دل ہوا ہمارا واہ
دل اس امام کا عامل ہوا ہمارا واہ   صلہ ملا کہ وہ کامل ہوا ہمارا واہ

لکھا ہمارا الم اور حال کا کل کا
وہ رو و لکھا کہ ہوا دھوکہ ہم کو اک گل کا

رقص

(جناب محمد عبد الرحمن چغتائی صاحب)

رقاصہ نے حنا لگا رکھی تھی۔ بادشاہ نے رقص کے لئے حکم دے رکھا تھا۔
بادشاہ رقاصہ کے انتظار میں اس قالین پر جہاں رقاصہ کے پاؤں جگنو کی طرح اٹھتے بیٹھتے دکھائی دیگے کسی بڑے دیوتا کے بت کی طرح۔ . . . .

. . . . . . تمثیل حیرت بنا تک رہا تھا۔

قالین یہ وہی جگہ ہے جہاں بادشاہ کا دل رقاصہ کے قدموں کے ساتھ ساتھ رقص کریگا . . . .

. . . . بادشاہ محو تماشہ ہے۔

رقاصہ کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹ پازیبوں کی جھنکار ابھی تک سنائی دے رہی ہے

. . . . . لیکن قالین پر اس کے قدموں کا کوئی نشان نہیں۔

غزل

(نواب شاہ یار جنگ بہادر قرآن (؟) تعلقدار ضلع رگھو)

دل اس بت پرفن سے پھر وصل کا سائل ہے
دیوانہ ہی دیوانہ انجام سے غافل ہے

یاں منتظر جلوہ اک عاشق بیدل ہے
واں محو خود آرائی وہ حور شمائل ہے

دیباچۂ الفت ہے محرومی و ناکامی
واماندگی منزل قطع رہ منزل ہے

آوارۂ غربت کو حاجت نہیں رہبر کی
خار رہ منزل ہی خضر رہ منزل ہے

موجوں کے تلاطم کا کیا خوف شناور کو
ہاں ہمت مردانہ دو ہاتھ میں ساحل ہے

منت کش عزلت ہے میری شب تنہائی
یا ایک میرا نالہ فریادرس دل ہے

یہ کوچہ جاناں ہے اور یہ در جانانہ
اک صید گہ جاں ہے اک سجدہ گہ دل ہے

تم دل کی حقیقت سے آگاہ نہیں شاید
ہر قطرۂ خون میرا لخت جگر دل ہے

سارے یہ کرشمے ہیں اک چشم فسوں گر کے
ناقہ ہے نہ مجنوں ہے لیلیٰ ہے نہ محمل ہے

مانا کہ مزاج اس نے وعدہ تو کیا لیکن
وعدہ کا وفا ہونا مشکل سی یہ مشکل ہے

شکسپیر کا ایک شاہکار ڈراما

(انٹینی اور کلیوپٹرا کا ایک سین)

مُترجمہ

(جناب سید صغیر حسین صاحب میرٹھی)

شکسپیر کے مشہور ڈراما انٹینی اور کلیوپٹرا اور اس کے حسن و عشق کے معرکتہ الآرا پلاٹ سے اردو دنیا متعدد اصحاب کی کوششوں سے واقف ہو چکی ہے صغیر صاحب نے پورے ڈرامے کو بڑی صفائی اور خوبی سے اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس اشاعت میں اس کا ایک سین پیش کیا جا رہا ہے آئندہ اس کے چند اور مزید سین شائع کئے جائینگے قریب ہے شکسپیر کا یہ شاہکار بھی اردو جامے میں زیور طباعت سے آراستہ ہو جائیگا۔

(مجلہ مکتبہ)

دوسرا سین

روم۔ لیپی ڈس کے محل کا ایک کمرہ

اینوباربس اور لیپی ڈس کا آنا

لیپی ڈس۔ اچھے اینوباربس یہ ایک شریفانہ کام ہے۔ اور تم اس کو بڑی خوبی سے انجام دو گے کہ اپنے سردار کو خوشامد کرکے ملائم اور نرم گفتگو پر آمادہ کرو۔

اینوباربس۔ میں ان سے التجا کروں گا کہ وہ اپنے شایانِ شان گفتگو کریں اور خود سیزر نے ان کو برانگیختہ کیا مجھکو یقین ہے کہ انٹنی سیزر سے متنفرانہ برتاؤ کرینگے مشتری کی قسم اگر انٹنی کی ڈاڑھی میری منہ پر ہوتی تو آج میں سیزر کی ملاقات کے

لئے حجامت تک نہ ہوتا۔

لیپی ڈس۔ یہ وقت ذاتی مخاصمت کے اظہار کا نہیں ہے۔

اینوبارس۔ کسی معاملہ کے لئے ہر وہ وقت موزوں ہو سکتا ہے جس میں کہ اس معاملہ کا وقوع ہوا ہو۔

لیپی ڈس۔ لیکن اہم معاملات کی موجودگی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دخل ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

اینوبارس۔ نہ اسوقت جبکہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا وقوع اول ہو۔

لیپی ڈس۔ تمہاری گفتگو غصہ سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن خدا کیلئے بجھتی ہوئی چنگاریوں کو پھر مشتعل نہ کرو۔ معزز اینٹنی بھی ادھر آرہے ہیں۔ (اینٹنی اور وینٹی ڈیس کا آنا)

اینوبارس۔ اور وہ سامنے سے سیزر بھی۔

اینٹنی۔ اگر یہاں کوئی قابلِ اطمینان تصفیہ ہوجائے تو ہمکو فوراً پارتھیا روانہ ہوجانا چاہیئے۔

ونٹی ڈیس۔ تم نے سنا۔

سیزر۔ میکے ناس میں کچھ نہیں جانتا اگر پا سے دریافت کرو۔

لیپی ڈس۔ معزز دوستو! یہ وہ مقصد جس کے لئے ہم یہاں پر یکجا ہوئے ہیں نہایت اہم ہے۔ پس کسی ایک حقیر امر کی وجہ سے ہم میں تفرقہ نہ پڑنا چاہیئے۔ باہمی رنجشوں کو آہستگی سننا چاہیئے۔ جب ہم اپنے معمولی اختلافات کا تذکرہ بحالت غیظ و غضب کرتے ہیں تو گویا اپنے روبہ اندمال زخموں کو اور الٹا مہلک بنا دیتے ہیں۔ میرا سے معزز شرکا یہی وجہ ہے کہ میں نہایت سرگرمی سے ملتجی ہونگا اپنے انتہائی تلخ وجوہات مخاصمت پر نہایت شیریں الفاظ میں گفتگو کرو نہ اس طرح کہ موجودہ حالت میں مزید رنجش کا اضافہ ہو جائے۔

انٹنی۔ یہ ایک عمدہ تقریر ہے۔ اگر ہم اپنی اپنی فوجوں کے روبرو ایک دوسرے سے آمادہ مجادل ہوتے تو میں یہ کرتا (مصافحہ کرتا ہے)

سیزر۔ روم میں آپ کا آنا مبارک ہو۔

انٹنی۔ شکریہ!

سیزر۔ تشریف رکھیئے۔

انٹنی۔ آپ تشریف رکھیئے۔

سیزر۔ بہتر ہے جیسی آپ کی مرضی۔
انیٹنی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بہت سی باتوں کا برا مان جاتے ہیں۔ جو ایسی نہیں ہوتیں کہ ان کا برا مانا جائے یا اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔
سیزر۔ میں مستحق تضحیک ہونگا اگر بلا سبب یا کسی معمولی وجہ کی بنا پر یہ کہوں کہ میں ناراض ہوا۔ وہ بھی آپ سے اور بھی زیادہ قابل مضحکہ ہوں گا اگر میں نے کبھی برائی کے ساتھ آپ کا نام لیا ہو جبکہ آپ کا تذکرہ مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا تھا۔
انیٹنی۔ میرے مصر کے قیام سے آپ کو کیا واسطہ تھا؟
سیزر۔ اس سے زیادہ نہیں جتنا میرا یہاں روم کا قیام آپ کیلئے مصر میں واسطہ رکھتا تھا۔ لیکن اگر آپ میرے خلاف وہاں کوئی سازش کرتے۔ البتہ آپ کا قیام مصر قابل حرف گیری تھا۔
انیٹنی۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ سازش کرنا؟
سیزر۔ آپ خود میرے مطلب کا اندازہ ان واقعات سے کرسکتے ہیں جو مجھے یہاں پیش آئے۔ آپ کی بیوی اور بھائی نے میرے خلاف فوج کشی کی جس کا بیّن مقصد آپ کی طرف داری تھا۔ جنگ میں آپ ہی کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔
انیٹنی۔ اس معاملہ میں آپ کو غلط فہمی ہوئی میرے بھائی نے اپنی اس حرکت میں مجھ کو بنا رجنگ کبھی قرار نہیں دیا تھا میں نے اس کی تحقیق کرلی ہے۔ مجھے اس کا علم ان راستباز لوگوں کے بیانات سے ہوا ہے جنہوں نے آپ کی طرف داری میں تلواریں کھینچی تھیں کیا اس نے آپ کے اقتدار کی تحقیق کرنے میں میرے اقتدار کی تحقیر نہیں کی اور کیا ان کا آپ کے خلاف معرکہ کرنا میری مرضی کے خلاف نہیں ہوا۔ جبکہ ہم دونوں کے اغراض واحد ہیں۔ اس کے متعلق میری گذشتہ تحریرات نے آپ کا کافی اطمینان کردیا تھا اگر آپ مجھ سے لڑنا ہی چاہتے ہیں تو چونکہ آغاز جنگ کے لئے آپ کے پاس کافی مواد موجود نہیں ہے اس لئے میرے بھائی کے طرز عمل کو اس کا سبب نہ قرار دیجئے۔
سیزر۔ مجھ پر نقائص رائے کے عائد کرنے میں آپ خود ستائی کر رہے ہیں لیکن آپ نے اپنے عذرات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔
انیٹنی۔ نہیں نہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں اور مجھکو اس بات کا یقین ہے کہ آپ اس خیال کی

احتیاج کاملہ کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ میرے اور آپ کے اغراض واحد ہوتے ہوئے ہیں ان ڈائیوں کو بہ نظر پسندیدگی نہیں دیکھ سکتا تھا جو میرے اطمینان قلب اور صلح پسند طبیعت کے بالکل خلاف تھیں۔ اور میری بیوی کے متعلق جو آپ نے فرمایا میری تمنا ہے کہ کاش اس کا جیسا جوش کسی دوسری عورت میں پایا جاتا۔ آپ ایک ثلث دنیا کے مالک ہیں اور عنانِ حکومت کی تھوڑی سخت گیری سے اس کو اطمینان کے ساتھ قدم قدم چلا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی زوجہ پر قابو حاصل کرنا محال ہے۔

اینوبارس۔ کاش ہم سب کی بیویاں ایسی ہی ہوتیں تا مرد عورتوں سے دست و گریبان رہتے!

اینٹنی۔ وہ اسقدر ضدی اور خود رائے تھی کہ اس کے برپا کئے ہوئے فسادات جو خود سری کا نتیجہ تھے لیکن جن میں انتظامی دوراندیشی اور زود فہمی کی کمی نہ تھی آپ کے حق میں باعثِ تکلیف ثابت ہوئی جس کا میں نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں اس بارے میں آپ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ میں مجبور تھا۔

سیزر۔ ان سب باتوں کے متعلق میں نے آپ کو لکھا تھا جب آپ اسکندریہ میں مصروف عیش و عشرت تھے لیکن ان تمام خطوط کو بیکار سمجھ کر آپ نے جیب میں رکھ لیا اور میرے قاصد کو طعن و تشنیع کے ساتھ اپنے سامنے سے دور کردیا۔

اینٹنی۔ جناب قبل اسکے کہ اسکو باریابی کی اجازت دیجاتی وہ یکدم اندر گھس آیا۔ اس وقت میں نے پہلے پہل تین بادشاہوں کی دعوت کی تھی اور اس وجہ سے شب کو میری وہ حالت نہ تھی جو صبح میں تھی لیکن دوسرے روز میں نے اس سے اپنی شب کی حالت کا تذکرہ کیا جو گویا اس سے معافی مانگنے کے برابر تھا ہمارے جھگڑے سے اس شخص کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے اگر ہمکو لڑنا ہی ہے تو موجودہ بحث میں سے اس کا تذکرہ قطعی خارج کردینا چاہیئے۔

سیزر۔ آپ نے اس عہد و پیمان کی پابندی نہیں کی جس کے لئے قسم کھائی تھی۔ اسی قسم کا الزام مجھ پر عائد کرنے کے لئے کبھی تمہاری زبان نہیں کھل سکتی۔

لیپی ڈس۔ سیزر تحمل سے کام لو۔

اینٹنی۔ نہیں لیپی ڈس ان کو کہنے دو ان کا یہ گمان کہ مجھ میں اس اقتدار کی کمی ہے جس کا انہوں نے ابھی تذکرہ کیا ایک نہایت قابل احترام معاملہ ہے سیزر! اور فرمائیے میں بھی تو سنوں کہ وہ شرائط کیا تھے جن کے

متعلق میں نے قسم کھائی تھی؟

سیزر۔ یہی کہ بوقت ضرورت فوج اور روپیہ سے تم میری اعانت کرو گے لیکن ان دونوں سے تم نے انکار کیا۔

انیٹنی۔ یوں کہئے کہ غفلت کی وہ بھی ایسے وقت میں ہوئی جب کہ نشہ مرے نے مجھکو خود اپنی عالی منشی سے بے خبر کر دیا تھا۔ جہانتک جلد ممکن ہوگا میں اس کی تلافی کروں گا لیکن اپنے نقائص کے اعتراف سے میری عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور میرا اقتدار بغیر اس عظمت کے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ مجھے مصر سے نکالنے کیلئے منویا نے یہاں فسادات شروع کئے جس کے لئے میں ایک لاعلم اور بے خبر بانی کی حیثیت سے اس حد تک معافی کا خواستگار ہوں جہاں تک کہ میری عزت اور خودداری اس معاملہ میں مجھ کو سرنگوں ہونے کی اجازت دیتی ہے۔

لیپی ڈس۔ یہ نہایت شریفانہ گفتگو ہے۔

میسینے ناس۔ مہربانی فرما کر آپ اپنی باہمی رنجشوں کو زیادہ طول نہ دیجئے۔ ان کو قطعی دل سے نکال ڈالنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ ضرورتیں آپ سے باہمی مصلحت کے لئے التجا کر رہی ہیں۔

لیپی ڈس۔ میسینے ناس تم نے قابل تعریف بات کہی۔

اینوباربس۔ یا اگر آپ دونوں فی الوقت ایک دوسرے سے محبت قرض لے لیں پاپی کا تذکرہ قطعی مفقود ہو جانے کے بعد پھر واپس کر سکتے ہیں۔ جب آپ کو کوئی اور کام نہ رہے گا تو لڑنے جھگڑنے کے لئے کافی موقع ملے گا۔

انیٹنی۔ تم محض ایک سپاہی ہو اس لئے سیاسی معاملات کے سمجھنے سے قاصر ہو خاموش رہو۔

اینوباربس۔ آہا میں بالکل بھول گیا تھا۔ کہ راست گفتار شخص کے لئے خاموشی ہی مناسب ہے۔

انیٹنی۔ تمہاری موجودگی اس مجمع کے لئے باعث تذلیل ہے لہذا زیادہ گفتگو نہ کرو۔

اینوباربس۔ تو جاؤ جہنم میں میں بھی بت بنا جاتا ہوں۔

سیزر۔ میں مقصد تقریر کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا البتہ طرز گفتگو کو ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہم میں دوستی قائم رہے جبکہ ہمارے طبائع اپنے طرز عمل میں اس قدر مختلف ہیں تاہم اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ کونسا حلقہ دوستی ہمکو مضبوطی کے ساتھ اپنے حصار میں لے سکتا ہے تو میں دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک

اسکی تلاش کرنیکے لئے آمادہ ہوں۔

اگرپا - سیزر! مجھکو بھی اجازت دیجئے۔

سیزر - ہاں ہاں اگرپا کہو۔

اگرپا - پیاری آکٹیویا آپ کی سوتیلی بہن ہیں اور عالی مرتبت مارک انٹنی کی زوجہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

سیزر - اگرپا ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ اگر کلیوپٹرا نے سن لیا تو تمہاری سخت کلامی ان کیجانب سے مستوجب سزا ہوگی۔

انٹنی - سیزر! میری اس سے کوئی شادی تو ہوئی نہیں مجھے سننے دیجئے کہ اگرپا اور آگے کیا کہتے ہیں۔

اگرپا - آپ دونوں میں رشتۂ محبت اور تعلقات برادرانہ قائم کرتے اور آپ کے دلوں میں اخوت باہمی کی نہایت مضبوط گرہ ڈالنے کے لئے مناسب ہے۔ کہ انٹنی اکٹیویا کو اپنی زوجیت میں لے آئیں جن کے حسن کا تقاضہ یہ ہے کہ بہترین انسان انکا شوہر ہے جنکی نیکی اور ظاہری شان و شوکت سے وہ بات ظاہر ہے جس کا فخر کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اس شادی سے تمام حقیقی رنجشیں جو اسوقت نہایت ہی اہم معلوم ہو رہی ہیں اور تمام اہم اندیشے جو اسوقت مختلف خطرات کا پیش خیمہ ہیں بالکل بے حقیقت ہوجائینگے بحالت موجودہ محض افواہیں اصلیت کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ مگر اسوقت واقعات بھی افواہوں کی صورت اختیار کرلیں گے انکو جو محبت آپ دونوں سے ہوگی وہ آپ کو باہم دگر اور عوام الناس کو آپ دونوں سے محبت کرنے پر مجبور کریگی جو کچھ میں نے عرض کیا اُسے معاف فرمائیے۔ میرا یہ خیال وحشی نہیں ہے بلکہ خوب غور شدہ ہے جس کو بطور فرائض میں بارہا سوچ چکا ہوں۔

انٹنی - کیا اسیزر! آپ کچھ فرمائینگے؟

سیزر - اس وقت تک نہیں جب تک کہ یہ نہ معلوم ہوجائے کہ موجودہ گفتگو سے انٹنی نے کیا اثر لیا۔

انٹنی - اگر بالفرض میں کہوں کہ "اچھا اگرپا ایسا ہونے دو" تو اگرپا میں اسکی تکمیل کی کیا قدرت ہے۔

سیزر - سیزر کا اقتدار اور اکٹیویا پر اس کا قابو ایسا کرسکتا ہے۔

انٹنی - کاش میں ایسے اعلیٰ مقصد میں جو اس قدر بہتر معلوم ہوتا ہے رکاوٹ پیدا ہونے کا خواب بھی نہ دیکھوں ہاتھ ملائیے۔ اس عالیشان اور مبارک کام میں امداد فرمائیے خدا کرے اس وقت سے برادرانہ محبت ہمارے دلوں میں جوش زن رہے اور ہمارے اہم منصوبوں کے تکملہ میں ہماری

مدد کرے۔

سیزر۔ مصافحہ کیلئے میرا ہاتھ ہے میں ایک ایسی بہن آپکے حوالہ کرتا ہوں جس سے کبھی کسی بھائی نے محبت نہ کی ہوگی۔ ہماری سلطنتوں اور دلوں کو متفق کرنے کے لئے خدا اس کو زندہ رکھے اور پھر کبھی ہماری باہمی محبت دور نہو۔

لیپی ڈس۔ آمین۔ یہ نتیجہ نہایت مسرت انگیز ہے۔

اینٹنی۔ میرا خیال پامپی کے خلاف جنگ کرنے کا نہ تھا۔ کیونکہ کچھ عرصے سے وہ میرے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آرہا تھا۔ میں اب صرف آپ کا شکریہ ادا کرسکتا ہوں مبادا مجھ پر احسان فراموشی کا الزام عائد ہو اور اس کے بعد میں ابھی اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔

لیپی ڈس۔ وقت آن پہونچا ہمکو پامپی پر فوراً حملہ آور ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ ہم پر دھاوا کردے گا۔

اینٹنی۔ اس کا پڑاؤ اس وقت کہاں ہے؟

سیزر۔ کوہ سی نم کے قریب۔

اینٹنی۔ اس کی بڑی قوت کسقدر ہے۔

سیزر۔ زبردست اور روزافزوں۔ لیکن سمندر پر تو اس کا کامل تسلط ہے۔

اینٹنی۔ مشہور بھی یہی ہے کاش اب تک میں اس سے مبارزطلبی کرچکا ہوتا ہمکو اس کے لئے جلد تیاری کرنی چاہیئے لیکن قبل اس کے ہم مسلح ہوں طے شدہ معاملے کی تکمیل کرلینی چاہیئے۔

سیزر۔ بڑی خوشی کیساتھ میں اپنی بہن سے ملاقات کے لئے آپ کو مدعو کرتا ہوں اور راست وہیں لے چلتا ہوں۔

اینٹنی۔ لیپی ڈس آپ بھی اپنی شرکت سے ہم کو محروم نہ رکھیں گے۔

لیپی ڈس۔ معزز اینٹنی۔ علالت بھی مجھکو شرکت سے نہیں روک سکتی۔

(بینڈ کا بجنا۔ سیزر اینٹنی اور لیپی کا جانا)

میکے ناس (اینو باربس سے) جناب بمصر سے سلامتی سے واپسی آپ کو مبارک ہو۔

اینو باربس۔ (اگریپا اور میکے ناس کا تعارف کراتا ہے۔) (اگریپا کو) یہ سیزر کے نہایت چاہتے لائق میکے ناس ہیں۔ (میکے ناس سے) اور یہ میرے محترم دوست اگریپا ہیں۔

اگریپا۔ اچھے اینو باربس۔

میکناس ہم کو خوش ہونے کا بہت اچھا موقع ملا۔ کیونکہ معاملات نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا گئے۔ آپ کا قیام مصر میں پُر لطف رہا ہوگا۔

اینوبارس جی ہاں جناب۔ ہم اسقدر سوئے کہ دن کی صورت بھی نہ دیکھی اور شغل شراب سے رات کی تذلیل کی۔

میکناس کیا یہ سچ ہے کہ آٹھ سالم بریاں جنگلی سور دسترخوان پر موجود تھے۔ اور کھانے والے صرف بارہ۔

اینوبارس جو کچھ آپ نے کہا یہ اصلیت کے مقابلہ میں بالکل ایسا ہے جیسا کہ عقاب کے سامنے مکھی اس سے بھی کہیں زیادہ سامان دعوت مہیا تھا جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

میکینس اگر اس کے متعلق خبریں سچ ہیں تو وہ ایک نہایت ہی حسینہ وجمیلہ اور عالیشان خاتون ہے۔

اینوبارس جبکہ دریائے سڈنس پر اول اول دونو دوچار ہوئے تو کلیوپٹرا نے اینٹنی کے دل پر کامل تسلط کر لیا۔

اگریپا ۔یا تو کلیوپٹرا اس موقع پر اپنے پورے جاہ وحشم کیساتھ موجود ہوگی۔ یا مخبر نے مجھکو نہایت خوبی کے ساتھ قصہ تصنیف کرکے سنایا۔

اینوبارس میں عرض کرتا ہوں سنیئے وہ کشتی جس پر کلیوپٹرا سوار تھی ایک چمکدار تخت شاہی کے مانند تھی اور اس کا عکس سطح آب پر شعلہ افگن تھا۔ کشتی کا پچھلا حصہ خالص طلائی تھا۔ بادبان ارغوانی تھے اور ایسے معطر کے ہوائیں بھی ان کے عشق کی مریض تھیں۔ پتوار نقروی تھے جن کی متواتر ضرب سے سریلا اور خوش گوار نغمہ پیدا ہوتا تھا اور وہ پانی جس پر ان کی ضرب پڑتی تھی نہایت تیزی کے ساتھ ان کے پیچھے رواں ہوتا تھا گویا کہ وہ انکی ضربوں کا عاشق ہے خود کلیوپٹرا کے متعلق جس قدر بھی بیان کیا جائے ناکافی ہے۔ وہ اپنے زربفتی شامیانے کے نیچے لیٹی ہوئی تھی، اور اس کے سراپا کے سامنے زہرہ کی وہ تصویر ماند تھی جس کے کھینچنے میں مصور کے خیال نے دست قدرت کو مات کر دیا تھا۔ اس کے اطراف حسین اور نوخیز لڑکے متبسم کیوپڈ (عشق کا دیوتا) کی طرح استادہ تھے، ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگ کے پنکھے تھے جن کی ہوا بجائے ٹھنڈک پہونچانے کے اس کے نرم ونازک رخساروں کی تمتماہٹ کو اور زیادہ تیز کر رہی تھی۔ اور ان سے وہ اثر پیدا ہو رہا تھا جو ظاہر نہ ہونا چاہیئے تھا۔

اگریپا ۔اینٹنی کیلئے کیسا نایاب نظارہ رہا ہوگا۔

اینوبارنس ۔کلیوپٹرا کی خواصیں دریائی پرندوں کے مانند تھیں اور ہر ایک حسن وخوبی میں بنت البحر کو بھی شرمندہ کرتی تھی اس کی آنکھوں کی طرف نگراں تھیں گویا کہ اشاروں پر حکم بجا لانیکی منتظر ہیں اور جس ادا کے ساتھ وہ اس کے

سامنے تعظیماً خم ہوتی تھیں۔ اس سے اس نظارے کی خوبی میں اور چار چاند لگ گئے تھے۔ کشتی کے پچھلے حصہ پر ایک حسین بنت البحر پتوار لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلانے میں مصروف تھی۔ ریشمی ڈوریاں ان پھولوں کے مانند نرم و نازک ہاتھوں سے مس ہونیکی مسرت میں پھولی نہیں سماتی تھیں جو اس فرض کو نہایت ہوشیاری سے انجام دینے کیلئے مقرر کئے گئے تھے۔ کشتی سے ایک نرالی اور عنبر فشاں خوشبو آرہی تھی۔ جس سے قرب و جوار کے گھاٹ معطر تھے۔ تمام باشندے جوق جوق کلیوپیٹرا کو دیکھنے کیلئے شہر سے باہر نکل پڑے تھے حتی کہ اینٹنی چوک کے منظر عام چبوترے پر تخت نشین ہوا سے باتیں کرتا ہوا تنہا بیٹھا رہ گیا۔ اور اگر فضا میں خلا واقع ہوجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہوا بھی کلیوپیٹرا کے نظارے کیلئے چلی گئی ہوتی۔ اور دنیا قطعی اس سے خالی ہوجاتی۔

اگریپا۔ لاثانی ملکہ مصر!

اینوبارلس۔ جس وقت وہ کشتی سے اتری اینٹنی کے قاصد وہاں پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر مدعو کیا جس کے جواب میں اس نے نہایت ادب سے کہلا بھیجا کہ اگر آپ خود ہمارے مہمان ہوں تو بہتر ہے۔ ہمارے خوش اخلاق اینٹنی جنکو کبھی صنف نازک نے لفظ "نہیں" کہتے نہیں سنا۔ دس مرتبہ خط بنوا کر دعوت میں گئے اور اپنا دل اس کھانے کی قیمت میں دیدیا جس کو صرف نگاہوں سے کھانے پر اکتفا کی۔

اگریپا ایسی شاہزادی!

اینوبارلس۔ میں نے ایک بار اس کو شاہراہ عام پر ایک ٹانگ سے چالیس قدم تک دوڑتے ہوئے دیکھا اور بیدم ہوکر بولتی اور ہانپتی جاتی تھی تاکہ اس کا عیب کمال سے بدل جائے اور ہانپتے وقت اسکے الفاظ جادو کا اثر رکھتے تھے

میکےناس اب تو اینٹنی کو چاہیئے کہ اُسے قطعی چھوڑدیں۔

اینوبارلس۔ نہیں، وہ کبھی ایسا نہیں کرینگے۔ عمر کلیوپیٹرا کو پژمردہ نہیں کرسکتی۔ اور نہ رسم و رواج کی پابندی اس کے لاتعداد مختلف آدمیوں کے ساتھ لطف و محبت کے ذائقہ کو بدمزہ کرسکتی ہے۔ دوسری عورتیں لوگوں کی خواہشات کو آسودہ کردیتی ہیں مگر کلوپیٹرا جس شخص کو بے انتہا سیر کرتی ہے اسکی خواہشات کو اور زیادہ مشتعل کردیتی ہے کیونکہ نہایت فحش حرکات اس کے اندر دلفریب معلوم ہونے لگتے ہیں حتی کہ اس کو فاحشہ دیکھکر مقدس پادری بھی اس کی اصلاح کیلئے دعا خیر کرتے ہیں۔

میکے ناس ۔ اگر حسن فہم اور عصمت اینٹنی کے دل کو مشتعل بنا سکتے ہیں تو اکٹیویا ان کے حصہ میں آ جانا ایک مبارک قرعہ ہے۔

اگر پا ۔ اچھے دینو باربس آؤ چلیں اور جب تک آپ یہاں مقیم ہیں میرے مہمان رہیں۔

دینو باربس جناب نہایت خوشی سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(سب کا جانا)



انساں ہونا

(از مولانا عبد القدیر حسرت صدر شعبۂ دینیات)
(جامعۂ عثمانیہ)

غایت معرفت و علم ہے ناداں ہونا — سرمۂ دیدۂ تحقیق ہے حیراں ہونا
بوالہوس تیغ محبت سے ہو کس طرح شہید — کار ہر سنگ نہیں لعل بدخشاں ہونا
خود نہاں اور عیاں اس سے نہاں ہائے جہاں — حیرت انگیز ہے پیدائی کا پنہاں ہونا
ایک ہاں یا ور ہر گونہ بلا ہائے جہاں — کیا قیامت ہے یہ پابستۂ پیماں ہونا
چشم تحقیق میں ہیں شادی و ماتم توام — لطمۂ باد خزاں گل کا ہے خنداں ہونا
داور حشر میری جان ہے بحل قاتل کو — اور منظور نہیں اس کا پریشاں ہونا
انس انسان میں ہے اصل سمجھ لے حسرت — انس جب تک نہ ہو ممکن نہیں انساں ہونا

اتحادِ یورپ

(۱)

ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ڈی ایس سی (پیرس)، ڈی۔ ایف۔ ایم آنرز (لندن)

ڈاکٹر صاحب کا نام اردو صحافت میں بالکل نیا نہیں۔ اس سے قبل آپ کئی اردو رسالوں میں دلچسپ مضمون لکھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور کے "نیرنگ خیال" میں آپ کا ایک مضمون "اتحادِ ایشیا" شائع ہوا تھا۔ آپ نے یہ دلچسپ مضمون ہمارے محبِ صادق ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری کی تحریک پر خاص مجلۂ مکتبہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ آپ نے چار برس یورپ میں رہ کر لندن سے برقی انجنیری میں اور پیرس سے طبعیات میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور اب اپنے وطن پنجاب کو لوٹے ہیں (مجلۂ مکتبہ)

یورپ باایں ہمہ قیل وقال کبھی متحد نہیں ہوسکا۔ حالانکہ مدبرین فرنگ کی مساعیِ لا حاصل عرصۂ مدید سے اتحادِ یورپ قائم کرنے پر صرف ہو رہی ہیں؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سولہویں صدی کی ابتدا میں آنسلون[1] اپنی کتاب "فرہنگِ انقلاباتِ سیاسیاتِ یورپ" کے دیباچے (ص ۱۷) میں لکھتا ہے :

"اب چند ماہرین سیاست اس بات کا سبق دے رہے ہیں کہ یورپ میں ایک سلطنت مشترکہ کی بنا ڈالی جائے مگر یہ کہاں ممکن ہے کہ یورپ والے ایک ایسی انجمن با اقتدار قائم کرلیں کہ جملہ ممالک فرنگ کے لئے موجد قوانین ومصدر احکام متصور ہو۔ "ہنری چہارم" کے فکر رسا اور ایبے سنٹ پیئر کی ان تھک کوشش نے اس آرزو کو بر لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر روزمرہ کے مشاہدات اس بات کے موکد ہیں کہ یہ تجویز ناممکنات سے ہے" ایبے سنٹ پیئر (جس کا ذکر مندرجہ بالا حوالہ میں مرقوم ہے) ایک نہایت بلند پایہ فرانسیسی فلاسفر تھا اس نے اتحادِ یورپ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا اور اس کے بعد جملہ حکومتوں سے استدعا کی کہ اس کتاب عمل پر کاربند ہوں مندرجۂ ذیل شرائط اس تجویز اتحاد کا ملخص سمجھیں :

(۱) جملہ شاہان یوروپ مدعو کئے جائیں کہ اتحادِ یورپ کی شرائط طے کریں۔

(۲) ہر ملک جو ان شرائط پر دستخط کرے "اتحادی" قرار دیا جائے۔

---

(1) ANCILLON-TABLEAUX DES EIVLUTION DUSYSTEIME POLITIQUE DE L'EUROPE DEPUIS 15 SIECLE BIBSAINH 8ENUIEVE PARIS

(۳) ہر ملک جو اس اتحاد عظیمہ میں شریک ہو حسب مقدور چندہ دے جس سے "انجمن" کا اقتدار قایم کیا جائے اور اس طرح اس کے حلقۂ اثر کو وسعت دی جائے۔

(۴) اختلاف رائے کے وقت "اتحادی" حرب سے گریز کریں اور قضیات کے تصفیہ کے لئے "پنچایت" پر بھروسہ کریں۔ اس "پنچایت" کے ممبر "انجمن اتحاد" سے منتخب کئے جائیں۔

ایبے سینٹ پیئر روحانیات کا قایل تھا اور انسانی حرص و آز سے کلیتہً بے خبر۔ مندرجۂ بالا تجاویز اسکی سادہ لوحی کی شاہد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس نے "اتحاد یوروپ" کے لئے یہ لائحہ عمل تیار کیا اس وقت یورپ خودسر بادشاہوں کے زیر فرمان تھا جو نخوت و رعونت کے نشے سے اس قدر سرمست تھے کہ انھیں ان تجاویز سے زنجیر پا کرنا تحصیل حاصل تھا۔ جین جیک روسو جو ہمیشہ واقعیت کو خیال پر ترجیح دیتا تھا ایبے سنٹ پیئر کے خیال اتحاد کی نکتہ چینی کرتے ہوے لکھتا ہے:

"یہ کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ جو خدا ے آسمان کو اپنے ملکی اقتدار میں دسترس نہ ہونے دیں ایک "انجمن اتحاد" کے قوانین پر کاربند ہو سکیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات معمولی سپاہی انسانی خود پرستی کی وجہہ اپنی شکایات "حضور پارلیمنٹ" میں پہنچانا قابل ہتک قرار دیتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خودسر آزادہ رو شاہان یوروپ بوقت غیظ و غضب اپنے جذبات کو ایک "کونسل" کے فرمانبردار کردیں گے؟"

یوروپ کے ممالک مختلفہ کو ایک تسبیح میں پرونے کا خیال دراصل اس وقت پیدا ہوا جب جنگ صلیب کے دوران میں یوروپ بھر کے گرجاؤں میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف منادی عام کی گئی۔ اس وقت اس خیال کی حیثیت صرف مذہبی تھی۔ چنانچہ ہم پفنڈر کی کتاب (۱) "تاریخ عالم" کے دیباچے میں حسب ذیل سطور مرقوم پاتے ہیں:

"پاپا" کی طرف سے ایک سنسنی خیز اعلان شائع ہوا جس میں جملہ ممالک یورپ کو فلسطین کے عیسائیوں کی اعانت کے لئے متحد ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس دعوت کے جواب میں با اقتدار لوگوں نے جنگ صلیب میں حصہ لیا۔ مشہور سپہ سالاران جنگ میں ہیوز ملقب "اعظم" برادر شاہ فرانس ڈیوک آف نارمنڈی۔ برادر شاہ انگلستان۔ ریمنڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں" مگر جنگ صلیب کے بعد ہوس ملک گیری کا زمانہ آیا۔ ہندوستان

---

(1) BARON DE PUFFENDER INTRODUCTION A L'HISTOIRE MODERNE GENERALE, ET POLITIQUE BIB. ST. GENEVIEVE PARIS

کی دولت اور خوشحالی کو دیکھ کر جملہ ممالکِ یوروپ کے منہ میں پانی بھر گیا اور ہر ایک کوشاں ہوا کہ کسی طرح یہ "سونے کی چڑیا" اس کی ڈالیوں میں اپنا نشیمن بنائے۔ اس حرص و آز کی وجہ یوروپ میں ایک پھوٹ پڑ گئی اور جذبات اتحاد، جو جنگِ صلیب نے پیدا کئے تھے، معدوم ہونے لگے مگر آخر کار صد سالہ جنگ نے پھر ایک مرتبہ اقوام یوروپ کو تھکا دیا۔ اور مدبرین یوروپ محسوس کرنے لگے کہ براعظم پر اُس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہو سکتا جب تک ایک رسمی معاہدہ جملہ ممالک یوروپ کے اختیارات کو محدود نہ کرے۔ اس وقت اتحاد یوروپ کی بنیاد "مساوات فوجی" پر رکھی گئی۔ یہ تجویز ایسی تھی جس کو صحیح معنوں میں سیاسی تجویز کہا جا سکتا ہے چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۱۴ء کو جو شرائط نامہ انگلستان، فرانس اور دوسرے ممالک یوروپ میں طے ہوا اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

"صلح عام کو ترقی دینے کے لئے پندرہ جون ۱۸۱۹ء کو ہیگ میں دوسری کانفرنس بلائی جائے جس میں یوروپ کے شہزادے، بادشاہ، مدبرین اور وزراء وغیرہ مدعو ہوں۔ تاکہ اتحادِ یوروپ سے متعلق مختلف مشکلوں کے حل کے لئے غور و خوض کیا جائے۔"

مندرجۂ بالا سطور میں ہم نے بالاختصار بیان کیا ہے کہ کس طرح یوروپ کئی صدیوں سے ایک رسمی اتحاد کے قائم کرنے کے لئے کوشاں رہا ہے۔ حال میں موسیو بریاں فرانسیسی وزیر امورِ خارجی نے اس خیال کی تکمیل کیلئے بیڑا اٹھایا ہے۔ "لیگ اقوام" دراصل اسی خیال کو ثمرور بنانے کے لئے بنائی گئی۔ گو ناواقف دنیا کو کہا گیا کہ اس سے مراد اقوام عالم میں ربط و صلح پیدا کرنا ہے۔ جنگ یوروپ کے بعد اس براعظم کی حالت بدل سی گئی ہے۔ فرانس کے سپاہی جو اس جنگ میں مقتول ہوئے اُن کی تعداد ۰۰۰،۰۰۰،۰۰ سے کم نہیں اور اس پر طرفہ یہ کہ اس ملک کی آبادی روز بروز رو بہ تنزل ہے لہذا فرانس نے "[illegible]" یعنی وعدۂ معاونت لینے کی پالیسی بے وجہ اختیار نہیں کی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جرمنی باوجود لاتعداد مشکلات کے بحیثیت تجارت و صنعت اور بالخصوص بہ حیثیت آبادی فرانس سے کہیں بڑھ کر ہے اس کی یہ تیز گامی دیکھ کر فرانس کو چین کی نیند سونا حرام ہے۔ اس لئے فرانسیسی چاہتے ہیں کہ دوسری اقوام سے معاہدے کئے جائیں جن کی رو سے ان کی جنگی حیثیت بڑھ سکے اور دوسرے ملکوں کی جنگی حیثیت کم ہو جائے۔ چنانچہ "کیلاگ پیکٹ" جو دراصل موسیو بریاں ہی کی اختراع تھا اس لئے تیار کیا گیا کہ کسی طرح امریکہ اور انگلستان کی ہمدردی

حاصل کی جائے۔ فرانس کی یہ پالیسی دراصل بہت قدیم ہے "اتحادِ ثلاثہ" جو مارشل فوش اور کلیمنشو کی مساعی کا نتیجہ تھا اسی پالیسی کا مظہر تھا۔

۱۷ مئی ۱۹۳۰ء کو موسیو بریاں نے ممالک یوروپ کو دعوت بھیجی کہ وہ ریاست ہائے متحدۂ یورپ کے قائم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں اور اس طرح ہنری چہارم کی مردہ تجویز کو زندہ کرنے میں شریک ہوں۔ ہم چند ملخصات پیش کرتے ہیں جن سے قارئین مطلع ہوسکیں گے کہ یوروپین اخبارات نے اس دعوت کو کن نظروں سے دیکھا۔ یہاں ہم اپنی رائے اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہیں مگر ہم اس مضمون کے حصۂ دوم میں اس دعوت پر بالتفصیل بحث کریں گے۔

(۱) "پان یوروپین یونین" (Pan Eropeen Union) نے کونٹ کوون ہے کی تحریک سے موسیو بریاں کی تجویز پر آفریں کہی اور اس بات کا اعلان کیا کہ یونین اس تجویز کو بار آور بنانے میں کوشاں ہوگا

(۲) نیویارک ٹائمز (New Yark Times London) فرانسیسی مدبر کی خیالی تجویز پر آفریں کہتے ہوئے رقمطراز ہے کہ دراصل اس تجویز سے یہ مراد ہے کہ "اتحاد سیاست" کی آڑ میں "اتحاد سرمایہ داری" یا شرائط تقسیم سرمایہ داری" طے کی جائیں۔

(۳) جرمن اخبار "جرمانیہ" (Germania) لکھتا ہے کہ بنظر سطحی دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موسیو بریاں کی یہ تجویز اس بات کی محرک ہے کہ "لیگ اقوام" کی ایک خصوصی شاخ پیدا کی جائے۔ تجویز اتحاد ایک بحث طلب مسئلہ ہے اور اس کے موافق و مخالف دلایل پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال سیاست دانوں کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خیالی تجویز اور حقیقی ارادہ میں تفریق کریں۔

(۴) دچ ٹاگس تزوائگتون (جرمنی) (Dutch Tagus Zweigtun) رقمطراز ہے کہ موسیو بریاں کی تجویز اس وقت تک ناقابل غور متصور ہوگی جب تک عہدنامہ وارسلز کے شرائط کو فسخ نہ سمجھا جائے۔

(۵) لوکل انت زواگر (Locale Inth Yzeiga) جرمن اخبار لکھتا ہے کہ فرانس کا اصل ارادہ ہے کہ اس تجویز کی سبیل سے "وعدۂ معاونت" حاصل کیا جائے۔ امریکہ، انگلستان اور اٹلی سے مایوس ہوکر اب فرانس اس بات کا خواہشمند ہے کہ دوسرے ممالک سے یہ مقصد حاصل کرے۔ اگر موسیو بریاں کی تجویز معرض عمل میں آگئی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے اور ہماری آزادی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

(۶) آرتر تزوائونگ (Arther Yuse Yueting) اسٹریا کا اخبار راقم ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں

آتا کہ فرانس کا اتحادِ یورپ پر اصرار کرنا کونسی مصلحت کا پیش خیمہ ہے ایک "انجمن صلح" جس میں انگلستان اور روس شریک نہ ہوں فرانس کے لئے کسی طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ تاہم یہ حقیقت کہ اتحادِ یورپ مدبرینِ فرنگ کے لئے سرمایۂ افکار ہے اس بات کی شاہد ہے کہ اک نہ اک روز یہ آرزو پوری ہو کر رہے گی۔

(۷) انگریزی اخبار آبزور (Observer) لکھتا ہے: یہ انسانی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ایک مشہور ترین مدبر نے "اتحادِ یورپ" کا بیڑا اٹھایا ہے جس کی بنیاد آلاتِ حرب پر نہ ہو گی بلکہ اس کی بنا عقلِ عام اور نیک نیتی پر رکھی جائے گی۔

(۸) میوز Meuse بلجیم کا اخبار لکھتا ہے کہ فرانس جو شہنشاہیت کا دشمن ہے "اتحادِ یورپ" کی تجویز سے صلح و امن کا دستور العمل قائم کرنا چاہتا ہے . . . . . "

مندرجۂ بالا ملخصات کو پڑھنے کے بعد قارئین خود تصفیہ کر سکتے ہیں کہ اس اہم مہم کو سر انجام دینے کے لئے کس قدر مشکلوں کا سامنا ہو گا۔ ہم اس مضمون کے دوسرے حصہ میں اس پر بحث کریں گے جو خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

(۲)

ہمارے نزدیک حصولِ اتحاد تین صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ مگر یورپ حاضرہ کی شیرازہ بندی ان میں سے کسی صورت میں ہونا اگر دشوار نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔

(۱) اتحاد بوجہ سرمایہ داری | ایسے اتحاد کی امثال بکثرت مل سکتی ہیں جس کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ ممالکِ یورپ میں جو اتحاد اب تک تھا اس کی بنیاد یہی سرمایہ داری تھی۔ ایشیا، افریقہ وغیرہ کی اقوام بوجہ انحطاط تجارت صنعت و حرفت اور جملہ اسبابِ حصولِ دولتمندی سے نامراد ہو چکی تھیں ان کی پستی اور کم مائیگی کی وجہ فرنگی اقوام نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا اور اس طرح تمام با عظم نوبت اور تنگدستی کے ہاتھوں سے چھوٹ کر بامِ ترقی پر کمند افگنی کے لئے متحد ہو گیا۔ دراصل آزادی اور یک جہتی کی بنیادیں قومی فارغ البالی ہے!

چنانچہ آنسلون لکھتا ہے "کسی حکومت کی قوت کثیر المالی، کثرت رعایا، یا عساکر وافرہ پر انحصار نہیں رکھتی۔ بلکہ اس عمارت کا سنگ بنیاد قومی دولت مندی اور سرمایہ داری ہے۔ یہ دولتمندی او رسرمایہ داری اس طرح میسر ہو سکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد خوشحال ہو۔ اور ہر فرد کی خوش حالی اس طرح نصیب ہو سکتی ہے کہ صنعت وحرفت، تجارت، اور دوسرے مشاغل کو برسرِ اوج پہنچایا جائے " یورپ کے ممالکِ مختلفہ میں اتحاد پیدا کرنے کا

خیال عوا ایک خوش فہمی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی ساعی سے ہر فرد قوم کو خوش حال بنانے کی کوشش کی گئی اور اس طرح انفرادی خوش حالی سے قومی عروج کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ اس امنگ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اقوام یورپ میں پست اقوام کو تاخت و تاراج کرکے ذخائرِ اموال و امتعہ کی فراہمی کی ہوس دامنگیر ہوتی۔ اس دوڑ دھوپ میں افراد قوم کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کسی ذاتی عناد کی وجہ سے حکومت کو تہ و بالا کرتے یا ہمسایہ قوموں سے دست و گریباں ہو جاتے۔ مگر بیسویں صدی میں یہ حالت بدل سی گئی ہے۔ ایشیائی اقوام، ترکی، چین، جاپان، ایران، روس وغیرہ بیدار ہو رہے ہیں اور اس بیداری کے ساتھ ان کے دلوں میں قومی و ملکی حریت و فارغ البالی حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوئی ہے۔ اس سے یورپ کی کشتی تجارت میں روڑا اٹکا ہے۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ ہم لیبر منسٹر کی رپورٹ سے جو ڈیلی میل میں چھپی حسب ذیل اعداد بے روزگاری نقل کرتے ہیں:

اٹلی	۳۷۲،۲۳۶	اپریل ۱۹۳۰ء کے آخر تک
ہالینڈ	۴۱،۵۰۸،۴	مارچ ۱۹۲۹ء کے آخر تک
بلجیم	۶۳۱،۹۱۹	۵ اپریل ۱۹۳۰ء تک
جرمنی	۲۷،۸۶،۹۱۲	اپریل ۱۹۳۰ء کے آخر تک
روس	۱۲۳۵،۶۰۰	"
انگلستان	۱۸۸۵،۳۰۰	۱۷ جون ۱۹۳۰ء تک
فرانس	۱۱،۵۱۰	۱۷ مئی ۱۹۳۰ء تک

ان اعداد سے ظاہر ہوگا کہ فرانس کے سوا قریباً ہر دوسرے ملک میں بے روزگار لوگوں کی تعداد بکثرت ہے ان لاتعداد لوگوں کو اُس وقت تک اتحاد پر راغب نہیں کیا جا سکتا جب تک انھیں روزگار نہ دیا جائے (قارئین خود ہندوستان کی حالت سے قیاس فرما سکتے ہیں کہ خالی پیٹ سے سیاست کی سرگرمی کہاں تک رہ سکتی ہے) عہدِ حاضر میں جب تاراج شدہ اقوام خواب غفلت سے بیدار ہو رہی ہیں اور مغربی "انڈسٹری" روز بہ روز روبہ تنزل ہے اس قسم کی اُمید موہوم ہے۔ لہٰذا راقم کے نزدیک مغرب میں "اتحاد بوجہ سرمایہ داری" کا زمانہ گزر چکا ہے۔

(۲) اتحاد بوجہ وحدتِ مقصد | ہم اس مضمون کے حصۂ اول میں ذکر کر چکے ہیں کہ دورانِ جنگ صلیب میں

ایک مذہبی احساس نے ممالک یورپ کو متحد کر دیا۔ اس وقت ممکن تھا کہ جملہ اقوام فرنگ کو ایک تسبیح میں پرو لیا جا
مگر فطرت انسانی بے حد خود غرض واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ایشیا کی دولت نے اقوام یورپ کے قلوب میں پھوٹ
ڈال دی۔ ظاہراً اب کوئی ایسا مقصد نظر نہیں آتا جو یورپ کو از سر نو متحد کر دے۔ سوائے اس کے کہ امریکہ کی
روز افزوں ترقی یورپ بھر کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکا دے۔ مگر "بحری کانفرنس" جس میں انگلستان نے
ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بحری طاقت میں اپنا ہم پلہ قرار دیا۔ اس بات کی شاہد ہے کہ انگلستان بجائے
فرانس اور اٹلی سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کے جاپان اور امریکہ کی دوستی اولیٰ تر سمجھتا ہے۔

(۳) اتحاد بوجہ ہمدردی مذہب | مذہب ہی ایک ایسی صورت ہے جس سے اتحادِ عالم یا اتحادِ برّاعظم ہو سکتا ہے۔
اور اس کی آخری صورت یہ ہوگی کہ جملہ ممالکِ غرب "پاپا" کے اقتدار کو تسلیم کر لیں۔ مگر حالاتِ حاضرہ میں یہ خواب
و خیال ہے۔ یورپ میں قومیت ملک پر منحصر ہے اور "عیسائیت" ایک رسمی لفظ۔

ہم مندرجۂ بالا دلائل کو خود فرنگی اخبارات کے ملخصات سے واضح تر کریں گے تاکہ قارئین کو اس مسئلہ کا
علم کلیتہً ہو سکے۔ موسیو بریاں وزیر امورات خارجی کی معرکتہ الآرا "دعوتِ اتحادِ یورپ" کی اشاعت کے
چند روز بعد "ڈوس مسولینی" وزیر اعظم اٹلی نے فلارنس میں ۲۰۰,۰۰۰ آدمیوں کے سامنے ایک معنی خیز
تقریر کی جس کا ضروری حصہ حسب ذیل ہے:

"اطالوی قوم کے لئے سب سے مضرت رساں دشمن "شک" ہے خصوصاً اس بات میں شک کرنا کہ
حکومت اٹلی اپنے مصمم ارادہ کو سرانجام نہ دے گی۔
میں اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہماری "بحری تجویز" حرف بحرف پوری ہوگی کیونکہ اطالوی
ارادہ اٹل ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ان سمندروں میں قید رہیں جو کبھی ہماری ملکیت تھے۔ ہم اپنے تئیں
آزاد بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔
اٹلی آج اس قدر طاقت ور اور منظم ہے کہ وہی ملک اس کا دشمن ہو سکتا ہے جس کو خواہش فنا ہو
الفاظ خوب ہیں مگر مشین گن، بم، بحری، جہاز، ہوائی مشینیں اور توپیں الفاظ سے خوب تر ہیں۔ کیونکہ
"حقوق" کا لفظ اس وقت تک بے معنی ہے جب تک "طاقت" اور "قوتِ بازو" ان کی نگہبان نہ ہو
اطالوی مدبر "نکولو ماشیاولی" نے کیا خوب کہا تھا کہ صرف وہی "نبی" نذر بلا ہوے جو آلاتِ حرب رکھتے تھے۔
کل ہماری منظم افواج کی پریڈ اس شان و شوکت سے ہوگی کہ اقوامِ عالم دیکھ لیں گے کہ اٹلی

کس قدر مسلح ہے۔"

جب مسولینی نے یہ الفاظ دہرائے تو "ملیشیا فوج" کے سپاہی اپنی بندوقوں کو ہوا میں حرکت دے رہے تھے گویا ہر لفظ کے موئد ہیں۔ اٹالوی وزیراعظم نے اپنی تقریر کو ان الفاظ سے ختم کیا:

"اٹلی آج اس قدر آلاتِ حرب سے مزین ہے کہ ہم دنیا کو دو چیزیں پیش کرسکتے ہیں ہماری بیش قیمت تنظیم یا تباہ کن دشمنی"

یہ تقریر فلارنس میں اس قدر مقبول ہوئی کہ شہر کا گھر گھر فوجی جھنڈوں اور قومی نشانات سے آراستہ وپیراستہ کر دیا گیا۔ عامۃ الناس کے جذبات رفعتِ آسمان پر پہونچے ہوئے تھے۔

اس تقریر کے چند روز بعد مسولینی نے میلان میں ۲۴ رمی ۱۹۳۰ء کو دوسری تقریر کی۔ سامعین کی تعداد ۳۰،۰۰۰ تھی اس کا ضروری حصہ یہ ہے:

"آج اٹلی کے لوگ اپنی تقدیر کے آقا ہیں اور اپنے "حقوق" کی حفاظت کے لئے بدل وجان آمادہ۔ ہم ان حالات سے ناواقف نہیں جو کل وقوع پذیر ہونے والے ہیں۔ ہم ان کے انتظار میں اپنی قوت اور فوج کو منظم کر رہے ہیں کیونکہ ہم اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ دفعتہً کسی مہم کی نذر ہو جائیں۔

تم کو اس آنے والے وقت (مراد جنگ ہے) کے متعلق یقین کامل دلانے کے لئے میں ۲۸ راکتوبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ مقرر کئے دیتا ہوں۔"

اس تقریر کے دوران میں اکثر سامعین "مسولینی زندہ باد" اور "فرانس غارت شود" کے الفاظ دہرا رہے تھے اس تقریر کے دوسرے حصہ بھی اسی قدر آتش فشاں ہیں۔

اٹلی کے مختلف امصار ودیار کے طلبا فرانس کے مخالف ایک خصوصی تنظیم میں حصہ لے رہے ہیں ۹ جون کو "مجلس طلبائے روم" نے مسولینی کو حسب ذیل تار دیا:

"پوایل کے طلبا اپنے دلوں کو آلاتِ جنگ سے مزین کرچکے ہیں اور اس بات کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں کہ اپنے ہاتھوں کو بھی آلاتِ حرب سے پیراستہ کریں ...."

موسیو گراندی اٹالوی وزیر امورات خارجی نے روم میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے پاس ایک صحیح وجہ ہے کہ تنظیم یورپ یا اتحادِ یورپ کو بنظر شکوک دیکھیں۔ اگر ان بین الاقوامی حالات پر غور کیا جائے جو "لیگ اقوام" کے حلقۂ اثر کے اندر یا باہر وقوع پذیر ہو رہے ہیں تو اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ یورپ میں آلات حرب کو بجائے کم کرنے کے اُس کے بڑھانے کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ اس طرح بجائے رفع شکوک غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے۔"

"ہنری بیرنگر" فرانسیسی نائب صدر کمیشن امورات خارجی مسولینی کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مسولینی نے کہا کہ "حقوق" کا لفظ بغیر "فوجی طاقت" کے بے معنی ہے کیا یہ الفاظ موسیو بریاں کی دعوت کا صحیح جواب نہیں ہیں؟ یہ امر از حد خطرناک ہے کہ ان تمام واقعات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ سیاست امن پر عملدرآمد ضروری سہی مگر سیاست بیرونی کے نشیب و فراز سے بے اعتنائی کوتاہ نظری ہے۔ اقوام یورپ کے اقوال و افعال میں بہت فرق ہے۔ ہر ملک "آلات حرب" کو کم کرنے کی بجائے روز بروز اس میں اضافہ کر رہا ہے اسی طرح جرمنی نے اپنی فوجی بجٹ کو گلوم دوم کی بجٹ کے برابر پہونچا دیا ہے۔ اٹلی "بحری طاقت" کے پروگرام کو حرف بحرف پورا کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ روس اپنی طاقت حرب کو زار کی طاقت سے بڑھانے کا آرزومند ہے۔ ان حالات میں اتحاد یورپ مشکل نظر آتا ہے۔ دراصل یورپ یورپ کہاں رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) انگلستان ایک معمولی جزیرہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی آبادی ۴۵ ملین سے زیادہ نہیں مگر اُس کے زیر عنان ایشیا آفریقہ اور امریکہ ہیں ۴۰۰ ملین انسانوں کی آبادی ہے۔

(۲) فرانس جس کی آبادی ۴۰ ملین ہے افریقہ ایشیا اور امریکہ میں ۱۰۰ ملین آدمیوں پر حکمراں ہے

(۳) بلجیم اور ہالینڈ یورپ میں ناقابل توجہ ہیں مگر کانگو کی سلطنت اُن کی ہے۔

(۴) روس نصف یورپ میں ہے نصف ایشیا میں۔

(۵) جرمنی اور اٹلی کو ملک گیری کی ہوس دامنگیر ہے۔

ان حالات کے ماتحت اگر موسیو بریاں نے ہو سکے تو اس یورپ کو متحد کرنے کے لئے ساعی ہوں۔ جو دراصل یورپ نہیں کہلایا جا سکتا۔

موسیو ونیواسوری بیرونی نے اٹالین پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہم فرانس سے ایک عہد نامہ کیوں نہ کر لیں جس کی رو سے فرانس، اٹلی، اسپین اور انگلستان میں ایسا اتحاد قائم ہو سکے کہ ہم عربوں کی مخالفت میں ایک روح و جسم ہو جائیں" اس کے جواب میں ٹیا لوجا نے کہا: "اٹلی فرانس کے ساتھ واشنگٹن میں بحری مساوات حاصل کر چکا ہے اور یہ سوال "لیگ اقوام" کے سامنے پیش کرنا چاہیئے"

مندرجہ بالا ملخصات کو حاجت تبصرہ نہیں۔ قارئین اندازہ فرماسکتے ہیں کہ خود یورپ میں کیلاگ پیکٹ یا "عہد نامہ امن" کی کیا وقعت ہے؟ جب خود ممالک یورپ کی یہ حالت ہوئی تو "اتحادِ عالم" کو جنون ہی کہنا چاہیئے۔ جیسا کہ "بحری کانفرنس" کے نتائج سے ظاہر ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اس کانفرنس میں پانچ ملک مدعو کیئے گئے۔ انگلستان، فرانس، امرکیہ، جاپان، اور اٹلی۔ تین ماہ کی مشقت کے بعد جو معاہدہ طے ہوا۔ اس میں اٹلی اور فرانس شروع سے شریک ہی نہ ہوئے۔ انگلستان، ریاستہائے متحدہ امرکیہ اور جاپان نے اس معاہدہ پر دستخط کیئے مگر دستخط کرنے کے کچھ روز ہی بعد جو نتائج برآمد ہوئے حسب ذیل سطور سے ظاہر ہونگے:

جاپان جاپانی بحری وزیر جب وطن پہنچا تو اس کی پارٹی کے ایک ممبر نے اُسے چھری نذر گزرانی۔ مراد یہ تھی کہ اس چھری سے خودکشی کرلو۔ ایڈمرل ٹکار ابائی کے خلاف یہ اشتہار چسپاں کیئے گئے: "غدار قومی جو امرکیہ اور انگلستان کے زانو پر سر بسجود ہوا"، لفٹننٹ کمانڈر کساکاری نے بحری معاہدہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے "ہاراکیری"، "یعنی خودکشی"، کرلی۔ جاپان میں یہ قدیمی رسم ہے کہ کسی ناگوار واقعہ کی تشہیر کے لئے "ہاراکیری" کرلی جاتی ہے۔

انگلستان جرنال ۔ ۲ مئی ۱۹۳۰ء ۸۵ ممبر کنسرویٹو نے بحری معاہدہ کے خلاف دستخط کیئے۔ دستخط کنندگان نے جو رزولیوشن پاس کیا وہ یہ تھا: "بحری معاہدہ کا تیسرا حصہ جس سے مراد یہ ہے کہ آلات حرب کو محدود کیا جائے۔ برطانوی فوائد کے لئے ازبس مضرت رساں ہے اور پارلیمنٹ کو کبھی اس کی حمایت نہ کرنی چاہیئے" بحری معاہدہ کا تیسرا حصہ ہی ایسا ہے جس کو ضروری کہا جاسکتا ہے۔ کانسٹاڈ بیرل ہمیش مندرجہ ذیل رزولیوشن پیش کرنے والے تھے۔

"لندن کے بحری معاہدہ" سے صرف یہ مراد ہے کہ برطانوی اور صرف برطانوی بحری طاقت تک کو محدود کیا جائے۔ امرکیہ جس کے موجودہ بحری جنگی جہاز ۹۰۵۰۰ ٹن سے زیادہ نہیں۔ ۳۲۳۵۰۰ ٹن تک بڑھایا جاسکتا ہے جاپان جس کی موجودہ طاقت ۱۶۶۸۱۵ ٹن ہے ۲۰۸۸۵۰ ٹن اور اضافہ کرسکتا ہے۔ اٹلی اور فرانس اس معاہدہ کی قید سے آزاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "بحری معاہدہ" صحیح معنوں میں برطانوی فوائد کے مخالف ہے یہ صرف ہماری بحری طاقت کا سبب تھا کہ دنیا ہماری رائے کا لوہا مانتی تھی۔ اب دنیا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری حالت بدل ہی گئی ہے۔ ہم نے وہ شرائط قبول کئے ہیں جن پر اٹلی اور فرانس دستخط کرسکے"۔

خود امرکیہ میں "بحری معاہدہ" کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے۔ الغرض سیاسات عالم

ملاحظہ پذیر ہیں یہ الفاظ اقبال ؎
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

حدیثِ شوق

(جناب الحاج ابو الاشرف محمد جہانگیر صاحب تجید آغائی ابو العلائی)

یہ غزل عالیجناب مہاراجہ سر یمین السلطنۃ بہادر صدراعظم باب حکومت سرکار عالی کے ایک مشاعرۂ خاص میں پڑھی گئی تھی۔ طرح مصرع "آکسی دن میکدہ میں رقص ما و ہو بھی دیکھ" تھا......
مجید صاحب حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ طبیعت اچھی پائی ہے اور غزل خوب کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام اُن کے شاعرانہ مذاق کا آئینہ اور ہر طرح لائق داد ہے۔ (مجلہ مکتبہ)

آ، بہارستانِ عالم کا تماشا تو بھی دیکھ!
اپنے محشر خیز جلوے، اپنا رنگ و بو بھی دیکھ!

دیکھ! ضبطِ شوق کا عالم کسی دن تو بھی دیکھ!
دُکھ یہ قدرت دیکھ ظالم، درد پر قابو بھی دیکھ!

میری بزمِ آرزو کو اپنی بزمِ ناز کر
تیری صورت میں بھی دیکھوں، میری صورت تو بھی دیکھ!

ہے ورقِ زرین حدیثِ شوق کا لختِ جگر
رازِ دل کا ایک نقطہ ہے مرا آنسو بھی دیکھ!

سوزِ ناکامی نے بھر دی ہیں شرر افشانیاں
میری شامِ بیکسی بھی دیکھ اور جگنو بھی دیکھ!

سیکھ لے حسن وفاداری کے پہلو، سیکھ لے!
لے، مرا دل لے! تو اس کو دیکھ! اسکی خو بھی دیکھ!

چشمِ جادو فن کے مارے جیتے ہیں مرتے بھی ہیں!
سحر میں اعجاز دیکھ، اعجاز میں جادو بھی دیکھ!

محوِ خوابِ نا امیدی ہر پریشاں حال ہے
دیکھ! تاثیر ہوا ہے دامنِ گیسو بھی دیکھ!

آنکھ کی پتلی کو غافل! نور کی پتلی سمجھ!
ہاں! اسی پردے میں عکسِ قامتِ دلجو بھی دیکھ!

اے دلِ بیتاب! بزمِ ناز، اسکی بزمِ ناز!
ڈھونڈلے کوئی بہانہ اور کوئی پہلو بھی دیکھ!

اب تڑپ میں درد بھی ہے درد میں لذت بھی ہے
آ، کبھی بیتابیِ دل کا تماشا تو بھی دیکھ!

تیرے اندازِ بیاں کا پوچھنا کیا ہے مجید
ایک ہی ہے آج اربابِ سخن میں تو بھی دیکھ!

برسات کا سماں

(ماخوذ از رامائن)

(جناب محمد عبدالرحمن آزاد صدیقی)

جب سے رام چندر جنگل میں آ کر رہتے ہیں جنگل منگل روپ بنگیا ہے درخت ہرے بھرے نظر آتے ہیں پھل پھول افراط سے پیدا ہو گئے ہیں۔ شہد کی مکھیاں پھولوں اور رس بھرے پھلوں میں لپٹی ہوئی نغمہ سرائی کرتی ہیں، درختوں میں لٹکے ہوئے شہد کے چھتّے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ آگے چلکر تلسی داس عقیدتِ مذہبی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگل میں یہ تر و تازگی مہاراج ہی کے فیض قدم کی بدولت پیدا ہوگئی ہے جو پہاڑ کی ایک خوش آئند چٹان پر آکر ٹھہر گئے ہیں۔

کہت انج سن کتھا انے کا۔۔ بھگت بریت نرپ نیت دی ویکا

انج = بھائی، سن = سے، بھگت بریت = خدا پرستی کے اصول، نرپ نیت = اصول ملک داری = راجہ کے فرائض۔

راجہ رامچندر اپنے چھوٹے بھائی لکشمن سے کچھ اس طرح کے حقائق و معارف بیان کرتے ہیں جن میں خدا پرستی اور راج نیت کی سبق آموز نصیحتیں بھری ہوتی ہیں۔

برشکال میگھ نبھہ چھائے گرجت لاگت پرم سوہائے۔

برشکال موسم بارش، میگھ = بادل، نبھہ = آسمان فضائے بسیط، پرم سوہائے = دلکش اور بھلے برشکال فارسی لفظ ہے جو سنسکرت میں کاف سے بدل کر لے لیا گیا ہے۔

بارش کا موسم شروع ہو گیا ہے کالے کالے بادلوں سے فضائے بسیط معمور ہے، جو گرجتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

رام اپنے عزیز بھائی لکشمن کی طرف مخاطب ہیں اور ان کو مناظر قدرت کی جانب ایک ادائے عارفانہ کے ساتھ متوجہ کرتے ہیں:

لکشمن دیکھ ہو مورگن ناچت بار دیکھ گرہی ورت رت ہرش جس بشن بھگت کہنہ دیکھ

گرہی = دنیادار، گر نیکوکار ہشن = رزاقِ عالم یعنی خدا = ہشن بھگت = خدا پرست۔
اے لکشمن! دیکھو، جیسے نیک دل گرہستی عارفان کامل کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ویسے ہی موران کالے کالے بادلوں کو دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولے نہیں سماتے ہیں۔ مست ہوکر ناچ رہے ہیں۔ اس جگہ موروں کو گرہستی یعنی دنیادار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور بادلوں کو عارفان الٰہی سے تشبیہ دینا بوجہ اُن کے فیض کے ہے کیونکہ وہ پانی برساتے ہیں اور نباتات وحیوانات کو پیام حیات پہنچاتے ہیں۔ گرہستی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک نیکوکار و نیک کردار دوسرے بدکار و بداعمال۔ سنسکرت میں اُن کے لئے دو لفظ ہیں (دھرمی) و [illegible]رمی مولانا روم نے بھی دنیاداروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں پہلی قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو دنیا کو اختیار کرنے پر بھی گناہوں سے بچے رہتے ہیں اور نیک عمل کو نہیں چھوڑتے دوسری قسم میں وہ دنیا پرست شامل ہیں جو بوالہوس اور مبتلائے معصیت ہیں اور دنیا پرستی کی دھن میں دین و مذہب کی پروا نہیں کرتے، شب و روز گناہوں میں آلودہ رہتے ہیں اور عاقبت کی فکر نہیں رکھتے۔ پابند مذہب رہ کر نیک عمل کے ساتھ دنیاداری بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔ جس نے زن و فرزند کے ساتھ رہ کر آلائشِ معصیت سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔ وہی گرہستی کہلائے گا۔ جن دنیاداروں کا ایمان درست نہیں ہے۔ وہ اہل اللہ کو نہ پہچان سکتے ہیں نہ ان سے فیض اُٹھا سکتے ہیں۔ پس ایسوں کو دنیادار کہنے کے بجائے دنیا پرست کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

گھن گھمنڈ بینہہ گرجت گھورا   پریا چین ڈرپت من مورا
دامن دمک رہی گھن ماہیں   کھل کی پریت یتھا تھر ناہیں

گھن گھمنڈ = گھنگھور گھٹائیں۔ بینہہ = بادل = پریا = معشوق و محبوب = دامن = بجلی گہن = آسمان فضائے بسیط۔ کھل = خودغرض = پریت = محبت = یتھا تھر = قرار و قیام

آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں بادل گرج رہے ہیں۔ اُن کا گرجنا سنکر میرا دل تنہائی میں اپنے محبوب کے بغیر تڑپتا ہے۔ بجلی آسمان پر چمکتی ہے اور غائب ہوجاتی ہے اُس کو ایک جگہ پر قرار نہیں ہے جس طرح خود غرض اور فاپرست لوگوں کی دوستی و محبت کا اعتبار نہیں ہوتا نہ وہ قایم رہتی ہے اسی طرح بجلی کی روشنی ایک جگہ قایم نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جیسے

بجلی کی بیقرار اور متزلزل روشنی کسی راہ گیر کو جو اندھیرے میں چل رہا ہو فائدہ نہیں پہنچا سکتی ویسے ہی خود غرض دوستوں کی دوستی سے کسی کو فیض نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اُس کو پائداری و استواری ہوتی ہے۔

برشہیں جَلا بھومی نیارا ئے یتھا نوے ہیں بدہ ودیا پائے

جلا = بادل ۔ بھومی = زمین = نیارائے = نزدیک آکر = بدہ = عارف ۔ ودیا ۔ علم معرفت

پانی بھرے ہوئے بادل زمین کی طرف جُھک کر برس رہے ہیں جیسے عارفانِ کامل معرفتِ الٰہی کے بوجھ سے جُھک جاتے ہیں اور منکسر المزاج ہو جاتے ہیں = اس جگہ بدہ سے عارفِ کامل مراد ہے اور ودیا کے معنیٰ معرفتِ الٰہی کے ہیں جب انسان معرفتِ الٰہی کو پاجاتا ہے تو وہ منکسر المزاج ہو جاتا ہے اور غرور و تمکنت کو پاس نہیں آنے دیتا جو درخت باردار ہوتے ہیں اُن کی ڈالیاں زمین کی طرف جُھک جاتی ہیں اور خوشہ چینوں کو فیض پہنچاتی ہیں جو شجر بے ثمر ہیں اُن سے نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ وہ خود اپنے لئے کوئی بہتری حاصل کر سکتے ہیں کاٹ کر پھینک دئے جاتے ہیں یا جانوروں کا چارہ بنتے ہیں۔

بوند ادھات سہین گر کیسے + کھل کے بچن سنت سہین جیسے

ادھات = چوٹ = گر = پہاڑ = سنت = اہل اللہ = کھل = جاہل و نا اہل =

پانی کی بڑی بڑی بوندوں کی چوٹیں پہاڑ اس طرح برداشت کر رہے ہیں جیسے اہل اللہ نالایق لوگوں کی ناسزا باتوں کو سُن کر برداشت کر لیتے ہیں اس جگہ پہاڑوں کو اہل اللہ سے تشبیہ دینا ایک نہایت لطیف کنایہ ہے ۔ مقصود لکشمن کو نصیحت کرنا ہے ۔ کیونکہ وہ تیز مزاج تھے ، طبیعت میں غصہ زیادہ تھا ذرا سی بات میں بھڑک جاتے تھے ۔ فلسفۂ اخلاق میں ناصحانہ مضمون تلخ اور بے مزہ تصور کیا گیا ہے اکثر حکما نے نصیحت کی کڑوی دوائی میں تمثیلات واشارات کی مصری ملا کر اُس کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ اس جگہ حکیم روحانیت رام نے اُسی نسخہ کو استعمال کیا ہے ۔ نہایت لطیف اور دلکش کنایہ ہے اپنے عزیز بھائی لکشمن کو سمجھاتے ہیں کہ تحمل و صبر میں تم کو اس پہاڑ کے مانند بننا چاہیئے ۔ تم جب تک اپنے نفس کو تحمل کا خوگر نہ بناؤ گے عرفانِ حقیقی سے بہرہ اندوز نہ ہو سکو گے اس لئے غصہ روکو اور نفسِ سرکش کو

صبر و تحمل کی زنجیر میں باندھ کر قابو میں کرلو۔

چھدر ندی بھر چلی اُترائی　　جس تھوڑے دھن کھل اِترائی

چھدر ندی = چھوٹی ندی = اُترائی = اُبل کر چلی = اِترانا = غرور و تمکنت کو کام میں لانا۔

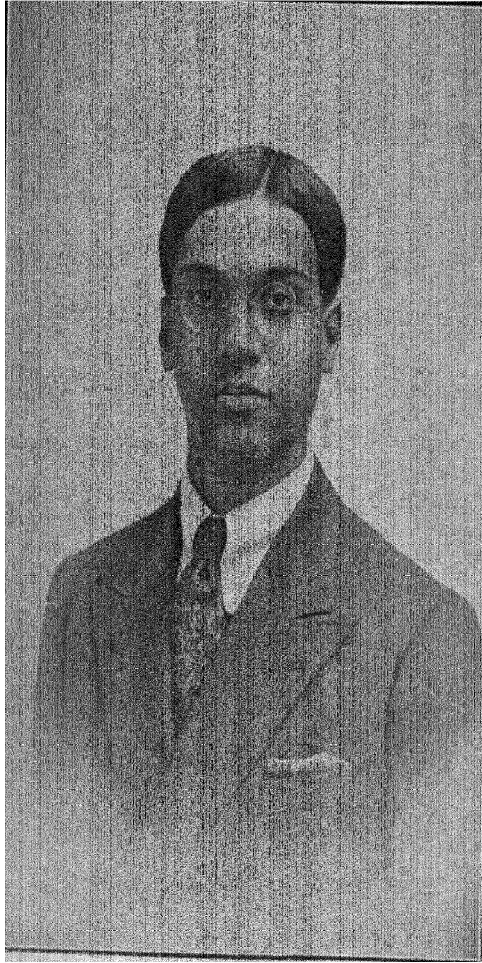
کمال ادب دیکھو اُترائی اور اِترائی میں صرف اعراب کا فرق ہے مگر زیر و پیش کی تبدیلی سے شعر میں زوردار مضمون پیدا ہو گیا ہے اُترائی کے معنیٰ ہیں لبریز ہو کر اُبل چلنے کے اور اِترائی کہتے ہیں غرور سے اینٹھ کر چلنے کو۔ تو فرماتے ہیں کہ دیکھو چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے اس طرح بھر کر اُبل چلے ہیں جیسے کم ظرف اور سفلے لوگ تھوڑی دولت پا کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پس عارف کو نہ چاہیئے کہ جادۂ عجز سے قدم باہر نکالے۔

بھوم پرت بھا ڈابر پانی　　جمین جیو ہیں مایا لپٹانی

بھوم = زمین = ڈابر = کثیف گندلا۔ جمیں = جیسے۔ جیو = روح = مایا = خواہشات جیو = نفس

فرماتے ہیں کہ جس طرح پاک و منزہ روح خواہشات نفس کے دام میں پھنس کر گندی ہو جاتی ہے اُسی طرح برسات کا صاف و شفاف پانی زمین پر گرتے ہی گندلا ہو گیا ہے۔ ڈابر کے معنیٰ کثیف کے ہیں جب تک پانی زمین پر نہیں گرا تھا پاک و صاف تھا زمین پر گرا تو آلائشِ ارضی نے اُس کو میلا اور گندلا کر دیا۔ روح جب تک جسم کے کثیف قید خانہ میں نہیں ڈالی گئی تھی۔ گناہوں سے بچی تھی اور پاک و صاف تھی۔ جب عالم اجسام میں مستور ہوئی تو دنیا کی کثافتیں اور خواہشیں اُس سے لپٹ گئیں جس سے اُس کی پاکیزگی جاتی رہی اور مکدر ہو کر رہ گئی۔

میرے دوستو! ان مضامین نادرہ پر غور کرو اُن تخیلات عجیبیہ و نفیسہ کو دیکھو ان اشارات بلیغہ اور کنایات غریبہ کا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو رامائن کے شاعرانہ مضامین کو بنظر غایر دیکھ چکے ہیں۔ آپ اپنے ملک کی زبانوں سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کرتے اگر آپ کو اپنے ملک کے ادب سے دلچسپی پیدا ہو جائے تو آپ کو خود اپنے گھر میں ادبیات کا ایسا قیمتی ذخیرہ مل جائیگا کہ پھر آپ کو یورپ کے بازاروں میں اس جنس کی تلاش کی ضرورت باقی نہ رہیگی کتنے درِ شہوار گمنامی کے سمندر کی تہہ میں پڑے ہیں جن کا حال ہمارے غواصانِ ادب کو ابھی معلوم نہیں ہے کس قدر لعل بے بہا تعصب اور بدمذاقی کے قعر میں مدفون ہیں جن کی خوش آبی اور چمک دمک کیسے



مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خان ایم اے - ال ال بی (عثمانیہ)
ڈی فل، بی سی ال (اکسفورڈ) بیرسٹر ایٹ لا

مطبع کوہ نور حیدرآباد دکن

دنیا محوِ حیرت بن سکتی ہے نہیں معلوم مغرور مگر اپنی حالت پر قانع مسلمانوں کے حصہ میں ملک کی یہ گراں بہا ادبی دولت جو خود اُن کے گھر میں موجود ہے کب آئے گی اور وہ اُس سے کب فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہمارا ادب اُس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک بدمذاقی اور تعصب کا پردہ ہم اپنی آنکھوں پر ڈالے رہیں گے۔ ہم کو خوانِ ادب سے پورا حصہ اسوقت تک نہ ملے گا تاوقتیکہ ہم میں کالیداس اور تلسی داس کے ایسے ہزاروں باکمال ادیب اور شاعر پیدا نہوں ہماری ادبی تشنگی اُس وقت تک نہ بجھے گی جب تک بیاس اور بھوبھوتی کے ایسے باکمال شعرا ہم میں پیدا نہو جائیں۔ ہمارا ادب ٹیگور کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے ہم اس نوبل پرائز کے جیتنے والے گیتانجلی کے مردِ میداں مصنف کو دیکھ کر رشک کرتے اور حیرت آتی ہے کہ کاش ہم میں بھی ایسے سورما پیدا ہوتے جو یورپ کی بازیگاہوں میں بازی لگاتے اور جیت کر آتے! اقبال اور اکبر ہماری بزمِ ادب کے روشن چراغ ہیں مگر محفل کی وسعت اُن کی روشنیوں سے کہیں زیادہ روشنی کی متقاضی ہے اُس کو بجلی کا لیمپ اور گیاس کی روشنی درکار ہے۔ میرے عزیز و ملک کے فرزندو! اُٹھو اُٹھو اور اپنے اپنے ادبی لیمپوں سے محفل کو جگمگا دو مجلس کو منجلی کر دو۔ اردو کے مردہ جسم میں بالیدگی کی روح پھونک دو اُس کو دُنیا کی ممتاز زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کر دو اور یہ کوشش کرو کہ ہم جلیسوں اور ہم نشینوں میں اُس کا سر نیچا نہ ہونے پائے!

(باقی آئندہ)

زندہ طلسمات

خطبۂ صدارت

(حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس)

گذشتہ ماہ تیر میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب عادت ٹون ہال میں منعقد ہوا تھا۔ جلسہ کی صدارت کے لئے اس سال ملک کے تجربہ کار و ماہر تعلیم عہدہ دار مولوی عبدالرحمان خاں صاحب صدر کلیۂ جامعہ عثمانیہ کا انتخاب ہوا تھا موصوف نے جو خطبہ دیا وہ ملک کی گذشتہ تعلیمی حالت اور آئندہ ضروریات پر بڑی حد تک حاوی ہے اس لئے ملک کی تعلیمی ترقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔

(مجلہ مکتبہ)

خواتین و حضرات!

ایک دن شام کو چند ہی روز قبل سالانہ امتحانوں کے کام سے تھکا ماندہ میں نظام کلب گیا تو میرے دوست مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تعلیمی کانفرنس حیدرآباد کے دسویں اجلاس کی صدارت میرے تفویض ہوئی ہے اور میں جلد اس کے لئے تیار ہو جاؤں۔ پروفیسر میگ ناتھ ساہا (Meg Nadh Saha) جو عثمانیہ یونیورسٹی کے عملی امتحانات طبیعات کے لئے میرے ساتھ شریک ممتحن منتخب ہوئے تھے انہیں دنوں میں آنے والے تھے۔ تعلیمی سال کا آخری زمانہ ایم۔ یس۔ سی کے عملی امتحانات کی تیاری میں، توقع کر رہا تھا کہ ان سے فارغ ہو جاؤں تو ذرا فرصت کے ساتھ آرام تو کیا اوں کسی دوسرے علمی کام میں مصروف ہو جاؤں معتمد صاحب کے یہ فرمانے سے میں حیران و ششدر رہ گیا۔ کانفرنس کی صدارت کا اعزاز میرے لئے باعث تشکر و ممنونیت تھا لیکن پریشانی تھی کہ خطبہ کی تیاری اور ضروری مواد کی فراہمی کیلئے وقت کہاں سے لاؤں معتمد صاحب موصوف نے مواد کی فراہمی میں مدد دینے کا وعدہ فرمایا تو مجھے اس عزت کے قبول کرنے کی ہمت ہوئی۔

حضرات! میں آپ کا نہایت درجہ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس جلسہ کی صدارت پر مامور فرمایا۔

مجھ سے پہلے جن بلند مرتبہ نام آور عالیشان ہستیوں نے یہ کام انجام دیا ہے ان کے مقابلے میں جب میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو آپ کی یہ کرم فرمائی میرے لئے باعث فخر ہو جاتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے اس خطبہ میں جو فرو گذاشتیں ہونگی آپ ان کو از راہ کرم تنگی وقت کے خیال سے معاف فرمائیں گے۔

معزز حاضرین! میں اس خطبہ میں تعلیم کا کوئی جدید نظریہ یا سائنٹفک اصول نہیں بیان کروں گا۔ کسی خاص مسئلہ پر مفصل بحث نہیں کروں گا۔ اس کا نہ تو موقع ہے اور نہ اس کے لئے اتنا وقت مل سکتا ہے۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے حیدر آباد کی گذشتہ اور موجودہ تعلیمی حالت کا ایک خاکہ کھینچ کر بتانا چاہتا ہوں اور ضروریات حالیہ کے پیش نظر ملک کی ترقی و بہبود سے متعلق میرے ذاتی تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو تجاویز مناسب معلوم ہوتے ہیں ان کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تعلیمات کے مسائل بہت ہیں اور ان پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے اشخاص بھی جنہوں نے مسلسل سررشتہ تعلیمات ہی میں اپنی پوری مدت ملازمت صرف کی ہو تعلیم کے مختلف شعبوں پر حاوی نہیں ہو سکتے یہ اسپیشیلائزیشن (Specialization) یعنے تخصیص کا زمانہ ہے ہر شعبہ میں خصوصی ماہر فن کی ضرورت ہے کوئی ایک شخص ایسا نہیں مل سکتا جو تعلیم کے تمام شعبوں سے اچھی طرح واقف ہو میری عمر کا بیشتر حصہ اس ملک کی محض اعلیٰ تعلیم اور اس کے مسائل حل کرنے کی کوشش میں صرف ہوا ہے۔ تعلیم کے دیگر مسائل کے متعلق میری رائے اور میرے معلومات اپنے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہیں۔ جیسا کہ ڈسمبر ۱۹۲۵ء کے خطبہ صدارت میں میرے محترم دوست نواب مرزا یار جنگ بہادر نے بیان فرمایا ہے۔ ممالک محروسہ میں اسٹیٹ ایجوکیشن اور سرکار کی طرف سے براہ راست تعلیم کا انتظام تقریباً اسی وقت سے آغاز ہوا ہے جب سے کہ گورنمنٹ ہند نے اپنے آپ کو باشندگان ہند کی تعلیم کا علی الاعلان ذمہ وار گردانا۔ اس وقت سے اب تک تقریباً (۷۵) سال ہوئے خواہ برٹش انڈیا میں یا ممالک محروسہ میں ترقی ہی ترقی ہوتی رہی مہذب ممالک میں تعلیم کی ترقی نہ ہو تو کیا تنزل ہو گا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ ترقی کس رفتار سے ہو رہی ہے۔ کیا تعلیم کے مختلف شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح اس کی اصلاح ہو سکتی ہے؟

یہ امر واضح ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی کی رفتار برطانوی ہند کی بہ نسبت سست تر رہی ہے۔ اس کے اسباب بھی واضح ہیں۔ دیسی ریاستوں کو وہ سہولتیں اور ذرائع حاصل نہیں جو سرکار عظمت مدار کو حاصل ہیں برٹش انڈیا کی تعلیمی رفتار کے ساتھ توازن و تقابل سے حیدر آباد کی تعلیمی رفتار کے متعلق رائے

قائم کرنے کے لئے مبنی بر انصاف نہ ہوگا۔ یا تو برٹش انڈیا کے مختلف صوبہ جات کی تعلیمی حالت سے فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے یا ان کے اوسط سے میری رائے میں یہ ایک بیکار آدمی کا کام ہے۔ ایسے اعداد و شمار کو جس شکل میں چاہیں ڈھال سکتے ہیں۔ لیکن ان سے فائدہ کچھ نہیں ہم سب تسلیم کرتے ہیں۔ برٹش انڈیا کے بہترین صوبے سے ہمارے اس حصہ ملک کی تعلیمی حالت یقیناً پست تر ہے۔ اور ان کی ترقی کی رفتاروں میں بھی طبعی طور پر اسی قسم کی نسبت پائی جاتی ہے۔ اس سے ہمارے مدبرین یا عہدہ داران سررشتہ تعلیم پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ جب تک ملک کے تمام حالات پر غور نہ کیا جائے سد راہ تعلیم معاملات اور دقتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ شاید زیادہ منصفانہ طریقہ یہ ہوگا کہ ہم اس وقت ہماری گذشتہ بیس سال سے پہلے کی تعلیمی حالت سے موجودہ حالت کا اندازہ کریں۔ اس مدت کا اکثر و بیشتر حصہ ہمارے آقائے ولی نعمت ہز اگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علی خاں بہادر جی۔ سی۔ یس۔ آئی۔ سلطان العلوم کی فرمانروائی کا ہے۔ اس مجمع میں غالباً متعدد ایسے لوگ موجود ہونگے جنہوں نے عہد عثمانی کے آغاز سے پہلے حیدرآباد کی درس گاہوں میں تعلیم ختم کی ہوگی۔ اور جو عالی تر یا فنی تعلیم کے خواہشمند رہے ہوں گے۔ لیکن ادھر ادھر تگ و دو کرنے کے بعد ضرور محسوس کیا ہوگا۔ کہ اس مقصد کے لئے بیرون ممالک محروسہ جانا ناگزیر تھا جو ذی استطاعت تھے اور شوق بھی کافی رکھتے تھے انہوں نے تو مدراس، پونہ، بمبئی یا علیگڑھ وغیرہ جاکر اپنی آرزو پوری کرلی ہونگی بقیہ لوگوں نے صرف حسرت ہی حسرت میں عمریں بیگاں کی ہونگی۔ میں آپ کے حافظہ پر اس وقت کی درس گاہوں کی تعداد اور ان کی تفصیل وغیرہ کی فہرستیں پڑھکر اعداد و شمار کا بار ڈالنا اور تکلیف دینا نہیں چاہتا چند سرسری لیکن مناسب حال واقعات بیان کردوں گا مشرقی علوم کے لئے اس وقت دارالعلوم کا دروازہ کھلا تھا مغربی علوم کے لئے (لیکن سائنس کو اس سے خارج کرکے) نظام کالج کی بلند عمارت موجود تھی۔ مگر اس میں داخل ہونے کا راستہ مدراس یونیورسٹی کے تعلق کی وجہ بہت دشوار گزار اور دشوار تھا۔

قانون کے شیدائی شب کو لا کلاس کی سیر کرلیا کرتے تھے مغربی طب کے خواہشمند طبی اسکول کی معدودے چند نشستوں پر متمکن ہوکر اس کے مختصر کورس کو پورا کرنے کے لئے ذی اثر حضرات سے سفارشی خطوط مانگتے پھرتے تھے۔ انجینئرنگ کے طلب گاروں کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ آرٹس اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم میں بھی ایسی ہی رکاوٹیں حائل تھیں۔ سائنس رو دھو کر انٹرمیڈیٹ تک تو حاصل کرتے تھے لیکن آگے جانے کا راستہ بند تھا عملی تعلیم کے لئے سامان مل سکتا تھا۔ تو عمارات کا سوال نئی جماعتوں کے افتتاح کو خارج از بحث کردیتا تھا۔ قدیم

طرز پر جنہوں نے عملی مشق بغیر مضامین سائنس میں ڈگریاں حاصل کرلی تھیں وہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھے اور دوسرے بدنصیب ان کو حسرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ایم اے کے لئے پڑھنا اور اس کی ڈگری حاصل کرنا صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ مدراس یا کسی اور جگہ چلے جاتے اور وہاں بھی برائے نام کسی پروفیسر سے مدد لیکر دو تین سال کتابیں رٹ لیتے اور ایم اے بن کر واپس آتے۔

ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات کا نام بھی ہند کی جامعات میں کبھی نہیں سنا جاتا تھا البتہ کتب نویسی اور خصوصاً نصاب کی کتابوں پر نوٹس لکھنا فارغ التحصیل شخص کے لئے مفید و کارآمد کام سمجھا گیا تھا۔ اور ہمارے ملک کے حضرات کبھی کبھی اس جولانگاہ میں قدم رکھتے تھے۔

ذرا اب حالیہ صورت کو دیکھئے جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا دسترخوان ملک کی معمولی سے معمولی حیثیت اور اوسط قابلیت والے لڑکے کے لئے بھی بچھا دیا ہے ملک کا ہر فرد و بشر جس نے ملک میں نشو ونما پائی ہے اور اسی لئے زبان اردو سے واقف ہے۔ اوق سے اوق مضامین میں ایم اے اور ایم ایس سی کی حقیقی معنوں میں تعلیم پا تا اور ڈگری حاصل کرسکتا ہے۔ یہ سہولتیں طب اور انجنیری اور ایجوکیشن کے پیشوں کی تعلیم میں بھی مہیا ہو چکی ہیں۔

عثمانیہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کے عالی شان مستقبل سے کون شخص ہے جو آشنا نہیں زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کارروائی جاری ہے اور امید ہے کہ چند سال کے بعد ہمیں ان مضامین میں بھی برٹش انڈیا کی محتاجی نہ رہے گی۔

اس بیان سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حیرت انگیز ترقی پر نازاں ہوکر اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر مطمئن ہو بیٹھیں کہ بہت کچھ ہو چکا ہے اب جو کچھ ہو رہا ہے صرف وقت کا سوال ہے، کافی مدت میں ہم تعلیم کے نقطۂ نظر سے کمال کو پہنچ جائیں گے۔ کمال تو کسی صورت میں ممکن نہیں یہ ایسی کی وہ (　　) ناممکناہی مقدار ہے جس کے صرف قریب تر ہونا ممکن ہے۔ لیکن جس کو پہنچ جانا ناممکن ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہماری رفتار ہماری متمدن زندگی کے لئے کافی تیز ہے۔ ہم جو روپیہ صرف کر رہے ہیں اس کی تقسیم تعلیم کے مختلف شعبوں پر ان کی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے صحیح اصول پر ہو رہی ہے یا نہیں میں نے اب تک صرف اعلیٰ تعلیم اور کچھ فنی تعلیم کا حال بیان کیا۔ دیگر شعبہ جات تعلیم کے متعلق بھی کیا ہماری ترقی کوئی حقیقت رکھتی ہے یا نہیں۔

سہولت کی خاطر تعلیم کو متذکرہ ذیل حصوں یا شعبوں میں تقسیم کرلیں تو بیجا نہ ہوگا:

(۱) ابتدائی تعلیم جس کے دو حصے کئے جاسکتے ہیں۔ ایک حصہ دیہی رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا اور دوسرا شہری رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا۔

(۲) وسطانی تعلیم

(۳) فوقانی تعلیم

(۴) جسمانی تعلیم یا فزیکل ٹریننگ

(۵) تعلیم اناث

(۶) اعلیٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم۔

(۷) ٹکنیکل تعلیم جو دستکاری پر زیادہ زور دے۔

(۸) پروفیشنل یا فنی تعلیم مثلاً طب، انجنیرنگ، زراعت، صنعت، تجارت، قانون وغیرہ۔

(۹) ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات علمیہ۔

(۱۰) معمر اشخاص کی تعلیم اڈلیٹ ایجوکیشن۔

(۱۱) معذورین کی تعلیم جیسے اندھوں، بہروں اور گونگوں کی۔

سنہ ۱۳۴۵ف کی رپورٹ سے جو زیر ترتیب ہے۔ میرے دوست مولوی فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات نے مجھے از راہ کرم جو اطلاع بہم پہنچائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار عالی نے پبلک ایجوکیشن کی اہمیت کے کماحقہٗ سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ بعض ابواب میں سرکار عالی کا فیاضانہ صرفہ دیگر ممالک کے لئے قابل تقلید سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ ابتدائی تعلیم ٹکنیکل تعلیم، تعلیم نسواں ریسرچ پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا موجودہ طریق تعلیم زیادہ تر برٹش انڈیا کے طریقہ تعلیم کی تقلید ہے لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ دن قریب آنے والا ہے۔ جب کہ یہ قدیم طریقہ ایک بڑی حد تک بدل دیا جائیگا۔ اور محض کتابی یا زبانی تعلیم کے عوض طلباء کو ملک و رعایا کے ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم دلائی جائے گی جس سے کسب معاش و روزگار میں انہیں حالیہ تکالیف و پریشانیاں برداشت کرنی نہ پڑے گی۔

اگر میں متذکرہ بالا (۱۱) ابواب پر تفصیل سے بحث کرنا چاہوں تو اس کے لئے کئی پکچروں کی ضرورت ہوگی۔ نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس اتنا وقت یا آپ حضرات کو اتنی فرصت ہے

ابتدائی تعلیم

اس پر صرف چند ابواب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر کے آپ صاحبوں سے استدعا کروں گا کہ ان پر غور فرمائیں۔

متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ملک کے تمام باشندوں کو لکھنا پڑھنا آنا ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسا کہ محض زندگی کے لئے کھانا پینا۔ جو لوگ نوشت وخواند سے واقف نہیں وہ متمدن نہیں ہو سکتے ابتدائی تعلیم کا لزوم ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے سے ان کو تہذیب سکھا دی جاتی ہے کیا سرکار کا فریضہ اس معاملہ میں صرف اسی قدر ہے اور بس میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ابتدائی تعلیم بالکلیہ ناقص ہے اور آگے چلکر اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم عام تو کی جائے لیکن اضلاع کے لئے یہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو کہ لوگ اپنے آبائی پیشوں کو ترک کر کے ملازمت کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کریں اور دیہات کو ویران و برباد نہ چھوڑ دیں۔ اسی طرح شہری رقبوں میں بھی ابتدائی تعلیم اگر طلبہ کو صنعت و دستکاری سے نا فرنبا کر صرف پیشہ ملازمت سرکاری یا وکالت ہی کو معزز پیشہ تصور کراتی ہے۔ تو اس سے احتراز کیا جانا چاہیے۔

ممالک محروسہ میں سب سے زیادہ عام جو پیشہ ہے وہ پیشۂ زراعت ہے۔ دیہاتی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں زراعت کی تعلیم بطور جزو اعظم شریک کی جانی چاہیئے۔ تاکہ لڑکے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ جانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ زراعت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور دھوکے میں پڑ کر علم یا ملازمت کی خاطر شہروں میں بھٹکتے نہ پھریں۔ جس سے نہ تو خود انہیں کوئی اطمینان کی زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان کے والدین یا سرپرستوں کو اولاد کی پرورش و تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اگر زراعت کا شوق دلائے اور اس کے متعلق صحیح اور مفید معلومات مہیا کرائے۔ تو اس سے بہتر کوئی تعلیم ہمارے ملک کی فلاح و بہبود اور نوع انسان کی خوشحالی کے لئے نہیں سوچی جا سکتی۔ ایسی دیہی تعلیم کے ساتھ اضلاع میں کافی ٹکنیکل مدارس کا کھولنا بھی ضروری ہوگا۔ زراعت محض بیج بونا اور کھیتوں کو پانی پہنچانا نہیں ہے۔ اس کے لئے آلات کی بھی ضرورت ہے وہ آلات ایسے ہونے چاہئیں کہ آسانی سے کم قیمت پر بروقت مہیا ہو سکیں ورنہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ جب تک ملک میں میکنیکل انجینئرنگ عالمگیر نہ ہو جائے آلات کا اس طرح بہم پہونچانا ناممکن ہے۔ عرصۂ دراز تک جانوروں گائے بیل وغیرہ سے کام لینا پڑے گا۔ اور ان کی نگہداشت بغیر حفظان صحت اور ویٹرنیری سرجری دشوار ہے۔ پس دیہات میں ایسے ٹکنیکل اور ویٹرنیری مدارس کا زیادہ تعداد میں کھولا جانا بھی ضروری ہے۔

زراعتی تعلیم سے متعلق مجھ کو فنی تعلیم کے ساتھ بھی کچھ کہنا ہوگا۔ شہری رقبوں کی تعلیم میں زیادہ تر شہر کی ضروریات کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس رقبہ کے لوگوں کی نظر زیادہ تر ملازمت اور تجارت و صنعت و حرفت کی طرف لگی رہتی ہے۔ عام تعلیم تو قدیم یا موجودہ طریقہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن وسطانی اور فوقانی مدارس میں اگر کمرشیل کلاسیں۔ ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دلائی جائے اور مناسب صنعت و حرفت کے مدارس کھولے جائیں تو شہروں میں بے روزگاری کا سوال زیادہ تشویش اور تکلیف کا باعث نہ ہوگا۔

جسمانی تربیت میں نہایت خوف و ہراس کے ساتھ چند سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ملک کے نوجوانوں اور خصوصاً طلبہ کی صحت جسمانی گھٹتی جا رہی ہے۔ شہر کے لڑکے اور لڑکیاں خاص طور پر کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ حفظانِ صحت اور معیشت کے عام مسائل کے ساتھ وابستہ ہے تمام ملک میں ملیریا طاعون اور دق کے امراض پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری سکونت و بود و باش کے مقامات غیر سائنٹیفک طریقہ پر منتخب ہوئے ہیں اور سچ پوچھو تو بمصداق:

"حیدرآباد نگینہ ـــــ اندر مٹی اوپر چونا"

انسانوں کی بود و باش کے لئے اتنے موزوں نہیں ہیں جتنے کہ چوہوں گھونسوں اور متعدی امراض کے لئے موزوں ہیں۔ میں دولت مند بزرگوں اور صاحب ثروت امرا سے معافی چاہ کر عرض کروں گا کہ ماحول کے اثر نے ان کے مکانات کو بھی جراثیم سے مصئون اور مبرا نہیں رکھ چھوڑا ہے۔ حفظانِ صحت کی معمولی سے معمولی واقفیت بھی اس سقم کو دور کر دیگی۔ آرائش بلدہ کی اسکیم سرعت کیساتھ جاری ہے تو قع کیجاتی ہے کہ غربا کی رہائش کا مسئلہ بھی خاطر خواہ طریقہ پر حل ہو جائیگا۔ یہ امور سر رشتہ تعلیم کے دائرہ سے باہر ہیں سر رشتہ تعلیم طلبہ کے اقامت خانوں اور طلبہ کی ورزش جسمانی کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔ اقامت خانوں کی زندگی اخلاقی اصول کے تابع ہمدرد اساتذہ کے زیر نگرانی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اس کے ساتھ ساتھ اگر ورزش جسمانی کا بھی انتظام کیا جائے تو ملک کے آئندہ شہری (citizens) اپنی تندرستی کی وجہ زیادہ صحیح الدماغ و خوش خلق اور کارفرما و کارکن ثابت ہوں گے۔ بوائے اسکاوٹس مومنٹ نرمل کور کا قیام اور طلبہ مدارس کی عام جسمانی تربیت کے لئے ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ تجربہ کار شخص کا تقرر حال ہی میں عمل میں آیا ہے۔ ہمیں امید دلاتے ہیں کہ طلبہ کی صحت جسمانی میں معتدبہ ترقی ہو جائے گی۔ یونیورسٹی کے طلبہ کا سالانہ طبی معائنہ بھی منظور ہو چکا ہے اگر . . . .

مدارس کی عمارتیں سائنٹیفک اصول کے بموجب بن جائیں گی تو طلبہ کی اکثر و بیشتر جسمانی کمزوریاں مثلاً بینائی کا قصور، خشیوی نقائص وغیرہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گے۔

طلبہ کا فطرتاً ورزش جسمانی کی طرف میلان طبع ہوتا ہے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ اقامتی جامعات میں سب سے بڑی تربیت کتابی علوم سے بدرجہا بڑھ کر کھیلوں اور ورزش جسمانی اور معاشرتی زندگی ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے بڑے مدارس میں بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں۔ اس فطری شوق کی ایک مثال شفیع احمد صاحب سابق طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی پیراکی میں کامیابی ہے۔ جیساکہ اکثر حاضرین کو معلوم ہے اسی فطری جذبہ نے شفیع احمد صاحب کو رودبار انگلستان کے عبور کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس عالی شان عزم میں کامیاب ہو جائیں۔

ٹکنیکل تعلیم

ٹکنیکل تعلیم پر میں نے اس سے پہلے بھی کچھ کہا ہے۔ کسب معاش کے نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت واضح ہے لیکن یہاں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ٹکنیکل تعلیم کی کامیابی کے لئے اول تو ملک کی صنعت و حرفت کا وسیع پیمانہ پر موجود ہونا لازمی ہے۔ کارخانوں کے مالکوں کو ایسے ہونہار کارآموزوں کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے۔ جو وہاں جاکر نوکری کرنا چاہتے ہیں۔ کارآموزوں کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے مدرسہ یا جامعہ کی سند ان کو اگر کسی ہنر کا اہل بناتی ہے تو محض کارخانوں میں داخل ہو کر کام سیکھنے کا اہل بناتی ہے . . . . اصل کام وہ کارخانوں ہی میں سیکھیں گے اگر یہ اسپرٹ رہی تو ملک میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ فروغ ہو گا لیکن انڈسٹری یا صنعت میں کسی ملک کا حقیقی معنوں میں ترقی کرنا محض اس قسم کی تدابیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بعض معاشی اور بین الاقوامی مسائل کا حل ہونا بھی ضروری ہے۔ برطانوی ہند کے معاشی اور ٹکنیکل ماہر اور علی الخصوص کیمسٹ اس طرف توجہ کر رہے ہیں مجھے اپنی طرز زندگی اور مصروفیتوں کی وجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سردست میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان حضرات کو جو اس مسئلہ کے حل میں اپنے آپ کو مشغول بتاتے ہیں تحقیقات کر لینے دیں اس کے بعد ہم ان کے نتائج پر تنقید کر سکیں گے ہمارے ملک کی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر رہے ہیں چاہیے کہ سردست زراعت ہی کے مسائل پر غور کریں اور ان کے تمام حل ڈھونڈیں۔

جو کچھ بھی ٹکنیکل تعلیم ہم دے سکتے ہیں اس کو کامیاب بنانے کیلئے طلبہ کو بالطبع دست کاری کی طرف مائل اور اس سے مانوس بنانا سررشتہ تعلیمات کا بڑا فریضہ سمجھا جا سکتا ہے اس کے لئے ابتدا ہی سے طلبہ کو

دست کاری کا عادی بنا نا ضروری ہے۔ پس مناسب ہوگا کہ دستکاری کو تعلیم کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔
سائنس چونکہ ایک عملی علم ہے اس کو بھی ابتدا ہی سے نصاب تعلیم میں شریک کرنا لازمی ہوگا۔ جتنے بھی عملی مضامین ہیں ان سبھوں کی بنیاد طبیعات، کیمیا، حیاتیات اور ریاضی پر قائم ہے۔ پس ان مضامین کی طرف خاص توجہ کی جانی چاہیے۔ اور اعلیٰ تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ترقی و ترویج کا انتظام ہونا چاہیے۔

اعلیٰ تعلیم اعلیٰ تعلیم ایک ایسی شئے ہے کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش بلکہ تکوین ہوتی ہے۔ الحمدللہ ہمارے ملک میں اس کی طرف بتوسط جامعہ عثمانیہ و نظام کالج وغیرہ کافی توجہ کی جارہی ہے۔ دس بارہ سال کے اندر جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اور ایم ایس سی تک کی جماعتیں کھل گئیں۔ ایل ایل بی کی تعلیم بھی اچھے اصول پر جاری ہے۔ جامعہ کے موزوں عمارت نہ ہونے سے ہمیں اس تعلیم سے وہ حیرت انگیز فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے جس کی ہمیں توقع ہے۔ باوجود ان رکاوٹوں کے ہم نے جو کام شروع کر دیا ہے اس کی اہمیت کو ممالک غیر کے ماہر نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ بلحاظ تعلق مجھے جامعہ عثمانیہ کے متعلق زیادہ نہیں کہنا چاہیے۔ صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ حیدرآباد میں جامعہ کا قیام ایک فطری امر تھا۔ اور اسی طرح اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی ہمارے کے لیے ایک فطری بات تھی۔ گزشتہ جلسہ تقسیم انعامات کے موقع پر میں نے بیان کر دیا ہے کہ اردو زبان میں تعلیم حقیقی باشندگان ملک کے تمام افراد کو بلالحاظ قوم و ملت انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلانے سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔
میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ملک کی دوسری زبانوں مثلاً تلنگی، مرہٹی اور کنٹری کی بھی خاطر خواہ خدمت کی جارہی ہے۔ ان زبانوں میں ایم اے تک کی بھی تعلیم دی جاتی لیکن ان سے پروفیسروں نے زمانہ کا رنگ اور ہندو طلبہ کا طبعی رجحان دیکھ کر یہی مشورہ دیا کہ بجائے ورنیکولر زبانوں میں ایم اے کی جماعتیں کھولنے کے ریسرچ کی تعلیم دلائی جائے چنانچہ حال میں (۵، ۵، ۷) روپیہ کے تین وظائف ان زبانوں کی ریسرچ کے لئے منظور ہوئے ہیں اور یہ کام آئندہ شہریور سے شروع کر دیا جائیگا۔ سائنس میں ایم ایس سی کے ساتھ ریسرچ بھی شریک کر دی گئی ہے۔ تاریخ کے ایم اے میں پہلے ہی سے مقالہ نویسی داخل تھی اب اردو میں بھی اسکو لازمی کر دیا جانا تجویز ہوا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اس بارے میں میں ذرا زیادہ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں:

کسی قوم یا ملک کا وقار اس کے اعلیٰ ترین افراد سے ہوتا ہے وہ کون ہیں؟ ملک کے مدبر و عمائد سلطنت جو اپنی قابلیت، وفا شعاری، ہمدردی اور کارگزاری سے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ امرا و سرمایہ دار جو اپنے فضل و کرم

جود و سخا اور ملک کی خدمت گزاری سے رعایا اور حاجتمندوں کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں ان کے سوا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو زمانہ دراز سے دنیا پر اپنا اثر ڈالتا چلا آرہا ہے۔ اس طبقہ میں مذہب و ملت کے پیشوا اور علماء و فضلا شریک ہیں زمانہ حال کی مادیت پرستی نے افسوس ہے کہ پیشوایان مذہب و ملت کو خارج از بحث گردانا اس لئے میں ان کا ذکر اس جگہ مناسب نہیں سمجھتا سچی بات تو یہ ہے کہ علما فضلا ہی اس زمرہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے علما فضلا ہی کے متعلق بحث کروں گا۔ پہلے زمانے میں خانگی تعلیم سے یا کسی مشہور و معروف استاد کی خدمت سے لوگ علم و فضل کے بلند ترین درجوں تک پہنچ سکتے تھے۔ اب مادی علم اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ بغیر اعلیٰ پیمانہ پر باقاعدہ اور مسلسل کوشش کرنے کے ملک کا کوئی فرد حقیقی معنوں میں عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔ روحانیت کا دروازہ بند ہونے کو ہے صرف مادیت میں ترقی اور حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ خواہ فنون کے شعبہ میں ہو یا سائنس کے شعبہ میں نام آوری حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی تحقیق صرف بڑے پایہ کے کتب خانوں اور تجربہ خانوں ہی سے ممکن ہے۔ قابل سے قابل شخص ان کتب خانوں اور تجربہ خانوں کے بغیر گمنام رہ جاتا ہے۔ اور اوسط ذہانت کا انسان بھی ان میں کام کرکے کبھی کبھی بڑے اہم اور نمایاں ایجادات و انکشافات سے دنیا کو مسخر کر لیتا ہے۔ کتب خانوں اور تجربہ خانوں پر سرکار یا قوم کی طرف جتنا بھی روپیہ صرف ہو فائدہ سے خالی نہیں۔ ان میں کام کرنے والوں کو اطمینان قلب نصیب ہونا چاہیئے۔ اگر ایسی پروفیسریاں قائم کردی جائیں اور ان پر ملک کے قابل ترین اشخاص مامور کئے جائیں تو ممالک محروسہ میں بھی اسی پایہ کی ایجادات و انکشافات دیکھنے میں آسکیں گی جیسی کہ برطانوی ہند کے بعض حصوں میں ابنمایاں ہو رہی ہیں اور جن کا چرچا چاردانگ عالم میں ہو رہا ہے۔ سررامن، بندرناتھ ٹیگور، میگ ناتھ ساہا، اور سرسی وی رامن وغیرہ کی وجہ علمی دنیا میں ہندوستانیوں کو جو شہرت نصیب ہوئی ہے وہ بیس سال قبل لوگوں کے وہم و گمان سے بھی باہر تھی کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے سرآوردہ ماہران علوم و فنون میں حیدرآباد کے منتخب افراد کا نام داخل نہ ہو۔ ایسے کام کرنے والے یہاں ڈھونڈنے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کو موقع دیا جانا چاہیئے۔ ایک بار جب وہ اطمینان کے ساتھ کام پر لگ جائیں گے تو ان کے زیر اثر ملک کے ہونہار طبقہ سے بھی ایک بڑی جماعت ایسے محققین کی پیدا ہونے لگے گی۔ میں نے کوڈائی کنال (Kodaikanal) کی رصدگاہ شمسی طبیعات (Solar physics observatory) میں ریسرچ کی اجازت ہمارے طالب علموں کے لئے حاصل کرلی پروفیسر ساہا نے ہمارے ایک ایم۔ ایس۔ سی کے طالب علم کو الہ باد کی فزکس لیبوریٹری میں

(SPECTEROSCOPY) پر کام کرنے کی دعوت دی ہے نظام کالج کے ایک ہونہار گریجویٹ نے
پروفیسر رامن کے تجربہ خانہ میں قابل تعریف کام کرنا شروع کر دیا ہے یہاں میں جامعہ عثمانیہ کے ان لائق طلبہ کا
ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے یورپ کی جامعات میں قابل تحسین کامیابی حاصل کی ہے اور کر رہے ہیں
اس لئے کہ متعدد موقعوں پر میں نے تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کر دیا ہے اگر ہم ہمارے تجربہ خانوں کو ترقی دیکر اطمینان
کے ساتھ اعلیٰ تحقیقات کا کام شروع کر دیں تو ہمارے طلبہ کو باہر جانے کی ضرورت نہ ہوگی اور تحقیقات میں
جو کچھ کامیابی حاصل ہوگی اس کا کریڈٹ ہمارے ملک ہی کو ملے گا۔

تعلیم نسواں اب میں تعلیم نسواں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگرچہ گزشتہ چند سال سے ہم نے
اناث کی اعلیٰ تعلیم پر کافی روپیہ صرف کرنا شروع کر دیا ہے اور مستورات کو یورپ بھیجکر تعلیم دلائی
جارہی ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی تعلیم نسواں پر اس سے بہت زیادہ روپیہ اور توجہ صرف کرنے کی شدید
ضرورت ہے۔ عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ روزمرہ کی معمولی اور ان کے ضروریات کے
مناسب تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے
خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو بلند طبقہ کی ہوں یا پست طبقہ کی نہ صرف لکھنے پڑھنے کی بلکہ اچھے اور اونچے
معیار تک کی تعلیم دلانا کس لئے ضروری ہے۔ اگر ہندوستان مہذب دنیا کی نظروں میں عزت مقام
چاہتا ہے تو اسے بہت جلد اپنے اناث کو تعلیم یافتہ بنا دینا چاہیے۔ لیکن اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ
لڑکیوں کو ان کے مفید مطلب اور کارآمد تعلیم دلائی جائے لڑکیوں کے لئے لڑکوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہی
غیر موزوں ہے جیسے کہ فوجی ملازمت اگر مطمح نظر یہی ہے کہ لڑکیاں بھی سب کی سب لڑکوں کی طرح
میٹرکیولیٹ انٹرمیڈیٹ پاس یا بی اے ایم اے بن کر تعلیم گاہوں سے نکلیں تو میں بلا تامل اپنے آپ کو ایسے
ماہران فن تعلیم کے زمرہ سے علیحدہ کروں گا جن کا یہ مطمح نظر ہے اس مسئلہ کے متعلق بارہا اناث کی تعلیم کیلئے
سرپرستوں اور مہتمموں سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا میں نے جب دریافت کیا کہ انگلستان کے مدارس میں
اعلیٰ تربیت اناث کے اصول پر تعلیم کیوں نہیں دیجاتی تو یہی جواب ملا کہ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم لڑکیاں ہمارے
مدرسوں میں شریک ہونگی کیونکہ سرکاری یا یونیورسٹی کی سند کی رشوت کے بغیر اکثر والدین اپنی بچیوں کو
مدرسہ بھیجنا عبث سمجھتے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد یہ خیال پبلک کے دلوں سے دور ہو جائیگا
اور تعلیم کے اصل منشاء و مقصد کی طرف وہ مائل ہو جائینگے۔

یہ سرکاری اور یونیورسٹی کی سندیں ہیں جو غالباً اناث کو بھی انہیں نصاب کا پابند کراتی ہیں جو مردوں کے لئے تجویز ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید مسٹر کاروے (Karve) کی بنائی ہوئی مستورات کی جامعہ نے حصول سند کے شوق کو مفید مطلب نصاب کے ساتھ ایک حد تک نباہ دیا ہے۔ لیکن بہ نظر غائر اگر دیکھا جائے تو الا اس صورت کے جب کہ عورت کو مجبوری یا محض شوق کی خاطر نوکری اختیار کرنا پڑتا ہے حصول سند کی خواہش ضروری ہے۔ اور اگر درس گاہیں صحیح اصول پر باقاعدہ طریقہ سے اناث کی ضروریات ہی سے متعلق نصاب تجویز کر کے تعلیم دینا شروع کریں تو میرا خیال ہے کہ بیشتر روشن خیال والدین اپنی بچیوں کو ایسے ہی مدرسوں میں بھیجنا پسند کریں گے اور تعلیم یافتہ اناث کی تعداد میں معتدبہ ترقی ہوگی ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں یقیناً اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی خوش رہینگی اور شادی کے بعد شوہروں میں بھی بخوبی اتفاق رہے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی ذہانت والی یا اعلیٰ تعلیم کی دلدادہ لڑکی محض اکتساب علم کی خاطر یونیورسٹی کا کورس اختیار کرنا چاہتی ہے تو ایک دوسری ہی بات ہے۔ ایسی لڑکی کو جس قدر بھی اس کے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے مدد دی جائے اچھا ہے ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ملک سے ایسی چند لڑکیاں نکلیں گی اور اپنے ماں باپ اور وطن کا نام روشن کرینگی۔

اگر اناث کو سینا پرونا، کشیدہ کاڑھنا اور کھانا پکانا سیکھ لینے کے بعد حفظان صحت، ڈومسٹک اکانومی، بیالوجی یا طب خصوصاً ([illegible]) دایہ گری اور نرسنگ (Nursing) کا شوق دلایا جائے تو وہ ملک و قوم کے لئے نہ صرف مفید بلکہ مایہ ناز بھی ہونگی آخر الذکر دو شعبوں میں بڑی ہندوستانی عورتوں اور علی الخصوص مسلمان عورتوں کی اس قدر قلت ہے کہ ان کے لئے سرکار اور پبلک کی جانب سے خاص طور پر کوشش کیجانے کی ضرورت ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ پردہ مانع تعلیم اناث ہے اور جب تک یہ نہ اٹھ جائے گا ہندوستان میں تعلیم یافتہ عورتیں عنقا ہی عنقا رہیں گی پردہ کی حقیقت یا اس کی ضرورت و غیر ضرورت کا سوال معاشرتی ہے خالصاً تعلیمی نہیں لہذا میں اس کے حسن و قبح پر اس محفل میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ پردہ کا عذر بتا کر جو لوگ تعلیم اناث سے غفلت کرتے ہیں اور اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ پردہ اٹھا دیں بعد کو عورتوں کی تعلیم شروع کریں اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کے گھروں کا پردہ تو غالباً اٹھ جائیگا لیکن اس میں تعلیم داخل نہیں ہوگی۔

ایسی پردہ نشین شادی شدہ مستورات کی تعلیم کے لئے جو اپنے گھر کے کاروبار اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ مدرسہ جا کر علم حاصل نہیں کر سکتیں سن نا سکتے ایک اسکیم زیر نظر ہے جو محلوں یا خاندانوں کے اتحاد عمل پر مبنی ہے جب یہ اسکیم مکمل صورت اختیار کر کے حیدرآباد کی انجمن خواتین (WOMEN'S ASSOCIATION) کی منظوری حاصل کرے گی تو امید ہے کہ اس سے بہت خاندان استفادہ کر سکیں گے کیا عجب ہے کہ اپنے خطبہ میں محترمہ مسز رستم جی اس مسئلہ پر بھی بحث کریں۔

تعلیم نسواں کے کئی اور مسائل حل طلب ہیں مثلاً یہ کہ آیا چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقررہ عمر تک مدارس میں ایک ساتھ تعلیم دلانا مناسب ہے یا نہیں یا یہ کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دلانا زیادہ مفید ہوگا یا اپنی مادری زبان کی تعلیم مسائل بہت دلچسپ اور ان پر خالص تعلیمی نقطہ نظر سے اچھی بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ خوش نصیبی سے محترمہ مسز رستم جی موضوع تعلیم نسواں پر تقریر کرنے والی ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کو اب ختم کردوں۔

اب میں مختصر طور پر یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تعلیم کی اسپرٹ کیا ہونی چاہئے مجھے یہ کہنے میں مطلقاً تامل نہیں کہ وہ تعلیم جو اخلاق کی نگہداشت نہ کرے عبث اور بے سود ہے۔ انسان میں اخلاق حمیدہ جب تک نہ پیدا ہوں وہ بہائم سے علیحدہ نہیں سمجھا جا سکتا مختلف زبانوں اور تمدن میں اخلاق کی تعلیم مختلف طرزوں پر رہی ہے لیکن ہر صورت میں اس کا کوئی معین نصاب نہیں رہا ہے یہ زیادہ تر اساتذہ کے اخلاق اور ملک کے اخلاق ہی پر مبنی رہا ہے قدیم زمانے میں شاگرد استاد کو اپنے ہر کاروبار میں پیشوا اور رہادی سمجھتے تھے۔ اور اساتذہ کو بھی اپنے شاگردوں سے ایسی محبت اور انست تھی جیسی کہ اپنی اولاد کے ساتھ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں تعلیم مفت دیجاتی تھی یا اساتذہ کا معاوضہ اوقاف یا اسٹیٹ کی دیگر پوشیدہ امداد کے ذریعہ سے کچھ ایسے غیر محسوس طریقہ پر ادا ہوتا تھا کہ تعلیم مفت ہی متصور ہوتی تھی۔ زمانہ میں رفتار کے ساتھ اس طرز تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ موجودہ تنخواہ یاب اساتذہ کا کم از کم ایشیائی ممالک میں وہ احترام نہ رہا جو پرانے عہد کے اساتذہ کو نصیب تھا۔ لوگ یہی سمجھنے لگے کہ استاد کو اگر ہماری فیس سے روپیہ نہیں ملتا ہے تو کم از کم سرکار سے تو ضرور معاوضہ ادا ہوتا ہے۔ پس ہم پر احسان ہی کیا۔ معمولی تعلیم کی حد تک تو ایسے یا ان سے مختلف خیالات کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم و تحقیقات عالیہ کا سوال پیدا ہوا تو اساتذہ نے یہ محسوس کیا کہ ان ابواب میں طلبہ کی رہنمائی ایک ایسی چیز ہے جس کا معاوضہ روپیہ پیسے سے کسی طرح

ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی معاوضہ ہو سکتا تو وہ اپنے صرف شاگرد کی عقیدت، فرمانبرداری اور سعادت مندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے طلبہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور جن جامعات میں آئے دن نئی نئی تحقیقات وانکشافات کی بارش برس رہی ہے وہاں استاد اور شاگردوں ایسے ہی تعلقات پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں دیکھے جاتے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ ہر درجہ کی تعلیم میں بھی اس قسم کا تعلق برقرار رہتا۔ زمانہ گذشتہ کی اس خوبی کو کر حاصل کرنے کیلئے اساتذہ کو زیادہ ایثار سے کام لینا ہوگا اور شاگردوں کو زیادہ سعادتمندی اور اطاعت گزاری اختیار کرنی ہوگی۔ جو کامیاب استاد ہیں وہ اب بھی پیشہ تعلیم کو حصول زر کی خاطر نہیں اختیار کرتے بلکہ محض علم کی محبت میں اختیار کرتے ہیں جو جاہ طلب ہیں وہ اس میدان میں زیادہ دن رہنے نہیں پاتے۔ وہ یا تو اپنا پیشہ ہی بدل دیتے ہیں یا زمانہ انہیں ایثار سکھا دیتا ہے۔ یہ تو اساتذہ سے متعلق واقعات ہیں۔ طلبہ بھی جب تک سعادتمندی نہیں اختیار کرتے انہیں علم نہیں نصیب ہوتا۔ اور اگر نصیب بھی ہوا تو اس کے مفاد سے وہ محروم رہتے ہیں پس میں اساتذہ وطلبہ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ نوع انسان کے ارتقاء وفلاح وبہبود کی خاطر وہ زمانہ ماسبق کے ان مبارک اخلاق واطوار کو اپنا نصب العین بنالیں جس سے معلم ومتعلم دونوں کی عزت افزائی ہوتی تھی - اور دونوں کو بیرون از قیاس فائدہ پہونچتا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں استاد ہیں وہ اپنے ہونہار شاگردوں کے مفاد کے لئے اگر ضرورت ہو تو تمام دنیا سے بگاڑ کر لینا بھی پسند کرتے ہیں ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ شفقت استاد کی بدولت کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی یکتائے روزگار بن گئے۔ ان کی دنیا و عاقبت دونوں اچھی رہی ہیں استاد کا احترام اور اس کے ساتھ وفا شعاری شاگرد کے لئے ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے جو مذہبی حکم کی وقعت رکھتا ہے۔

معمر لوگوں کی تعلیم یا اڈلٹ ایجوکیشن ایک زمانے سے زور دیا جارہا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ایسے مرفہ الحال لوگ جو بدقسمتی سے اوائل عمر میں اچھی تعلیم پاسکے عمر بھر ایسے ہی ناقص التعلیم رہیں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کا تمدن زیادہ تر تعلیم ہی پر قائم ہے اور تعلیم عمر اور دیگر قیود سے بری ہے معمر شخص کے لئے امتحانات کامیاب کرنا یا ڈگریاں لینا اگر ممکن نہیں تو محض علم کی خاطر تحصیل علم چنداں مشکل نہیں انسان کی قوت ارادی فضا اور وقت دونوں پر غالب آسکتی ہے علم کے ایسے

طلب گارکتب خانوں نائٹ کلاسوں اور پاپولر یا کلشن لکچروں سے خاطر خواہ استفادہ کرسکتے ہیں۔ پس امید کیجاتی کہ سرکار یا دولت مند پبلک کی طرف سے انسٹیٹیوشن زیادہ تعداد میں اور سرعت کے ساتھ قائم ہوتے جائینگے۔ پبلک کتب خانوں کا اثر ملک کی خواندگی پر انتہا درجہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بلدہ و مضافات میں ہمارے ملک میں بھی ایسے کتب خانے بڑی تعداد میں قائم ہونے لگے ہیں اگر ان کتب خانوں کے سرپرست یا مہتمم محض اشاعت تعلیم ہی اپنا نصب العین رکھیں اور سیاسی یا سازشی آلائشوں سے ان کو پاک صاف بنائیں تو ملک علم کی تنویر سے منور ہوجائیگا اور فرقہ بندی کے جھگڑے آپ سے آپ رفع ہوجائینگے۔

اشاعت تعلیم میں صاحب ثروت امرا اور دولتمند اشخاص کا اثر اب تک ہم نے جو کچھ کہا وہ زیادہ تر سرکاری انتظامات تعلیم ہی سے متعلق تھا۔ ہمارے ملک ہند میں پبلک کو ابھی سرکار کا ہاتھ بٹانے کا خیال نہیں پیدا ہوا ہے۔ اگر پبلک بھی ایسے تعلیمی اور رفاہ عام سے متعلق کاموں میں محض زبانی نہیں بلکہ دام و درم کے ساتھ دلچسپی لے تو یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں کسی دوسرے متمدن ملک سے پیچھے نہیں رہے گا۔ امرا اگر کارہائے تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم ان کو دلچسپی دلانے کی کوشش کریں۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک حیدرآباد میں لائق اور نامور اساتذہ وغیرہ بہت گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی طبقہ امرا یا صاحب ثروت حضرات پر اپنے علمی کاموں کا ایسا گہرا اثر نہیں جمایا جس سے ان بزرگ ہستیوں کو کم از کم وظائف یا انعام تعلیمی کے ذریعہ ان اساتذہ کی یادگاریں قائم کرنے کا کچھ بھی احساس پیدا ہوا ہو۔ جو یادگاریں قائم ہیں وہ زیادہ تر سرکاری ہی کی رقم سے قائم ہیں۔ پبلک فنڈ سے اگر کوئی یادگاریں قائم ہیں تو ان کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا دونوں مساوی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس قلت کی وجہ زیادہ خود اہل علم کا باہمی حسد یا سہل انگاری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب ان کمزوریوں کو رفع کریں گے اور طبقہ علما کی فضیلت کو ملک سے منوا کر انہیں اس بلند رتبہ پر پہنچادیں گے جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

مطابع اور ان کا اثر اشاعت تعلیم پر مطابع خواہ انگریزی ہوں یا اردو یا دیگر ملکی زبانوں کے مدارس سے بھی زیادہ علم کی اشاعت کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہزارہا

معلومات دور دراز مقامات تک اور عام طور پر بہترین پیرایہ میں پہنچائی جاتی ہیں۔ مطابع کے مالک اور علمی اخبارات و رسالہ جات کے ایک طرح سے علم کے سرپرستوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ انھیں اپنی قوت کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنی اس قوت کو اچھے ہی کاموں میں صرف کریں گے۔ ان کے پاس ایک نہایت ہی تیز شمشیر ہے جس سے وہ اگر چاہیں تو جہل اور دروغ کو دنیا سے نیست و نابود کردیں پس انہیں چاہیئے کہ اس ہتھیار کو صرف نیک کاموں کی تائید میں استعمال کریں لغویات اور غلط بیانی اور غیر محققہ اطلاعوں کی شاعت سے پرہیز کریں ورنہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا وہ مشہور شعر ان کے حسب حال سمجھا جا سکیگا۔

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اب ایسے مدبّر پیدا کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے جو اس شعر کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور واقعات کے بیان اور رایوں کے اظہار میں حق شناسی اور نیک نیتی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں سیاسیات کو نظر انداز کرکے مطابع کے ان کاروبار سے بحث کر رہا ہوں جو علمی رسالوں اور کتابوں کی طباعت سے متعلق مناسب رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سے ہر گھر مدرسہ یا دار التعلیم بن سکتا ہے اور ان کا ہر مطالعہ کرنے والا ایک گھریلو یونیورسٹی کا طالب تصور ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری اقتصادی کمزوری اجازت نہیں دیتی کہ ملک میں مطابع کی کافی تعداد مہیا ہو جائے اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں انگریزی اور اس میں بھی ریاضی اور سائنس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں خدا کرے کہ طباعت کتب کے لئے حیدرآباد میں جلد مدراس بھی کلکتہ وغیرہ کی سی سہولتیں میسر ہو جائیں تاکہ مصنفین کو تصنیف و تالیف کی مزید سہولت ہو اور پڑھنے والوں اور علی الخصوص طلبہ کو سستے داموں اور عمدہ چھپائی کی کتابیں مل سکیں۔

یہاں اردو ٹائپ اور نستعلیق وغیرہ کا سوال بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ حال ہی میں نستعلیق کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے تھے اور اس کا مسئلہ زیر سرپرستی سرکار عالی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہوا ہے اس لئے میں صرف اتنا بیان کرکے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار عالی نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش میں کئی ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے۔ اور خرچ کرنے پر آمادہ ہے جس سے اس کی سرپرستی علم کا ایک مزید

ثبوت ملتا ہے۔

تعلیمی نمائشیں اور ان کے فوائد

سابق میں ہماری تعلیمی کانفرنس کے جلسوں کے ساتھ علمی نمائش کا بھی انتظام ہوتا آیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ حتی الامکان ایسی نمائشوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں ان کے قیام و انتظام پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ بیان کروں کہ اگر ہر سال بلدہ کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسی نمائشیں منعقد کیجائیں اور دیگر ممالک کے مدارس اساتذہ وغیرہ کو ان میں شرکت کی دعوت دی جائے تو شوق مسابقت اور باہمی ارتباط نہ صرف تعلیم کی ایفی شنسی (EFFICIENCY) یعنی استعداد کو ترقی دیگا بلکہ آپس کا اتحاد بھی بڑھادیگا جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے۔ ایسی نمائشوں میں سینما کے ذریعہ تاریخی و اقتصادی مطالب پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور سائنس کے جدید ترین تحقیقات اور ان کے نتائج سے چھوٹے اور بڑے بچے اور بوڑھے سب کے سب بوقت واحد واقف کرائے جاسکتے ہیں۔

فوٹوگرافی اور پینٹنگ

اسی ضمن میں میں نقاشی وعکاسی یعنی پینٹنگ اور فوٹوگرافی کی ضرورت تعلیم کیجانب آپ کو متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک کو عمدہ پینٹروں اور فوٹوگرافروں کی سخت ضرورت ہے سیر و سیاحت کے ذریعہ انسان اپنے اور پرائے ملکوں کے خوشنما مناظر سے آگاہ ہوجاتا ہے اور ان کا خوش گوار اثر اس کے جمالیاتی حواس کو تقویت بخشتا اور اس کی اخلاقی زندگی کو فروغ دیتا ہے لیکن حافظہ کہاں تک اور کب تک کام دیسکتا ہے ان چیزوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمدہ فوٹو یا تصاویر لئے جائیں بعض صورتوں میں فوٹوگراف کے ذریعہ اشیاء کی تفصیل حسب خاطر خواہ نہیں کیجا سکتی معہذا اچھے سے اچھے فوٹوگراف زیادہ دیرپا نہیں ہوتے اس لئے پینٹنگ یا ڈرائنگ اور فوٹو انگریونگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے ہمارے ملک میں مہذب دنیا کے ان مشہور و معروف کمالات کا شوق پیدا کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ان کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جائے اگر ہر سال چند ہونہار طالب علم اٹلی یا دیگر مشہور ممالک یورپ کو فنون لطیفہ کی تعلیم کے لئے بھیجے جائیں تو ملک کو اس سے بڑی تقویت ہوگی ان کمالات کے کسب سے انسان کی حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذی استطاعت و صاحب ثروت لوگ ممالک غیر کی خوبیوں کو دیکھکر اپنی بود و باش کے شہروں کو بھی خوشنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیر و سیاحت (اکسکرشن)

شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے:-

گر بہ دکان حنانہ درگردی ـــــ ہرگز اے خام آدمی نشوی

بر واندر جہاں تفرج کن ـــــ پیش ازاں روز کز جہاں بروی

کون ایسا شخص ہے جو سیر و سیاحت کے فوائد سے انکار کرتا ہے یا اس کا لطف اٹھانا نہیں چاہتا کسی عمر میں بھی ہو سیاحت مختلف طریقوں سے منفعت بخش ہوتی ہے لیکن نوعمری اور طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ انسان کے حواس مشاہدہ قوی تر اور اس کی آئندہ زندگی کو ایک خاص شکل میں ڈھالنے کے مواقع بیشتر اور بہتر ہوتے ہیں سیر و سیاحت زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے انگلستان کے مدارس (صاحب ثروت اور علم دوست اصحاب کی مدد سے جو کیا عجب کہ انہی مدارس کے طلبہ قدیم میں سے ہوں) طلبہ کی سیر و سیاحت کا خاص طور پر انتظام کرتے ہیں سولہ سترہ سال کے لڑکے چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں دوران مدت تعلیم دنیا کا سفر کر کے اپنے اپنے مدرسوں کو واپس لوٹتے ہیں یو ائے سکاوٹ کے منتظمین بھی اس قسم کے کاموں میں عہدہ داران مدارس کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایسے اکسکرشن ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ اور سب کے سب دلچسپی سے مملو ہوتے ہیں ان میں کوئی پا پیادہ ملک کا سفر کرتے ہیں کوئی سیکلوں پر اگر دور کا سفر مطلوب ہے۔ تو ریل یا جہاز کے ذریعہ سیاحی کرتے ہیں ارباب دول کے فرزند موٹر کاروں میں گھوم کر آتے ہیں شاید چند سال کے بعد ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی طلبہ سیاحت کر سکیں چونکہ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ اس قسم کا سفر مدرسہ کی زندگی کا ایک جزو ہے اور ڈسپلن یعنی ضبط کما حقہٗ ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لئے دوران سفر کوئی ناگوار بات وقوع میں آنے نہیں پاتی اگر آتی ہے تو خاطی کو پوری سزا دیکر واپس بھیج دیا جاتا ہے جب نوعمر طالب علم ایسے باقاعدہ طریقہ پر دنیا کی سیر کرتا ہے اس کے مختلف ممالک پہاڑ، دریا، جنگل، میدان، شہر اور قصبے دیکھتا، متعدد اقوام کی بیشمار درسگاہوں پر نظر ڈالتا، ان کے ہم عمر بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا اور کھیلتا ہے تو دنیا اس کے اندازہ میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور انسان کا عز و وقار اور اس کے ساتھ ہی خالق قدرت اور عظمت کا یقین اس کے دل میں بڑھ جاتا ہے اگر بنی نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرانا مقصود ہے تو شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔

کھیل

کھیلوں کے متعلق جسمانی تربیت کا ذکر کرتے وقت میں کچھ زیادہ نہ کہہ سکا ابھی ابھی سیر و سیاحت کے بیان میں میں نے کھیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے طلبہ کے لئے کھیل بھی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کہ درس اس دعوی کے ثبوت میں مجھے کوئی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہر کس و ناکس مدارس کے لئے کھیل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے کیا خوب ہوتا کہ ہمارے تمام یا کم از کم بڑے بڑے مدارس اور کالج اپنی اپنی زمین رکھتے اکثر صورتوں میں تو مدرسہ کو خود اپنا مکان نصیب نہیں تو زمین کہاں سے آئی "جامہ ندارم دامن از کجا آرم" لیکن جب کرایہ کے مکان میں مدرسہ کھولا جاتا ہے تو کھیل کے لئے زمین بھی کرایہ یا اجازت سے لی جا سکتی ہے اور اکثر صورتوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات دارالسلطنت سے دور واقع ہونے میں انہیں یہ بڑا فائدہ ہاتھ آیا کہ ان کے پھیلنے میں موانعات کم آئے ہیں اور ان کو کھیل کود کے لئے مسطح میدان کے وسیع رقبہ بہ آسانی مل گئے اور مل جاتے ہیں لندن اور دوسری شہری جامعات کو یہ قدرتی مواقع نصیب نہ ہو سکے اس پر بھی لندن کے کالج اور مدارس شہر کی آبادی سے باہر مناسب میدان کرایہ یا اجازت سے لیکر رکھتے

ہیں اور شوقین طلبہ موسم بہار و گرما میں وہاں ریل وغیرہ کے ذریعہ پہنچکر کھیل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیمات اگر اس قسم کی سہولتیں اپنے علاقہ کے تمام مدارس کیلئے مہیا کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف طلبہ کی صحت ہی ترقی کرے گی بلکہ تعلیم کے ساتھ عام تربیت بھی اچھی ہو جائے گی۔

تعلیم اور بے روزگاری اکثر اصحاب تعلیم کی عمومیت کے لئے جب کوئی تحریک کیجاتی ہے تو بے روزگاری کا سوال پیش کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیم عام ہونے سے پڑھے لکھے آدمی بہت ہو جائینگے اور ان سب کو چونکہ نوکریاں نہیں مل سکتیں اس لئے ان میں بے چینی پھیل جائے گی۔ صحیح اعداد و شمار کے بغیر کسی بھی مسئلہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر دینا مناسب نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں ضرور ایسا ہوتا ہو۔ لیکن ابھی حیدرآباد میں تعلیم کی ایسی عمومیت نہیں ہے کہ اس قدر خدشہ پیدا ہو صرف اتنا سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا بھی تدبر نہیں ہے۔ پہلے تو ہمیں چاہیے کہ ایسے طریقۂ تعلیم ہی اختیار نہ کریں جن سے بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو تعلیم عام ہو یا نہ ہو ملازمت کی تعداد تو محدود ہی رہے گی ممکن ہے کہ تعلیم زیادہ ہونے سے نوکریوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ ہو جائے لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص سرکاری یا خانگی نوکری حاصل کریگا اور ساتھ ہی ہر زندہ انسان کو اپنا پیٹ پالنا اور اپنے متعلقین کی پرورش کرنا ناگزیر ہے۔ اس خطبہ کے ابتدائی حصہ میں میں نے جس قسم کی تعلیم کی سفارش کی ہے اگر وہ اختیار کرلیجائے تو بے روزگاری اور بے چینی کا خطرہ کم رہے گا بحالت موجودہ جب کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً گریجوئیٹس وغیرہ کی تعداد ہمارے ملک میں چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور ہر سال ہماری اور دیگر جامعات سے ڈیڑھ دو سو سے زیادہ ملکی گریجوئیٹ نہیں نکلتے ہیں۔ تو باہر خصوصیت کے ساتھ لائق افراد کے تقرر کی گنجائش نکال کر بھی ہیں شاید کافی تعداد میں ملازمت مل سکے اگر ریاست کے تمام محکمہ جات کارخانہ جات وغیرہ کی سرکاری اور غیر سرکاری خدمتوں کو شمار میں لا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے محض گریجوئیٹس کی تعداد کا خدمات کی تعداد سے مقابلہ کرنا درست نہیں امیدوار کے لئے خدمت کی موزونیت کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً خدمت کے لئے امیدوار کی موزونیت کا تو لحاظ کرنا لازمی ہے اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو اب بھی جب کہ گریجوئیٹس کی تعداد کم ہے ملک میں کافی نوکریاں نہیں مل سکتیں۔ پس ضروری ہے کہ تعلیم کا طریقہ تبدیل کیا جائے یہ مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے اور امید کیجاتی ہے کہ بہترین مشوروں کی بموجب اس مسئلہ کا بہترین حل منظور ہوگا۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ ہمیں زراعت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ ہماری تعلیم ہمیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کیلئے زیادہ قابل بنانا چاہیئے کہیں بعض حضرات اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ اس تحریک سے

میرا منشا یہ ہے کہ ہم لوگ صرف غریب کسان بن جائیں نہیں ہیں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص زمیندار ، ذی مقدرت جاگیردار اپنی جاگیروں کو آپ خود دیکھا لیں مقطعہ دار بہ نفس نفیس اپنے مقطعوں کی دیکھ بھال کریں اور پٹہ دار و انعامدار اپنے وسیع زمینات پر صحیح اور فنی معلومات کے ساتھ زراعت اور باغبانی کریں تعلیم یافتہ شخص اگر زراعت کی طرف توجہ کرے تو وہ نوکری سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ زراعت سے مرفہ الحال زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سے شرائط کی تکمیل کی ضرورت ہے آب رسانی ، اتحاد عمل ، تقاوی وغیرہ کا اچھا انتظام ہونا چاہیئے ۔ صبر و استقلال اور جدید تحقیقات کے نتائج سے واقفیت جب تک نہو کامیابی ممکن نہیں ۔ لیکن جب زندہ رہنا مقصود ہے تو زندگی کے لئے جن امور کی ضرورت ہو ان کو بہم پہنچانا بھی لازمی ہے۔

سرکاری خدمات کے متعلق بھی مجھے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سیول سروس کے لئے ملک کے بہترین امیدواروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اس طرح دوسری گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ خدمات کے لئے بھی اچھا انتخاب کیا جانا چاہیئے تمام خدمات کے لئے تحریری یا زبانی امتحان لینے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن مناسب شرائط و ضوابط کے لحاظ سے امیدواروں کی قابلیت و اہلیت کا پرکھ لینا تو ضروری ہے ذاتی تلخ تجربہ نے ہر بڑے یا چھوٹے عہدہ دار کو نہایت تکلیف دہ طریقہ سے ثابت کرکے بتا دیا ہے یا بتا رہا ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی خدمت کے لئے بھی ایک خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت ہے اور اگر بوقت تقرر یا ترقی اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے تو کام میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اب میں اس تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰحضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر جی ۔ سی ۔ یس ۔ آئی کو علم سے بے حد دلچسپی ہے ۔ آپ نے کروڑہا روپیہ رفاہ عام کے لئے منظور فرمایا ہے ۔ اور اس کروڑہا روپیہ میں سے کارہائے تعلیم پر معتد بہ رقمیں صرف ہوتی ہیں اور صرف ہونے کو ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی ہو اور انکے زیر سرپرستی حیدرآباد میں علم و ہنر کو ایسا عروج نصیب ہو جیسا کہ بغداد و قرطبہ میں ان کے بہترین زمانے میں نصیب ہوا تھا ۔ آمین!

ترانۂ غم

از

(جناب حکیم آزاد انصاری)

وہی ایک جلوۂ یار ہے کہیں نور ہے کہیں نار ہے　　وہی ایک اصلِ بہار ہے وہی پھول ہے وہی خار ہے

وہی حالِ نخوتِ یار ہے وہی خوئے غفلت کار ہے　　وہی رنگ ہے وہی ڈھنگ ہے وہی ننگ ہے وہی عار ہے

وہی تم کہ خواہشِ جان و دل وہی الم کہ کاہشِ جاں گسل　　وہی تم ہو اور وہی جیت ہے وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

وہی طاعتِ غمِ دوست ہے وہی غایتِ غمِ دوست ہے　　وہی حالتِ دلِ زار ہے کہ شکیب ہے نہ قرار ہے

وہی شورِ شیونِ غم فزا وہی آہ و نالۂ جاں گزا　　وہی زخمۂ غمِ یار ہے وہی نغمہ ہے وہی تار ہے

وہ دل کہ دعوئ دوستی وہی دوست اور وہی دشمنی　　وہی دشمنِ دلِ زار ہے وہی دوست ہے وہی یار ہے

جو ذرا سی پی کے بہک گئے جو ابل پڑے جو چھلک گئے　　وہ ضرور لائقِ عار ہے وہ ضرور قابلِ دار ہے

کبھی ساغرِ مئے غم بھی پی کبھی ہوش بھی ہو کبھی خوش بھی جی　　کہ حباب اس کا سرور ہے تو نجات اس کا خمار ہے

نہ وہ ربطِ ضبط ہم رہے نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے　　نہ وہ شوق ہے نہ وہ ذوق ہے نہ وہ چاہ ہے نہ وہ پیار ہے

ہمیں باغ جانے سے کیا غرض ہمیں داغ کھانے سے کیا غرض؟　　نہ وہ یارِ لالہ عذار ہے نہ وہ لطفِ سیرِ بہار ہے

میری جد و جہدِ طلب ابھی خوار تر ہو تو کیا عجب!　　کہ تری نظر میں وقار ہے نہ مری نظر میں وقار ہے

نہ ہے عہدِ فرصتِ رنج و غم نہ ہے دورِ بے غمی تم　　کہ وہ آس سے سروکار ہے نہ وہ یاس سے سروکار ہے

میرے اہلِ مشورہ دوستو مجھے طعنِ عجز بیاں نہ دو!　　جو تخلص آ نہ سکے تو کیا یہ قصورِ شعر نگار ہے!

شریر شریف

از

جناب ناکارہ حیدرآبادی

"ہلو" میں نے گھر میں داخل ہو کر کہا "شریف کہاں ہے"؟ جب باپ گھر آتا ہے اور اپنے لخت جگر کو کہیں نہیں دیکھتا ہے تو جان سے اگر وہ زندہ ہو، کچھ اسی قسم کا سوال کرتا ہے۔ میری بیوی نے کہا "کیا کہوں؟ تم ادھر گئے اور شریف نے شرارت شروع کی"۔

یہ میرے سوال کا جواب ہرگز نہیں تھا۔ اس پر نوٹس لینے کے بجائے میں سیدھا ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اور شوز اتار کر سلیپر پہن لیا "میں ادھر گیا اور ادھر شریف نے شرارت شروع کی؟ آخر ہوا کیا؟"

بلاشبہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مکان میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوئی ہے جس کے لئے فراست اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ایسے موقعوں پر عورتوں کی حیرانی و پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی اور ان کے دماغ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ بیوی کی تکلیف میاں کی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ایک عرصے کے بعد آج مجھے ایک نایاب موقع ہاتھ آیا ہے۔ لاؤ اس معاملہ کو سلجھا دوں اور اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت دوں وہ بھی کیا یادگار ہو گی میں اس وقت خوش خوش تھا اور دنیا کا روشن پہلو دیکھ رہا تھا۔ دعوت میں شریک ہو کر اور تناول ماحضر سے داعی کو ممنون و مشکور فرما کر ہر انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دنیا رہنے کی جگہ ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ شروع ہو گئیں "تمہارے جانے کے بعد ایک پھیری والا غبارے لو غبارے پکارتا ہوا ادھر آ نکلا شریف گلی میں کھیل رہا تھا اور ــــــ" "گلی میں کھیل رہا تھا؟ ہاں ٹھیک ہے۔ آج جمعہ ہے مدرسہ نہیں گیا" میں نے فٹ نوٹ کے طور پر کہا "اچھا آگے چلو"

"اس کی آواز سنتے ہی میرے پاس بھاگا بھاگا آیا اور لگا ضد کرنے۔ اماں پیسے دو غبارہ لیتا ہوں اوں اوں اوں میں نے کہا اوں اوں نہ روں روں تو زمین پر لوٹ لوٹ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ پھر دیکھا اس سے بھی کام نہیں بنتا جھٹ کمرہ میں گھس اور جو چیز پہلے ہاتھ آئی اس کو اٹھا سیدھا باہر بھاگا میں ہزار ہاں ہاں ارے ارے کہتی رہی

لیکن باپ کا بیٹا میری کا سکو سنتے باہر گیا اور برابر ایک بڑا ہرا غبارہ خرید لایا میں نے فوراً غسل خانہ میں رکھ بند کردیا اور بولی "اچھا ٹھہر تھوڑی دیر تھوہو آتے ہی ہو نگے دیکھ تو سہی کیسا پٹواتی ہوں ایسا نڈر ہوگیا ہے تو؟ دیکھو جی تم اس کو ڈھیلی ڈوری بہت دیتے ہو اس کی عادت بگڑتی جا رہی ہے وہ آپ کی ــــ"

میں نے مسکراتے ہوئے قطع کلام کیا۔ بلا شبہ ایسے موقع پر فراست اور حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے بیگم میں کہنے لگا "تمہاری شادی کی رات سے میں تمہاری جس خوبی کی قدر کرتا آیا ہوں وہ یہ ہے کہ تم اپنا فرض بخوبی ادا کرتی ہو میں چاہتا ہوں کہ آگے کچھ کہنے سے پہلے تم یہ بات ذہن نشین کرلو تم نے شریف کو اندر بند کردیا یہ تمہاری حد تک ایک اچھا فعل ہے لیکن کیا وہ حقیقت میں ایک اچھا فعل ہے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے۔ انگریزی میں ایک پرانا مقولہ ہے کہ ــــ"

معترض بن کر کہنے لگیں "لیکن آپ سمجھے نہیں وہ چیز جو شریف ــــ" معلوم ہوتا تھا وہ واقعہ کی تفصیل پیش کرنا چاہتی ہیں مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے کہا "انگریزی میں ایک مقولہ ہے جس کا با تصرف و آزاد ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ بیجا لاڈ پیار سے بچہ بگڑ جاتا ہے۔ جب تک ڈنڈا استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک کام نہیں چلتا۔ بیشک زمانہ سلف میں یہ نصیب بہت معقول و کارآمد تھی۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ آجکل سائکالوجی کا دور دورہ ہے ماہرین کہتے ہیں کہ جسمانی سزا جس کی تم خواہش مند ہو میرا مطلب ہے شریف کے لئے ــــ بچوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہوتی بلکہ صرف عارضی طور پر شرارت کو دباتی ہے۔ جو بعد میں اور زیادہ جوش کے ساتھ بھبک اٹھتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ لڑکے کو بلایا جائے اور نرم مگر نصیحت آمیز لہجہ میں اس کو بتایا جائے اس کو کہاں لغزش ہوئی اور وہ کہاں راہ راست سے بھٹک گیا۔ اور ایسی چھوٹی چھوٹی خطائیں ایک روز چل کر ــــ"

بیگم صاحبہ کی بے صبری اب غصہ سے بدلتی معلوم ہوئی لیکن جناب" جھنجھلا کر بولیں آپ میری بات تو پہلے سن لیجئے تقریریں پھر کرنا"

میں کم سخن مشہور ہوں مگر جب ایک دفعہ بولنا شروع کرتا ہوں تو صرف بیہوشی مجھے روک سکتی ہے "آخر شریف نے کیا کیا" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا "میں سمجھتا ہوں تمکو اس کا افسوس ہے کہ اس نے تمہارا کہنا نہیں مانا اور بغیر اجازت ایک چیز اٹھالیجا کر اس کے بدلے ایک غبارہ خرید لایا۔ وہ چیز کیا تھی ہمیں اس سے بحث نہیں۔ آخر اس معمولی سے جرم کی اگر میں اس کو جرم کہہ سکتا ہوں کیا اساس ہے جس کے لئے ایسا سخت علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ کچھ نہیں سوائے ایک ننھے سے دل کی خواہش پورا کرنے کے شوق کے ہر شخص کی کوئی نہ کوئی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ دنیا جہان کی عظیم ترین ہستیاں ہر زمانہ میں اپنے دل میں خواہشات رکھتی تھیں۔ میری بہت سی خواہشات ہیں۔

تمہاری بہت سی خواہشات پوری نہیں ہوئی ہونگی" ہندوستان کے مشہور و معروف مچھر پہلوان" اور لیڈر گاندھی جی کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو سوراج مل جائے غرض جہان ——— "

اب تو میری اہلیہ محترمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے پہلے تو یہ خیال ہوا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ لیکن ان کی صورت دیکھنے پر خیال غلط نکلا۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ میری تقریر اس قدر موثر اور دلسوز ثابت ہوگی آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں سنو تو۔ مجھے صرف یہ کہنا ——— "

کسی کام کو شروع کرکے اس کو اختتام کو پہونچانا میرے خصائل خصوصی میں سے ہے اور اب میں اپنی مندرجہ بالا تقریر ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ہر قسم کی اصلاح کے ——— سوائے حجام کی اصلاح کے دوران میں ہمیں رحم و کرم سے کام لینا چاہیے۔ خصوصاً بچوں کے معاملہ میں اس جذبہ سے بے حد متاثر ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ "شیخ پیر" ——— یہ شکسپیر کا آواگون ہے۔ وہ رحم کے متعلق کہتا ہے ——— خیر جانے دیجئے وہ کیا کہتا ہے۔ ہاں تو میرا کہنے سے یہ مطلب ہے کہ شریف کو میرے سامنے بلا لاؤ اور اس کو مٹھائی کھانے کو دو اور پھر دیکھو میں کیسے ——— عین اس وقت ان سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوگئی کہ میں حیران رہ گیا وہ کھلکھلا کر روپڑیں یعنی پہلے تو ہنس پڑیں اور پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رونے لگیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جس کو میں نے ان کا رونا سمجھا تھا وہ ان کی ہنسی تھی" بہت اچھا بہت اچھا" کہنے لگیں "آپ نے بھی حد کردی میں جب سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ جس چیز سے شریف نے غبارہ خریدا تھا وہ تمہیں بہت عزیز تھی اور اس پر تمہیں فخر تھا۔ مختصر یہ کہ وہ آپ کی خوشنما نایاب نگیں پنسل تھی۔"

کیا؟ میں نے سلیپر ہاتھ میں لیا۔ اور دروازہ کی طرف جھپٹا "بولو وہ بدمعاش نوٹا کہاں ہے؟" میں نے کڑک کر پوچھا۔

(باقی آئندہ)

غزل

از

(جناب محمد جمیل احسن خان صاحب کوکب شاہجہانپوری)

اللہ اللہ، اثرِ ناصیہ فرسائی کا!　　داغِ سجدہ ہے کہ نقشہ تری زیبائی کا

عالمِ آئینہ ہے اُس محوِ خود آرائی کا　　کیا تماشہ ہے، تماشہ ہے تماشائی کا!

دم بدم کیوں نہ بڑھے ذوق جبیں سائی کا　　ذرہ ذرہ میں ہی عکس اس کی خود آرائی کا

خود نمائی کی کوئی حد بھی ہے دیکھو دیکھو!　　ٹوٹ جائے نہ طلسم انجمن آرائی کا

میری دنیائے تمنا کہیں برباد نہ ہو　　اک قیامت ہے، تصور تری انگڑائی کا

وحشتِ عشق نے دی وسعتِ صحرا گھر کو　　جوش جب حد سے بڑھا بادیہ پیمائی کا

نگہِ شوق ہو کس پہ تصدق یعنی　　برگ ہر گل ہے مرقع تری رعنائی کا

امتحانِ دلِ بے تاب و تواں کی حد بھی؛　　دیکھئے ذوقِ نظر چشم تماشائی کا

کہیں شیرازۂ عالم نہ پریشاں ہو جائے　　حشر انگیز ہے منظر تری انگڑائی کا

ہوگیا، روکشِ آئینہ حجابِ کثرت　　اللہ اللہ یہ عالم تری یکتائی کا!

خوب دادِ دلِ ناکام ملی کوکب کو
شکریہ! آپ کی اس حوصلہ افزائی کا

تنقیدیں

ستارۂ محمدی | مولفہ جناب علی احمد صاحب زاہد جبل پوری متوسط تقطیع اچھا خط اور صاف چھپائی ضخامت (۱۴۰) قیمت (۱۰ /) ملنے کا پتہ ایس ۔ اے ۔ احمد اینڈ کمپنی، جامع مسجد جبل پور ۔

۵ ر فروری ۱۹۲۷ء کو غروب آفتاب کے بعد جبل پور میں یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا گیا کہ ایک روشن ستارہ ٹوٹ کر ایک لکیر بنا ۔ پھر چند منٹ کے بعد اس نے لفظ "محمد" صلعم کی صورت اختیار کی ۔ اس نظارے کو کیا ہندو کیا مسلمان، سب ہی مذہبوں اور فرقوں کے پیروؤں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اخباروں کے ذریعہ یہ خبر عالمگیر پھیل گئی ۔ اُس کی نسبت مختلف اصحاب نے مضامین لکھے، نظمیں کہیں، اخبارات میں مقالات افتتاحیہ شایع ہوے ۔ جناب علی احمد صاحب نے جو جبل پوری باشندے ہیں، ان تمام مضامین کو کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے ۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے بھی ایسے عجیب وغریب واقعات جو اسلام کی حقانیت کی آسمانی شہادتیں ہیں، پیش آئے ان کو بھی ضمناً بیان کر دیا ہے ۔ تقریباً تمام مضامین اور نظمیں اسلامی جذبات وخیالات سے بھری ہوئی اور صداقت اسلام پر روشنی ڈالنے والی ہیں ۔ بعض نظمیں بڑی پاکیزہ اور عمدہ شاعری کا نمونہ ہیں ۔

زیور اخلاق | منظومہ مولوی محمد وزیرالدین صاحب انصاری عاقل اورنگ آبادی متوسط تقطیع (۴۴) صفحات دیدہ زیب خط وطباعت قیمت (۸ /) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے ۔

یہ ایک اخلاقی مثنوی ہے جس کی غایت لڑکیوں میں عمدہ خصائل پیدا کرنا اور دل نشین پیرایے میں انھیں اپنی زندگیاں سنوارنے کی نصیحت کرنا ہے ۔ اس مثنوی کے مطالعے سے جس کا پیرایہ بیان کمسن لڑکیوں کا لحاظ کرکے خاص طور پر آسان اور دلچسپ رکھا گیا ہے، لڑکیوں میں سادہ زندگی کا شوق پیدا ہوگا ۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدارس نسواں میں یہ مثنوی امدادی کتاب کے طور پر شریک نصاب کی جائے یا طالبات کو انعام کے طور پر دی جائے تو مناسب ہے ۔

کلام ناظم | از مولوی قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی چھوٹی تقطیع (۵۴) صفحے اوسط درجے کی کتابت

وطباعت ۔ قیمت (۴ /) ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۔

قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم اردو کے ایک اچھے شاعر ہیں اور بالخصوص تاریخی قطعات لکھنے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ۔ کلام ناظم کے نام سے عبد البصیر صاحب (ان کے ایک ہم وطن) نے ان کی چند غزلیں ردیف وار اور کچھ متفرق کلام شایع کرایا ہے ۔ اکثر غزلیں اچھی ہیں اور مشاعروں وغیرہ میں داد حاصل کرچکی ہیں ابتدا میں "خادم الطلبا (ابوالکلمان عبدالحفیظ صاحب) برق فیروزپوری" نے تقریب لکھی ہے جس میں ناظم صاحب کے کمالات شعری پر مختصر سی بحث کی گئی ہے ۔

بال سکھا مدیرین (۱) ہری ناتھ سنگھ صاحب (۲) سید حامد علی صاحب حامد متوسط تقطیع (۴۰) صفحات نہایت عمدہ خط اور بڑی صاف طباعت سالانہ چندہ (عہ/) انڈین پریس الہ آباد ۔

الہ آباد کا مشہور مطبع "انڈین پریس" پہلے اردو کی بہت کچھ خدمت بجالاچکا ہے ۔ ایک عرصے سے وہ اردو کی طرف سے بے توجہ تھا ۔ اب پھر اردو کی خدمت گزاری پر آمادہ ہے ۔ کچھ دنوں قبل بعض اچھی علمی کتابیں اس نے شایع کی اور اب ملک کی ایک نہایت اہم ضرورت یعنے ترقی اطفال کے سلسلے میں کم سن بچوں کے لئے ایک ماہوار اردو رسالہ "بال سکھا" شایع کرنا شروع کیا ہے ۔ یہ رسالہ دلفریب سبز ورق کے ساتھ نستعلیق ٹایپ پر چھپتا ہے ۔ خطابت پاکیزہ اور طباعت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ چھوٹے چھوٹے مضمون قصے، نظمیں، مفید معلومات اور نصیحتیں وغیرہ کمسن بچوں کے مذاق کی تمام چیزیں بڑے سلیقے کے ساتھ شایع کی جاتی ہیں ۔ اکثر مضامین تصویر دار ہیں اور تصویریں بلاک کی بنی ہوئی اور بہت خوب ہوتی ہیں ۔ ایک مرتبہ کوئی بچہ یہ رسالہ پڑھ لے تو یقین ہے وہ ضرور دوسری دفعہ اس کے لیے مچلے گا کیونکہ ہر حیثیت سے اس کو جالب توجہ بنایا گیا ہے ۔ جو والدین اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دماغی اور اخلاقی تربیت کو خاص طور پر مدنظر رکھتے ہیں وہ ضرور اس کی خریداری پر تیار ہو جائیں گے ۔

کتب موصولہ

(۱) قافیہ میانوال مولفہ جناب سید سخاوت علی صاحب شوخ (۲) ہماری شاعری از پروفیسر سید مسعود حسن صاحب ادیب (۳) مضامین فرحت حصہ دوم از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب (۴) رسالہ اعجاز (ماہوار) لکھنو (۵) رسالہ طریقت (ماہوار) دہلی (۶) رسالہ حسن خیال (ماہوار) میرٹھ (۷) بڑی بی مولفہ ایم اسلم صاحب (۸) سالنامہ دکن پنچ (ہفتہ وار) حیدرآباد ۔

رسالہ ادب

"ادب" ہر حیثیت سے اسم با مسمیٰ ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے اور تہذیب و متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پاتے ہیں۔ دل آزاری، دریدہ دہنی، لفظی نزاع، جماعتی تنگ نظری، مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے۔ اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ لیکن ادب کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے۔ تمام با ادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔

ادب دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیوں کر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سایہ میں پروان چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق تمام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ ان مقدس مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کو اس رسالہ کی شان، بلند نگاہی اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم کم از کم ۲ صفحہ چندہ للعہ سالانہ ایک پرچہ کی قیمت ۶/ر۔

منیجر ادب متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

چاند

جناب رواںؔ صاحب

کیسا ہے کامیاب ہو جائیگا
کچھ روز میں لاجواب ہو جائے گا
یہ چاند ابھی چاند نظر آتا ہے
نکھریگا تو آفتاب ہو جائیگا

اصلاح، ادب، علمی فوائد، صنعت و حرفت پند و نصیحت، نتیجہ خیز افسانے، صلاح نیک ترقی کی راہیں، اتحاد کے ترانے اور اتفاق کے درس دیکھنا اور سننا چاہیں تو "چاند" الہ آباد کو دیکھیں اخبار و رسائل کی دنیا میں اس رسالہ کی دھوم مچ گئی ہے ہندی چاند پندرہ ہزار اور اردو چاند پانچ ہزار چھپتا ہے اردو چاند ابھی ابتدائی دور میں ہے، پبلک اس کی گرویدہ ہو رہی ہے، اور مانگ بڑھتی جاتی ہے اگر ہمدردان ملک و قوم کو اس طرف توجہ ہوئی تو یقیناً اس کی روشنی سے تمام ملک جگمگا اٹھیگا اور اردو چاند بھی بیسوں ہزار تعداد میں نکلنے لگیگا۔ عمدہ کاغذ، صاف ستھری اعلیٰ درجہ کی چھپائی۔ تصویروں کی کثرت اور ضخامت میں کوئی رسالہ اس کی برابری نہیں کر سکتا زمانہ کی سچی خدمت اس کا اعلیٰ مقصد اور اصلاح و درستی پاکیزہ مدعا ہے

ایڈیٹر منشی کنہیالال ایم اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ

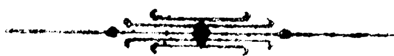
چندہ سالانہ	آٹھ روپیہ
ششماہی	پانچ روپیہ
فی جلد	ایک روپیہ

کاپی نمونہ بلا قیمت نہ اجرا ہوگی نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرا لیجئے۔

"چاند" اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت منیجر دفتر "چاند" اردو ایڈیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے ٹیلیفون ۲۵ تار کا پتہ "چاند"

خاص نوٹ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی بابت مراسلات بنام ایڈیٹر چاند اردو ہونا چاہیے

مجلّہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ با ہمیت سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں گیشت یا بدفعات نقد خریدفرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لیے و آہمیت نائش ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں بچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی دوسری کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلّہ مکتبہ با آہمیت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہئیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احکام بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلّہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

۱۹۱۲ء

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

مجلّہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو کا ہوگا۔

منتظر احتیاطاً پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہو تو ہر کسی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶ر

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلّہ مکتبہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے۔

مجلہ ماہانہ
جلد (۵) شمارہ (۵)

رسالہ ادب

"ادب" ہر حیثیت سے اسم بامسمیٰ ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے۔ اور تہذیب و متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پاتے ہیں۔ دل آزاری، دریدہ دہنی، لفظی نزاع جماعتی تنگ نظری، مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے۔ اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ لیکن ادب کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتیں ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے۔ تمام بادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔

ادب دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیوں کر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سایہ میں پروان چڑھنا تو آسان ہے۔ لیکن ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق تمام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ ان مقدس مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کو اس رسالہ کی شان، بلند نگاہی اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم کم از کم ۷۲ صفحہ چندہ للعہ سالانہ ایک پرچہ کی قیمت ۶/۔

منیجر ادب متصل جھوا ہاتھم گنج لکھنؤ

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ مہر سنہ ۱۳۳۹ ف م جولائی سنہ ۱۹۳۰ ع شمارہ (۵)

تصویر باغ عامہ کا ایک دلفریب منظر

فہرست مضامین

شذرات

اس سے پہلے کسی قریبی اشاعت میں ہم نے ایرانی حسن کاری کی نمائش کا ذکر کیا تھا۔ بعض مستشرقین کی کوشش سے لندن میں منعقد ہونے والی تھی۔ اب اس کا تصفیہ ہو گیا ہے، آئندہ جنوری اور فروری میں نمائش "رایل اکاڈمی" لندن میں منعقد ہو گی۔ تیاری بڑے وسیع پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ جو اشیاء جمع کی جا رہی ہیں ان کی اجمالی تفصیل یہ ہے۔ ایران کے طلائی، نقرئی اور تانبے کی اشیاء، ایرانی قالین، جو دنیا خصوصاً یورپ بھر میں بے حد مشہور اور مقبول ہے۔ کارچوب، زربفت مخمل، مٹی اور کانچ کی چیزیں، مطلا مخطوطات تیار اور فوجی سامان صورت سازی اور تعمیر کاری کے نمونے وغیرہ۔ دنیا بھر کے عجائب خانوں اور شخصی محفوظات سے چیزیں بھیجی جا رہی ہیں۔ اعلحضرت تاجدار ایران نے کمال مہربانی سے شاہی محلات اور شاہی خزانوں بلکہ ان مسجدوں سے بھی نوادرات بھیجنے کا حکم دیا ہے جس میں آج تک کسی یورپی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی۔ حکومت مصر بھی قاہرہ کے میوزیم سے بہترین ایرانی مصنوعات نمائش میں بھیج رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ اب تک بے شمار مصنوعات کا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے لیکن کارکن کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ سے اگر کوئی نادر ایرانی چیزیں نمائش کے لئے بھیجنی چاہے، تو وہ "معتمد عمومی، پرشین آرٹ اگزی بیشن کارک اسٹریٹ، لندن" کے پتہ پر مراسلت کر سکتے ہیں۔ جو چیز بھی بھیجی جائیگی، اس کی پوری حفاظت اور واپسی کی ذمہ داری کمیٹی نے لی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان، جو سالہا سال تک ایرانی تہذیب و تمدن کا اجارہ دار رہا ہے۔ اس بین القومی ایرانی نمائش کے موقع پر فراخدلی کے ساتھ اپنے ہاں کی ایرانی نوادرات بھیج کر ایران کی گذشتہ خدمات کا کچھ نہ کچھ ضرور اعتراف کر سکے گا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے یہاں نوادرات کے اجارہ داروں کے بخل اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی بدنیتی نے، ہم میں، ایسی خدمات کا وہ اعلیٰ احساس اب تک پیدا ہی نہیں کیا۔ جو بلا مبالغہ یورپ کے ہر ادنیٰ فرد کے دل میں بھی موجود ہے۔

دنیا کے ہر خطہ میں جہاں جس کام کا موقع اور سہولت سے ہوتا رہا ہے۔ انگریز، انگریزی

زبان کی اشاعت دنیا کے ہر دور دراز خطے میں کر رہے ہیں، ان کے پاس حکومت ہے، سلیقہ ہے ملکی زبان میں تعلیم کا احساس پیدا نہ ہوتا، تو ہندوستانی انگریزی زبان کے مقابلے میں، اپنی زبانوں کو بھول بھی جانے تو کوئی شبہ نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں پہلے فارسی زبان کو رواج دیا، پھر جب وہ ہندی ہو گئے، تو ہندوستانی زبانوں میں سے جس کو اپنے حسب مطلب دیکھا، اس کی خدمت پر کمربستہ ہو گئے۔ اس زبان پر ان کی اپنی زبان کا اثر ہونا ضروری تھا، بہرحال اس زبان کو ہندوستانی کہو یا اردو، انہوں نے اس کی خدمت کی۔ دکن کے عادل شاہوں نے دکن کی ممکنہ خدمت کی۔ اور یہ گویا اصول بنگیا ہے۔

حیدرآباد کے پڑوس میں مغربی جانب مرہٹہ قوم کا مرکز پونا ہے۔ یہاں اس قوم کے ایک فدائی ڈاکٹر بھنڈارکر نے (جو بعد میں سر بھنڈارکر ہو گئے تھے) مرہٹی زبان، مرہٹہ قوم اور ان کے عتایق کی خدمت کے لئے جو بہت زیادہ قدیم نہیں ہیں، ایک ادارہ "بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے قائم کیا تھا۔ اب وہ اس قدر پھیل گیا ہے کہ مشرقی ریسرچ یعنے تحقیقات کا نہ صرف دکن میں بلکہ سارے ہندوستان میں واحد اجارہ دار سمجھا جا رہا ہے۔ یہ سب بھنڈارکر کی نیک نیتی اور مرہٹہ قوم کی باہمی امداد کا نتیجہ ہے اس قوم میں زندگی کے آثار کس قدر نمایاں ہو گئے ہیں۔ سو سال پہلے ان کی حالت پر نظر کرو تو یہ جاہل جنگجو قبیلہ تھا، جو سیواجی قائد کی سرکردگی میں منصہ تاریخ پر نمودار ہوا۔ نفاق کی کش مکش میں جنگلیں لڑیں، کچھ حکومت حاصل کی۔ اور اب سے چند سال پہلے یہ قوم بجھتی نظر آرہی تھی، آج دیکھو تو پھر چمکنے پر تیار ہو گئی ہے۔ اس قوم کی تنظیم کا ایک بڑا مرکز بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ ہے۔

اس ادارے نے تھوڑی سی مدت میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا حصر کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف وہ مرہٹی تاریخ اور عتایق کی چھان بین میں مصروف ہے، دوسری طرف زبان کی وسعت اور ترقی میں کوشاں (اور قومی تنظیم بھی کر رہا ہے۔ یہ مرہٹہ قوم کی نئی زندگی کا شفاخانہ ہے۔ جہاں اس کے قومی امراض کو دور کرکے، اس کو صحت یاب تنومند اور طاقت ور بنانے کی تمام دوائیں مہیا کر لی گئی ہیں۔

ابھی ماہ اگست کی آخری تاریخوں میں اس ادارے کی پانچویں سالگرہ منائی گئی صوبہ بمبئی اور اطراف سے علما جمع ہوئے تھے بڑا شاندار موقع تھا۔ نواب گورنر بمبئی جو چند ہی روز پہلے اس کے میر مجلس منتخب کئے گئے ہیں، مدعو کئے گئے تھے، وہ خود گو تشریف لا نہ سکے۔ مگر اپنا پیغام بھیج دیا، اعانت کی خواہش

اور خدمات کے اعتراف سے مملو تھا۔ عطیہ بھی دیا۔

حیدرآباد میں فارسی، عربی اور اردو زبان کی ریسرچ کے لئے موقعے موجود ہیں۔ دکن کی مستند تاریخ کی تدوین کی بھی سخت ضرورت ہے۔ تاریخ کی تدوین میں عربی اردو خصوصاً فارسی زبان کی تحقیقات سے جب تک مدد نہ لی جائے۔ یہ کام بخوبی انجام نہیں پاسکتا۔ چند مرکز اور چند ادارے بھی ہمارے پاس موجود ہیں، جن میں تھوڑی سی اصلاح کے ساتھ انہیں اپنی طرز کے بہترین اداروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ مرکز ہے۔ دارالترجمہ، کتب خانہ آصفیہ، دائرۃ المعارف کے ادارے، اگر بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ کے جیسے کام کرنے والے دستیاب ہو جائیں تو ان کی حیرت انگیز کارگزاری پر ہمیں تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ سرکاری ادارے ہیں۔ یہ ایک اشارہ ہے۔ ممکن ہے کہ ہم کبھی تفصیل بھی پیش کر سکیں۔

حیدرآباد میں چھاپے کی دشواریوں میں بلاک سازی کا فقدان بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ کلکتہ یا مدراس کو تصویریں بھیج کر بڑی زحمت انتظار کے بعد بلاک حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب ہمارے ناظرین یہ سنکر بہت مسرور ہونگے۔ حیدرآباد میں بھی اس فن کے ایک ماہر پیدا ہو گئے ہیں۔ عظیم الدین صاحب صیغہ دار محکمہ تعلیمات نے محض اپنے ذاتی شوق اور ذوق فن سے اپنی تنخواہ کا کثیر نقصان برداشت کر کے بڑی بڑی صعوبتوں کے بعد کلکتہ کے مشہور کارخانوں میں اس فن کو سیکھا اور اب پایہ تکمیل کو پہنچا کر اپنے وطن حیدرآباد آگئے ہیں انکی مہارت فن کے لیئے ہمارے ہاں کے متعدد شایع شدہ بلاکوں کے علاوہ سالنامہ رہبر دکن کے صفحہ آخر کی تصویروں کا نمونہ کافی ہے۔ ہمیں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ بارگاہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ میں ان کے کارنامہ کو شرف پسندیدگی بخشا گیا اور ہمارے قدردان علم و فن ظل اللہ نے اپنی رعایا کے ایک فرد کے اس ذوق فن اور اس کے نمونہ فن کاری کو ملاحظہ فرما کر وہ خوشنودی ظاہر فرمائی جو ہر اہل فن کی دلی آرزو ہے۔

شمالی ہند کی زبانوں میں

ٹی اور ڈی کے تلفظ کی زیادتی

(از کرنل گریہم بیلی پروفیسر اردو، لندن یونیورسٹی)

(مترجمہ جناب حمید اللہ صاحب ام، اے ایل ایل بی)

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ پرتگالی زبان کے نطعی (Dental) ت، د (T، D) ہندوستان میں حسب حال نطعی باقی رہے۔ اس کے برخلاف انگریزی مسوڑوں سے ادا ہونے والے (Alveola) ٹ، ڈ (T، D) ذلقی (Cerebral) ہو گئے یعنی ان کے تلفظ میں نوکِ زبان تارک (Palate) سے لگانی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کپتان، بوتل، ہاسپتال وغیرہ کو جنھیں ہم اصلاً انگریزی کہتے ہیں، پرتگالی الاصل قرار دینا پڑے گا۔ یہ سوال یوں آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا؛ بظاہر مخالف اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں اور بعض ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں۔ (س۔ ر۔ د لگادو کی تصنیف Fraud سے قیمتی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں)

مندرجہ ذیل سطور کے پیش نظر وہی علاقہ ہے جہاں اردو، پنجابی اور ہندی (اپ ھ) بولی جاتی ہیں، اگرچہ کہ جن حقائق کے ثابت کر دکھانے کی کوشش کی گئی وہ وسیع تر حلقے پر محمول ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ ایک تلفظی مسئلہ ہے اس لئے ہمیں اپنے آپ کو تکلمی الفاظ تک محدود کر لینا چاہیئے اور سوائے اس کے کہ تکلمی الفاظ نہ ملیں، تحریری الفاظ کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ مطبوعہ شکلیں عموماً استخراجی بنیاد پر بآسانی بدل دی جاتی ہیں۔

ہم بلا پس و پیش کہہ سکتے ہیں کہ انگریزی (T، D) کی ایک عظیم اکثریت جب ہندوستانی الفاظ میں رائج ہوتی ہے تو ذلقی ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان میں سے کوئی نطعی ہو جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟ یہ یاد رہے کہ بے تکی توجیہیں عموماً کم مفید ہوتی ہیں ....

توجیہیں کسی معین اصول پر مبنی ہونی چاہییں۔ اسی وجہ سے یہ آسان خیال کہ پنجابی ڈاگدار (ڈاکٹر) فارسی کے عام لاحقے کی مناسبت سے لیا گیا ہے اس وقت تک بے قیمت ہے تاآں کہ ہم یہ نہ بتائیں کہ کیوں انسپکٹر، ڈائرکٹر، ماسٹر بگڑ کر انس پیٹر، ڈائگ ٹر، ماس ٹر، ہو گئے ہیں اور کیوں (canister) ایک قسم کا تمباکو کناس تر ہو گیا ہے۔

(۱) الفاظ جو غالباً پرتگالی الاصل ہیں اگرچہ انہیں عموماً انگریزی سے ماخوذ کہا جاتا ہے:۔

اردو	پرتگالی		انگریزی	
بپ تِس مہ	Baptismo	بپ تزمو	Baptism	بپ ٹزم
بوتام (کتابی شکل)	Butao	باتاں او	Button	بٹن

اس کے مقابل عام طور پر بٹن جو انگریزی (Button) سے آ رہا ہے بولتے ہیں۔

اردو	پرتگالی		انگریزی	
گارڈ	Guarada	گارادا	Guard	گارڈ
پ اسپتال / اھ ہاس پتال	Hospital	اوس پی تال	Hospital	ہاس پٹل
کپتان	Capitao	کپی تاں او	Captain	کیپ ٹن
کارتوس	Cartucho	کارتیوشو	Cartridge	کارٹ رج
مستول	Mastro, Masto	مسترو، مستو	Mast	ماسٹ
پستول	Pistola	پس تولا	Pistol	پسٹل
سلاد (ترکاری)	Salada	سالادا	Salad	سیلڈ
سکتّر	Secretario	سکرتیاریو	Secretary	سکریٹری
تماکو	Tabaco	تبا کو	Tobacco	ٹباکو
تولیہ (توال)	Toolha	تولا	Towel	ٹاویل

بوتل (پرتگ Botelho انگ Bottle) اور پتلون (پرتگ Pantlona انگ Pantloon) پرتگالی ہو سکتے ہیں مگر کم از کم یہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ شمالی ہند میں اس وقت بھی برتے جاتے ہیں جب کہ یہ الفاظ پرتگالی میں ابھی موجود بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۲) الفاظ جو حقیقتاً انگریزی معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں دندانی ٹ، ڈ (T ، D) ہیں جو انگریزی مسوڑوں سے نکلنے والوں (Alveolar) سے مشابہ ہیں۔ اگر کوئی پرتگالی لفظ (ا پ ھ) سے مشابہ ہے تو بیان کردیا گیا ہے:۔

	انگ		پرتگ
لنڈن	London لنڈن		Londres لون درے
ا	ڈلہوزی	Dalhousie ڈلہوزی۔	
پ	دِلاوجی	پہاڑی مقام	
پ	اردلی	Orderly آرڈرلی۔	
اھ	اردلی		
پ	ڈاگدار	Doctor ڈاکٹر	Doutor دوتو
اھ			

(ڈاکٹر عام طور پر اھ میں بولا جاتا ہے کتابوں میں ڈاکٹر، للوجی ہیں، ڈاگدر آج کل)

		انگ	پرتگ
پ ا	دراز واحد	Drawer واحد ڈرار	
۔۔	درازاں جمع	Drawers جمع ڈرارز	
	کیتلی	Kettle کیٹل	Caldeira کالدرا
	کناستر	Canister کینس ٹر	
	توس	Toast توسٹ	(Pieuf)
	ترِیل	Tray ٹرے۔	
	سَنتری	Sentry سنٹری	Sentinella سان تی نیلا

مندرجہ ذیل الفاظ بھی اس میں بڑھائے جاسکتے ہیں مگر وہ اتنے یقینی نہیں ہیں:۔

درجَن	Dozen ڈزن	Duzia دُوزیا
ہاتھی کاک	Artichoke آرٹی کاک	Alcachofra آلاشوفرا

	انگ	پرتگ
ٹرَپ	Trump (card) ٹرَنپ	Trunfo ترون فو
تارپین	Turpentine ٹرپن ٹائن	Terebinthia, تربی نتھیا Trebentina ترے بین تی نا

(کتابی صورت میں اسے ترمن تین اور ترمن تو کہتے ہیں جو پرتگالی (Termentina) سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں) علم مثلاً (Stirling) کو استرلنگ غالب نے لکھا ہے۔ اور للوجی کے دیباچے میں (Gilchrist) کو گل کرسٹ لکھا گیا ہے۔ مزید نیچے دیکھئے۔

مہینوں کے نام پرتگالی سے زیادہ انگریزی نظر آتے ہیں۔ اور غالباً ہم یہ نتیجہ نکالنے میں صحیح ہیں کہ چار زبانوں میں ٹ، ڈ (T ، D) کا دانت کی بجائے مسوڑے سے تلفظ پایا جاتا ہے۔ یہ نہ بھلایا جائے کہ ج (ج) اپ ھ میں انگریزی سے عملاً مشابہ ہے مگر پرتگالی ج (ژ) سے بہت جدا ہے۔

اپ ھ	انگ	پرتگ
جنوری	January جنوری	Janeiro ژانی رو
فروری	February فبروری	Fevereiro فے وری رو
مارک (CHچ)	March مارچ	Março مارسو
اپریل	April اپ رل	Abril آبری
مئے	May مے	Maio مے او
جون	June جیون	Junho ژونو
جولائی	July جیولائی	Julho ژولو
آگست	August اوگسٹ	Agosto آگوستو
ستم بر	September سپ ٹم بر	Setembro سے ٹین برو
اکتوبر	October آک ٹوبر	Outubro اوتو برو
نوم بر	November نوم بر	Novembro نوئین برو
دسم بر	December ڈسم بر	Dezembro ڈے زین برو

قابل ذکر آگست ، سنمبر ، اکتوبر ، دسمبر ہیں

(۳) الفاظ جن میں پرتگالی نطعی (دندانی) ذلقی ہوسکتا ہے ان میں سے بعض بہت مختلف فیہ ہیں اور، باقی تمام کے تمام متشابہ ۔

پرتگ		اردو
Balde	بَل دے	بالٹی
Falto	(بمعنی کم) فال تو	(پ ا) فالتو (بمعنی زاید)
		لینھدی پھالتو (کولی مزدور)
		نیپالی پھالٹو پھالتو
Foguetar	فوگیت (بمعنی راکٹ)	پٹاخہ (بمعنی آتشبازی)
Toke	(سر مستول) توپے	ٹوپی (سر کا لباس)
Baranda	وراں دا (اپ ھ)	برانڈا
	(ھ ا)	بَرَنڈا = برآمدہ (کتابی صورت)

میرے خیال میں برآمدہ ایک مصنوعی فارسی لفظ ہے جو ہندوستان میں گڑھا گیا ہے اور ایران میں ایسا ہی نامانوس جیسے (Non. De. Plame قلم نام = فرضی نام) اور ذومعنی فرانس میں ، اس پر بے حد بحث ہوتی ہے ۔

(Termentina)	ترمیں تی نا	ترمنٹو (کتابی صورت)
Terpentina	ترپیں تی نا	

"ایھ" لفظ پلٹن (رجمنٹ) اور بسکوٹ (بسکٹ ، جاگٹ (جاکٹ) ممکن ہے انگریزی (Buttalion) بٹالین (Biscuit) بس کٹ (Jachet) جاکٹ سے ماخوذ ہیں یہ بھی ممکن ہے پرتگالی (Batalhao) باتالاؤ (Biscoito) بزکوئی تو (Jaqueto) ژاکے تو سے ماخوذ ہوں ۔

(۴) میں نے دو تین باتوں کی تعلیق کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب کی نسبت ۱۰۰ سال قبل کے ہندوستانی ، ہندی دندانی تلفظ کو انگریزی سوڈ سے کے تلفظ کے مساوی کرنے

کے لیے مستعد نہ تھے۔ اگر مزید ثبوت ملیں تو دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اسد اللہ خاں غالب تقریباً ۱۸۳۰ء
میں (دیکھو اردوئے معلی اڈیشن ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۱۱) اسٹرلنگ بجائے (Sterling) کے لکھتا ہے۔ اور
دو جگہ سکرتر بجائے (Secretaries) کے محمد یحییٰ تنہا سیر المصنفین (۱۹۲۴ء) میں اسی عبارت کو نقل
کرکے اسٹرلنگ اور سکرتر کے لئے تبدیل کرلیتا ہے۔ تاہم سکتر آج کل گفتگو میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔
للولال ۱۸۰۳ء میں گل کرشٹ بجائے (Gilchrist) کے لکھتا ہے گو مروجہ صورت گل کرسٹ ہے۔
(اسی طرح تنہا نے لکھا ہے مذکورہ بالا دیکھو) اس عبارت میں للو خود آزادی سے ذلقی حروف استعمال
کرکے ان کو انگریزی مسوڑوں سے تلفظ پانے والے الفاظ کا نمائندہ بناتا ہے۔

نوک زبان مسوڑوں سے تلفظ پانے والے الفاظ ادا کرتے وقت دانت اور مسوڑوں کے
تقریباً بیچ میں ہوتی ہے۔ اگر سخت مسوڑوں کو آگے سے پیچھے تک ۱½ انچ شمار کریں تو ذلقی "ٹ
ڈ" دانتوں کی حد کے پچھلے کنارے سے آدھی انچ پر زبان رکھ کر ادا کرتے ہیں۔ مرکز یا اگلے دانتوں
کے نصف تختی تقریباً ⅜ انچ کا چوتھائی حصہ دانتوں کی اگلی حد (Edge) سے ہوتا ہے۔ لیکن ہند میں
اب ذلقی (T، D) ٹ، ڈ کا مخرج گویا مسوڑوں سے ادا ہوتا ہے۔ یہ کوئی صوتی اصول نہیں ہے بلکہ دیہاتی
گفتگو میں بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح ہمارے پاس:۔

پ رَٹّی، ڈ رَپٹی، د رَپٹی، د رَپوٹی، د رپورٹی (وہ شخص جو خبریں پہنچاتا ہے)
پ بَٹّیمی، د بٹیمی، د بے ٹیمی یعنی سہتی دیری۔

انشاء اللہ خاں کا پُر ذکاوت شعر ہر دو رجحانات ظاہر کرتا ہے:۔

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اسکا + حاضری کھائے جو کلکتہ تو لنڈن میں ٹپن

میں نے انگریزی Th ث کو جیسے (Think، Them) میں ہے۔ مس نہیں کیا ہے
جسے تقریباً ہمیشہ "تھ" پڑھتے ہیں اور اگر آخر میں ہو تو کبھی صرف "ت" مثلاً اس کے تھرو (یعنی اس
کے ذریعے) سامت صاحب (مسٹر اسمتھ) اس کے برخلاف تھڈ کلاس (تھرڈ کلاس کے لئے) قابل
تعلیق ہے۔ دوسری قسم کا "Th" D: فادر (Father)، رومن کیتھلک مذہبی امام؛ لیکن "پادری"
پرتگالی لفظ "Padre" (پادرے) سے لیا گیا ہے جو عام طور سے عیسائیوں کے امام کے لئے بولا
جاتا ہے۔

(۵) خاتمہ ۔ بہ ظاہر یہ امر صاف ہے کہ چند اب وہ الفاظ براہ راست انگریزی سے آئے ہیں جن میں پرتگالی اثر بالکل ممکن نہیں اور وہ اب بجائے ذلقی "D T" کے دندانی سے بدل گئے ہیں۔ کیا اس کی کوئی توجیہہ ممکن ہے؟

(۱) ایک توجیہہ پیش کرتے ہی مسترد ہو جا سکتی ہے ۔ یعنی یہ کہ "ر" کا "ٹ" یا "ڈ" کے قریب ہونا اس کے تلفظ پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ بہت سے انگریز جو انگلستان کے باشندے ہیں "ٹ" "ڈ" "ل" "ن" کا مخرج نوک زبان (ذولقی) سے ادا کرتے ہیں جب کہ "ر" اس کے بعد ہی ہو ۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو "D T" کے بعد "R" آجائے تو اسے دانتوں سے ادا کرتے ہیں مگر یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جدید "R" شمالی ہند میں کچھ اثر رکھتا ہے ۔ اس بارے میں ہندی طالب علموں کو انگریزی پڑھتا دیکھ کر ہم پوری تشفی حاصل کر سکتے ہیں ۔

(۲) بعض انگریزی سے ماخوذ الفاظ پرتگالی اثر سے تبدیل پا چکے ہیں اور اس کے برعکس ۔

(۳) جب پرتگالی خارج از بحث ہو جاتے ہیں تو ہم انفرادی الفاظ کے متعلق کچھ بھی اصول نہیں پاتے ۔ سوائے اس کے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اسی یا سو برس پہلے انگریزی مسوڑوں سے ادا ہونے والے "T" "D" اب کی نسبت نطعی سے زیادہ قریب تھے ۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو اس امر کی توجیہہ مشکل تر ہو جاتی ہے کہ کیوں للّو، گلبرٹ، لارڈ منٹو، ٹیلر، ڈاکٹر، لفٹننٹ (لپٹن)، ہنٹر اور لاکٹ لکھنے میں ذلقی حروف برتتا ہے ۔

(۴) کسی پرتگالی "D T" کے متعلق جو ذلقی ہو گئے ہوں، میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اس مضمون کا اصلی مبحث نہیں ہیں اور کچھ اس لئے کہ بہت ہی قلیل تعداد الفاظ جن سے یہ نظارہ ہو سکتا ہے، مشتبہ ہیں ۔

غزل

جناب حکیم آزاد انصاری

میں ہوں اور میلان دل اک دل کے دشمن کی طرف
جستجوئے رہنما لائی تو رہزن کی طرف

خیر یارب آشیانِ بلبل بیکس کی خیر
برق منڈلاتی نظر آتی ہے گلشن کی طرف

راہ الفت لاتعد خطرات سے پُر ہے تو ہو
لوٹنا مخدوش تڑپاتا ہوں مامن کی طرف

کون پوچھے میری کلفت، میری بیتابی کی بات
کون دیکھے میری وحشت، میری اُلجھن کی طرف

وہ ذرا نفرت سے چتون پھیر کر بیجا عتاب
وہ مرا حیرت سے تکنا تیری چتون کی طرف

پھر تجھے اے دشمن زادِ سفر قسمت! نوید
پھر مجھے لٹنے کی حسرت لائی رہزن کی طرف

مجھ کو بھی حسرت ہے، میں بھی ہمکلام دوست ہوں
لے چل، اے ارمان لے چل دشت ایمن کی طرف

اب کسے معلوم، وحشت میں کہاں کا قصد ہے
اب نہ منزل کی طرف رُخ ہے نہ مسکن کی طرف

کس طرح آزاد! تنہا فوجِ قسمت سے لڑوں؟
اپنے بیگانوں کی جانب، دوست دشمن کی طرف

طرزی افشار

از

(جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین)

تمہید سرزمین ایران بھی عجب مردم خیز ہے۔ کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی زمانہ شاید ہی ایسا ہوگا جس میں اہل کمال کا قحط ہو ممکن ہے یہ دعوی صحیح نہو اور کسی زمانے میں ان میں کمی واقع ہوئی ہو اور کسی میں زیادتی۔ لیکن ان کا اوسط دیگر ممالک کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ ہی رہا۔ دنیا میں اس بات کا فخر (اگر ہم یہاں مبالغہ نہ کرتے ہوں) خطۂ ایران ہی کو حاصل ہے کہ جہاں اس نے بلند پایہ سنجیدہ سے سنجیدہ مذاق کے ادیب و شاعر پیدا کئے ہیں وہیں آتش زبان ظریف سے ظریف ادبا و شعرا دنیا کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دئے۔ اشتہا اصفہانی، سگ قزوینی، عبید زاکانی، عرب مشہدی، خضر سبزواری، عالی شیرازی، فتحی ہراتی، قلندر کاشی، کافر اصفہانی، مولانی اویانی، نوری مشہدی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ کو لیجئے یہ افراد کچھ کم تفنن گو ظرافت نگار شاعر ہوئے ہیں جن کے انفاس شعریہ نے ظرافت و فکاہت کی فضائے بسیط کو جان نواز و روح پرور نغموں سے بھر دیا۔ طرزی افشار بھی انہیں تفنن گو شعرا میں سے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی کے تذکرہ نویسوں نے ان کی شرح حال سے اپنے تذکروں کو زینت نہیں دی۔ اور نہ ان کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ ہم اس کمی کو محسوس ہی کر رہے تھے۔ کہ مولانا عبدالباری آسی نے حال میں اردو و فارسی زبان کے ظریف شعرا کا ایک تذکرہ بنام "خندۂ گل" لکھکر اردو ادبی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ کیا چنانچہ وہ طرزی افشار کے کلام کے متعلق مختصر مگر جامع الفاظ میں اظہار رائے فرماتے ہیں:-

"طرزی۔ ان کی ظریفانہ شاعری کا بہترین جوہر لطافت و ظرافت یہ ہے کہ انہوں نے

دعوی کیا تھا کہ زبان فارسی بھی اس قابل ہے کہ عربی زبان کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے اسمار کو بھی مصادر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اس سے مختلف صیغوں کا اشتقاق بوجہ احسن ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کی بنار پر انہوں نے اپنی زبان اور شاعری کو اس خیال اور صنف پر مبنی کر دیا تھا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کمالات اور خیالات اربابِ ادب کے نزدیک ظرافت بن گئے۔ اور ان کی شاعری سے ظریف شاعروں میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ طرزی ایک خوش طبع ظریف المزاج، بذلہ سنج شاعر تھے۔ رندانِ بادہ نوش اور سرمستانِ امارد پرست کیلئے شعر کہتے تھے۔ اور اسی مذاق کے لوگ اس کو گلی گلی اور کوچے کوچے گاتے پھرتے تھے" (صفحہ ۔ ۳۰۵)

ذیل کا مقالہ آقا میرزا محمد تمدن کے کاوش قلم کا نتیجہ ہے جو مجلۂ "ایران شہر" شمارہ (۱۲) "سال سیم" بابتہ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ میرزا تمدن کی تحقیق اس وجہ سے قابل اعتماد ہے کہ وہ ایران کے قصبۂ ارومی کے (جو جھیل ارومیہ کے قریب واقع اور اسی نام سے موسوم بھی ہے) رہنے والے ہیں۔ چونکہ طرزی افشار کے حالاتِ زندگی اور ان کے نمونۂ کلام سے اردو خواں اصحاب بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لئے براہِ راست فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

(ابو المحاسن متین)

طرزی افشار دسویں صدی ہجری کے آخری زمانہ کے شعرا میں بڑا ہی آتش زبان و فصیح اللسان ادیب گزرا ہے۔ یہ بلیغ البیان شاعر شاہ عباس صفوی کا معاصر و ہمعہد اور اس کے دربار سلطنت میں رتبہ عالی رکھتا تھا۔

وہ افشار کے جلیل القدر قبیلہ سے تھا۔ اس کا تولد ارومی کے ایک قریہ میں ہوا۔ اس کا نام طرزی تھا۔ ارومی کے شعر پرور ماحول میں جو اس .... نواح کے مخصوص فطری ودائع میں سے ہے شعور پیدا کیا اور زانوے ادب بھی وہیں کے ادبا کے آگے طے کئے بعد ازاں

مسافرت اصفہان میں ایک عرصہ تک وہیں پر اقامت اختیار کی۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اتبک اس کی شرح حال اور تاریخ حیات کے خصوص میں کوئی اہم چیز کتب تذکرہ وغیرہ میں نظر سے نہیں گزری۔ البتہ "مجمع الفصحا" میں طرزی افشار کے نام کے نیچے اس عبارت پر قناعت کی گئی ہے: "وہ ایک ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج، روشن فکر اور عہد صفویہ کے شعرا میں سے گزرا ہے، اس نے طرز سخن گوئی میں عجیب اختراع کی ہر اور یہ طرز ادا بھی اسی کا شیوۂ خاص رہا ہے۔ پھر چند اشعار اس کے کلام سے نقل کئے گئے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

مبادا کہ از ما ملولیدہ باشی — حدیث حسوداں قبولیدہ باشی
چو درس محبت نخواندی چہ سودار — فروعیدہ باشی اصولیدہ باشی
بروطرزیا، زلف خوباں بہ چنگ — زمانے بیفتد کہ پولیدہ باشی

اُس کا دیوان فی الوقت موجود ہے۔ اور مثل شعرا کے تمام دواوین کے اس کی غزلیں حرف الف سے شروع ہو کر حرف یا میں تمام ہوتی ہیں۔ اس کے دیوان کے آخر میں چند رباعیاں اور بحر طویل میں مذاقیہ اشعار ہیں۔ اس کی غزلوں سے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں بعض حالات، شاہ عباس صفوی کے دربار میں رسائی اور دربار سلطنت میں رتبہ عالی کا حاصل کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی پہلے پہل تحصیل علوم کے ارادے سے اصفہان کی مسافرت اور اس کے تمام سفروں کا حال پورے طور پر اس کے اشعار سے ملتا ہے۔

اُس کا ایک جلد گرانقدر اور مکمل دیوان راقم الحروف کے پاس موجود تھا جو رمضان ۱۳۳۵ھ ہجری میں شہر ارومی کے بازاروں کو روسی عساکر کے آگ لگا دینے کے باعث بہت سی قیمتی کتابوں کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس وقت اس کے دیوان کا ایک نسخہ راقم کے پاس موجود مگر ناقص ہے، لیکن چونکہ اس کے دو تین کامل نسخے خود ارومی میں موجود ہیں۔ لہذا میں ان کے حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں ویسے تو طرزی کی بعض غزلیں اور متفرق اشعار جو پریشان اوراق میں اور بعض مختلف اشخاص کی زبان

پر ہیں۔ جمع کر کے اس کی تکمیل میں مصروف ہوں۔

طرزی کی مختصر شرح حالات اور تاریخ حیات اس کے بعض اشعار کے ساتھ تاریخ افشا اور بعض ارومی سے متعلق مختلف تاریخوں میں مندرج و مذکور ہیں، لیکن یہ تاحال طبع نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان کے دو تین مخطوطے بعض قدیم الخاندان اشخاص کے پاس موجود ہیں جنہیں میں فراہم کرنے کی کوشش میں ہوں اور کوشش جاری رکھوں گا۔ اس کے حالات زندگی اس کے بعض اشعار اور غزلیں، جنہیں اس کے دیوان سے اقتباس کیا گیا ہے، ذیل میں بغرض ملاحظہ درج ہیں۔

سیاحت عراق عجم کے بعد اس نے اپنی اصفہان کی مسافرت کے خصوص میں کہا:

از بلدۂ قزوین بصفاہاں سفریدم ‏ ‏ بخرجی و بے اسب خراماں سفریدم
یاراں سفریدند بہ جمعیت و من ہم ‏ ‏ یک قافلہ با جانِ پریشاں سفریدم
وارم طمعے آں کہ بہیچم نہ فروشند ‏ ‏ ہرچند کہ چوں زیرہ بکرماں سفریدم

اس کو اصفہان میں عرصہ دراز تک سکونت پذیر ہو کر تحصیل علوم میں مشغول رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بحر طویل میں جس کو ذیل میں درج کیا جائے گا۔ اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جبکہ ابتدا میں اس نے شہرت نہیں حاصل کی تھی اور نہ بلند رتبہ کو پہنچا تھا جیسا کہ وہ خود اپنی ایک غزل کے ضمن میں کہتا ہے:

اہل عجب و ریا دماغیدند ‏ ‏ من فقیریدم و حقیریدم
ہرگز از کس نہ خواستم چیزی ‏ ‏ گر قلیلیدم ار کثیریدم
پشت بر منصب جہانیدم ‏ ‏ نے امیریدم نے وزیریدم
ہمہ از پیش شاہ میرشدند ‏ ‏ من ہم از پیش خویش میریدم
یار رانیست قیدِ من طرزی ‏ ‏ او حریریدہ من حصیریدم

اس کے بعد اس نے دربار سلطنت میں رسوخ حاصل کیا اور اس طرح سے اپنے فضل و کمال کے سایہ میں مقام بلند کا مالک ہو گیا جیسا کہ وہ خود اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے:

می تواں گفت مردم امروز | عاقبت رفتہ رفتہ شاہیدم
ازحوادث چناں امینیدم | کہ بہ درگاہ شہ پناہیدم
عمری از دور می نگاہیدم | بہ مکان شہ اشتباہیدم

اس نے متعدد سفر کئے ہیں۔ اوران تمام سفروں میں سے ایک سفر عتباتِ عالیہ کا بھی ہے چنانچہ اس نے اپنی ایک غزل کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے:

ترکیدم و تاتیدم و آنگہ عربیدم | در دیدہ کوتہ نظراں بوالعجبیدم
شعباں رمضاں کربُ و بلاوم شعب | بے آتش جماویدم و بی نان رجبیدم

بعض جگہ اس نے اپنی جدت طبع پر تعلی بھی کی ہے جن میں سے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

گرچہ طرز نو اختراعیدم | جانبِ نظم را مراعیدم

ایضاً:

آب از دہانِ قافیہ سنجاں فرو چکد | چوں بشنوند طرز نو آبدار من

دوسری غزل کے ضمن میں:-

تراطرزیا! صد ہزار آفرین | کہ طرزِ غریبی جدیدیدۂ ای

ایک اور مقام پر:

طرزی سخنورانِ جہاں آرمیدہ اند | تا تیغ طرز تازہ برونیدہ از غلاف

اس کی اس طرزِ سخن سرائی میں بہترین محرک خود شاہ عباس صفوی کی ذات والا صفات تھی جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے:

طرزیدن من ز طرز تازہ | از دولت شاہ دین پناہ است

وہ ہمیشہ سفرِ حجاز کا آرزو مند رہا ہے اور اکثر اپنی غزلوں کے ضمن میں آرزوئے حج کا اظہار کرتا ہے چنانچہ ایک مقام پر وہ اس کا ذکر کرتا ہے:

طرزی از رہ ہمت، ہمرہاں حجازیدند | تو زراہ مانیدی بلکہ اصفہانیدی

دیوان کے آخر میں ایک بحرِ طویل اس کی ادائے خاص میں ڈوبی ہوئی درج ہے

جس کے ضمن میں اُس نے جو تحصیل و تکمیل علوم اور متفرق نواح میں اپنی مختلف سیاحتوں پر تعلّی کی ہے۔ اس سے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اس میں سلسلۂ صفویہ کی مدح سرائی کی گئی اور اس کے اپنے باپ کی مفارقت کی وجہ اظہار غم کیا گیا ہے۔ اس بحر طویل سے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

۱۔ شکر للہ کہ بکلید مرادید زخاک در تو می کہ ز اولاد رسولند برافلاک قبولند گروہی
ہمہ پاکیزہ و خوش صورت و نیکو سیرت و پاک سرشت و ملکی خوی یافتہم از اثر
صحبت شان فیض فراوان و برون از حد و اندازہ و دریسیدم و درکیدم
علیدم و فہیدم اگر بگزرد ایام من این نوع با تم علما را۔
گرچہ عمرم بجہان بیہدہ گردیدہ فرنگیدم و ترکیدم و تاتیدم و گرجیدم و روسیدم
و لزگیدم و بے فائدہ گشتم پس ازاین دست من و دامن آن طائفہ کز ہمت
ایشان بجز و جسم ز صفاہان و بشیرازم و آنگا حجازیدہ و جیدہ زیارت بکنم
مقبر پاک شہدا را۔

۲۔ کردگارا ملکا داد گرا بادشہا بندہ نوازا کہ مرا نیست ز خود خیر بدہ خیر و
توفیق و بہ لطف و کرم تا با صولم، بفروعم ز کرمہای تو اینہا نہ بعید است
کہ خلاقی و رزاقی و بیرون کنی از نخل، رطب شکر شیرین ز قصب، نیست
ز لطف تو عجب کز کرم خویش برآری ز کرم مقصد ما را۔

آہ اگر باز می افشارم و از صحبت ایشان متاذی شدہ اوقات بضائع
گذر دہر طرفی جو بہ نگاہم نباید رخ خنجر بیگ و قلیچ بیگ و ایرانقلی بیگ،
داشش دمور آقا "منی تانیدلی" بہر فردی از افراد بہ این زمرہ مذکور بہ تعظیم
و ناچار تکریم و گویم کہ "بویور سرنہ بویو رسن چکرم جانمہ منت"، زیرہ کہ کشیدہ
است بشمشیر و بخنجر نتواند کہ زند یا کہ نہد سر بسر آہن خارا۔

۳۔ للہ الحمد کزان قوم فراقیدہ خراسان و عراقیدہ ام و سیر کنان آمدہ
ام تا بہ صفاہان و شب و روز ہمی درسم می بکنم و می مشقم و نی تعلیقم نکنم

یاوز ترکان کہ نیاوند خدارا۔

ہیچ قیدی بہ دلم نیست بجز دو رشدن از پدر پیر کہ فرمودہ خداوند بہ احسان وی آیا بود آن روز کہ ببینم رخِ نورانی اوراوبوسم یدش و عذر بخواہم، بروای بادِ صبا، از من مہجورستم دیدہ پریشان دل آزردہ سلامی و پیامی بہ پدر بردہ بگو طرزی افشار کے از دستِ فراق تو زبس گریہ و آہِ سحری، کردہ خجل ابر و ہوارا۔

ذیل میں طرزی کی غزلیات سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

با منِ دل خستہ اے دلدار رنجیدن چرا
تو غزالِ گلشنِ حسنی پلنگیدن چرا

با مسلمانانِ مسکین کافریدن بہرچہ
با گرفتارانِ مستضعف فرنگیدن چرا

می نگاہی با من و می التفاتی با رقیب
با منِ یک رنگ ای رعنا دو رنگیدن چرا

از سرِ کویت منِ دیوانہ را راندی بہ سنگ
دلبرا دنگی مرا کافیست سنگیدن چرا

ای کہ می سہوی دمادم با وجودِ عقل و ہوش
بادہ ایدون از برای چیست بنگیدن چرا

ہر یکے از قوسِ قضا تیرِ اجل خواہند خورد
مردمان را گو کہ این توپ و تفنگیدن چرا

طرزیا چون در طریقِ عاشقی می مقصدے
ہمچو ز ہادِ ریائی عذر لنگیدن چرا

ایک اور غزل:

در مملکتِ حسن تو را بادشہیدند بر جبہۂ ما خطِ غلامی رقمیدند

فریاد کہ فریادِ فقیران نہ شنیدی — ہر چند کہ بر خاک درت زیر ومیدند
رفتند حریفاں کہ بشادی نغمید ند — از دل بہ تو دادن بدل خود ستید ند
چوں میگزرد نیک و بد عالم فانی — خوشحال کسانیکہ بہ نیکی عملیدند
ہر طائفہ طرزی علم خویش نمودند — دونان درسیدند و کریماں کریمیدند

ایضاً:

افتادہ دل بدامک وحشی نگاہکی — بے رحمکی ستمگرکی دل سیاہکی
مژگانک درازک خنجر گزارکش — تشنیدہ ای بخونکی بر بے گناہکی
در بحرک عقیقک سیرابکش مدام — دارم بخونک دلک خود شباہکی
باشد بخونکی و بخصالک رقیبکش — دیک دروغ گویک و بیرون زراہکی
از حسنک تو ذرہ اکی کم نمی شود — گر بنگری بسویک ماہ گاہ گاہکی
خونبہاز چشمک منک افتادہ طرزیا — در اشتیاق ماہک مہر اشتباہکی

ایضاً

ای کہ در شیریں زبانی شکرستانیدہ ای
دورۂ یاقوت لب را خطِ ریحانیدہ ای
سبزۂ خطارا بہ آہوئے تتان ننمودہ ای
عاشقاں را عید رخ بنمودہ قربانیدہ ای
مدعی برخوانِ وصلت می زند بریان پلو
سینۂ ما در تنورِ ہجر بریانیدہ ای
دلبرا در حق گزاری ہا نہ تقصیریدہ ام
جان فدائید ستمت ہر گہ کہ مہمانیدہ ای
باخط سبز و گل رخسارہ و سیب آن ذقن
وہ کہ در اقلیم خوبی باغ و بستانیدہ ای
نی ہمی سیر گاہ باغ رخسارت مرا

بلکہ عالم را بخطِ رخ گلستانیدہ ای
طرزیا خطش بطرزِ تازہ تعریفیدہ ای
در فضائے شاعری چوں باز ترانیدہ ای

خاتمہ تحریر پر میں یہ عرض کرونگا کہ فی الوقت صرف اسی اجمال پر اکتفا کی گئی اور خاص طور پر یہاں اس امر کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ طوالت سے بچنے کے لئے بعض وہ اشعار جو بطور شواہد حال بیان کئے گئے ہیں ان کو طرزی کی غزلوں سے انتخاب کرکے بقیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر دلچسپی کا باعث ہو تو اس کی تمام غزلیں اور اشعار بھی تدریجاً عرض کر دئے جائینگے۔

آہ

ازجناب رازقاسمی صاحب حیدرآبادی

چشم حسرت سے تجھے دیکھ کے رو دیتا ہوں — خامشی نام ہے مجبور کی گویائی کا

سنتا ہوں دنیا میں خوشی بھی ایک چیز ہے۔ دیکھنے کا آرزومند ہوں، مگر کوئی دکھانے والا نہیں ملتا۔ یا کسی میں خوشی کے دکھانیکی قابلیت نہیں اور جو دکھا سکتا ہو، دکھانا نہیں چاہتا۔

کسی زمانے میں میرے منہ سے اہاہا کی بے ربط و بے معنی صدائیں نکلتی تھیں جن کو لوگ ہنسی کہا کرتے تھے اب وہ بے معنی آوازیں بند ہوگئیں صرف ٹھنڈی سانسیں نکلتی ہیں اور اکثر آنکھوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔ جس کا نام ساتھ والوں نے آنسو رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اول الذکر کیفیت کا نام خوشی و مسرت اور مابعد الذکر حالت کا نام رنج و غم ہے۔

اگر فی الاصل خوشی کی حقیقت چند بے ربط قہقہے اور غم کی اصلیت چند بے بساط پانی کی بوندیں ہیں تو ایسی خوشی و غم کو ہم دیوانوں کا سلام وہ خوشی خوشی نہیں جو مردہ ارمانوں میں جان نہ ڈال سکے اور وہ غم غم نہیں جو کم از کم جینا حرام نہ کرے۔

کسی کی ادنیٰ چشم ترحم ڈوبتے کو ترا سکتی اور مرتے کو بچا سکتی ہے۔ مگر آہ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا یا نہیں کرسکتا اور ایسا نہ کرنے میں ہی اس کے لئے بہتری ہے......کیوں.....؟

"یہ میں خود نہیں جانتا"

"یہ ایک سربستہ راز ہے جس کو میں خود نہیں جانتا"!

رباعیات

از

جناب حکیم بہبود علی صاحب صفیؔ اورنگ آبادی

(۱)

خاموشی میں زبان کی راحت ہے
عصیاں سے بچو، تو جان کی راحت ہے
قلت اسباب کی ہے، راحت دل کی
دل کی راحت جہان کی راحت ہے

(۲)

تلوار کا جوہر ہے، جو تلوار ہو تیز
رفتار ہے کام کی جو رفتار ہو تیز
لیکن، تیزی زبان کا حسن نہیں
گفتار کا عیب ہے، جو گفتار ہو تیز

(خاص مجلہ مکتبہ کے لئے)

چوری کے بعد

از

کارلو گوزی

مسٹر بن ولگا ایک ریشم فروش تھا۔ یہ ایک نہایت نیک نفس اور نہایت ایماندار اور قابل اعتماد تاجر تھا۔ اتوار کی صبح کو ایک روز حسب معمول بیدار ہو کر اس نے غسل کر کے لباس پہنا۔ اور چونکہ اس نے آج کا روز اپنی دوکان کا ششماہی کرایہ ادا کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ رقم کو گننے کے بعد وہ کہنے لگا: "ان دس سی کوئنس (وینس کے سکے) کو جیب میں لے کر میں پہلے نماز کے لئے جاؤں گا اور نماز پڑھنے کے بعد کرایہ کی ادائی کا کام پورا کر دوں گا۔" یہ کہکر اس نے کپڑے پہن لئے اور گرجا کی طرف روانہ ہوا۔ گرجا کے قریب پہنچکر گھنٹہ کی آواز سے اُسے معلوم ہوا کہ نماز ہو رہی ہے۔ اُس نے کہا۔ "او ہو نماز ہو رہی ہے"۔ اس لئے وہ جلدی گرجا میں داخل ہوا۔ مقدس پانی کو چھونے کے بعد قربان گاہ کے قریب جہاں پادری اپنا وعظ سناتا ہے پہنچا۔ یہاں وہ جاتے ہی عبادت میں مصروف ہو گیا لیکن اس جگہ سوائے ایک حسین اور نیک خصال عورت کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ عورت ملک وینس کے عام وضعداروں کے مطابق عمدہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور سنہری انگوٹھیاں چوڑیاں اور ہیروں کی مالا پہنے ہوئے تھی یہ بہت پاکدامن اور پرہیزگار تھی اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت مجلد کتاب تھی جس میں سے وہ ایک فرشتہ کی طرح حمد و ثنا کے گیت گا رہی تھی۔

جراردو چند منٹ اس کی طرف کسی بُرے خیال سے نہیں بلکہ اس کے زاہد فریب حسن سے متاثر ہو کر دیکھتا رہا اور خود بھی اپنی جیب سے ایک کتاب نکالکر گیت گانے میں شریک ہو گیا۔

نماز ختم ہونے کے بعد جراردو اخلاق و رواج کے بموجب عورت کو سلام کرنے والا تھا لیکن ابھی وہ اس خیال میں ہی تھا کہ وہ عورت گرجا سے چلی گئی اور جراردو یہ سوچتے ہوئے کہ اس کی خدمت میں اپنے سلام کا ہدیہ کس طرح پیش کیا جائے۔ اس کے پیچھے چلا گیا۔ گرجا سے باہر نکلکر وہ اپنے مکاندار کے گھر پر پہنچا اور کرایہ ادا کرنے کی غرض سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم غائب تھی۔ اس نے کہا: "یہ کیا بات

ہے ۔ کیا میری عقل ٹھکانے نہیں ؟ آخر کار اس کو جیب کے ایک گوشے میں ایک سخت چیز دستیاب ہوئی اس نے اس کو باہر نکالا نکالا دیکھتا ہے کہ ایک خوبصورت سنہری مالا ہے جس پہ ہیرے جڑے ہیں اور تقریباً دو سو ڈوکیٹ کی مالیت کی ہے ۔ مالا دیکھ کر تاجر تقریباً خوف زدہ ہو گیا ۔ پہلے تو اس نے اس کو جادو سمجھا اور اس قدر خوش ہوا کہ زبان سے ایک لفظ بھی کہے بغیر واپس ہونے لگا ۔ مکان دار کرایہ کی رسید لکھنے کے لئے ہاتھ میں کاغذ قلم لئے کھڑا تھا یہ پکارتا رہا کہ "مسٹر جرارڈو کیا معاملہ ہے ؟" اس نے دریچہ سے جھانک کر جرارڈو کو زور سے بھاگتے ہوئے دیکھا ۔ مکان دار کو کرایہ کا روپیہ وصول نہ ہونے کا افسوس ہوا لیکن جرارڈو مالے کی مالیت کا اندازہ کروانے کی غرض سے سنار کے پاس پہنچا جب اس نے سنا کہ مالا دو سو ڈوکیٹ کی مالیت کی ہے تو اس کو فوراً اُس عورت کا خیال آیا جو نماز میں اسکے بازو کھڑی تھی ۔ اس نے خیال کیا کہ شاید مالا اس عورت کا ہے لیکن اس کا اُس کو یقین نہ تھا ۔ پھر خیال کیا کہ شاید اس عورت نے ایسا مذاق کیا ہے لیکن یہ بھی مقام اور وقت کے لحاظ سے ناممکن تھا علاوہ اس کے دونوں ایک دوسرے سے واقف نہ تھے ۔ اس نے خیال کیا کہ جس وقت میں عبادت میں مشغول تھا عورت کو رقم کی ضرورت ہوئی غالباً اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا ، اتفاقاً اس کا سنہری کنگن جیب میں رہ گیا ہوگا ۔ "سرقہ کے الزام سے اس کو خوف ہوا وہ شرمندہ ہوا اور اس خیال کو دل سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا اور مالا کو محفوظ رکھ کر نتیجہ کا منتظر رہا ۔

دوسرے روز مسٹر جرارڈو سڑک پر جا رہا تھا اس کی نظر اتفاقاً ذیل کے اشتہار پر پڑی جو دیوار کے ایک گوشہ میں چسپاں تھا ۔ اس کی عبارت یہ تھی :- "ایک سنہری کنگن جس کو خوبصورت ہیرے لگے ہوئے ہیں گم ہو گیا یا چوری گیا ہے جو شخص اس کو سانتو مارکولا کے گرجا میں لاکر مالک تک پہنچائیگا اس کو معقول انعام دیا جائے گا ۔" مسٹر جرارڈو یہ الفاظ دیکھ کر متحیّر ہو گیا اور ان کو بار بار پڑھتا تھا ۔ اس کے بعد وہ اشتہار میں جس گرجا کا نام بتلایا گیا تھا اس کی طرف روانہ ہوا ۔ گرجا میں پہنچکر اس نے نائب پادری سے کہا : "مقدس باپ ! میں آپ کے پاس ایک واقعہ کا اعتراف کرنے آیا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اس سے مطلع کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے جس کی عدم تکمیل کی صورت میں مجھے واپس جانا پڑے گا ۔" پادری نے کہا : "کہو کیا معاملہ ہے اگر تمھاری شرط معقول ہے تو اس کی اجازت دیجائے گی" مسٹر جرارڈو نے کہا : "وہ کنگن مجھے ملا ہے لیکن میں سوائے اُس خاتو

کے کسی کو نہ دوں گا، میں استدعا کرتا ہوں کہ آپ اس سے کوئی شبہ یا کسی میرے برے ارادے کا احتمال نہ کریں یہ مناسب ہوگا کہ میں بالمشافہ خاتون کو کنگن حوالے کردوں اگر آپ مجھے اس خاتون کا مکان بتلا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی جیسا کہ کیا تعلق گرجا کے ایک اچھے پیرو کو کرنا چاہیئے۔ میں اس خاتون کی خدمت میں جا کر کنگن اس کے حوالے کردوں گا ورنہ مجھے آپ معاف فرمایئے کنگن میں اپنے پاس رکھ لونگا" یہ سن کر پادری نے کہا "مجھے حکم ملا ہے کہ جو شخص کنگن لائے اس کو تین سو گینیں دوں لیکن غالباً تم کو ایک کی بھی ضرورت نہیں ہے" جرارڈو نے کہا "پادری صاحب میں ایک سو سو گینیں کے بدلہ میں بھی کنگن واپس نہ کروں گا لیکن اگر میں بالمشافہ مالک کو یہ چیز حوالے کروں تو ایک حبہ بھی نہ لونگا"

پادری نے جواب دیا "خدا کا خوف تو کرو۔ جو چیز تمھاری نہیں اسے تمھیں اپنے پاس نہ رکھنا چاہیئے لیکن تم کنگن خاتون ہی کے حوالے کرنا چاہتے ہو تو میں اپنے منشی کو بتلاتا ہوں وہ تمھیں اس خاتون کا مکان بتلا دے گا" اس طرح جرارڈو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کے بعد منشی نے ایک خوش وضع اور نہایت وسیع مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس خاتون کا مکان یہی ہے" مکان نہایت آراستہ پیراستہ اور عالی شان تھا پہلے تو جرارڈو نے یہ خیال کر کے کہ اس نے ایک بھاری غلطی کی ہے وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا جب وہ اس سوچ میں کھڑا تھا کہ اب کیا کیا جائے ایک خادمہ سیڑھیوں کی طرف سے پکارتی ہوئی آئی۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو" اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جرارڈو نے مبہوت ہو کر کہا "میں مالکہ مکان سے ملکر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ بازو کے کمرے میں جا کر خادمہ نے اپنی مالکہ سے کہا: "کوئی صاحب کسی معاملہ میں گفتگو کرنے کی غرض سے آپ سے ملنا چاہتے ہیں" خاتون نے کہا: "انھیں آنے دو۔ تو نے انھیں اندر کیوں نہیں بلایا" اندر داخل ہو کر جرارڈو ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے اسی خاتون کو دیکھا۔ خاتون نے جرارڈو کو پوری طرح دیکھا اور اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا اور اس پر قریب قریب بیہوشی طاری ہوگئی تھی کیونکہ کنگن گم ہو جانے کے وقت سے اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ اس نے اس بوڑھے آدمی کی جیب میں کنگن چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے یہی سمجھا کہ گرجا سے آتے وقت کنگن سڑک پر گم گیا ہوگا وہ اس وقت شرمندہ ہو رہی تھی کہ میں نے اشتہار کیوں دیا۔ لیکن قدرت جو مجرموں کو ایسی سزا دیتی ہے جس کی کہ انھیں توقع بھی نہیں ہوتی خطاوار کی

کو گرفتار کرنے میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوتی جرارڈ و خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا دونوں خاموش تھے ۔ آخر کار تاجر اپنے اطمینان قلب، تیزی اور وسیع تجربہ کی وجہ سے کنگن اپنی جیب سے نکالا اور ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگا: "میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کنگن کس طرح میرے پاس آیا ۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا کنگن گم ہو گیا تھا لیکن میری جیب کی رقم چوری گئی اگر میری رقم واپس نہ ملے تو میں اس بدمعاش کو ایسی سزا دونگا جو اس کو عمر بھر یاد رہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کا دوست ہے اور آپ اُس سے بہت محبت رکھتے ہیں میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی شہرت اور خاندانی اعزاز کی خاطر اُس کا جرمانہ ادا کریں ورنہ میں اس سے ایسا انتقام لونگا جو آپ کو سخت ناگوار خاطر ہوگا ۔ اگر آپ میری رقم ادا کر دیں تو یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے اور آپ مناسب ہدایت کے بعد چور کو آزاد کر سکتے ہیں" پریشانی کے باوجود خاتون یہ الفاظ سنکر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی ۔ اُس نے بڑی عقلمندی کی کہ دس سی کوئنیس اپنی میز میں سے نکالکر جرارڈ سے کہنے لگی: "میں قسمیہ کہتی ہوں کہ جب سے اس بدمعاش نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس وقت سے وہ میری ناراضامندی اور غصہ کے خوف سے بھاگ گیا آپ کا روپیہ لیجئے ۔ اور چونکہ آپ اس کو آزاد کر کے اس معاملہ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ آپ اسی طرح عمل کریں میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی ۔ آپ کے منشا کے موافق میں اس کو کافی ہدایت کر کے آئندہ ایسے جرم کے ارتکاب سے باز رکھوں گی یہ کہکر اُس نے سی کوئنیس گن کر تاجر کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور اپنا کنگن واپس لے لیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد تاجر واپس چلا گیا ۔ یہ عورت ایک معزز اور معتبر گھرانے کی لڑکی اور ایک دولتمند شخص کی بیوی تھی فیشن کی دلدادہ تھی اور اس کو بناؤ سنگار اور فضول خرچی کا بیحد شوق تھا اس کا شوہر اس کو ان اغراض کی تکمیل کے لیئے کافی روپیہ نہیں دیتا تھا ۔ اس لئے وہ دیگر ذرایع سے جیسا کہ ہم نے اُدھر بیان کیا ہے روپیہ حاصل کرنے کی عادی تھی حقیقت یہ ہے کہ بیرے افعال غلط کاریاں ہی انسانی عقل پر پردہ ڈالدیتی ہیں جس کی وجہ انسان رفتہ رفتہ قعرِ مذلت و تباہی میں جا گرتا ہے ! ——— ترجمہ

از

وہ بھی کیا دن تھے!

از مولوی سید اعظم اللہ صاحب اظہر وکیل

کبھی تم کو بھی تھی میری محبت وہ بھی کیا دن تھے
کہ پہروں دیکھتے تھے میری صورت وہ بھی کیا دن تھے

اِدھر بے تاب تھا میں، تم اُدھر بے چین تھے شب بھر
کہو تو یاد ہے وہ وصل و فرقت وہ بھی کیا دن تھے

مرے نوکِ زبان تھا سارا قانونِ وفاداری
تمھیں سب یاد تھے آئینِ الفت وہ بھی کیا دن تھے

کیا کرتے تھے میرے دیدۂ حیراں کا نظارہ
تمھیں آئینے سے ہوتی تھی نفرت وہ بھی کیا دن تھے

تمھیں میرے تصوّر میں پسند آتی تھی تنہائی
میرے سایہ سے بھی تھی مجھ کو وحشت وہ بھی کیا دن تھے

تصور بھی جدائی کا کبھی آتا نہ تھا دل میں
کبھی آتی نہ تھی فکرِ قیامت وہ بھی کیا دن تھے

بگڑنے میں لگاوٹ کی ادا کیا یاد آتی ہے
عتاب آلود نظروں میں مروّت وہ بھی کیا دن تھے

بناوٹ سے بگڑنے کی ادا پھرتی ہے نظروں میں
بجائے شکر تھی باہم شکایت وہ بھی کیا دن تھے

سحر تک عیش میں کٹتی تھی باہم کیا وہ راتیں تھیں
سحر سے شام تک تھی گرم صحبت وہ بھی کیا دن تھے

ہمیشہ کاروبارِ عیش میں مصروف تھے دونوں
نہیں تھی اس سے دم لینے کی فرصت وہ بھی کیا دن تھے

تصور بھی کبھی آتا نہ تھا رنجش کا آپس میں
کبھی دو دو پہر رہتی تھی حجت وہ بھی کیا دن تھے

کہو اظہر یہ کیسی عمر کھوئی اپنی غفلت میں
بس اب روتے ہو یہ کہہ کے "حضرت وہ بھی کیا دن تھے"

دُنیا کے چند خود ساختہ انسان

از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

ظروف سازی کی تاریخ میں جن اشخاص کی عمدہ مثالیں اور سوانح عمریاں (جنھوں نے نہایت صبر و استقلال سے کام کر کے شہرت دوامی حاصل کی) ملتی ہیں ان میں سے تین ممتاز اشخاص کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ برنارڈ پالسی (فرانس) جان باٹر (جرمن) اور ویجوڈ (برطانیہ) کی ہستیاں ہیں۔

اگرچہ اکثر قدیم اقوام کو چکنی مٹی کے معمولی ظروف بنانے کا ہنر معلوم تھا اور میناکاری کے ظروف کی صنعت کا رواج بہت کم تھا قدیم (ETRUSCANS) میں یہ صنعت جاری تھی اس کے نمونے آج تک آثار قدیمہ میں پائے جاتے ہیں یہ صنعت مٹ چکی تھی لیکن حال ہی میں پھر یہ جاری ہوگئی۔ قدیم زمانہ میں اٹرسکینز کے برتن کی بڑی قدر ہوتی تھی اور آگسٹس کے زمانہ میں ظروف کی قیمت وزن کے لحاظ سے سونے میں ادا ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مورلینڈ کو بھی اس صنعت کا علم تھا کیونکہ جس وقت پینیس نے ۱۱۱۵ء میں جزیرۂ میجورکا کو فتح کیا اس زمانہ میں اہل مورلینڈ یہاں یہ صنعت کیا کرتے تھے۔ مال غنیمت میں مورلینڈ کی مٹی کی کئی رکابیاں ہاتھ آئیں۔ جنھیں پیسا کے کئی قدیم گرجاؤں کی دیواروں پر فتح و نصرت کی یادگار کے طور پر چسپاں کیا گیا تھا آج تک وہ وہاں موجود ہیں۔ اس کے تقریباً دو صدی بعد اہل اٹلی نے مورلینڈ کے سے میناکاری کے برتن بنانا شروع کیا۔ اس کو اہل اٹلی نے مورلینڈ کی صنعت گاہ کی مناسبت سے میاجولیکا کے نام سے موسوم کیا۔

اٹلی میں جس شخص نے میناکاری کی صنعت کو دوبارہ دریافت کیا وہ فلورنس کا لوساڈلارابیا نامی ایک سنگ تراش تھا۔ واساری کا بیان ہے کہ وہ بڑا جفاکش مستقل مزاج اور با حوصلہ آدمی تھا۔ تمام دن اپنی چھینی سے کام کرتا اور بڑی رات تک نقشے اور تصاویر تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا فن آخر الذکر سے اس کو بڑی دلچسپی تھی اس میں دیر تک اس قدر محنت سے کام کرتا تھا کہ پیروں کو

سردی سے بچانے کے لئے اپنے نزدیک بالوں کی ایک ٹوکری رکھ لیتا تھا اور ہر ٹوکری میں چھوڑ دیتا تھا کہ گرمی حاصل ہو اور وہ اپنے کام میں مصروف رہ سکے۔ وساری کہتا ہے کہ "اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ کوئی شخص جو اپنے آپ کو حرارت، سردی، بھوک، پیاس، اور دیگر تکالیف برداشت کرنے کا عادی نہ بنائے کسی صنعت میں شہرت حاصل نہیں کر سکتا اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آرام طلبی اور تعیشات دنیاوی میں گھرے رہنے کے باوجود عزت و شہرت حاصل کر سکتے ہیں، اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں کیونکہ کمال اور شہرت آرام کی نیند سونے سے نہیں بلکہ جاگنے کی تکلیف اٹھانے اور مسلسل محنت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔"

لیکن لوسا کو باوجود سخت مشقت کے سنگ تراشی کے ذریعہ اپنی بسر اوقات کے لئے کافی روپیہ کمانے میں کامیابی نہیں ہوی۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب بھی وہ کسی ایسی چیز کے ذریعہ جو سنگ مرمر کی نسبت ارزاں اور ملائم ہو نقشہ کشی یا بت تراشی کا کام جاری رکھ سکتا ہے چنانچہ وہ مٹی کے نمونے بنانا اور انھیں پائدار بنانے کی غرض سے تجربتاً مٹی کو پکانا اور سخت کرنا شروع کیا۔ آخر کار کئی تجربوں کے بعد اس نے مٹی پر ایک ایسا مادہ چڑھانے کی ترکیب دریافت کر لی جو بھٹی کی سخت گرمی کھانے سے قریب قریب ایک غیر فانی روغن یا لمع کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ بعد میں اس نے لمع پر رنگ چڑھانے کی ترکیب بھی دریافت کر لی جس کی وجہ لمع کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

تمام یورپ میں لوسا کی کارگزاری کے ڈنکے بج گئے اور اس کی صنعت کے نمونے جا بجا پھیل گئے چند نمونے فرانس اور ہسپانیہ روانہ کئے گئے۔ جہاں ان کی بڑی قیمت وصول ہوی۔ اس زمانہ میں فرانس میں مٹی کے ظروف میں صرف بھدے مرتبان اور ہانڈیاں تیار ہوتی تھیں اور پالسی کے زمانہ تک ان میں معمولی اصلاح بھی نہیں ہوی تھی۔ پالسی نے بڑی بڑی دشواریوں کا اس دلیری سے مقابلہ کیا کہ اس کی زندگی کے گوناگوں واقعات قریب قریب افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

برنارڈ پالسی کے متعلق قیاس ہے کہ اس کی ولادت ۱۵۱۰ء میں جنوبی آفریقہ کے ایک پادری کے ہاں ہوئی اس کا باپ غالباً ایک (WARKERINGIAN) تھا۔ برنارڈ کو بھی آبائی پیشے کی تعلیم دی گئی اس کے والدین بوجہ مفلسی بیٹے کو کسی مدرسہ کی تعلیم دلانے سے قاصر تھے۔ برنارڈ کہا کرتا تھا میرے پاس بجز آسمان و زمین کے جو ہر شخص کے لئے کھلے ہیں، کوئی کتاب نہیں بہرحال اس نے شیشہ پر رنگ چڑھانے کا کام سیکھا اور بعد میں بت تراشی بھی سیکھی اور لکھنے پڑھنے میں بھی مہارت حاصل کی۔ جس وقت اس کی عمر تقریباً

۱۰ سال کی تھی۔ کلیچ کی تجارت میں زوال پیدا ہو گیا۔ پالسی نے باپ کے گھر کو خیرباد کہہ کر اپنی پیٹھ پر سامان کا تھیلا لئے ہوئے تلاش معاش کی غرض سے روانہ ہوا۔ پہلے گیاسکنی کی طرف سفر کیا۔ جہاں کہیں کام ملتا اس کو کرلیتا تھا وقتاً فوقتاً اپنا کچھ وقت پیمائش اراضی میں صرف کرتا تھا۔ پھر شمال کی جانب سفر کیا اور مختلف اوقات میں فرانس، فلانڈرس اور جرمنی کے مختلف مقامات پر اس کا چند روزہ قیام رہا۔

پالسی نے تقریباً اور دس سال تک اپنی زندگی اسی طرح بسر کی اس کے بعد اس نے شادی کی جس کی وجہ اس کی آوارہ گردی کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے قصبہ سینٹس میں سکونت پذیر ہو کر شیشہ کے سامان کی رنگائی اور پیمائش اراضی کا کام شروع کر دیا اس کے تین بچے تولد ہوئے جس سے نہ صرف اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں بلکہ اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا۔ آمدنی ضروریات زندگی کے لئے بالکل ناکافی ہوئی اب اس کو سخت محنت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ غالباً اس نے یہ محسوس کیا کہ شیشہ کی رنگائی جیسے غیر معین پیشے میں سر کھپانے کی بہ نسبت وہ کوئی دوسرا بہتر کام کرسکتا ہے چنانچہ وہ ظروف کی میناکاری کی صنعت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس فن سے وہ بالکل ناآشنا تھا کیونکہ اس میں قدم رکھنے سے قبل اس کو کبھی مٹی کو پکتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کو بغیر کسی کی امداد کے ہر چیز از خود سیکھنا پڑا اس کو کامیابی کی بڑی توقع تھی وہ بڑے شوق و دلچسپی مستقل مزاجی اور صبر سے کام سیکھتا رہا۔

حسن اتفاق سے اٹلی کا بنا ہوا ایک خوش وضع پیالہ جو غالباً لوساڈلا ربیا کا بنایا ہوا تھا پالسی کی نظر سے گذرا اور یہی وجہ تھی کہ پالسی نے جدید فن پر غور کرنا شروع کیا اس واقعہ کا جو بادی النظر میں معمولی اور حقیر معلوم ہوتا ہے ایک معمولی دماغ نیز خود پالسی پر بھی کسی اور وقت میں اثر نہ ہوتا لیکن وہ ایسے موقع پر واقع ہوا جبکہ پالسی اپنا پیشہ بدلنے کی فکر میں تھا۔ فوراً اس کے دل میں اس پیالے کی نقل اتارنے کا جوش پیدا ہوا اور اس پیالے کو دیکھتے ہی اس کو سخت اضطراب ہوا اور اس وقت سے جس ملمع سے وہ برتن روغن کیا گیا تھا اس کو دریافت کرنے کی دھن پالسی کے دماغ میں بس گئی اگر وہ تنہا ہوتا تو اس راز کی تلاش میں سفر اٹلی اختیار کرتا لیکن اس کو اپنے اہل و عیال کی دیکھ بھال کرنی تھی اور انھیں چھوڑ نہ سکتا تھا بال بچوں ہی میں رہ کر مٹی کے برتن بنانے اور ان کو ملمع کرنے کی ترکیب دریافت کرنے کی امید میں کوشاں رہا۔

پہلے پہل اس نے ان چیزوں پر غور کیا جن سے ملمع تیار ہوتا تھا پھر ان کی ماہیت و حقیقت دریافت

کرنے کی غرض سے ہر طرح کے تجربات شروع کئے۔ جن اجزا کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ان سے ملمع تیار ہوتا ہے اس نے انھیں کوٹا پیٹا۔ پھر معمولی مٹی کے برتن خریدے ان کو پارہ پارہ کیا، اپنے مرکبات ان پر لگا کر بھٹی پر جس کو اس نے اسی مقصد سے تیار کیا تھا گرم کرنے کے لئے رکھ دیا۔ اس کے تجربات ناکام ثابت ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ برتن ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور لکڑی ادویات وقت اور ساری محنت اکارت ہوئی۔

عورتیں عموماً ایسے تجربات کو، جن کا نتیجہ محض یہ ہوتا ہے کہ ان کی اولاد کے خورونوش ولباس کے مصارف ان میں برباد ہو جاتے ہیں پسند نہیں کرتیں۔ پالسی کی بیوی گو دیگر معاملات میں اپنے شوہر کی اطاعت گزار تھی مٹی کے اور برتن خریدنے سے سخت ناراض تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ برتن محض توڑنے کی غرض سے خریدے جاتے ہیں لیکن اس کو مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ کیونکہ ملمع کے راز پر حاوی ہونے اس سے واقفیت حاصل کرنے اور اس کو ادھورا نہ چھوڑنے کا پالسی نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

پالسی نے اور کئی سال اپنے تجربات جاری رکھے۔ پہلی بھٹی ناکامیاب ثابت ہونے پر اس نے دوسری بھٹی گھر کے باہر تیار کی۔ اس میں پہلے کی نسبت زیادہ لکڑی جلی۔ زاید ادویات برتن اور وقت ضائع ہوا آخر چل کر اس کو معلوم ہوا کہ اب وہ اور اس کا گھر بار مفلسی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس نے کہا "میں نے اس طرح کئی سال رائگاں کئے، بجز رنج و افسوس کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ فرصت کے اوقات میں وہ کبھی کبھی اپنا پچھلا شیشہ کی رنگائی، تصویر کشی اور پیمائش اراضی کا کام کیا کرتا تھا، لیکن ان ذرائع سے اس کو نہایت قلیل آمدنی ہوتی تھی۔ آخر کار لکڑی بے حد گراں ہونے سے اس کے تجربات جاری نہ رہ سکتے تھے اس نے ہانڈیوں کے اور ٹکڑے خریدے پہلے کی طرح ان کے تین یا چار سو ٹکڑے کرکے ان پر کیمیاوی ادویات لگائے اور مقام سینٹس سے ڈیڑھ لیگ کے فاصلہ پر سفال سازی کے ایک کارخانہ کی معمولی بھٹی میں پکانے کی غرض سے لے گیا۔ پکنے کے بعد ٹکڑوں کو باہر نکالا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ساری محنت برباد ہوئی۔ اب اس کی ہمت پست ہو گئی لیکن مایوس ہونے پر بھی اس نے ہمت نہ ہاری کیونکہ اس تجربے کو اسی مقام پر از سر نو آزمانے کا اس نے پورا تہیہ کر لیا تھا۔

پیمائش اراضی کے کام کی وجہ اس کو کچھ عرصہ اپنے تجربات ملتوی رکھنے پڑے۔ ریاست کے ایک سرکاری حکم کی بنا پر محصول اراضی لگانے کی غرض سے سینٹس کے قرب وجوار کے (SAIF MARSHES) کی پیمائش کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس پیمائش اور ضروری نقشہ کی ترتیب کا کام پالسی کے سپرد ہوا اس میں

پالسی کا کچھ وقت صرف ہوا جس کا اس کو معقول معاوضہ ملا لیکن جونہی یہ کام ختم ہوا اس نے دہ گنے جوش کے ساتھ اپنے ملموں کی تحقیق کا پرانا کام پھر آغاز کر دیا اس مرتبہ اس نے تین درجن برتنوں کے ٹکڑے لئے اور ان پر اپنے مختلف مرکبات چڑھا کر ایک قریب کی شیشہ کی بھٹی پر پکانے کی غرض سے لے گیا اس تجربے سے اس کے کسی قدر دھندلی سی امید بندھی۔ کانچ کی بھٹی کی زاید گرمی سے بعض مرکبات پگھل گئے پالسی نے سفید ملمع کی بڑی تلاش کی لیکن کوئی ملمع اس کے ہاتھ نہ آیا۔

اور دو سال تک اس کے تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا حتیٰ کہ (SAIF-MARSHES) کی پیمایش سے جو آمدنی ہوئی وہ بھی قریب قریب صرف ہو چکی اور مفلسی نے پھر منہ دکھایا۔ اب پالسی نے ایک بڑی اور آخری کوشش کرنے کا ارادہ کیا اور اس مرتبہ سابق سے زیادہ برتن لیکر تجربہ شروع کیا۔ مٹی کے برتن کے تین سو سے زاید ٹکڑے جن پر اس نے اپنا تیار کردہ مصالحہ لگایا تھا شیشہ بھٹی کے پاس بھیجے گئے اور وہ خود بھی اس تجربے کے نتائج دیکھنے کی غرض سے وہاں پہنچا۔ چار گھنٹے تک وہ بھٹی کو دیکھتا رہا اس کے بعد بھٹی کھولی گئی۔ مٹی کی ہانڈیوں کے تین سو ٹکڑوں میں سے صرف ایک ٹکڑے کا مصالحہ پگھلا اس کو باہر نکالا گیا سخت ہونے کے بعد وہ سفید اور چکنا ہو گیا۔ اس ٹکڑے پر سفید ملمع کیا گیا اور پالسی نے اس کو "غیر معمولی خوبصورت ملمع" کے نام سے موسوم کیا۔ حقیقت میں پالسی کی نظر میں اس کا خوش وضع نظر آنا لازمی تھا کیونکہ ایک طویل کوشش اور انتظار کے بعد اس کو یہ نتیجہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کو لئے ہوئے وہ اپنی بیوی کے ہاں مکان کو دوڑا گیا اس نے خود میں جیسا کہ اس کا بیان ہے ایک نئی روح محسوس کی لیکن ہنوز پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی اس آخری کوشش کی خبر دی کامیابی اس کے لئے اپنی ناکامیوں اور تجربات کا سلسلہ آیندہ جاری رکھنے کی ترغیب و تحریص کا باعث ہوی۔

اس ایجاد کو مکمل کرنے کی غرض سے جس کی عنقریب تکمیل کا اس کو یقین ہو گیا تھا اس نے اپنے مکان کے قریب کانچ کی ایک بھٹی تیار کرنے کا ارادہ کیا جہاں اس کو خفیہ طور پر اپنے تجربات کرنے کا موقع مل سکتا تھا اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بھٹی تیار کرنی شروع کی اور اینٹوں کی بھٹی سے اپنی پیٹھ پر اینٹیں لایا کرتا تھا۔ معمار، مزدور، اور ہر قسم کا کام اس نے خود انجام دیا سات آٹھ ماہ اور گزرے آخر کار بھٹی تیار ہو کر قابل استعمال ہو گئی۔ اس اثنا میں ملمع چڑھانے کی غرض سے پالسی نے مٹی کے بہت سے برتن تیار کئے تھے۔ ابتدا میں تھوڑا پکانے کے بعد ان پر ملمع کا مصالحہ چڑھا دیا جاتا تھا اور پھر تجربہ کی

غرض سے بھٹی میں رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ پالسی کی تمام آمدنی اس کے بھینٹ چڑھ چکی تھی تاہم آخر بھی آزمائش کی غرض سے وہ کچھ عرصہ تک لکڑیوں کا کافی ذخیرہ جمع کرتا رہا آخر کار آگ سلگائی گئی اور کام شروع ہوا۔ تمام دن بھٹی میں لکڑیاں پڑتی رہیں رات بھر بھی پالسی اس میں لکڑیاں جھونکتا اور دیکھ بھال کرتا رہا لیکن ملمع نہ پگھلا۔ صبح ہوگئی اور بیوی نے صبح کا ناشتہ سامنے لا رکھا۔ کیونکہ پالسی بھٹی کے قریب سے جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکڑیاں ڈالتا جاتا تھا ہٹا نہیں۔ دوسرا روز بھی گذرا لیکن ملمع نہ پگھلا دن ختم ہوا۔ دوسری رات بھی گذری بلا غرض مایوس اور افسردہ دل پالسی ملمع کے پگھلنے کے انتظار میں بھٹی کی طرف نظر جمائے بیٹھا رہا۔ تیسرا روز اور رات بھی گذری۔ پھر چوتھا پانچواں حتیٰ کہ چھٹا دن بھی گذرا مسلسل چھ شبانہ روز تک باہمت پالسی نے جان توڑ کوشش کی اس پر بھی ملمع نہ پگھلا۔

پالسی کے دل میں خیال آیا کہ شاید ملمع کے اجزا میں کوئی نقص یا پگھلائے ہوئے مرکب میں کچھ کسر رہ گئی ہے اس لئے اس نے از سر نو پھر ایک آزمائش کیلئے تازہ مرکبات وغیرہ تیار کرنے شروع کئے اس میں اور دو تین ہفتہ گذر گئے۔ اب دقت طلب سوال یہ تھا کہ مٹی کی ہانڈیاں کس طرح خریدی جائیں؟ کیونکہ جو ہانڈیاں اس نے پہلی آزمائش کے لئے خود اپنے ہاتھ سے تیار کر رکھی تھیں عرصہ تک پکنے کی وجہ اس قدر ناکارہ ہو گئی تھیں کہ ان سے دوبارہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس کا تمام روپیہ صرف ہو چکا۔ اب نوبت قرض کی آپہونچی تھی اور اپنی اخلاقی حالت کے ٹھیک ہونے کی وجہ وہ قرض حاصل کر سکتا تھا۔ اگرچہ اسکی بیوی اور پڑوسی سمجھتے تھے کہ وہ اپنی آمدنی مہمل اور باطل تجربات میں ضائع کر رہا ہے لیکن پالسی کو کامیابی ہوئی مزید لکڑیاں اور برتن خریدنے کے لئے اس نے اپنے ایک دوست سے کافی قرضہ حاصل کیا اور پھر ایک بار آزمائش کے لئے تیار ہو گیا۔ برتنوں پر نیا مصالحہ لگایا گیا۔ اور ان کو بھٹی میں رکھ کر آگ سلگا دی گئی۔

یہ سب سے آخر اور نہایت مایوس کن آزمائش تھی آگ بھڑک اٹھی اور سخت گرمی پیدا ہوئی اس پر بھی ملمع نہ پگھلا۔ لکڑیاں کم ہونے لگیں اور مشکل یہ تھی کہ ضروری آگ کسطرح برقرار رکھی جائے قریب میں باغ کے احاطہ کی لکڑیاں پڑی تھیں ان سے کام چل سکتا تھا۔ پالسی اپنے بڑے تجربہ کی کامیابی کے مقابلہ میں ان کو ایثار کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے باغ کی لکڑیاں کھینچکر بھٹی میں جھونک دیں اب بھی ملمع نہ پگھلا باغ کی لکڑیاں بے فائدہ جل گئیں ملمع کے پگھلنے کے لئے ابھی اور دس منٹ

کی ضرورت تھی۔ اس وقت جس قیمت پر بھی لکڑیاں دستیاب ہوں خریدنے کی ضرورت تھی۔ اب گھر کا فرنیچر اور الماریاں باقی تھے۔ یکایک مکان میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دی اور پالسی کے بیوی بچے جن کو خوف ہوا کہ اس کی عقل سلامت نہیں پہنچتے ہی رہے لیکن اس نے تمام میزیں گھسیٹ کر ان کے ٹکڑے بھی بھٹی میں جھونک دیئے۔ اب بھی ملمع نہ پگھلا اب الماریوں کی باری آئی مکان میں لکڑیوں کے توڑنے کی پھر ایک آواز آئی اور الماریاں بھی ٹکڑے ٹکڑے کئے جا کر فرنیچر کے بعد آگ میں جھونک دی گئیں... بیوی بچے مکان سے باہر نکل پڑے اور شہر میں دیوانہ وار چلّا کر کہنے لگے کہ پالسی کو جنون ہو گیا ہے اور وہ گھر کا فرنیچر توڑ کر جلا رہا ہے۔

کامل ایک مہینے سے پالسی نے جسم کے کپڑے تک نہیں بدلے تھے۔ سخت محنت فکر اور غذا نہ ہونے سے وہ بالکل تھک گیا تھا علاوہ مقروض ہونے کے وہ قریب قریب لٹ گیا۔ لیکن آخر کار اس سفنے ملمع کے راز کو پا ہی لیا۔ کیونکہ حرارت کی آخری زبردست آنچ نے ملمع کو پگھلا دیا بھٹی ٹھنڈی ہونے کے بعد گھر کے معمولی بھورے مرتبان جب اس میں سے باہر نکالے گئے۔ تو ان پر ایک سفید روغن پایا گیا۔ اس ملمع کی خاطر پالسی کو لعنت ملامت حقارت وذلت برداشت کرنی پڑی اور اب جبکہ اس کے لئے اچھا زمانہ آیا۔ اپنی تحقیق کو عملی جامہ پہنانے کے موقع کا صبر سے انتظار کرتا رہا۔

اس کے بعد پالسی نے ایک ظروف ساز کو اس غرض سے نوکر رکھا کہ وہ اس کو اس کے مقررہ نمونوں کے مطابق مٹی کے برتن بنا دیا کرے ان پر ملمع چڑھانے کی غرض سے خود چکنی مٹی کے کچھ قدیم سکے یا تمغے تیار کرنا شروع کئے لیکن سوال یہ تھا کہ برتن تیار ہو کر قابل فروخت ہونے تک اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گذر بسر کس طرح ہو خوش قسمتی سے سینٹس میں ایک شخص رہتا تھا جس کو اگرچہ پالسی کی رائے سے اتفاق نہیں تھا لیکن اس کی دیانت وراست بازی پر بھروسہ تھا یہ شخص ایک مسافر خانہ کا محافظ تھا اور چھ ماہ تک پالسی کے قیام وطعام کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے رضامند ہو گیا اسطرح خورد ونوش کی فکر سے نجات حاصل ہوئی لیکن پالسی نوکر کو مقررہ اجرت ادا نہ کر سکتا تھا۔ گھر کا تمام اثاثہ ختم ہونے سے اس کو برہنہ ہونا پڑا چنانچہ اس نے اجرت کی جزوی ادائی

میں جو اس کے ذمہ واجب الادا تھی اپنے چند کپڑے دیدئیے

اس کے بعد پالیسی نے ایک مرتبہ بھٹی تیار کی لیکن یہ اس کی شومی قسمت کا باعث تھا کہ اس نے بھٹی کا تھوڑا اندرونی حصہ FLINTS سے تیار کیا تھا جب اس کو گرم کیا گیا تو FLINTS میں تڑک پیدا ہوئی اور وہ پھوٹ گئے ۔ پگھلا ہوا مادہ برتنوں کے ٹکڑوں پر پھیل کر جم گیا۔ ملمع کسی قدر ٹھیک ہوا۔ بھٹی کے پھوٹنے سے نقصان ہوا۔ مزید چھ ماہ کی محنت رائیگاں ہوئی۔ نقصان کے باوجود لوگ ان ظروف کو کم قیمت میں خریدنا چاہتے تھے پالیسی نے اس طرح برتن فروخت کرنا گویا اپنی عزت گھٹانا اور اس کو بٹہ لگانا سمجھا اس نے تمام برتن پارہ پارہ کردئیے وہ کہتا ہے کہ اس پر بھی یاس مجھے جو ش دلاتی رہی اور میں نے دلیری سے اپنا کام جاری رکھا۔ بعض اوقات جب کبھی ملاقاتی اور مہمان مجھ سے ملنے آتے تو اگرچہ حقیقت میں میں افسردہ خاطر رہتا تھا۔ لیکن خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی تواضع اور مہمان نوازی کیا کرتا تھا ۔ مجھے جو مصائب برداشت کرنا پڑے ان میں سب سے زیادہ خود میرے گھر کے لوگوں کے مضحکے اور ایذا رسانیاں تھیں یہ لوگ استقدر تنگدل تھے کہ انہیں میرے بغیر کسی ذرائع کے کام کو سرانجام دینے کے متعلق توقع نہ تھی۔ کئی سال تک میری بھٹیاں غیر محفوظ حالت میں رہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے موقعوں پر کئی شب مجھے بارش اور ہوا کے تکالیف برداشت کرنا پڑے ۔ میرا کوئی غمگسار اور مددگار نہ تھا بجز اس کے کہ ایک جانب بلیوں کے رونے اور دوسری طرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں کوئی تسلی کا سامان موجود نہ تھا۔ بعض دفعہ طوفان اس شدت کے ساتھ بھٹیوں سے ٹکراتا تھا کہ مجھے فوراً انہیں چھوڑ کر دروازوں میں پناہ لینا پڑتا تھا ۔ بارش میں بھیگنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کیچڑ میں لت پت ہوگیا ہوں ۔ اپنی اس حیثیت کذائی سے کبھی آدھی رات اور کبھی صبح میں مکان جاتا تھا۔ رات میں مکان میں روشنی نہ ہونے سے ٹھوکریں کھاتا اور ایک شرابی کی طرح ایک جانب سے دوسری جانب گھومتا تھا۔ حقیقت میں میں بھٹی کی دیکھ بھال سے تنگ آگیا اور مجھے اپنی طویل محنت کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس تھا۔ افسوس کہ مجھے گھر میں پناہ نہ ملی کیونکہ بارش میں بھیگنے اور کیچڑ میں لت پت ہونے کے علاوہ مجھے میرے کمرے میں سابق سے زیادہ بدتر ایذا پہنچائی گئی ۔

٭٭٭٭



باغ عامہ کا ایک دلفریب منظر

Kohinoor Power Press, Hyderabad.

جذباتِ نسیم

از

جناب محمد سلطان محی الدین خان قاسمی صاحب نسیمؔ

مدعا ہے یہ سرِ بزم تماشائی کا — کاش جلوہ نظر آئے تری رعنائی کا

دل ہے سینہ میں کہ تفسیرِ جفائے دلبر — قطرۂ خوں میں ہے نقشہ ستم آرائی کا

او تقاضائے جنوں! رحم کہ گھبراتا ہوں — چھوٹ جائے کہیں دامن نہ شکیبائی کا

بنگیا عشق میں گو سرو چراغاں لیکن — منتظر حیف رہا اپنے تماشائی کا

رازِ سربستہ ہوں۔ ہے مہرِ تعین لب پر — ورنہ کیا مجھ کو بھی دعویٰ نہیں یکتائی کا

میں وہ موسیٰ ہوں کہ دل میں ہے عیاں جلوۂ طور — لطف کچھ اور ہی درپردہ ہے گویائی کا

لامکاں ہے مرے جولانِ جنوں کو درکار — شوق پورا ہو کہاں بادیہ پیمائی کا

بزمِ امکاں میں رہا صورتِ انساں بنکر — کیا نیا رنگ ہے سب سے میری یکتائی کا

باعثِ ننگ محبت نہیں ناکام سہی — پردہ درِ نالۂ پنہاں نہیں سودائی کا

چاہیئے ضبطِ نفس عشق میں لیکن اے نسیمؔ!
لبِ خاموش میں انداز ہے گویائی کا

انگلستان اور اسکاچستان کے قدیم تعلقات

از

(جناب محمد فریدالدین خاں صاحب)

انگلستان اور اسکاچستان کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان دونوں ممالک کی تاریخ دیکھیں۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں ممالک شروع ہی سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

سنہ ۹۲۴ء میں کانسٹنٹائن شاہ اسکاچستان اور ایتھلسٹن شاہ انگلستان میں لڑائی ہوئی اور اول الذکر کو بمقام برونان برد شکست ہوئی۔ سنہ ۱۰۳۱ء میں ملکم دوم شاہ اسکاچستان نے کیانیوٹ کے آگے حلف اطاعت اٹھائی۔ سنہ ۱۰۷۲ء میں ولیم فاتح نے ملکم سوم سے اپنی فرمانبرداری کا اقرار لیا اور اسی طرح ولیم دوم نے بھی کیا۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں انگلستان اور اسکاچستان میں رشتہ داری ہوئی۔ ہنری اول نے ملکم سوم کی بیٹی مٹلڈا سے شادی کرلی۔ سنہ ۱۱۳۷ء میں ڈیوڈ شاہ اسکاچستان نے انگلستان پر اپنا حق (مٹلڈا اپنی ہمشیرزادی کی طرف سے) جتایا اور حملہ کیا لیکن سنہ ۱۱۳۸ء میں اس کو معارکہ عالم میں شکست ہوئی۔ سنہ ۱۱۵۷ء میں ہنری دوم نے ملکم چہارم کو اپنے ملک جنوبی قطع دینے اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ الکزنڈر نے سنہ ۱۲۰۹ء میں جان کی اطاعت قبول کی اور اسی طرح الکزنڈر سوم نے بھی ایڈورڈ اول کی اطاعت کی۔ الکزنڈر سوم کا انتقال سنہ ۱۲۸۶ء میں ہوگیا وہ مارگریٹ (دوشیزہ ناروے) کو وارث سلطنت چھوڑ گیا۔ مگر اس نے بھی بہت جلد انتقال کیا۔ اب بہت سے دعویداران تخت شاہی پیدا ہوئے ان میں سے جان بیلیل، رابرٹ بروس اور جان ہیسٹنگز قابل ذکر ہیں یہ ڈیوڈ کی اولاد سے ہیں تمام دعویداران تخت نے ایڈورڈ اول کو بحیثیت ایک ثالث کے مقرر کیا کہ وہ تمام دعویداروں کا فیصلہ کرے اسکاچستانی اور انگریز معززین کی ایک مجلس مقرر ہوئی جس نے سنہ ۱۲۹۲ء میں بیلیل کا حق جتایا۔ بیلیل نے ایڈورڈ اول کے آگے حلف اطاعت اٹھائی اور وہ بادشاہ اسکاچستان بنا دیا گیا چونکہ ایڈورڈ اول ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے

اس نے اسکاچستانیوں سے اس بات کا اصرار کیا کہ تمام مقدمات کی سماعت اسی کے آگے ہوا کرے۔ مزید براں بروقت فرانس سے گین کے متعلق جنگ چھڑنے والی تھی ایڈورڈ نے اسکاچستانی سردار کو فرانس کے مقابل اپنی طرف سے لڑنے کیلئے کہا اس پر اسکاچستانی بگڑ گئے اور ان لوگوں نے حلف اطاعت توڑ ڈالی۔

اسکاچستان میں جنگ لڑائی ۱۲۹۶ء میں شروع ہوئی بروک کو انگریزوں نے لیلیا۔ اور اسکاچستانیوں کو جنگ ڈنبار میں شکست ہوئی بیلیل ٹور ہو مسجد میں قید کردیا گیا۔ اور ایڈورڈ اول کی طرف سے ارل وارین گورنر اسکاچستان مقرر ہوا۔ ۱۲۹۷ء میں ولیم والیس نے چند سپاہی فراہم کرکے ارل وارین کو اسٹرلنگ کے مقام پر اور انگریزوں کو اسکاچستان سے مار باہر کیا۔ دوسرے سال ایڈورڈ بذات خود اسکاچستان پر حملہ آور ہوا اور والیس کو ۱۲۹۸ء میں بمقام فالکرک شکست ہوئی۔ والیس چند سال بعد گرفتار ہوا اور اسکو سولی دیدیگئی۔

جان کامن کی بغاوت جان کامن بیلیل کا پوتا، تمام شمالی صوبجات پر قابض تھا گو اس کو ۱۳۰۳ء میں کچھ کامیابی ہوئی لیکن پھر اسکو ایڈورڈ کا دست نگر ہونا پڑا کچھ عرصے تک ان تمام شورشوں کا سلسلہ معدوم ہو چکا تھا۔ اور اسکاچستان میں امن و امان تھا مگر ۱۳۰۶ء میں پھر رابرٹ بروس (بیلیل کا مخالف) نے اسکاچیوں کو اپنے ہمراہ لیکر ملک میں ایک شور برپا کیا۔ بروس کامن کا خاتمہ کرکے ۱۳۰۶ء میں اپنے آپکو بادشاہ اسکاچستان مشہور کیا۔

اڈنبرو، پرت اور راکس برو پر قبضہ کرلینے کے بعد بروس اسٹرلنگ کے محاصرہ میں سرگرم ہوا۔ اب ایڈورڈ دوم ایک لاکھ سپاہی لیکر بروس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ مگر بروس نے صرف ۴۰۰۰۰ سپاہیوں کی مدد سے ایڈورڈ دوم کو ۱۳۱۴ء میں شکست فاش دیدی یہ لڑائی جنگ بانک برن کہلاتی ہے ایڈورڈ سوم کے عہد میں اسکاچستانیوں نے پھر انگلستان کے سرحدی صوبجات پر حملہ کیا اور ۱۳۲۸ء میں انگریزوں و اسکاچستانیوں کے درمیان ایک صلح ہوئی جو (THE SHAMEFUL PEACE) کے نام سے مشہور ہے اس عہد نامے کیوجہ سے اسکاچستان کو انگلستان کے ہاتھ سے پوری آزادی مل گئی۔ اور ایڈورڈ سوم کی ہمشیرہ جونا کی شادی بروس کے خلف اکبر سے کردی گئی۔

۱۳۴۶ء میں جب کہ کیالے کا محاصرہ جاری تھا۔ اور فرانسیسیوں اور انگریزوں میں جنگ ہو رہی تھی تو اسکاچستانیوں نے شمالی انگلستان پر حملہ کیا۔ یہ سب کوشش نوجوان بادشاہ ڈیوڈ نے فرانس کی اعانت کے لئے کی تھی کیونکہ فلپ ہشتم شاہ فرانس نے اس کی جلاوطنی کے زمانے میں ڈیوڈ کے ساتھ بہت ہمدردانہ

سلوک کیا تھا اور جب ۱۳۴۶ء میں ڈیوڈ اور ایڈورڈ سوم کے درمیان جنگ نول کراس ہوئی تھی تو اسکاچستانیوں کو بری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی، خود بادشاہ اور بہت سے امرا لندن میں مقید کئے گئے۔

ہنری چہارم کے عہد میں بھی اسکاچستانیوں نے انگلستان پر حملہ کیا مگر ۱۴۰۲ء میں کوہ ہوملڈن کی لڑائی میں انہوں نے پرسیوں PERCIES کے ہاتھ شکست فاش اٹھائی اس فتح کی وجہ سے انگلستان کو بجائے نفع کے نقصان ہی پہنچا۔ اسی بناء پر پرسیوں کی بغاوت شروع ہوئی۔

ہنری ہفتم نے ۱۵۰۲ء میں جیمس چہارم شاہ اسکاچستان کی شادی اپنی لڑکی مارگریٹ سے کردی چونکہ ہنری ایک سیاسی قابلیت کا آدمی تھا اس لئے اس نے بدامنی کے زمانے میں اسکاچستان کو اپنا بنا رکھنا کوئی بیجا کام تصور نہ کیا۔

۱۵۱۱ء میں ہنری ہشتم نے اتحادِ مقدس میں شرکت حاصل کی اور فرانس کے مخالف اسپین، جرمنی، انگلستان یہ تینوں قوتیں متحد ہو کر پاپا کی جاگیرات کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ جب فرانس کو جنگ ہمیز میں شکست ہوئی تو فرانس نے شاہ اسکاچستان سے سازش کی اور جیمس چہارم شاہ اسکاچستان نے اپنے سالے ہنری ہشتم کا کوئی لحاظ نہ کیا اور فوراً انگلستان کی سرحد پر حملہ آور ہوا جیمس چہارم اس طوطا چشمی سے بار ور نہ ہو سکا ۱۵۱۳ء میں اس کو نواب سرے کے ہاتھوں میدان فلاڈنگ کی جنگ میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ خود جیمس اور اس کے بہت سے ساتھی میدان ہی میں قتل ہوئے ۱۵۴۲ء میں پھر ایک لڑائیوں کا سلسلہ اسکاچستان سے شروع ہوا اور جنگ سالوے ماس کی فتح نے اسکاچستانیوں کا زور بالکل توڑ دیا اور اس شکست کی خبر سے جیمس پنجم شکستہ دل ہو کر بہت جلد مرگیا اور تخت کے لئے اس کو جو میری آف سکاٹ کے نام سے مشہور ہے چھوڑ گیا۔

سامرسٹ جو ایک مدبر اور سیاسی قابلیت کا آدمی تھا اس نے ان دونوں حکومتوں میں اتحاد پیدا کرنے کی ایک تدبیر سوچی اور ۱۵۴۳ء میں ایڈورڈ ششم اور میری دونوں کی شادی کے لئے اقرار نامہ لیا گیا۔ مگر خود اسکاچستانیوں کی نااتفاقی کی وجہ سے یہ عہد پورا نہ ہو سکا ۱۵۴۷ء میں سامرسٹ نے اسکاچستان پر حملہ کیا اور چاہا کہ جبراً اسکاچستانیوں سے اس وعدہ کی تکمیل کرائے گو جنگ پنکی میں اسکاچستانیوں کو شکست ہوئی مگر انہوں نے میری کو جلد از جلد فرانس روانہ کر دیا تاکہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے اور وہاں اس کا نکاح ہنری دوم کے خلف اکبر فرانس سے کر دیا گیا۔

میری اسٹوارٹ کا ظہور پھر ملکۂ الزبتھ کے عہد میں ہوتا ہے۔ میری الزبتھ کی جانی دشمن تھی میری کی پہلی حرکت جس سے الزبتھ کی مخالفت ظاہر ہوتی ہے وہ اس کا اپنے آپ کو تخت انگلستان کا حقیقی وارث خیال کرنا ہے۔ الزبتھ کو وہ محض ایک غاصب قرار دیتی تھی اور خود کو چونکہ ہنری ہفتم کی پوتی تھی وارثِ تاج و تخت سمجھتی تھی مگر میری کے یہ سب حقوق ناقابل سماعت تھے، پہلی بات جو اس کے مخالف تھی وہ انگلستان کے قومی کلیسا یا مذہب کا پاپائے روم سے بالکل آزاد ہونا ہے اور دوسری بات یہ کہ انگلستان کی قومی پارلیمنٹ ایک آزاد قوت رکھتی تھی۔

اسکاچستان میں بھی ان دونوں اصلاحات کی تحریک بہت زوروں پر تھی اور اسکاچستانیوں نے الزبتھ سے اعانت کی درخواست کی مگر اس کا فیصلہ ایک طرف مذہب کے ہونے سے اور دوسری طرف میری اسٹوارٹ کے ہونے سے متزلزل ہوا تھا مگر جب میری نے ملکۂ انگلستان کا خطاب اپنے لئے جائز رکھا تو الزبتھ نے بھی پرسٹیریوں کو مدد دینی شروع کر دی میری کو پھر اسکاچستان کی سلطنت سے محروم کر دیا جیمس ششم جو کہ ابھی نابالغ تھا اسے بادشاہ بنا دیا گیا۔ میری کے شوہر کا جب فرانس میں انتقال ہو گیا تو اس نے ڈارنلے کے ساتھ شادی کر لی اور پھر اس کو مروا دیکر باتھول کے ساتھ نکاح کیا اس بنا پر اسکاچستانی اس کے سخت مخالف تھے اسکاچستان سے بھاگ کر میری انگلستان آئی اور یہاں اس کے آنے کی وجہ سے کئی شورشیں و سازشیں ہوئیں ۱۵۶۹ء میں میری کو الزبتھ نے بحیثیت ایک مجرم کے مقید رکھا تقریباً ۲۰ سال تک میری قید رہی اور ۱۵۸۷ء میں فیصلہ کے مطابق اس کو مجرم قرار دیکر قتل کر دیا گیا۔

۱۶۰۳ء میں اسکاچستان اور انگلستان کی ان سب جنگوں، سازشوں، اور شورشوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جیمس ششم ایک ہی ساتھ ادھر اسکاچستان کا بادشاہ بنا دیا گیا اور ادھر جیمس اول کے خطاب کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ بنا دیا گیا۔ غرض اس طرح سے دو ایسی حکومتوں کا اتحاد ۱۶۰۳ء میں ہوا جو صدیوں سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

ایک تسلّی

(شکسپیر کی ایک شہرۂ آفاق نظم کا ترجمہ)

از
جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

ذلت و افلاس پر پڑتی ہے جب میری نظر　　اشکِ حسرت ہوں بہاتا اپنے حالِ زار پر
حشر گو کرتے ہیں برپا نالہائے بے اثر　　میری اک سنتے نہیں ہیں آسماں کے گوش کر
جب ہجومِ یاس کا پاتا ہوں اپنے دل میں گھر　　دانت خوش بختی پہ رہ جاتا ہوں اپنی پیس کر

گاہ گھبرا کر یہ کہہ اٹھتا ہوں میں حسرت نصیب
ہائے مجھ کو کر دیا افلاس نے ذلت نصیب!

چاہتا ہے دل مرا بن جاؤں میں سرمایہ دار　　شان ہو جائے مری مثلِ امیرِ باوقار
تاجِ زریں سر پہ ہو بر میں قبائے زرنگار　　صورت و سیرت پہ میری ہو دلِ عالم نثار
اور ہوں زنگارنگ بزم آرائیاں لیل و نہار　　دوستوں کو ہو جدائی میری ازبس ناگوار

کیا بتاؤں دل میں میرے کرتا ہے کیا کیا خطور
ممکنہ کوشش سے بھی ممکن نہیں جس کا ظہور

یک بیک صبر و قناعت دل سے ہو جاتے ہیں دور　　عیشِ موجودہ کی بھی اشیا سے رہتا ہے نفور

رنج کا اُٹھتا ہے طوفاں غم کا ہوتا ہے وفور
غرقِ گرداب فنا ہوتی ہے کشتیِ سرور

سنگِ غم سے شیشۂ دل میرا ہو جاتا ہے چور
حالتِ ناگفتہ سے ہو جاتا ہوں میں ناصبور

دیکھ کر چشمِ حقارت سے میں اپنے آپ کو
کوسنے لگتا ہوں خجلت سے میں اپنے آپ کو

ایسی حالت میں کہ جب ہوتا ہے میرا غیر حال
میری پیاری زندگی ہو جاتی ہے مجھ کو وبال

بن کے رحمت میرے حق میں آتا ہے تیرا خیال
بارور ہو جاتا ہے میری تمنا کا نہال

برطرف ہوتے ہیں میرے دل سے اندوہ و ملال
اور میرا حال ہو جاتا ہے بس اس کی مثال

جیسے غم ناآشنا کوئی پرندِ صبح خیز
اُڑ کے سطحِ خاک سے ہو جو فلک پہ نغمہ ریز

سچ یہ ہے، خوئے محبت جب تری یاد آتی ہے
شادمانی کی وہ دولت ساتھ اپنے لاتی ہے،

عیش کی اک کیفیت دل پر مرے چھا جاتی ہے
کیا بتاؤں میں، کہ کیا حالت مری ہو جاتی ہے

اپنی حالت کے مقابل جانتا ہوں مبتذل
شانِ شاہانِ جہاں گنجینۂ اہلِ دُوَل

سولھویں صدی کا ایک ہیئت داں

(ٹائیکھو براہے)

از

جناب محمود مرزا صاحب متعلم بی اے نظام کالج حیدرآباد دکن

بہتیرے ایسے انسان ہیں جو ہر روز صبح میں سورج کو نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں رات میں چاند ستارے ان کے سامنے دکھتے نظر آتے ہیں کبھی آسمان سے کوئی روشنی گرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے تو کبھی بادلوں سے ہیبت آواز آتی ہے مگر ان کو اس بات کی کوئی پروا بھی نہیں ہوتی کہ آخر وہ کیا ہیں اور کیوں ایسی دکھائی دیتی ہیں تاریخ شاہد ہے کہ ہر طبقہ اور ہر زمانے میں ایک نہ ایک وجود ایسا ضرور رہا ہے جس نے اپنے ماحول کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور ان سے نتائج اخذ کئے زمین اور آسمان سورج اور ستاروں کے متعلق ہمکو پرانے سے پرانے خیالات دستیاب ہو سکتے ہیں سب سے قدیم خیال یہ ہے کہ زمین اور آسمان دونوں ایک جگہ دو چار کرے ہوئے ہیں زمین چپٹی اور ساکن ہے۔ اور سورج اس کے اطراف چکر لگاتا ہے۔ یونان والوں نے زمین ستاروں اور سورج کو دیوتاؤں سے موسوم کیا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ سورج ایک دیوتا ہے جو ہر روز اپنی رتھ آسمان پر سے زمین کے اوپر دوڑاتا ہے اہل مصر کا یہ خیال تھا کہ کرۂ ارض ایک بڑا دیو ہے جو ایک کہنی اور پاؤں ٹکائے لیٹا ہے۔ اور آسمان ایک دیوی ہے جو زمین کے دیو کے پیروں پر پیر رکھے ہوئے اور دونوں ہاتھ اسکی کہنی پر ٹکائے ہوئے نصف دائرہ کی شکل میں قائم ہے۔ اس دیوی کے لباس پر بیل بوٹے چمکتے ہیں جنکو ہم ستارے کہتے ہیں اک کشتی ہے جو اس دیوی کے سر ہانے سے نکلتی ہے اور پائینتی کی طرف جاتی ہے۔ اس کشتی میں مختلف صورت کے انسان ہیں جو کبھی کھیلتے ہیں اور کبھی کودتے ہیں اور یہ کشتی سورج ہے جو زمین کو روز روشن کرتی ہے۔ اہل ہنود کا فلسفہ سب سے بڑھا ہوا تھا انہوں نے یہ تبلایا کہ زمین ایک نصف کرہ ہے جو چار بڑے ہاتھیوں پر قائم ہے اور یہ ہاتھی اک کچھوے کی پیٹ پر کھڑے ہیں جو اپنا منہ

اور ہاتھ پاؤں نکالے پانی کی سطح پر تیر رہا ہے۔

جب یونان میں بطلیموس پیدا ہوا تو اس نے بتایا کہ زمین کے گرد سات سیارے چکر کاٹتے ہیں اور ہر ایک سیارہ ایک آسمان پر ہے اس طرح کل سات آسمان ہیں اس کے خیال میں زمین پر کرہ ہوا کے بعد کرہ نار ہے اور اس کرہ نار کے بعد پہلا آسمان ہے جو چاند سے منسوب ہے۔ پھر دوسرا جو عطارد سے اور تیسرا زہرہ سے چوتھا سورج سے پانچواں مریخ سے چھٹا مشتری سے اور ساتواں زحل سے زمانہ سلف کے لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے ہر ایک دن ایک ایک ستارہ کی حکومت کا زمانہ ہے پیر کے دن چاند منگل کے دن مریخ بدھ کے دن عطارد جمعرات کے دن مشتری جمعہ کے دن زہرہ ہفتہ کے دن زحل اور اتوار کے دن سورج زمین پر حکومت کرتے اور بنی نوع انسان کی قسمت کا اپنی مرضی کے موافق فیصلہ کرتے ہیں۔

اگرچہ اہل یونان نے علم وفن میں کمال حاصل کر لیا تھا مگر ہم کو ان کی معلومات کا زیادہ پتہ نہیں چلسکتا کچھ تو اس لئے کہ ان کے زمانے کو گزرے بہت عرصہ ہوا اور کچھ اس بیان کے لحاظ سے کہ اسکندریہ کا بڑا کتب خانہ جہاں یونانی علوم کی بڑی بڑی کتابیں تھیں جلا دیا گیا۔ اور پھر زمانہ کی ناقدری کی وجہ سے رہی سہی کتابیں بھی تلف ہو گئیں ایک زمانہ دراز تک علوم و فنون کا چرچا مسلمانوں میں ہوتا رہا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے نئے علوم ایجاد کئے الکیمیا خود اس بات کا شاہد ہے کہ علم کیمیا عربوں نے ایجاد کیا علم نجوم اور فلسفہ میں مسلمانوں نے بہت بڑی ترقی کی اور انہیں علوم کی ضیا باری یورپ میں ہوئی جسکی وجہ سے یورپ نے ترقی کی طرف رخ کیا سب سے پہلے یورپ میں جو بڑا سعید عالم ہوا وہ بیکن تھا اگر اسکو موجودہ زمانہ کا پیشرو کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ہر ایک علم میں اسکو کمال تھا مگر بدقسمتی سے اس زمانے کے لوگ جاہل تھے اور صرف اس لئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ جانتا تھا اور روپیہ پیسہ سے زیادہ محبت رکھتا تھا لوگوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور اسکو سزائے موت سنادی گئی، وو گر بیکن کے کوئی دوسو سال بعد لینارڈو ولسی پیدا ہوا اگرچہ یہ ایک مصور تھا مگر ہم اس کے کارناموں کے مطالعہ سے یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ واقعی وہ اپنے زمانے کا ایک بڑا شخص تھا سب سے پہلے اسی نے نقاشی میں روشنی اور سایہ اندازی کے قانون ایجاد کئے رنگکاری کے مختلف طریقے اسی نے بنائے اسی کے زمانہ میں طباعت کی مشین ایجاد ہوئی جسکی وجہ علوم و فنون کی تحصیل میں ایک حد تک بڑی آسانی ہوگئی کولمبس نے اتفاقاً نئی دنیا کا پتہ چلایا اور کوپرنکس پادری نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین سورج کے اطراف چکر لگاتی ہے۔

سب سے بڑی مشکل جو کوپرنکس کو پیش آئی وہ یہ تھی کہ مذہبی علماء کبھی ایسی بات کے سننے کے لئے آمادہ نہ تھے انجیل پر اُن کا ایمان تھا اور وہ یقین کرتے تھے کہ سورج ایک روشنی ہے جس کو فرشتے حسب احکام خداوندی زمین کے گرد لئے پھرتے ہیں

اور جو کوئی ان خیالات کے خلاف آواز بلند کرتا اسکو موت کا فتویٰ سنا دیا جاتا تھا۔ چونکہ کاپرنکس خود ایک مذہبی آدمی تھا۔ اور ساتھ ساتھ علوم ریاضی کا ماہر بھی تھا۔ اس لئے اس نے آہستہ آہستہ مگر بڑے استقلال کے ساتھ یہ خیالات شائع کرنے شروع کئے اور جب اس نے زمین کی حرکت کے ثبوت میں ایک مستقل کتاب لکھی تو اس کو پاپائے اعظم کے نام سے معنون کیا اور کتاب کی اشاعت کے اخراجات کا کفیل بھی ایک بڑے مذہبی شخص کو بنایا۔ اور اسی وجہ سے وہ متعصب لوگوں کے پنجہ سے بچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ جب اسکی کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو اسکو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنی کتاب کو اطمینان سے دیکھتا اچانک فالج نے اس پر حملہ کیا۔ اور وہ مطبوعہ کتاب کو سرہانے لئے ہوئے راہی ملک عدم ہو گیا۔

کاپرنکس کے بعد ٹائکھو نے دنیائے علوم میں خروج کیا۔ یہ بھی ایک مذہبی شخص تھا۔ اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سورج متحرک ہے اور زمین ساکن اور سورج زمین کے اطراف چکر لگاتا ہے۔ نہ کہ زمین سورج کے اطراف مگر اس کا یہ نظریہ جو کاپرنکس کے کلیہ کے خلاف تھا اس کے عین حیات تک ہی قائم رہا اور اس کے بعد ثابت ہو گیا کہ کاپرنکس کا خیال بالکل درست اور صحیح تھا اور ٹائکھو کا غلطی پر تھی۔

گرچہ ٹائیکھو کا قیاس زمین کے سکون کے متعلق غلط تھا۔ تاہم اس نے علم ہیئت میں بہت سے معلومات حاصل کئے۔ اس نے سیاروں کے دیکھنے کیلئے رسدگاہیں بنوائیں جو یورپ میں اس سے پہلے کبھی نہ بنی تھیں اجرام فلکی کے متعلق اس کے قیاسات خواہ کچھ ہی ہوں مگر جو مشاہدے کہ اس نے کئے وہ نہایت درست اور صحیح ہیں وہ سب سے پہلا مبصر ہیئت داں اور عملی علم ہیئت کے سلسلہ کا جس کے کمال کا نمونہ آجکل گرینچ کی رصدگاہ بنی ہوتی ہے بانی تھا۔ اس کے زمانے میں نہ تو خوردبین کا وجود تھا اور نہ دوربین کا۔ اور جب ہم غور کرتے ہیں کہ حساب میں اس نے ایک درجے کے ساٹھویں حصہ تک کی کمی بیشی کسی جگہ نہیں کی تو ہمیں ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی اس کا مشاہدہ ستاروں کی ٹھیک ٹھیک حرکت کے متعلقہ اغراض کیلئے بعض اوقات پیش نظر ہوتا ہے اور پچھلے زمانہ میں تو ہیئت دانوں نے نسلاً بعد نسل اس کے مشاہدہ کو ایک قابل اعتماد امر فرض کر لیا تھا اس کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہیئت داں اس قابل نہ تھے کہ مشاہدہ میں اس کی جیسی صحت کو پہنچ سکیں بہرحال وہ علم ہیئت کا ایک زبردست رہبر تھا جس کی سوانح ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

ٹائیکھو براہے شریف خاندان کا لڑکا تھا۔ اس زمانے میں جبکہ شرفا اور امرا کا کام صرف شکار اور قتل و خون تھا کون امید کر سکتا تھا کہ ایک شخص جو قسمت سے کہیں کا حاکم بننے والا ہے علوم و فنون

کیطرف توجہ کرکے یکتائے روزگار بن بیٹھے گا۔ علم کا حاصل کرنا امرا کیلئے اس زمانے میں باعث عار تھا پادریوں اور درویشوں کیلئے علم مخصوص تھا اور عوام کی نظر میں تحصیل علم کوئی زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی مگر ٹائیکھو کا چچا پڑھا لکھا آدمی تھا لڑکے کے طبعی رجحان کو دیکھکر مناسب سمجھا کہ اسے اپنا بیٹا اور وارث بنائے اور اعلیٰ تعلیم دلوائے۔ اس خیال سے اس نے خود اس کو ابتدائی تعلیم دی۔ یہاں تک کہ ہونہار لڑکا تیرہ برس کی عمر میں یونیورسٹی کی شرکت کیلئے کوپن ہیگن روانہ ہوا۔ زمانہ تعلیم میں ایک چاندگہن نے اس کی توجہ علم نجوم کیطرف منعطف کردی اور وہ غیب کی باتوں کے جاننے کیلئے سیاروں کی حرکت کا مطالعہ کرنے لگا۔ ۱۵۶۲ء میں اس کے چچا نے قانون کی تعلیم کیلئے روانہ کیا مگر اس نے تمام رقم نجوم اور ہیئت کی کتابوں اور اوزاروں کے خریدنے میں صرف کردی اور قانون کی ذرا بھی پروانہ کی حقیقت میں جس شخص کا مطمح نظر قانون عالم کا مطالعہ ہو اس کی نظر میں قانون انسانی کی کیا وقعت ہوسکتی ہے؟

۱۵۶۳ء میں اس کو مشتری اور زحل ملتے نظر آئے۔ اور جیسے کہ لوگوں کا خیال تھا اس سال ملک میں بڑی زبردست وبا پھیلی۔ مگر ان سیاروں کے اتصال نے ٹائیکھو کے رجحان کو اور زیادہ کردیا۔ اس نے کاپرنکس کے جدول کے ذریعہ جب تاریخ کو معلوم کرنا چاہا تو تاریخ اور وقوع میں ایک ماہ کئی دن کا فرق پایا۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کرلیا کہ پرانے جدول کی تصحیح کیلئے نئے جدول بذات خود تیار کرے اس کام کی تکمیل کیلئے ایک طویل عرصہ کی ضرورت تھی تاہم اس نے خود کو نئے جدول کی تیاری کیلئے وقف کردیا اس کا پہلا اوزار ایک قسم کا رولر تھا جس کے ذریعہ وہ سیاروں کی جگہ اور رفتار معلوم کرسکتا تھا اور اسی کے ذریعہ کسی سیارہ کا مقام کرہ آسمانی پر دریافت کرسکتا تھا۔

۱۵۶۵ء میں اس کے چچا کا انتقال ہوگیا اور ٹائیکھو اس کی جائداد کا وارث ہوا۔ جب ٹائیکھو اپنے چچا کی جگہ حاصل کرنے ڈنمارک آیا۔ اور لوگوں نے اپنے خیالات ظاہر کئے۔ تو عوام الناس نے سوائے تمسخر اور تذلیل کے اس کے ساتھ کوئی برتاؤ نہ کیا۔ بالآخر ڈنمارک سے وہ انہی خیالات کو لئے ہوئے نکلا اور پھر دوبارہ جرمنی کا رخ کیا۔ اس کی طبیعت کچھ ایسی تیز واقع ہوئی تھی۔ کہ ذرا سی بات پر الجھ جاتا تھا۔ جرمنی میں جب وہ ایک درویش کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کسی ریاضی کے مسئلہ پر دونوں میں بحث چھڑ گئی نوبت مار پیٹ تک پہنچی اور آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں .... (Duel) ڈوئل لڑیں.......... سات بجے شام کا وقت تھا۔ حریفوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزمائی کی مگر ٹائیکھو کے حریف کا وار ایسے زور کا چلا کہ بچارے کی ناک جڑ سے اڑ گئی آخر کار ناک نہ ہونے کا عیب وہ کس طرح دفع کرتا مجبوراً سونے کی ناک بنوائی

اور ہر روز وہ اس عیب کو چھپانے کے لئے اس طلائی ناک کو اپنے چہرہ پر لگایا کرتا تھا۔
اسی زمانہ میں وہ آگسبرگ گیا۔ اور وہاں اس نے ایک بڑا مقیاس الرفعت تیار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس آلہ کے ذریعہ اس نے متعدد سیاروں کے فاصلہ دریافت کئے اور ان کی نسبت نئے نئے معلومات حاصل کئے یہ آلہ اتنا بڑا تھا کہ بیس آدمی اس کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے لیجاتے تھے یہ آلہ برابر پانچ سال کام دیتا رہا لیکن آخرکار ایک طوفان کیوجہ سے برباد ہوگیا۔
۱۵۷۰ء میں وہ دوبارہ ڈنمارک گیا۔ لیکن اب کی دفعہ اس کی شہرت کے ڈنکے بج گئے اور لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی۔ چونکہ لوگوں کو کیمیا بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے اس نے کیمیا کیطرف توجہ کی اور عوام کی دلچسپی کے لئے مختلف مرکبات تیار کئے۔ پرانے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کچھ تو گرمی سردی سے اور کچھ سیاروں کی گردش سے کسی دھات کا سونا یا چاندی میں تبدیل ہونا مشکل بات نہیں۔ چنانچہ وہ ہر ایک دھات کو ایک ایک سیارے سے منسوب کرتے تھے۔ چاندی چاند سے سونا سورج سے تانبا مریخ سے اور سیسہ زحل سے منسوب تھے اس نے ان مفردات کی الٹ پھیر سے ایک عجیب الخاصیت دوا تیار کی جس سے وہ ہر ایک مرض کا علاج کرتا رہا اور ایک عرصہ دراز تک اس دوا کا تمام یورپ میں چرچا رہا۔
کیمیا بنانے کے شوق میں وہ اپنے عزیز وقت کو بیکار ضائع کردیتا اگر نومبر ۱۵۷۲ء میں ایک اور ستارہ آسمان پر نمودار نہ ہو کر اس کی توجہ اپنی طرف نہ پھیرتا۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر تین سال کے عرصہ میں ایک دمدار ستارہ نکلتا ہے۔ اور دنیا پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یہ ستارہ مشتری کے برابر چمکیلا تھا اور پورے ڈیڑھ سال تک نکلتا رہا ٹائیکو نے اس کے فاصلہ کے معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ ستارہ مذکور اس لاتناہی فاصلے کے آسمان پر نکلا تھا جو قطب تاروں کے طبقہ سے منسوب ہے۔
کوپن ہیگن کی یونیورسٹی نے اس سے علم ہیئت پر لکچر دینے کیلئے درخواست کی۔ مگر اس نے علم کی بے عزتی کے خیال سے اس کام کو اپنی کسر شان سمجھا۔ آخرکار بادشاہ نے بذات خود اس سے ایک دوستانہ درخواست کی جس پر وہ راضی ہوگیا۔ اسی زمانے میں اس نے عالی نسبی کے تعصب کو بالائے طاق رکھکر روستائیوں و کسانوں سے ربط وضبط پیدا کیا۔ وہ ان کا بغیر کسی فیس کے اپنی مستند اور مشہور و معروف دوا سے علاج کرتا جس سے مریض بہت جلد شفا پاجاتے تھے۔ جب شکم پرور طبیبوں نے اپنی روزی کو اسطرح ڈوبتے دیکھا تو وہ اس کے جانی دشمن بن گئے اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی قصہ مختصر وہ ایک زبردست مصلح اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ اس نے ایک کاشتکار کی لڑکی سے شادی بھی کرلی۔

اب ہم ٹائیکو کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بیان کرتے ہیں۔ فریڈرک دوم نے جب یہ دیکھا کہ ٹائیکو علم و فن میں اپنے زمانے کا یکتا ہے اور جب یہ خیال کیا کہ اگر اوس کی روپے سے مدد کیجائے تو نہایت ہی حیرت انگیز انکشافات کو ظاہر کرے گا تو اس نے ایک شاندار نذرانہ پیش کی۔ نذر یہ تھی کہ اگر ٹائیکو ڈنمارک میں رہے اور وہیں ایک رصدگاہ بنا کے علم ہیئت کے معلومات بہم پہنچانے پر راضی ہوجائے تو سرکار کی طرف سے چار سو پونڈ سالانہ اس کے اخراجات کے لئے ملا کریں گے۔ اور سردست رصدگاہ کی عمارت کے لئے بیس ہزار پونڈ کی منظوری دیجاتی ہے۔

ٹائیکو اس سے زیادہ چاہتا ہی کیا تھا۔ اس کی دلی تمنا یہی تھی اگر کسی ملک نے اپنا روپیہ کارآمد میں خرچ کیا تو بس یہی تھا۔ اس گراں بہا عطیہ کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کی تمام اقوام سے سائنس کے کاموں میں ڈنمارک کا ملک پیش پیش رہے جزیرہ ہون رصدگاہ کے لئے تجویز ہوا اور یہاں دنیا کی عظیم الشان رصدگاہ ہے۔ پہلے پہل یورپ میں تیار ہوئی۔ اس کا نام یورین برگ رکھا گیا جس کے معنی قصرالافلاک کے ہیں رصدگاہ جزیرہ کے وسط میں ایک پہاڑی پر بنائی گئی اور یہاں ہر ایک شئے کا انتظام کیا گیا تھا رصدگاہ کیا تھی واقعی ایک نمونۂ جنت تھی۔ چاروں طرف ہرے بھرے باغ، مطالع، تجربہ گاہیں، قیام گاہیں اور چار معائنہ گاہیں۔ جہاں نایاب و بہترین آلات وغیرہ ہمسایے تیار کئے گئے تھے۔ در و دیوار نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ اور اطراف میں زمانہ سلف کے غیر فانی اشخاص کی تصاویر آویزاں تھیں بے شک بیس ہزار پونڈ کی رقم معمولی نہ تھی تاہم عمارت کی تکمیل کے لئے ٹائیکو نے اتنی اور رقم اپنی جیب خاص سے خرچ کی۔

بیس سال تک اس علم و فن کی خانقاہ میں ٹائیکو نے کام کیا۔ اور بہت جلد یورپ کی سرزمین کا عظیم ترین شخص بن گیا۔ فلسفی، حکمار، مدبران وقت اور سلاطین زماں اس بڑے ہیئت داں کی ملاقات کو آتے اور اسکی نادر ایجادوں کا معائنہ کرتے تھے۔

ٹائیکو کا برتاؤ بڑے بڑے امرا کا مزاج بحال کردیتا تھا۔ فطرتاً ٹائیکو کسی کے آداب لحاظ کی پروا نہ کرتا تھا خواہ کوئی امیر و کبیر ہی کیوں نہ آئے اسکی غریب مسکین شکل بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اور وہ ذرا سی بات پر دیوانِ سلطنت کو بھی ڈانٹنے سے نہ چوکتا تھا۔ بہر حال اعزاز و مرتبت کی قدر اسکی آنکھوں میں نہ تھی بعض نادان امرا جو اسکی ملاقات کو آتے اس کے برتاو کو۔۔۔ اپنی ہتک خیال کرکے اس کے تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوجاتے تھے۔ اس نے ایک مسخرہ کو غیب کی باتیں بتانے کے لئے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ جب وہ ضیافت کے دسترخوان پر بیٹھتا اور کھانا کھالیتا تو اس غیب داں کو بلانا اور غیب کی باتیں سنانے کا حکم

دینا۔ اس وقت کسی شخص کو بھی اس کے سامنے دم مارنے کی اجازت نہ تھی

اس کو لوگوں سے نفرت تھی۔ اور ان کو متعلقہ علمی آلات نہیں دکھاتا تھا بلکہ ان کے سامنے نظر فریب عجیب و غریب اشیا مثلاً کھلونے، کلیں، چھوٹی چھوٹی پن چکیاں، انوکھی گھڑیاں، طلائی کرہ اور تمام قسم کے گورکھ دھندے پیش کرتا تھا جن سے بلاشبہ وہ خوش ہو جاتے تھے ٹائیکو کا برتاؤ کوئی برا یا فوق العادت نہ تھا۔ بلکہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی روش زمانے کی رفتار کے مطابق اپنے زمانہ میں جبکہ امرا کے اخلاق وحشیوں سے کچھ کم نہ تھے اور عزت ریزی اور قتل و خون ان کی نظر میں کوئی جرم نہ تھا تو ٹائیکو جیسے طبیعی کے لئے اپنی اور اپنے علم کی حفاظت کے لئے یہی چارہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی تند خو اور آتش مزاج بن جائے۔ اور امرائے عظام کا جابرانہ مقابلہ کرے۔

ان بڑی ہستیوں میں سے جو ٹائیکو کے پاس آئیں انگلستان کا بادشاہ جیمس اول بھی ہے جیمس ٹائیکو سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا اور اس کی رسدگاہ میں جب کہ وہ ڈنمارک کی شہزادی این سے ۱۵۹۰ء میں شادی کرنے کے لئے آیا تو آٹھ دن تک ٹھہرا رہا۔

جیمس نے جو ہدیہ ٹائیکو کو بطور نذر دئے ان میں سے ایک کتا بھی تھا اور یہی بچارا کتا ٹائیکو کی بربادی کا سبب بنا۔ اس کتے کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔

اتفاقاً جب کہ ڈنمارک کا دیوان سلطنت ٹائیکو کی ملاقات کے لئے آیا تو اس نے ایک لات بچارے کتے کے رسید کی جس پر ٹائیکو کا مزاج برہم ہو گیا اور اس نے دیوان اعظم کی بری طرح خبر لی جب دیوان صاحب ملاقات سے واپس ہوئے تو انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ٹائیکو کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیں گے محل میں آ کر بادشاہ سے شکایت کی مگر مہربان ملکہ صوفیا نے ٹائیکو کی طرف داری کی اور معاملہ ٹھنڈا ہو گیا کچھ عرصہ بعد فریڈرک کا انتقال ہو گیا اور کمسن لڑکا تخت نشین ہوا اب یہ وقت تھا کہ لوگ ٹائیکو سے اپنا بدلا لے سکتے تھے۔ وزیر اعظم نے تخت نشین لڑکے کو ٹائیکو کے خلاف میں بھڑکانا شروع کیا۔ اس زمانے کے خطوط سے جو ٹائیکو نے لکھے واضح ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مستقبل قریب کے متعلق خوف و ہراس ہے اور اندیشہ ہے کہ اس کو رسدگاہ چھوڑنی پڑے تاہم وہ خود کو اس خیال سے تشفی و دلاسا دینے کی کوشش کرتا ہے کہ جہاں وہ جائے گا اس کی لیاقت اس کی بصیرت اس کے ساتھ رہے گی اور ہر جگہ وہی چاند وہی سورج وہی آسمان وہی تارے نظر آئینگے۔

ایک دفعہ جب کہ نوعمر شہزادہ اس سے ملنے کیلئے آیا اور مختلف باتوں کی تشریح کے لئے اصرار کیا تو اس نے سختی سے جواب دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جاگیر چھین لی گئی اور تنخواہ بند کر دی گئی اور پانچ

سال کے اندر بغلیس نے اسے مجبور کردیا کہ رسدگاہ کو چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں دربدر خاک بسر نکلے اور وطن کو خیرباد کہے اس کی بیوی اور آلات و اوزار رسدگاہ میں ہی رہے تاکہ جب وہ کہیں مقیم ہو جائے تو وہ اس کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ دیوانِ سلطنت نے ایک کمیشن مقرر کی کہ اس کے علمِ ہئیت سے متعلق کارنامہ کا اندازہ کرلے۔ اس نابکار کمیشن نے یہ رپورٹ دی کہ ٹائیکو نے جو کچھ کیا وہ بیکار ہی نہیں بلکہ متنفر محض تھا اس پر عوام الناس نے بجائے ٹائیکو کی بڑی نے دے کی اور گلیوں اور سربازار بدنام کیا۔

آخر وطن میں رہنے کیلئے اس کے واسطے رکھا ہی کیا تھا گھر دار چھوڑ چھاڑ اس نے جرمنی کا رخ کیا۔ پورے دو سال صحرانوردی میں بسر ہوئے۔ آخرکار یہ معیار روشن خیال شہنشاہ روڈلف ثانی نے اسے پریگ میں آنے کی دعوت دی اور تین ہزار کراؤن سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کیا۔ یہاں اس نے ایک قلعہ کی مرمت کی اور رصدگاہ کا انتظام کیا۔ علم کے شیدائی اس کے گرد جمع ہوئے۔ اور انہیں شاگردوں میں ایک غریب لڑکا جان کپلر بھی تھا جس نے آگے چلکر اپنے اوستاد سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

گرچہ ٹائیکو نے پریگ میں بہت سے مشاہدے کئے اور رودلفی جدول کا کام آغاز کیا تاہم لوگوں کی بدنامی نے اس کی ہمت توڑ دی اور اس کے کام کی بے اعترافی نے اس کی کمر بٹھا دی۔ اور موت کا چنگل اس سے قریب ہوتا جاتا تھا ایک تکلیف دہ بیماری نے اسے آگھیرا اس کے ساتھ ساتھ بے چینی بے خوابی اور سرسام و شوریدہ سری نے اس پر حملہ کیا۔ اور یہ مظلوم ہستی بیماری کے دورہ میں یہ کہتی ہوئی چلی گئی:۔

"آہ شاید وہ ابھی طلوع نہ ہو۔ . . . . اور میرا انتظار اور زندگی بیکار ضائع ہوئی"

اس کے عزیز از جان آلات روڈلف کے حکم سے نمائش گاہ میں سجا دیئے گئے یہاں تک کہ الکٹر پیلیٹائن نے پریگ پر قبضہ کیا اور زمانہ کی کایا پلٹ سے وہ آلات خورد برد ہو کر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ صرف ایک یادگار ابتک باقی ہے جو پیتل کا ایک بڑا کرہ ہے۔ اور جسکو تقریباً ۲۰۰ سال بعد بادشاہ ڈنمارک کے آخر زمانے کے وزیر نے پہچانا کہ یہ کرہ ٹائیکو کا ہے۔ آجکل یہ کرہ کوپن ہیگن کی لائبریری میں موجود ہے۔

جزیرہ ہون پر ڈینیون نے حملہ کرکے رسدگاہ کو مسمار کر دیا۔ اور اب اس عظیم الشان رسدگاہ کی یادگار تودہ خاک اور گڈھوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تاہم ٹائیکو کا اصل کام ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے دوستوں اور اس کے شاگردوں نے اپنی اپنی عمر میں اس کے بوئے ہوئے درخت کو سیراب کرکے باور کر دیا ہے۔

خاموشی کہتی ہیں جس کو میری گویائی ہے

از
جناب محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم

سر کو ہر دم ہوسِ ناصیہ فرسائی ہے — پاؤں کو مشغلۂ بادیہ پیمائی ہے

آنکھ اس شوخ کے جلوہ کی تمنائی ہے — دل جمالِ رخِ پُرنور کا شیدائی ہے

درد نے دل میں مرے خوب جگہ پائی ہے — خوب تقدیر نے راحت مجھے پہنچائی ہے!

سب غلط دعویٔ اعجاز مسیحائی ہے — تم سے صحت کسی بیمار نے کب پائی ہے!

دیکھنا چاہتے ہیں طور پہ جا کر ہم بھی — کس قدر ہوش ربا جلوۂ رعنائی ہے!

میں ہوں دیوانہ تو سمجھا نہ مجھے اے ناصح! — اہلِ دانش تجھے کہدیں گے کہ سودائی ہے

دشتِ وحشت میں نہ بیٹھینگے ترے دیوانے — رہنما ان کا ہر ایک جادۂ صحرائی ہے

یا الٰہی مری دنیا ہی میں پرسش ہو جائے — عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے

پوچھتا ہوں انہیں آئینہ دکھا کر ہر روز — کیا اسی منہ سے تمہیں دعویٔ یکتائی ہے

اس کے ہمراہ جو پھرتا ہے تری زلفوں میں — دل تو دیوانہ ہے کیا شانہ بھی سودائی ہے

اک میری چپ سے ہوا رازِ نہانی افشا — خاموشی کہتے ہیں جس کو میری گویائی ہے

کنجِ مرقد میں تو ہر طرح سے ہم خوش ہیں فروغ — غم اگر ہے تو ذرا سا غمِ تنہائی ہے

دُھن کا پکّا

از جناب رشید احمد صاحب رشید (حیدرآبادی)

(بہ سلسلہ گذشتہ)

باب پہلا

سین پانچواں

لہستان

(اسپورٹس کا میدان۔ رعایا امرا اور بادشاہ جمع ہیں۔ خالد اور شہزادی بھی شاہ کے قریب متمکن نظر آتے ہیں عمران یہودی اور اس کی بیٹی ایک طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔)

شاہ لہستان۔ اب امید نہیں کہ کوئی اور شخص ہمارے بہادروں کے مقابلہ کے لیئے آئے گا ہمارے چاروں بہادروں میں نارمن نے بہت نمایاں طور پر بہادری دکھائی۔ اور اپنے حریفوں پر شمشیر زنی و نیزہ بازی میں فتح پائی۔ اس کے دو نو حریف تو زمین پر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور ایک سخت زخمی ہوا۔ اس لحاظ سے خوبصورتی کی ملکہ کا انتخاب جو اسے تاج پہنائے وہی کر سکتا ہے۔ یہ کون آرہا ہے؟

منتظم اسپورٹس (شاہ کو مودبانہ آداب بجالاکے) شاہ عالیجاہ۔ ایک بہادر جو اپنا نام ظاہر کرنا اور اپنی صورت دکھانا نہیں چاہتا بہادر نارمن سے معرکہ آزما ہونا چاہتا ہے۔

شاہ۔ (حیرت سے) بہادر نارمن سے؟

منتظم اسپورٹس۔ جی ہاں۔

شاہ۔ اور اپنا نام اور صورت بھی ظاہر کرنی نہیں چاہتا۔

منتظم اسپورٹس۔ جی ہاں۔

شاہ۔ اسے یہاں لے آؤ۔

منتظم اسپورٹس مودبانہ تسلیم بجالاکے اس بہادر کو لانے جاتا ہے۔ شاہ اور امرا اراستہ

کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھتے ہیں۔ منتظم اسپورٹس ایک شخص کو اپنے ہمراہ لاتا ہے جو سر سے پاؤں تک جوشن میں ڈوبا ہوا ہے)

منتظم اسپورٹس۔ (تعظیم سے تسلیم بجالا کے) یہی وہ بہادر ہے جو نارمن سے مقابل ہونا چاہتا ہے

شاہ۔ کیوں جی تم نارمن سے ہی کیوں لڑنا چاہتے ہو۔ ہمارے منتخب کردہ تین بہادر اور ہیں ان سے قوت آزمائی کرو۔ تم اپنی صورت کے ساتھ نام بھی نہیں بتاتے۔

بہادر۔ جی ہاں سریرآرائے سلطنت اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ امید ہے کہ میں معاف فرمایا جاؤنگا اور نارمن کے مقابلے کی اجازت سے سرفراز فرمایا جاؤں گا۔

شاہ۔ مگر مجھے تمھاری کامیابی کی امید نہیں۔ کسی اور بہادر کو انتخاب کرو۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے کیونکہ تم ایسے قوی ہیکل اور نارمن کی ٹکر کے نہیں ہو۔

ایک امیر۔ شاہ عالم پناہ کا حکم سنو۔ تم نارمن کی ٹکر کے نہیں ہو۔

بہادر۔ (شاہ سے)

دنیا میں میرا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے	اک دوست ہے اے شاہ سو وہ مرد نہیں ہے
مرجاؤں اگر میں تو کوئی غم نہ کرے گا	میت پہ میری کوئی بھی ماتم نہ کرے گا
دنیا میں نہ ہو دوست تو پھر لطف ہی کیا ہے	اس طرح کے جینے سے نہ جینا ہی بھلا ہے
اس جنگ میں بالفرض اگر موت ہی آجائے	لے لیگی کوئی ہستی قابل یہ مری جائے

شاہ۔ دیکھو ہم اپنے فرض سے ادا ہو چکے اور تمھیں خبردار کر چکے۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔ کیا کہتے ہو

بہادر۔ فدوی لڑے گا۔

(بہادر شاہ کو مودبانہ تسلیم بجالاتا اور منتظم اسپورٹس کے ساتھ دنگل میں آتا ہے۔ نارمن ایک طرف سے نکلتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر تک خاموش دیکھتے ہیں۔ اور پھر دونوں میں نیزہ بازی ہوتی ہے۔ دونوں کے نیزوں کی نوکیں چورچور ہو جاتی ہیں۔ تماشائی تالی بجاتے ہیں اب دونوں میں شمشیر زنی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر ایک ہی وقت میں وار کرتے ہیں۔ نارمن کی تلوار سپر کی مدافعت کی وجہ گمنام بہادر کے شانہ پر اوچھی پڑتی ہے۔ گمنام بہادر کا بھرپور وار نارمن کی سپر اور اس کے خود کو کاٹ کر سر پر پڑتا ہے نارمن زمین

گرتا ہے۔ تماشائی ایک اور مرتبہ چیئرز دیتے اور تالی بجاتے ہیں)

شاہ۔ اس گمنام بہادر کو جلد لاؤ۔

(منتظم اسپورٹس بہادر کو شاہ کے حضور میں پیش کرتا ہے)

شاہ۔ ہم تم کو تمھاری کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اب یہ تاج لو اور خوبصورتی کی ملکہ کو پیش کرو۔ جس کے انتخاب کا حق ہمیں حاصل ہے۔ وہ ہمیں یہ تاج پہنائے گی۔

(شاہ گمنام بہادر کو تاج دیتا ہے۔ بہادر تلوار کی نوک پر اسے لیتا اور آہستہ آہستہ گیلری کی ایک ایک عورت کو دیکھتا ہوا زبیدہ کے پاس آکر ٹھہر جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک بغور دیکھنے کے بعد تاج اس کے قدموں پر ڈال دیتا اور مودب کھڑا ہو جاتا ہے۔ شہزادی اپنی کرسی سے اٹھتی اور تاج لیتے ہوئے اُس کی طرف بڑھتی ہے۔

شہزادی۔ معزز بہادر۔ میں تمھیں تہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ میرے ہاتھ سے تاج پہننے والا معزز بہادر کون ہے؟

منتظم اسپورٹس۔ تاج پہننے کے لئے آپ کو خود اتارنا پڑے گا۔

بہادر۔ براہ کرم میرا خود نہ اُتاریئے۔

شہزادی۔ تاج پہنانے کے لئے بڑھتی ہے۔ مگر بہادر لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر گرتا ہے۔ منتظم اسپورٹس جب خود وغیرہ اتارتا ہے تو جمیل کی صورت دیکھتے ہی شہزادی دونوں ہاتھوں سے دل تھامی ہوئی گرنے کے قریب نظر آتی ہے۔

دوسرا باب

سین پہلا

(ایک کمرہ جس میں ایک پلنگ پر جمیل سو رہا ہے۔ قریب میں ایک اسٹول پر دو تین دوا کی شیشیاں ایک گلاس کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ ربیعہ جمیل کے کمرے میں داخل ہوتی اور اس کے پلنگ کے قریب آتی ہے اور اس کو نہایت محبت اور والہانہ نظر سے

دیکھتی ہے اور پھر اس کے منہ کے قریب اپنا منہ لیجاکر چاہتی ہے کہ اس کا بوسہ لے مگر پھر کسی خیال سے ہٹ جاتی ہے)

ربیعہ۔ کیا موہنی صورت اور کیا پیارا چہرہ ہے۔ کاش اس کو بھی مجھ سے محبت ہوتی۔ مگر افسوس اس کے دل کی تو کوئی اور مالک ہے۔ اور وہ مجھ سے محبت بھی کیوں کرے۔ کجا میں ایک یہودن اور کجا وہ ایک مسلمان۔ مجھے وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تف ہے مجھ پر کہ یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کی محبت کا دم بھروں۔

(گانا ربیعہ کا)

ستم پیشہ جفا جو کو دیا دل　∴　الٰہی آگیا کس پر مرا دل
یہودن میں مسلماں وہ غضب ہے　　پھنسا بھی تو کہاں جاکر پھنسا دل
کسی مغرور کافر سنگدل پر　　نہ آنا تھا نہ آنا تھا مرا دل
لگا کر آگ سارے تن بدن میں　　کہاں چھوڑا مجھے او بیوفا دل

(عمران آہستہ آنا اور ایک گوشے میں کھڑا ہوکر ربیعہ کا گانا سنتا ہے۔ گانا ختم کرتی ہے تو بیٹی کے پاس آنا اور اس کو اپنے گلے سے لگاتا ہے)

عمران۔ بیٹا تم ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو جو اپنے کفو کا نہیں، جو اپنے قبیلے کا نہیں، جو اپنی قوم کا نہیں۔ وہ مسلمان ہے تم یہودن ہو۔ وہ بے خانماں ہے تم صاحب سامان ہو۔ اس کا خیال اپنے دماغ سے نکالدو۔ اس کی ہوس اپنے دل سے دور کردو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کی محبت میں روز بروز گھلی جارہی ہو۔ اگر یہی حالت رہے تو بس ہماری زندگی ہوچکی۔

ربیعہ۔ آہ ابا۔ ابا!

عمران۔ (بیٹی کو گلے سے لگاکر) بیٹا نوجوانی میں دل و دماغ میں ایسے ہی خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اور کام نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کا بسیرا ہوتا ہے۔ اس سال تمھاری دل بہلائی کے لئے شام و دمشق کی سیاحت کریں گے دیکھو وہ بیدار ہوچکا۔

(جمیل بیدار ہوتا اور انہیں دیکھ کر خراماں خراماں ان کے پاس آتا ہے)

عمران۔ نوجوان محسن۔ ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہیں کہ اب آپ مثل سابق کے تندرست اور توانا

ہوتے جا رہے ہیں ۔

جمیل ۔ یہ بالکل سچ ہے ۔ اب تو میری صحت مجھے پہلے سے بھی بہتر نظر آتی ہے جس کی وجہ اپنے بوڑھے دوست اور پیاری بہن ربیعہ کی تیمارداری اور توجہ ہے ۔ جس کے لئے میں آپ کا اور پیاری ربیعہ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے ۔

ربیعہ ۔ (سائڈ میں) پیاری ربیعہ !

جمیل ۔ آپ کی ہمدردی کا میں شکر گزار ہوں ۔ ایسے وقت جب کہ ایک گمنام زخمی کا کوئی پرسان حال نہ تھا آپ نے اپنے اوپر تکلیف گوارا کی اور اس کی تیمارداری کی ۔

عمران ۔ پیارے دوست ہمیں اس گفتگو سے شرمسار نہ کرو ۔ اور ہماری ناچیز خدمت کی ستائش سے ہم کو زیر بار نہ کرو ۔ ہم آپ کے شرمندہ احسان ہیں ۔ یہ آپ ہی کا طفیل ہے جو میں اور میری بیٹی یہاں ہیں ورنہ معلوم نہیں اس ظالم کے ہاتھوں ہمارا کیا حشر ہوتا ۔ معلوم نہیں میری بیٹی کہاں رہتی اور میں کدھر رہتا ۔ آپ کی اس بیش بہا خدمت کے مقابلے میں تو ہماری خدمت عشر عشیر نہیں ۔

جمیل ۔ خیر صاحب ۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے ۔ اور مطلب پر آئیے ۔ اب چونکہ میں اچھا ہو گیا ہوں اس لئے اپنے معزز میزبانوں سے آج شام کو رخصت ہوں گا ۔

عمران ۔ نہیں نوجوان دوست آج نہ جاؤ ۔ دو چار روز اور آرام لو ۔

ربیعہ ۔ ہاں صاحب ذرا طبیعت کو اچھی طرح سے سنبھل جانے دیجئے اور پھر اس کے بعد آپ روانہ ہو جائیے ۔ ابھی آپ اس قابل نہیں کہ کہیں سفر کریں ۔

جمیل ۔ مجھے چند ضروری کام ہیں اس لئے میرا جانا ضروری ہے ۔

عمران ۔ کہاں کا ارادہ ہے

جمیل ۔ مقدونیہ ۔

عمران ۔ جب ایسی بات ہے تو پھر آپ کے سفر کا بندوبست کرتے ہیں ۔ (جانا عمران اور ربیعہ کا)

جمیل (آپ ہی آپ سے) معلوم نہیں زبیدہ کس حال میں ہے ۔ حالات تو کچھ سنبھلتے نظر نہیں آتے ۔

(باقی)

عروجِ فکر

از

جناب محمد جمیل احمد خاں صاحب کوکب شاہجہانپوری

اللہ اللہ یہ حجاب کا رنگ! رو کشِ مہر ہے نقاب کا رنگ

اے تری شان یہ نقاب کا رنگ زرد ہوتا ہے آفتاب کا رنگ

کس قدر شوخ ہے شباب کا رنگ عرقِ رخ میں ہے شراب کا رنگ

لطف کس طرح دے شباب کا رنگ کہ تصور میں ہے حباب کا رنگ

پرتوِ عارضِ درخشاں سے آفتابی ہو انقاب کا رنگ

لذتِ عشق اسی نے پائی ہے جس نے دیکھا ہو کچھ عتاب کا رنگ

دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی کیوں نہ اشکوں میں ہو شہاب کا رنگ

پھوٹ نکلا ہے دیدۂ تر سے گلشنِ دل کے التہاب کا رنگ

گرمیِ حسنِ عالم آرا سے اور کچھ ہو گیا نقاب کا رنگ

چشمِ باطن سے دیکھ اے کوکب!
ذرہ ذرہ میں آفتاب کا رنگ

چندہ دہندگان کی خدمت میں مصنف اپنے پرخلوص شکریے بھیجتا ہے، یہ اسپنے اصراف کے سامنے رسمی کورنش نہیں بلکہ ایک شاعر کے گرم دل کی احسان مندی ہے جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ ان کی فیاضی و محبت نے اس کو امتیاز و شہرت کا موقع دیا جس کی خواہش ہر شاعر کے پہلو میں ہوتی ہے اپنے قارئین سے اور بالخصوص فاضل و شائستہ اصحاب سے جو اس کے کلام کو پڑھ کر اس کی عزت افزائی کریں گے۔ اس کی یہ استدعا ہے کہ تعلیم و تربیت اور ماحول زندگی کی رعایت پیش نظر رکھیں لیکن اگر ایک منصفانہ و غیر جانب دارانہ تبصرہ کے بعد اس کے کلام کے متعلق کر داعی و بیہودہ گوئی کا الزام عاید ہو تو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور بلا تامل و رحم نفرت و فراموشی کے حوالہ کر دیں۔

(ترجمہ) ـــــ از سید شاہ محمد بی اے عثمانیہ)

دنیا کے شاہکار افسانے

برنس اپنی شاعری پر

(شاعر کا خود نوشت دیباچہ)

رابرٹ برنس (۱۷۵۹ - ۱۷۹۶) اسکاچستان کے ایک معمولی کسان کا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی بخوبی تعلیم نہ ہو سکی۔ اور اس کو ادب عالیہ اور دیگر علوم سے بے بہرہ رہنا پڑا۔ اس کا مطالعہ غالباً اسکاٹ لینڈ کے چند غیر معروف شعرا کے کلام تک محدود تھا لیکن اس میں شاعری کا فطری جوہر موجود تھا۔ اس کی اکثر نظمیں ترانے اور زمزمے معلوم ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک نقاد نے لکھا کہ برنس کا کلام پڑھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ "شاعری دل سے نکلتی اور دل میں پہنچتی ہے"۔

وہ غالباً اسکاچستان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے ہموطنوں نے بھی اس کی قدر دانی کی۔ اس کا کلام آج تک ہر دلعزیز و مقبول ہے۔ اس کو وہاں کا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری کی تاریخ میں بھی برنس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عہد مرور (جب ادب عالیہ رسمی کی جگہ خیالی شاعری لے رہی تھی) کے شعرا میں برنس کی ایک خاص اور امتیازی حیثیت ہے چنانچہ اس نے متقدمین شعرا مثلاً اسکاٹ ورڈسورتھ اس کے خوشہ چیں و مدّاح رہے۔

اس نے اپنے کلام کے پہلے اڈیشن کے ساتھ (جبکہ اسے شہرت و امتیاز ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا) ایک دیباچہ منسلک کیا تھا جو ادبی مذاق کے حضرات کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہم اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

جسب ذیل فرومایہ نظمیں اس شاعر کی کاوشیں نہیں ہیں جو تعلیم و تربیت سے مستفید ہو چکا ہو یا شاید اعلیٰ زندگی کی آسائش و فرصت سے فائدہ اٹھا کر تھیوکریٹس اور ورجل کی پیروی میں دیہاتی

مضامین کی تلاش کرتا ہو مصنف ہذا کے لئے یہ مشہور عالم شعراء از سر بستہ ہی رہے۔ اصولوں کے تحت شاعری شروع کرنے کے لوازمات سے محروم ہونے کے باعث وہ ان جذبات اور اطوار کا راگ اپنی مادری زبان میں گاتا ہے جن کو اس نے خود محسوس کیا یا اپنے گردو پیش کے دیہاتی ساتھیوں میں دیکھا صغر سنی سے یا کم از کم اپنے جذبات لطیف کے ابتدائی ہیجان ہی سے وہ شعر گوئی میں مصروف رہا لیکن حال ہی میں احباب کی ستائش دیا غالباً ان کی طرف داری جرارت آموز ہوئی اور اس کو خیال ہوا کہ خود میں جو کچھ قدر و جوہر ہے اس کو ظاہر کرے۔ تاہم ان میں سے کوئی نظم بھی پریس کو بھیجے جانے کے ارادہ سے نہیں لکھی گئی تھی شاعری سے دلبستگی میں اس کے مقاصد یہ تھے کہ کٹھن زندگی کی محنت و مشقت کے دوران میں اپنے تخیل کی معمولی مخلوق سے سرور حاصل کرے۔ اپنے مختلف جذبات یعنی محبت، غم، امید و بیم کا خاکہ کھینچے اور دنیا کے مصائب کے درمیان اپنا ایک ذریعہ تسلی تراش لے اور اس کے ساتھ اس کا یہ عقیدہ رہا کہ شاعری آپ اپنا صلہ ہے۔

اب وہ ایک مصنف کی حیثیت سے پبلک کے سامنے آرہا ہے مگر اس کام میں اسے خوف اور اندیشہ ہے بیت گو قبیلہ میں شہرت بہت عزیز رہی ہے اس لئے مصنف ایک غیر معروف و گمنام شاعر ہونے کے باعث اس خیال سے اندیشہ مند ہے کہ کہیں اس پر بھی گستاخ، احمق اور یاوہ گو ہونے کا الزام نہ لگایا جائے اور اس کے متعلق یہ خیال نہ کیا جائے کہ بحروں کی توڑ جوڑ اور قافیہ پیمائی سے واقف ہو کر خود کو شاعر تصور کرنے لگا۔

شاعر شنشٹون کا قول ہے کہ "فروتنی نے بہت سے ذکی اشخاص کو تارک الدنیا بنا دیا لیکن کسی کو شہرت عطا نہیں کی" اگر کوئی نقاد نقطۂ "ذکی" پر بگڑے تو مصنف اس سے یہ کہے گا کہ وہ خود کو چند شاعرانہ قابلیتوں سے معمور سمجھتا ہے ورنہ اس کا اس طریقہ سے اپنے کلام کا شائع کرنا نہایت ہی ذلیل فعل ہوتا۔ لیکن وہ یکساں خلوص سے اس کا بھی اظہار کرتا ہے کہ اس کی بہترین کاوشوں میں ریمزے و فرگوسن جیسی ذکاوت و بلند خیالی نہیں پائی جاتی متذکرہ دو شعراء کو اس نے اکثر زیر مطالعہ رکھا لیکن اس کا مقصد غلامانہ پیروی نہیں تھی بلکہ اپنا چراغ روشن کرنا منظور تھا۔

بڑی بی | تقطیع کراون۔ مطبوعہ مطبع کریمی، لاہور۔ ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو بازار بارودخانہ لاہور قیمت ۱۲ر

یہ ایم، اسلم صاحب کی چار کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ میاں اسلم ادبی حلقوں میں اپنی کثیر مصنفات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ ان چند اردو مصنفین میں سے جنہوں نے بچوں اور عورتوں کی اصلاح مختصر قصوں کے ذریعہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایک درجن سے زیادہ مطبوعہ اسلم صاحب کے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ بڑی بی اس قسم کا تازہ ترین مجموعہ۔ اس میں حسب ذیل قصے ہیں (۱) بڑی بی (۲) سہاگن (۳) رضیہ (۴) وہ بھی سچے۔

اسلم صاحب کے قصے کئی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اس مختصر سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہیں جس کا مطمح نظر بچوں اور عورتوں کی معاشرتی اصلاح ہے۔ دوسری طرف قصے کی اور تیسرے لطف زبان کی بدولت یہ بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

بچوں اور عورتوں بلکہ معمولی نوشت وخواند سے واقف عوام کی اصلاح تمدن کے لئے قصے سے بہتر، زیادہ مقبول اور موثر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ متمدن زبانوں میں قصہ، اس خدمت پر عرصہ سے مامور ہے۔ اس لئے اس مسلم تجربہ سے ہمیں زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھانا چاہیئے۔

بڑی بی کے چاروں قصے یکساں دلچسپ، اور نسائی کرداروں کی وجہ سے زبان کی لطافت سے بھی خالی نہیں ہیں میاں اسلم کے اکثر قصوں کی طرح، ان چاروں قصوں کے کردار بھی اسلم صاحب ہی کی طرح جدید تمدن کی سلامت رو ہستیاں ہیں۔ اس طرح کے رہبروں کی ہمارے بچوں ہماری عورتوں بلکہ خود ہم کو بھی سخت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہماری کورانہ تقلید کی خامیاں، غلط فہمی، غلط روئی روشنی کے موئدین ہرزہ کاریاں ہر قصے میں قصے ہی سے نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کی ہیں۔ اس طرح کے قصوں میں موعظانہ کیفیت کے پیدا ہو جانے کا ہمیشہ ڈر لگا ہوا ہے۔ چنانچہ حافظ نذیر احمد کے اکثر قصے جیسے توبتہ النصوح کے بعض مقامات، فسانہ کے کردار عادت کی نصیحتیں، اس ستم سے قطعی خالی نہیں ہیں۔ لیکن اسلم صاحب نے اپنی طرف سے کوئی مشورہ نہیں دیا۔ پھر بھی ہم قصوں کو پڑھ کر سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔

اس طرح کے ادب کی اردو کے لئے بہت ضرورت ہے۔ اس لئے ہم میاں اسلم صاحب کی اس تازہ تصنیف کے مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور آئندہ کے لئے ان کی پختہ خیالی کے مزید کارناموں سے متوقع ہیں۔



چاند، مردانہ دنیا ہی کا چاند نہیں بلکہ زنانہ دنیا کا بھی چندرماں ہے۔ چاند ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی سہیلی، ہمجولی، اور گوئیاں ہے۔ چاند میں عالم نسوان کی اعلیٰ خوبیوں پر، نسوانی سدھار وفلاح پر، انکے حقوق کے وکالت پر، اُنکے فوائد وبہبود پر بیش بہا مضامین شایع ہوتے ہیں چاند نسوانی اخلاق کا ترجمان تربیت اولاد کا رہنما، قومی سدھار میں استریوں کی امداد کا ڈنکا پیٹنے والا، اور مہلاؤں کی ترقی کا آرگن ہے۔ چاند ادبی اخلاقی، تاریخی، صنعتی، علمی، اصلاحی۔ اور معاشرتی مضامین، اور بہترین مضامین کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تصاویر کی کثرت کے اعتبار سے ایک تصویر کا البم ہے اور اردو زبان۔ عام ملکی اردو زبان۔ اور صاف ونکھری اردو زبان میں۔ بڑی آب وتاب سے ہر ماہ کی پندرہ ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ کاغذ وچھپائی نہایت نفیس، لکھائی عمدہ۔ ترتیب اعلیٰ۔ اور ضخامت سب اردو رسالوں سے بالا ہوتی ہے۔ اس کی خوبیاں اگرچہ مقبول عوام ہو چکی ہیں لیکن نمونہ دیکھنے کی اور بات ہے۔ یہ کہنا بے سود ہے کہ نمونہ دیکھکر آپ کیا کریں گے؟ بالیقین مستقل معاون بنجائیں گے۔

نمونہ کا پرچہ ایک ماہ تک مفت، آئندہ ایک روپیہ رونمائی دینے سے حاضر کیا جائے گا۔

ایڈیٹر۔ منشی کنھیا لال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ ایڈوکیٹ۔ الہ آباد۔

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرالیجیے

چندہ سالانہ	آٹھ روپے	چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت
ششماہی	پانچ روپیہ	منیجر دفتر چاند (اردو ایڈیشن) چندرلوک، الہ آباد سے دریافت کیجیے ٹیلیفون ۲۰۵
فی جلد	ایک روپیہ	تار کا پتہ "چاند" (خاص نوٹ۔ مضامین نظم ونثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بہ نام ایڈیٹر "چاند" اردو، ہونا چاہیئے

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ

کے

تازہ ادبی تحفے

اردو شہ پارے جلد اوّل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم، اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) (۱) تاریخ اردو ادب قدیم۔ (۲) اردو نظم و نثر کے جواہر پارے۔ (۳) ہر دور کے مصنفین کے علمی کارنامے۔ (۴) قدیم و متروک الفاظ کا فرہنگ۔ (۵) مشاہیر قدیم کے تصاویر۔ لکھائی چھپائی بہترین کاغذ فیدرویٹ۔ ضخامت (۴۰۰) صفحہ قیمت (۱۲/-) مجلد

ارباب نثر اردو:۔ مؤلفہ سید محمد ایم، اے (عثمانیہ) (۱) انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کی تاریخ (۲) فورٹ ولیم کالج کے مساعی جمیلہ کا تذکرہ۔ (۳) اردو نثر نویسوں کے حالات۔ (۴) اردو نثر کی کتابوں پر تنقید و تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ ضخامت (۳۲۰) صفحہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عاں) مجلد

دنیائے افسانہ حصہ اوّل مؤلفہ عبد القادر سروری ایم، اے، ال ال، بی (۱) تاریخ افسانہ نگاری (۲) اصول و مبادیات افسانہ نویسی۔ اردو افسانوں پر تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی ضخامت (۲۱۸) صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عہر)

افسانہ و کردار یعنی دنیائے افسانہ حصہ دوم مولفہ عبد القادر سروری ایم، اے، ال ال، بی، (۱) اشخاص قصہ اور ان کی افسانوی ہیئت۔ (۲) افسانوں کا میعاد (۳) اردو کے چند بہترین اشخاص قصہ پر تنقید و تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی ضخامت (۲۳۲) صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عہ) مجلد

گلشن گفتار مرتبہ سید محمد۔ ام۔ اے (عثمانیہ) (۱) زمانۂ قدیم سے لے کر میرؔ و سوداؔ کے عہد کے شعرا کا تذکرہ۔ (۲) قدیم اردو شاعری پر ایک نظر۔ (۳) اسالیب شعری، ان کی مقبولیت (۴) اردو تذکرہ نویسی پر دلچسپ بحث۔ لکھائی چھپائی عمدہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت (۱۰۰) صفحے قیمت (۱۲/)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

اردو شہ پارے

پر

(۱)

جسٹس سر سلیمان جج عدالت عالیہ الہ آباد
کی رائے

ڈاکٹر محی الدین قادری کی " اردو شہ پارے " اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اپنے موضوع اور عام ترتیب دونوں حیثیتوں سے یہ کتاب نہایت عمدہ ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اردو خواں پبلک اس کتاب کو ضرور پسند کرے گی ۔

(۲)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ام اے پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ الہ آباد
کی رائے

مجھے کتاب کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ باوجود اور مشاغل کے مصنف نے اس کام کے لئے بھی فرصت نکال لی ۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر محی الدین زور ایسی بہت سی مفید کتابیں شایع کریں ۔ جامعہ عثمانیہ کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ اس کے طلبہ تصنیف و تالیف کا کام خوش اسلوبی اور خوش ذوقی کے ساتھ کرتے رہیں ۔

کتاب نہایت خوب ہے اور اردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے امید ہے کہ باقی حصے بھی جلد چھپیں گے ۔ ڈاکٹر زور نے اپنے ذمہ کا کام بہت اچھی طرح انجام دیا ہے انھوں نے محنت اور کاوش کے ساتھ یہ شہ پارے مرتب کر کے اردو پر احسان کیا ترتیب اور انتخاب بہت ہی اچھا ہے ۔ کتابت و طباعت بہترین قیمت فی جلد مجلد ۔ ۱۲/ ے

مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

وجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اس کو سالہا سال کے تجربے اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ درد سر درد سول بچھو کے زہر کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو وہ ان کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔ **نوٹ** ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر جیمس ہینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹر اور پیٹنٹ شدہ ہے جسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھاتا ہے کا ایک ہی قطرہ ہے مثلاً ہیضہ، پلیگ، بخار، ہچکی، متلی، کھانسی، دمہ، بواسیر، خارش، سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ قسم اسہام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے

مجلّہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں پچاس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہوسکے گا اور جو حضرات بھی چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔
خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسید منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیج دیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ام اے

عمر یافعی

۳۰

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدرآباد دکن کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶/

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (للعہ) نصف کیلئے (عہ) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ۱/۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ آبان ۱۳۳۹ف م ستمبر ۱۹۳۰ء شمارہ (۶)

تصویر علامہ بحرالعلوم سید اشرف شمسی مرحوم

فہرست مضامین

شذرات

اس نمبر پر مجلّہ مکتبہ کی پانچویں جلد ختم ہوتی ہے اور بحمد اللہ وہ اگلے نمبر سے چھٹی شش ماہی میں قدم رکھے گا۔ اس ڈھائی سال کی مدت میں حیدرآباد سے متعدد رسالے اجرا ہوے مگر ناموافق حالات اور ناکافی خیر مقدم نے انہیں ختم کر دیا اور وہ کسی طرح پروان چڑھنے نہیں پائے۔ ارباب صحافت نیز ان حضرات سے جو رسالے کی اشاعت و اجرا کے کاموں سے واقفیت رکھتے ہیں، یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ حیدرآباد کے موجودہ حالات میں علمی رسالے کا چلانا کس قدر دشوار ہے ہمیں اس کام میں جتنی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں، ان کا اظہار کئی بار کر چکے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب تک ہم نے ہمت نہیں ہاری اور برابر کوشش کیے جا رہے ہیں۔ کئی مشکلات پر ہمیں غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور مستقبل قریب و بعید میں بھی امید کی جاسکتی ہے کہ ہماری مساعی بالکل نامشکور نہیں رہینگی

مکتبہ ابراہیمیہ پندرہ سال سے ملک کی جو علمی خدمت انجام دے رہا ہے اس سے اب تقریباً سارا ملک واقف ہے۔ حال ہی میں "دنیا کے شاہکار افسانے" کا جو مفید سلسلہ شروع کیا تھا اس کے اس وقت تک دو حصے (۱) قدیم افسانے (۲) چینی اور جاپانی افسانے، شایع ہو گئے ہیں۔ عنقریب اور دو حصے شایع ہونے والے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور بلند پایہ علمی اور تعلیمی کتابیں زیر طبع ہیں۔ ان میں سے اس وقت صرف ایک کتاب کا ذکر ہم اپنے قارئین کے لیے کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو کے کل مقدمات کا مجموعہ ہے۔ مولوی صاحب اپنے اسلوب بیان کے علاوہ ٹھوس علمی مقدمات لکھنے میں جو شہرت رکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس مجموعے میں مذہب و سائینس، تاریخ و تذکرہ، ادب و زبان کے (۲۰) مقدمات ہیں۔

مولانا سید اشرف شمسی سابق پروفیسر فارسی کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے

وہ فقید العصر عالم تھے کہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان میں بھی بہت کم عالم ان کے پا یے کے ہوں گے۔ مولانا ایک عالم مگر متوکل خاندان میں پیدا ہوئے۔ یتیمی و فلاکت میں تحصیل علوم وفنون کی اور فارغ التحصیل ہو کر جاہ و منصب کی بجائے علم کی شمع برداری اور فخر و غنا کو اپنا شعار بنایا۔ زمانہ طالب علمی سے درس و تدریس کا کام شروع کیا اور آخر عمر تک اسی مشغلے میں زندگی بسر کی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک ہو گی۔ مولانا نہ صرف جامع علوم و فنون بزرگ تھے بلکہ فارسی کے بہت بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ ایک مدت مدید تک حیدرآباد کو اپنے فیوض و برکات علمیہ سے سیراب کر کے چند ہی مہینے ہوئے کہ مولانا نے اس دنیا سے انتقال کیا اور اپنی مسند علم خالی چھوڑ گئے۔ اس نمبر میں مولانائے مرحوم کے متعلق جو مضامین اور نظمیں شایع کی جا رہی ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ ان کا تبحر عظمت اور شعر و شاعری کس درجہ کی ہے؟

حیدرآباد میں اردو صحافت روز بہ روز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اگرچہ گزشتہ تین چار سال میں کئی ہفتہ وار اور روزانہ اخبار جاری ہو کر بند ہو گئے۔ تاہم صحیفہ نگار افراد اس ناکامی سے پست نہیں ہوئے۔ بعض مستقل مزاجی سے کوشش کیے جا رہے ہیں۔ نئی کوششوں میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب رئیس (عثمانیہ) کی مساعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رئیس صاحب نے منشور نامی ایک روزنامہ جاری کیا ہے اور بڑے سلیقہ اور کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اپنے مندرجات و مضامین کی وجہ سے ان کا اخبار باوجود اس کے کہ اُسے جاری ہوئے ابھی دو تین مہینے بھی نہیں ہوئے مگر بڑی ہر دلعزیزی پیدا کر رہا ہے۔ ایسے سرگرم اور پرجوش ارباب صحافت سے جیسے کہ اس وقت اس میدان میں سرگرم جد و جہد ہیں، امید کرنی چاہیئے کہ حیدرآباد کی صحافت کا مستقبل بہت شاندار ہو جائے گا۔

ادارۂ چاند (الہ آباد) سے ایک ہفتہ وار سماجی سیاسی اخبار ہندی زبان میں شایع ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ یہ پرچہ مصور ہوگا اور قوم کی سماجی اصلاح اور سیاسی بلند آہنگیوں کے مضامین و مقالات شایع کرے گا۔ رسالہ چاند اپنے عام پسند مضامین اور رنگ

برنگ کی تصویروں اور نسوانی دلچسپی کی چیزوں سے جس قدر قبولیت حاصل کر رہا ہے، اس کے مدنظر کارکنان چاند نے جو نئی تجویز سوچی ہے امید ہے کہ وہ اسی طرح شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کریگی۔ اخبار کا نام "ہماری بیٹی" ہے۔

اس نمبر میں ہم نواب ضیا یار جنگ بہادر (علامہ مفتی نورالضیا الدین صاحب) کی ایک فارسی غزل شایع کرتے ہیں۔ نواب صاحب معز علامہ شبلی مرحوم کے ہم درس وہم مذاق ہیں۔ باوجود جاہ ومنصب کے آپ علم وفضل کی جس مسند پر متمکن ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم اس غزل کے لیئے جو بطور خاص ہمیں مرحمت فرمائی گئی ہے، نواب صاحب معز کے ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی ان کی عنایات اسی طرح "مکتبہ" پر مبذول رہیں گی۔

عام طور پر تمام علم دوست حضرات اور بالخصوص بہی خواہان جامعہ عثمانیہ واہل ملک اس اطلاع سے مسرور ہوں گے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبۂ قدیم نے حیدرآباد میں ایک مجلس علمیۂ عثمانیہ (عثمانیہ اکاڈیمی) قایم کی ہے۔ یہ انجمن تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ کی تصانیف وتالیفات، افکار وخیالات کو منظر عام پر لانے اور عام اہل ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرانے کے لئے افاضل کی تقریروں وغیرہ کا ایک زبردست لایحہ عمل اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وقت چند پرجوش طیلسانیوں کے ہاتھوں اس کی ابتدا ہو چکی ہے اور اس کا دایرہ عمل بھی زیادہ وسیع نہیں ہوا ہے تاہم جامعہ کے فیض یابوں کی ملک میں کمی نہیں اور عنقریب ہمیں اس کی توقع ہے کہ اس کا حلقہ امکان وسیع ہو جائے گا اور طیلسانیین عثمانیہ اس مرکز پر جمع ہو جائیں گے۔ اس انجمن نے قلیل سے سرمایے سے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور بہت قریب میں اس کا ابتدائی کام جو آیندہ کاموں کا نمونہ اور پیش خیمہ ہوگا، پبلک کے آگے آجائے گا۔

اسلام میں فلسفہ کا نشوونما

جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل

فلسفہ اسلام سے پہلے ابو سہل بن نوبخت نے اپنی کتاب نہمطان میں لکھا ہے کہ جم بن اونجہان کے عہد سے بہت زمانہ پیشتر فلسفہ نے بہت ترقی کی تھی مگر اس ترقی کے بعد بعض نسلوں کی سہل انگاری اور لاپرواہی کی وجہ اس میں تنزل پیدا ہو گیا تھا پھر جم ابن اونجہان کے عہد میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفہ کی طرف توجہ کی اور اس کے ہر شعبے کو بڑی کدوکاوش سے کتابوں کی صورت میں ترتیب دیا اسکے بعد ضحاک بن قے نے فلسفہ کو ترقی دی اور اس نے مشتری کے نام سے ایک شہر آباد کیا جہاں اس نے بروج سماوی کی تعداد کے مطابق بارہ (۱۲) محل تیار کروائے اور کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر کے اس شہر میں علما و فلاسفہ کو بسایا ۔ عوام الناس غیر معمولی قابلیت کی وجہ ان فلاسفہ کے بڑے معتقد رہے ۔ اسی زمانہ میں ایک نبی مبعوث ہوے تھے جن سے اکثر فلسفیوں نے انکار کیا اور بعض ان کے موافق بھی ہو گئے اسی وجہ سے آپس میں تفریق پیدا ہو گئی اور ہر فلسفی ایک شہر کا بادشاہ بن بیٹھا ۔ انہی فلاسفہ میں ہرمس نامی ایک مشہور فلسفی تھا جو مصر پہنچ کر وہاں کا بادشاہ بن گیا یہ علم کیمیا کا موجد ہے اس نے اس فن میں متعدد کتابیں لکھیں اور اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کی وجہ تھوڑے ہی عرصہ میں مصر کو سرسبز و شاداب بنا دیا اور وہاں کے باشندوں کی ہر طرح سے اصلاح کر کے ان کے دماغوں کو تعلیم سے روشن کر دیا۔

ولادت مسیح سے تقریباً پانچ سو سال پہلے یونان نے اولمپس کی پرستش کو خیرباد کہہ کر فلسفہ میں بڑی ترقی کی تھی اور مذہب کے قید و بند سے آزاد ہو کر فلسفہ ہی کو اپنا معتقد علیہ بنا لیا تھا چنانچہ فیثاغورث اور سقراط وغیرہ اسی عہد کے مشہور فلاسفہ ہیں جنہوں نے ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں قابل قدر ترقی کی تھی ۳۳۴ قبل مسیح میں سکندر یونانی نے مقدونیہ سے نکل کر ایران پر فوج کشی کی ۔ دمشق ۔ بابل ، شام اور مصر وغیرہ کو اپنی حیرت انگیز شجاعت کے ذریعہ فتح کیا ۔

بابل ، بڑا قدیم اور آباد شہر تھا ایک زمانہ میں اس کی فصیل کا دور جس کی بلندی (۸۰) فیٹ تھی

(۶۰) میل سے زیادہ تھا اس سرزمین میں فاضل علما و فلاسفہ تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی حکمت و دانش سے فضا میں دو معلق باغ تیار کئے تھے اور اُن کو کلوں کے ذریعہ دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہیں دنیا کی وہ نادر سُرنگ تھی جس کے ذریعہ دریائے فرات کے نیچے سے آمد و رفت ہوتی تھی۔ یہیں سے ارسطو کے بھتیجے کیلسنتھیز کو (۱۹۰۳) سال پہلے کے کلدانیوں کے مشاہدات اجسام فلکی سے متعلق آلات رصد ملے جن کو اس نے ارسطو کے پاس روانہ کر دیا۔ یہیں سے بطلیموس کو ایک جدول ہاتھ آئی تھی جس میں (۷۴۷) سال قبل مسیح سے اس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف کے نتائج موجود تھے۔

بعل وہ شہر ہے جو علم و حکمت میں مشہور تھا اُس کے بلند مندر کی چھت پر وہ رصدگاہ تھی جس میں کالدیہ کے ہیئت داں اختر شماری کرتے تھے۔

اصطخر، بلحاظ علوم و فنون ان سب سے زیادہ قابل ذکر ہے جہاں سنگ مرمر کے کتب خانے اور ایسی نادر الوجود عمارتیں تھیں جن میں کندہ کاری، صناعی، مینا کاری اور دیگر علوم و فنون کے بہترین نمونے محفوظ تھے۔ یہیں بادشاہان ایران کے موسم گرما بسر کرنے کا مقام تھا جس کے اطراف سبعہ سیارہ کی نجومی مناسبت سے مجلا پتھر کی سات فصیلیں تھیں۔ مختصر یہ کہ سلطنت ایران حیرت افزا آثار اور عظیم الشان علوم و فنون کا مخزن تھی۔ ان ممالک کو فتح کرنے کے بعد سکندر نے یہاں کے تمام علوم و فنون کو یونانی زبان میں ترجمہ کرا کے تقریباً ان تمام عمارتوں اور کتابوں کو جو قدیم فارسی زبان میں تھے نیست و نابود کر دیا۔

فارس کے بادشاہوں نے زردشت و جاماسب کے عہد میں فلسفہ و دیگر علوم کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا زردشت و جاماسب نے غلبہ سکندری کی پیشین گوئی کر دی تھی اس لئے ان بادشاہوں نے بنظر تحفظ اس علمی ذخیرہ کو چین و ہندوستان میں منتقل کر دیا تھا۔ سکندر کی جنگ کے بعد بابل کی حالت بالکل خراب ہوگئی تھی ایک عرصہ تک یہاں طوائف الملوکی پھیلی رہی۔ بالآخر اردشیر بابکان ساسانی بابل کا بادشاہ ہوا اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کی حالت درست کر لی۔ اس کے بعد چین و ہندوستان کی کتابوں کو واپس منگوا لیا اور اکثر لوگوں کو روم بھیجکر ان کتابوں کی نقلیں منگوائیں جن کو سکندر بابل سے ترجمہ کروا کر لے گیا تھا اس طرح جو علوم و فنون سکندر کی جنگ سے برباد ہوگئے تھے

بڑی محنت و کوشش سے اردشیر اور اس کے بیٹے ساپور نے دوبارہ جمع کر لئے ان کے بعد کسریٰ نوشیروان نے ان علوم کی بڑی سرپرستی کی۔

سکندر یونانی کے انتقال کے بعد خونریزی اور خانہ جنگیوں کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہو گیا۔ افسران فوج نے سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ سکندر کا علاتی بھائی بطلیموس سوٹر جو مصر کا حاکم تھا اب وہ بھی خود مختار فرمانروا بن گیا اور اپنا پایہ تخت اسکندریہ کو قرار دیا جس کی آبادی کی بنیاد خود سکندر نے ڈالی تھی اور فلسطین سے یہودیوں کو لا کر یہاں آباد کیا تھا۔ بطلیموس سوٹر کے حسن سلوک اور خدا شناسی کی وجہ یونان و مقدونیہ وغیرہ کے اکثر خاندان یہیں آکر آباد ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسکندریہ دنیا کا عظیم الشان اور دلفریب شہر بن گیا۔ بطلیموس سوٹر نے عجائب خانہ کا افتتاح کیا جس کے لئے سنگ مرمر کی ایک بہترین عمارت تیار کرائی گئی اور اس میں کتب خانہ بھی قائم کیا۔ اسحٰق راہب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اسکندریہ کا بادشاہ بطولوماوس فلید لفوس علوم قدیمہ کا بڑا دلدادہ تھا اُس نے زمیرہ نامی ایک شخص کو کتابیں جمع کرنے کے لئے مقرر کیا تھا اس شخص نے (۵۴۱۲۰) کتابیں جمع کیں اس کے بعد بادشاہ سے عرض کی کہ ہندوستان، سندھ، فارس، بابل، روم، جرجان اور موصل میں ابھی بہت بڑا ذخیرہ باقی رہ گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر اسی طرح محنت سے اور کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ ان تمام ممالک کا علمی ذخیرہ یہاں منتقل ہو جائے۔ چنانچہ اسی بادشاہ کے عہد میں جب عجائب خانہ مکمل ہوا تو اس وقت یہاں کے کتب خانہ میں مختلف علوم کی چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ اس زمانہ میں اسکندریہ مصر کا پایہ تخت ہی نہیں تھا۔ بلکہ فلسفہ اور دیگر علوم کی تعلیم کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز تھا۔ اس مشہور عالم کتب خانہ کے جمع کرنے میں شاہان بطلیموسیہ نے بڑی فراخ دلی سے روپیہ خرچ کیا۔ عجائب خانہ میں کاتبوں کی ایک جماعت محض اس لئے مامور تھی کہ جن کتابوں کو اُن کے مالک بیچنا نہیں چاہتے ان کی صحیح نقلیں کریں۔ جب کسی کتاب کا ترجمہ کیا جاتا تو اس کا معاوضہ اس قدر دیا جاتا کہ اِس زمانہ میں اس معاوضہ کا تصور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس عجائب خانہ میں شائقان علوم کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی جن کے تمام ضروریات کا انتظام حکومت کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ اس دار العلم کے انتظام و اہتمام کے لئے کسی سربرآوردہ اور مشہور عالم کو مامور کیا جاتا تھا۔ یہیں رصدگاہ بھی قائم کی گئی تھی۔ فلکی کرے، آلات ہیئت، اصطرلاب، آلات

پیمائش بکثرت مہیّا کئے گئے تھے ۔ اسی عجائب خانہ کے حکما وفلاسفہ کے دماغوں نے آتشین انجن اور آبی گھڑیاں ایجاد کیں ۔

حفاظت علوم کی طرف شاہان فارس کی خاص توجہ رہی ۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمیشہ کے لئے علوم دنیا میں محفوظ رہیں اور لوگ ان سے مستفید ہوتے جائیں ۔ اس حفاظت و پائیداری کے خیال سے شاہان فارس نے کتابوں کو بوج پتر پر لکھوایا یہی نہیں بلکہ ایک ایسا مقام تلاش کروایا جو بمقابل دوسرے مقامات کے حوادث دہر سے محفوظ ہوتا کہ وہاں کتب خانہ کے لئے کوئی محفوظ عمارت تیار کی جا سکے۔ ان تمام اوصاف کے لحاظ سے اصفہان کا انتخاب عمل میں آیا ۔ پھر اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ مقام رستاق جے منتخب ہوا اور یہیں کتب خانہ محفوظ کیا گیا ۔ ابو معشر کا بیان ہے کہ اب تک یہ عمارت موجود ہے اس کا نام سارویہ ہے ۔ ہمارے زمانہ سے بہت سال پیشتر جب اس کا ایک گوشہ منہدم ہوگیا تو اس میں سے مختلف علوم کی کتابیں برآمد ہوئیں جو قدیم فارسی زبان میں تھیں اور اُس وقت اس کتب خانہ کا حال معلوم ہوا ۔

ابن ندیم کہتے ہیں کہ ابوالفضل نے میرے پاس ان کتابوں میں سے چند نسخے بھیجے جو اصفہان کی شہر پناہ میں صندوقوں میں محفوظ پائے گئے تھے ۔ یہ کتابیں چمڑے پر یونانی زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ ان میں اس قدر بدبو تھی گویا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دباغت دی گئی ہے ۔ ایک سال گذرنے کے بعد جب یہ کتابیں خشک ہوئیں تب کہیں ان کی بدبو دور ہوئی ۔ ان میں کی کچھ کتابیں اس وقت بھی شیخ ابوسلیمان کے پاس موجود ہیں ۔

جس طرح ارض مغرب میں اہرام مصر قدامت وصنعت کے لحاظ سے مشہور ہیں اسی طرح مشرق میں سارویہ نہایت مستحکم اور نادرالوجود عمارت ہے ۔

ابواسحٰق بن شہرام کا بیان ہے کہ روم میں ایک قدیم مندر ہے جس میں لوہے کا عظیم الشان دروازہ نصب ہے ۔ قدیم زمانہ میں جب کہ یونانی کواکب واصنام پرستی میں مبتلا تھے اس وقت اس مندر کی بڑی تعظیم وتوقیر کی جاتی تھی ۔ میں نے بادشاہ روم سے اس مندر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن بادشاہ نے یہ کہہ کر اس کے بتلانے سے انکار کردیا کہ جب سے یونانیوں نے نصرانیت اختیار کی ہے اس وقت سے یہ مندر بند کردیا گیا ہے اس لئے اب اس کا کھولنا خلاف مصلحت ہے ۔ باوجود اس انکار

کے جب کبھی میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا برابر اس معبد کو دیکھنے کی تمنا ظاہر کیا کرتا یہاں تک کہ ایک روز میرے اصرار سے مجبور ہو کر بادشاہ نے مندر کو کھولا جس کی عمارت سنگ مرمر اور دوسرے مختلف رنگوں کے بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی تھی اس میں نہایت خوشنما مختلف کتبات اور نقوش تھے جن کی نظیر دیکھی نہیں گئی۔ اس مندر میں قدیم کتابوں کا اتنا ذخیرہ تھا جن کے اٹھانے کے لئے ایک ہزار اونٹ درکار تھے۔ ان میں بعض کتابیں اپنی اصلی حالت پر تھیں، بعض تو بالکل بوسیدہ ہو گئی تھیں اور بعض ایسی تھیں جن کو دیمک نے کھا لیا تھا۔ اس جگہ میں نے بہت سے نادر اشیا و آلات سونے وغیرہ کے بنے ہوئے دیکھے۔ میرے نکلتے ہی معبد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ یہ سیف الدولہ کے عہد کا واقعہ ہے۔ یہ مندر قسطنطنیہ سے تین روز کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ چند تاریخی روایتیں یہاں صرف اس لئے لکھی گئی ہیں کہ ان کے مطالعہ سے کم از کم سطحی طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام سے پہلے فلسفہ نے کس طرح اپنی ترقی و تنزل کے دور گزارے اور دنیا کی نظروں میں اس علم کی کیا اہمیت تھی اور قدما نے اس کی کس طرح قدر و حفاظت کی۔

فلسفہ کا نشو و نما اسلام میں | تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے بھی تہذیب و تمدن میں اس وقت تک کافی ترقی نہیں کی جب تک کہ اسنے اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم دیکر اپنے افراد کی سطحی ذہنیتوں کو بلند نہیں کیا۔

عرب کی قوم گو عرصہ دراز سے قعر جہالت میں پڑی ہوئی تھی مگر جب اسلام کی نورانیت نے اُس کے دل و دماغ کو منور کر دیا اور اس کی قدیم ذہنیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ تو اس بیداری کے ساتھ ہی عربوں نے بھی علوم و فنون کی ضرورت محسوس کی اور ان کے حصول کے لئے بڑے شوق و محنت سے قدم بڑھایا۔

اس زمانہ میں علوم کے حصول میں عربوں کو بڑے مراحل طے کرنے پڑے اس لئے کہ (۱) پہلے تو عربی زبان میں علوم موجود نہیں تھے (۲) دوسرے غیر زبان کے قلمی کتابوں کا دستیاب ہونا بھی نہایت دشوار تھا (۳) تیسرے تحصیل علم کے لئے دور دراز ممالک کا مخدوش سفر اختیار کرنا ضروری تھا لیکن عربوں کے شوق اور ان کی طلب صادق نے ان تمام دشواریوں کو انکی نظروں میں آسان بنا دیا۔ حصول علم کے وہ ایسے شیدائی بنے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کو نہایت کشادہ پیشانی سے برداشت کیا اور

مشکل سے مشکل منازل نہایت آسانی سے طے کئے۔ اس تعلیمی شغف نے عربوں پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ سب سے پہلے علمی ذخیرہ کو اپنی زبان میں جمع کرنا چاہیئے تاکہ قوم کا ہر فرد سہولت کے ساتھ علوم حاصل کر سکے اور غیر زبان سیکھنے کی زحمت ان کے شوق اور ارادوں میں مزاحم نہ ہو۔

سب سے پہلے خالد ابن یزید ابن معاویہ نے فلسفہ کے ترجمہ کی جانب توجہ کی۔ یہ بڑے قابل وفاضل اور علوم وفنون کے شائق تھے۔ خالد "حکیم آل مروان" کے نام سے مشہور تھے ان کو علوم قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی اکثر یونانی فلاسفہ نے مصر میں آکر سکونت اختیار کی تھی اور عربی زبان کے اچھے ماہر ہو گئے تھے۔ خالد نے اُن کو بلا کر فن کیمیا کی اکثر کتابوں کا ترجمہ عربی میں کروایا ان کے علاوہ بعض اور مسلمانوں نے بھی مختلف علوم کے عربی میں ترجمہ کئے۔

اس کے بعد خلفاء عباسیہ نے خاص طور سے اس جانب توجہ کی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں فلسفہ نے حقیقی طور پر اسلام میں نشو ونما پائی۔ منصور عباسی نے علمی سرپرستی کی ابتدا کی اس کو علوم قدیمہ کا بڑا شوق تھا اپنے عہد حکومت میں اُس نے ہر طرف طب اور قانون کے مدارس قائم کئے اور علوم و فنون کی ترویج میں بیحد کوشش کی منصور کو علم ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اس کا اکثر وقت اسی فن کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

ہندوستان کے ایک بڑے عالم ہیئت نے منصور کے دربار میں حاضر ہو کر ایک زائچہ پیش کیا تھا جس کی منصور نے بڑی قدر کی۔ محمد ابن ابراہیم فزاری سے اس کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس کے سوا اور چند کتابیں اس فن میں لکھوائیں۔ غرض اُس نے اپنے دور حکومت میں علم ہیئت کو ممکنہ ترقی دی۔

مہدی کے دورِ حکومت میں خاندانِ برامکہ کی توجہ سے علوم قدیمہ کا مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ ابن ناعم، ابرش، اہوازی وغیرہ اسی عہد کے مترجمین ہیں جنہوں نے فلسفہ اور دیگر علوم کے عربی میں ترجمہ کئے۔

خلیفہ ہارون علمی دلچسپی کے لحاظ سے خاص شخصیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے زمانہ خلافت میں علم کی بڑی سرپرستی کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا۔ ترجمہ وتصنیف کے لئے بیت الحکمتہ کی بنیاد ڈالی اور ہر زبان کے قابل ولائق افراد کو مختلف علوم کے ترجمہ کے لئے مامور کیا ہارون کے زمانہ میں عام طور سے علمی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اکثر امرا اور رؤسا نے بھی اس جانب توجہ کی اور رقم کثیر صرف کر کے

مختلف علوم کے عربی زبان میں ترجمہ کرائے چنانچہ بنو شاکر نے فلسفہ، طب، ہندسہ، موسیقی وغیرہ مختلف علوم کی کتابیں دور دراز ممالک سے زر کثیر خرچ کرکے منگوائیں اور اُن کا عربی میں ترجمہ کروایا۔

خلیفہ مامون کا عہد حکومت فلسفہ کے لئے نہایت ہی مبارک ثابت ہوا حقیقت میں فلسفہ نے جو ترقی اس دور میں کی اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ صاحب الفہرست نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون نے خواب میں ایک خوبصورت شخص کو تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا جس کے غیر معمولی وقار و رعب سے مامون بیحد متاثر ہوا۔ اور دریافت کیا کہ آپ کون ہیں اُس شخص نے جواب دیا کہ میں ارسطاطالیس ہوں۔ اس کے بعد مامون نے ارسطاطالیس سے کچھ امور دریافت کئے جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

اس خواب کے بعد ہی مامون کو فلسفہ اور علوم قدیمہ سے بڑی دلچسپی ہوئی اس نے فلاسفہ و علما کی قدر و منزلت کرکے عام علمی شوق میں اور بھی اضافہ کیا۔ فلسفہ کے لئے مامونی عہد بیحد اہمیت رکھتا ہے اسی دور میں فلسفہ نے کامل طور سے اسلام میں نشوونما پائی اور اس علم دوست خلیفہ کی قدردانی اور کوششوں نے فلسفہ کو عربی زبان میں معراج کمال پر پہنچایا۔

سب سے پہلے مامون نے فلسفہ اور علوم قدیمہ کی کتابیں مہیا کرنا ضروری خیال کیا چنانچہ اس نے قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو کے تمام تصانیف تلاش و تفحص سے جمع کرکے دارالخلافہ کو بھیجے۔ قیصر کو اس فرمایش کی تعمیل میں کوئی تعرض نہیں تھا۔ مگر اس زمانہ میں مذہبیت انتہائے کمال پر تھی جس کی وجہ خود روم میں فلسفہ مفقود ہو چکا تھا۔ تاہم قیصر کی کوشش سے ایک راہب نے پتہ دیا کہ یونان میں فلسفہ کا ایک قدیم کتب خانہ ہے قسطنطین نے فلسفہ کی کتابیں بڑی تلاش سے جمع کرکے اس لئے محفوظ کر دی تھیں کہ اگر فلسفہ عام طور سے رواج پا جائے تو مذہب کو سخت صدمہ پہنچےگا یہ کتب خانہ قسطنطین کے زمانہ سے مقفل ہے اب تک کسی نے اس کو نہیں کھولا۔ قیصر نے اس کتب خانہ کو کھلوایا جس میں سے صرف فلسفہ کی بہت سی کتابیں محفوظ نکلیں جن کو مامون کے پاس بغداد روانہ کر دیا گیا۔ حجاج ابن المطر، یوحنا ابن بطریق، سلما کو مامون نے زر کثیر دیکر روم کی جانب روانہ کیا تاکہ وہاں سے منتخب کتابیں علوم قدیمہ کی لائیں۔

اُن کے علاوہ آرمینیا، مصر، شام اور دوسرے ممالک کو بھی لاکھوں روپیہ دے کر متعدد اشخاص کو صرف اس لئے روانہ کیا کہ فلسفہ کی تصنیفات بہم پہنچائیں۔ غرض کہ جس شوق و کوشش

سے مامون نے فلسفہ کا قدیم ذخیرہ جمع کیا۔اس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے ۔ اس کتب خانہ میں مختلف علوم اور مختلف زبانوں کی، تقریباً دس لاکھ کتابیں تھیں ۔

مامون کی اس غیر معمولی دلچسپی نے امرا و اعیان دولت میں علمی شوق پیدا کر دیا تھا چنانچہ محمد ابن اسحٰق کا قول ہے کہ محمدؔ، احمد، حسن نے جو بنو شاکر المنجم کے نام سے مشہور ہیں روم سے علوم قدیمہ کی کتابیں منگوانے میں بڑی کوشش کی ۔ انہوں نے حنین ابن اسحاق کو زر کثیر دیکر روم روانہ کیا۔ یہ وہاں سے مختلف علوم فلسفہ، ہندسہ، ارثماطیقی، طب، موسیقی کے بہترین نادر کتابیں لایا ۔ ابو سلیمان سجستانی کا بیان ہے کہ بنو منجم نے حنین ابن اسحاق، حبیش ابن الحسن، ثابت ابن قرہ وغیرہ کو ماہانہ پانسو دینار مقرر کر کے صرف کتابوں کی نقل کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ان کے علاوہ بیش قرار مشاہرہ دیکر مترجمین کو ملازم رکھا تھا جو مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اور بھی بہت سے امرا نے بڑے شوق سے علوم قدیمہ کی بہترین خدمتیں کیں جن کی وجہ ایک بڑا علمی ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہو گیا ۔

مامون نے صرف علوم قدیمہ کا ذخیرہ ہی جمع کرنے میں کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ہی اس بے بہا ذخیرہ کو جو مختلف زبانوں میں تھا عربی میں ترجمہ کرانے کی جانب بھی توجہ کی ۔چنانچہ یعقوب ابن اسحٰق کندی کو جو مختلف زبانوں سے واقف اور فلسفہ کے بڑے ماہر تھے، ارسطو کے تصانیف کے ترجمہ کے لئے مامور کیا حقیقتہً کندی نے بڑی قابلیت اور کد و کاوش سے ارسطو کے فلسفہ کو عربی جامہ پہنایا جس کی وجہ بعد کے لوگوں کو فلسفہ کے سیکھنے میں بڑی سہولت ہو گئی ۔

مامون نے قسطا ابن لوقا کو جو ایک عیسائی فلاسفر تھا اور جس نے فلسفہ و حکمت کی بہت سی کتابیں جمع کی تھیں ۔بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا ۔سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا مجوسیوں کے علوم و فنون کے ترجمہ کی خدمت دی ۔جبرئیل بن بختیشوع جو ایک عیسائی طبیب تھا اس کو بھی ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا ۔اس طرح مامون کی توجہ سے فلسفہ کا کافی ذخیرہ عربی زبان میں پیدا ہو گیا ۔

مامون کو قدرتی طور پر فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی اس فطرتی شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مامون کی قبا کی آستینوں پر اقلیدس کے مقالہ اولی کی شکل پنجم کا نمونہ بنا ہوا تھا اس لئے کہ یہ شکل اس کو نہایت پسند تھی اور اسی وجہ سے اس شکل کو عربی میں شکل مامونی بھی کہا کرتے تھے ۔

مامون بلا لحاظ مذہب عام طور سے حکما و فلاسفہ کی بڑی توقیر کرتا تھا۔ اس کا قول ہے کہ علماء و فضلا خدا کے محبوب و مقبول بندے ہیں، یہ لوگ اپنے ابنائے جنس کو حکمت و فراست کی تعلیم دیتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو دنیا پر پہلے کی طرح پھر وحشت و جہالت چھا جائے گی۔

مامون کی یہ دلچسپی صرف علمی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ عمل کا بھی اس کو بے حد شوق تھا چنانچہ زمین کے کروی ہونے کا امتحان کرنے کے لئے اس نے علم ہیئت کے ماہروں کے ذریعہ بحیرۂ احمر کے ساحل پر دائرۂ ارضی کے ایک درجہ کی پیمایش کروائی جس سے زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل معلوم ہوا۔ اس ایک پیمایش سے زمین کے مدور ہونے کی نسبت مامون کو کافی اطمینان نہ ہو سکا اس لئے عراق عرب میں دو ہیئت داں جماعتوں کے ذریعہ دوبارہ پیمایش کرائی گئی۔ اس کے بعد مامون نے زمین کا مدور ہونا تسلیم کیا۔ محض فلسفہ کی اشاعت و ترویج کی وجہ اس زمانہ کے علماء دین نے مامون کو بدعتی ٹھہرایا مگر علما کا یہ فتویٰ مامون کو آخری دم تک فلسفہ کی خدمت سے باز نہ رکھ سکا۔

مصر میں بنی فاطمہ نے بھی بڑی محنت و کوشش سے لاکھوں روپیہ صرف کر کے بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا اور اس میں ایک لاکھ مختلف علوم کی خوش خط کتابیں جن میں سے فلسفہ کی چھ ہزار پانسو کتابیں صرف شعبۂ ہیئت و طب کی تھیں رکھی گئیں۔ اس کتب خانہ میں دو کرّے بھی تھے (۱) ایک چاندی کا (۲) دوسرا پیتل کا جس کی نسبت مشہور ہے کہ یہ بطلیموس کا بنایا ہوا تھا۔

اندلس میں خاندان بنی امیہ نے علوم قدیمہ کی بڑی خدمت کی حکومت کی جانب سے ایشیا، افریقہ وغیرہ مختلف ممالک میں محض اس لئے لوگ مقرر کئے گئے تھے کہ جو نادر کتاب ملے فوراً خرید لیں اسی شوق اور کد و کاوش سے خلفاء بنی امیہ نے بھی ایک عظیم الشان کتب خانہ مہیا کیا تھا جس میں مختلف علوم کی چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں اور جس کی صرف فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ اس کتب خانہ میں ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں کاتبوں، جلد سازوں، نقاشوں کی کثیر جماعت ملازم تھی۔

مسلمانوں کے اس علمی شوق و شغف کا ذکر کرتے ہوئے گبن کہتا ہے کہ صوبہ جات کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدار سے کام لیتے ہیں ان کی رقیبانہ مسابقت نے علمی مذاق کی اشاعت میں غیر معمولی حصہ لے کر فلسفہ اور سائینس کی روشنی کو اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیا۔

(باقی آئندہ)

تو حدیثِ گم شدہ کاروان ز زبانِ نقشِ قدم طلب

اثر خامہ
علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر
(سابق رکن عدالتِ عالیہ سرکارِ عالی)

رہ و رسمِ منزلِ شوق را ز بلا کشانِ حرم طلب ... سر و پا چو آتشِ دل زند ز دو دیدہ جنبشِ نم طلب

چو قدم ز خویشتن برون نہی دل و دیدہ را چہ سکون دہی ... پیِ صیدِ آہوی بیخودی گذری بوادیِ رم طلب

چہ بلاست گریۂ شادیی کہ فلک بکامِ تو آورد ... بہ ستارہ ریزیِ آسمان شرری ز آتشِ غم طلب

تو ہوایِ دامنِ خنجری دلِ خون گرفتہ چہ میخوری ... ز خرامِ فتنۂ محشری رہِ سیرگاہِ عدم طلب

ز خرامِ ناز گذشتگان چہ تلاشِ دیدہ دہد نشان ... تو حدیثِ گم شدہ کاروان ز زبانِ نقشِ قدم طلب

ز فسونِ سوزِ شبِ محن بزبانِ شمع گرہ مزن ... تو کشادِ کارِ صد انجمن ز نقابِ روی صنم طلب

ز خمارِ دیدۂ آرزو دلِ عالم است تہی سبو ... تو جوابِ نرگسِ مستِ او ز طلسمِ ساغرِ جم طلب

چو نیاز حرف نمی زند مژہ ترجمانیِ دل کند ... سخنی کہ لب نکشاد از دہنِ دریدہ قلم طلب

چہ بہ پیشِ اہلِ جہان کنی دلِ خویش را چو صدف تہی ... گہرِ ارادتِ بخششی ز محیطِ فضل و کرم طلب

چہ خوش است گر بہ سرخوشی شبِ ماہ بر سرِ آب جو ... تو بیادِ ساقیِ مہوشی قدحی ز جوششِ یم طلب

ز علوی مرتبتِ سخن سخن آفرین بود آشنا ... تو جوابِ این غزل ای ضیا ز سخنورانِ عجم طلب

عجائب خانہ دہلی

میں

خط نسخ و شکستہ کے نمونے

از جناب محمد سردار علی صاحب مدیر سالنامہ تجلی حیدرآباد

آج سے ایک سال قبل میں نے عجائب خانہ دہلی (دہلی میوزیم) کے ذخیرۂ خطاطی پر جو خط ثلث، نسخ، نستعلیق، شکستہ، رغبار وغیرہ پر مشتمل ہے ایک بسیط تفصیلی مضمون لکھا تھا جس کا ایک حصہ (صرف خط نستعلیق سے متعلق) سالنامہ رہبر دکن ۱۳۳۹ف میں شایع ہو چکا ہے۔ اسی مضمون کا یہ دوسرا ٹکڑا (خط نسخ و شکستہ سے متعلق) "مجلہ مکتبہ" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد انشاء اللہ خط کوفی، ثلث، طغرا وغیرہ کے نمونوں سے متعلق تیسرا حصہ بھی ناظرین "مکتبہ" کی خدمت میں پیش کروں گا۔

اس مضمون کی تمہید جس میں خوشنویسی کی تاریخ اور مختلف خطوں کے ارتقار سے بحث کی گئی ہے کافی طویل ہونے کی وجہ بجائے خود ایک مستقل مضمون بن گئی ہے۔ اس کو بھی اسی سلسلہ میں پیش کیا جائے گا

اس مضمون کا ماخذ عجائب خانہ دہلی کا کیٹلاگ ہے نمونوں کے نمبر بھی وہی دئے گئے ہیں جو کیٹلاگ میں درج ہیں۔

نسخ کے نمونے نمبر ۲ ایک وصلی یاقوت المستعصمی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو نقش و نگار سے مزین ہے اور جس پر تاریخ ۶۸۰ھ (۸۲ - ۱۲۸۱ء) درج ہے۔ جلال الدین المعروف یاقوت مستعصمی بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا درباری خوشنویس تھا۔ خطاطی میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے نام سے ایک طرز تحریر موسومہ "یاقوتی" مشہور ہے[۱]۔ ہندوستان

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۳۸۶

اور ایران میں اس کے خط کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ اس کو شیعہ عقائد رکھنے کی وجہ خلیفہ نے قید کر دیا تھا لیکن تین سال کے بعد رہا کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہلاکو خاں کے حکم سے بغداد میں قتل عام ہو رہا تھا اس وقت یاقوت ایک مینار میں پناہ گزیں ہو کر خطاطی کی مشق کر رہا تھا۔ اس سے اس کے خطاطی کے شوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یاقوت نے بعمر ۱۲۰ سال بمقام بغداد ۶۹۶ھ[۱] (۹۸-۱۲۹۷ء) میں وفات پائی۔

نمبر۳۔ ایک قرآن جو خط کوفی اور نسخ کی مشترکہ طرز میں لکھا ہوا ہے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرز کی نسبت (جو عام طور پر خط بہار کہلاتی ہے)۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کے عہد قدیم میں رائج تھی۔ اس خیال کو اس حقیقت سے اور تقویت ہوتی ہے کہ موریٹز نے عربی خطاطی پر جو کتاب شائع کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ عربستان، ایران اور مصر اس طرز سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ خط نسخ کے مقابلہ میں پنپ نہ سکا۔ نسخ نے پہلے ایران میں اور بعد ہندوستان میں پھیل کر اپنا تسلط جما لیا۔ اس قرآن کی لوح اور ابتدائی دو صفحے طلائی نقش و نگار سے مزین اور جدولیں طلائی ہیں تمام کتاب میں لفظ اللہ جہاں کہیں آیا ہے طلائی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح رموز او قاف بھی طلائی ہیں۔ یہ نسخہ امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک قدیم خاندان کے رکن کے پاس سے جو یہاں کے ایک مشہور بزرگ شاہ ولایت کی اولاد سے ہے خریدا گیا تھا۔ اس نسخہ کے متعلق اس خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ نسخہ فیروز شاہ (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے اپنی دختر کے جہیز میں جو ایک بزرگ کے لڑکے سے بیاہی گئی تھی دیا تھا۔ سر اوریل اسٹینس وسط ایشیا کے آثار قدیمہ کے بہت بڑے عالم ہیں اس نسخہ کے متعلق ان کی رائے ہے کہ اس کا کاغذ بخاری ساخت کا ہے اور بلا شبہ اسی قدر قدیم ہے جس قدر خاندانی روایت میں بیان کیا جاتا ہے۔

نمبر۴۔ ایک قرآن جس میں مذکور الصدر نسخہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں البتہ جدولیں طلائی نہیں اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اول و آخر کے چند صفحے بعد میں لگائے گئے ہیں جس کی طرز تحریر بہت مختلف ہے۔ کتاب کے بیچ میں چند صفحے طلاکار اور رنگین ہیں۔

---

[۱] تذکرہ خوشنویساں میں یاقوت کی وفات کا سن ۶۹۸ھ (۹۹-۱۲۹۸ء) لکھا ہے صفحہ ۲۴

نمبر ۵۔ ایک وصلی جو نقش و نگار سے آراستہ ہے محمد افضل کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اپنے کو داراشکوہی اور البخاری لکھتا ہے۔ یہ وصلی ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں جب کہ شہزادہ داراشکوہ قندہار کے محاصرہ میں مصروف تھا لکھی گئی ہے۔

نمبر ۶۔ ایک حمایل شریف جس کے ابتدائی دو صفحات نقش و نگار سے مزین اور عنوانات و جدولیں طلائی ہیں اس پر کاتب کا نام ہے نہ تاریخ تحریر درج ہے۔ لیکن اس کی نسبت روایت کی جاتی ہے کہ یہ حدّاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دہلی میوزیم کے ذخیرۂ خطاطی میں حداد کی تحریر کا اور کوئی نمونہ موجود نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ خاندانی روایت کہاں تک درست ہے۔

عبدالباقی المعروف حداد کو شاہ جہاں کے آخری عہد میں اورنگ زیب نے اس کے وطن ایران سے طلب کیا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر اس نے اپنی تحریر کے کئی نمونے ملاحظہ شاہی میں پیش کئے جس میں ۳۰ ورق کا ایک قرآن مجید بھی تھا۔ شاہ نے اس کو "یاقوت رقم" خطاب دیا[1]۔ حالاتِ خوشنویساں[2] کے مولف کا بیان ہے کہ اُس نے حداد کے ہاتھ کا لکھا ہوا اتیس ورق کا قرآن دیکھا ہے اور خطِ خفی میں یہ نادر اور عدیم المثال ہے[3]۔ زیرِ بحث حمایل خطِ خفی کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ حداد اپنے وطن کو واپس چلا گیا لیکن اُس نے اپنے کئی شاگرد ہندوستان میں چھوڑے ہیں اس کی طرز کے لکھنے والے نصف صدی پیشتر بھی ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔

نمبر ۷۔ ایک نقش و نگار سے مزین وصلی علی اکبر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عبدالباقی حداد کا بیٹا تھا۔

نمبر ۸۔ ایک طلاکار وصلی علی اصغر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عبدالباقی حداد کا دوسرا بیٹا تھا۔

نمبر ۹۔ ایک قرآن محمد عارف "یاقوت رقم خاں" کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس پر سن ۱۰۸۰ھ (۷۰-۱۶۶۹ء) درج ہے۔

محمد عارف ملقب یاقوت رقم خان ہرات کا باشندہ اور ہندوستان میں عبدالباقی حداد کا

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۲۴

[2] قلمی موجودہ کتب خانہ مولوی ظفر حسن مرتب کیٹلاگ۔

[3] حالات خوشنویساں ورق ۵۱

بہترین شاگرد تھا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹوں کو خط نسخ کی تعلیم دیا کرتا تھا اور نستعلیق کی تعلیم کے لئے میر سید علی جواہر رقم[1] مقرر تھا۔ حالات خوشنویساں کا مولف لکھتا ہے (ورق ۴) کہ اس نے ان شہزادوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن اور پنجسورہ کے نسخے دیکھے ہیں جو محمد عارف کی طرز میں بہت شاندار لکھے ہوئے ہیں۔ محمد عارف کو یاقوت رقم خاں کا خطاب شاہ عالم بہادر شاہ کا دیا ہوا ہے۔[2]

نمبر۱۰۔ سرخی سے لکھی ہوئی ایک زر فشاں وصلی محمد عارف یاقوت رقم خان کے بھانجے اور شاگرد عباد اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

نمبر۱۱۔ ایک وصلی قاضی عصمت اللہ کی لکھی ہوئی ہے جو محمد عارف یاقوت رقم خاں کا شاگرد تھا قاضی عصمت اللہ نے خوشنویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی خفی اور جلی دونوں خوب لکھتا تھا ۱۱۸۶ھ (۷۳-۱۷۷۲ء) میں انتقال کیا۔[3]

نمبر۱۲۔ ایک وصلی فیض اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عصمت اللہ کا بڑا بھائی تھا۔ خط نسخ میں بہت اچھا ہاتھ تھا۔ اس کے استاد کا نام معلوم نہیں ہے ممکن ہے کہ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح محمد عارف یاقوت رقم خاں کا شاگرد ہو۔

نمبر۱۳۔ ایک وصلی سید امام علی رضوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو ولیعہد مرزا ابو ظفر (جو بعد میں شاہ عالم ثانی ہوا) کے خوشنویسوں میں ملازم تھا۔ یہ قاضی عصمت اللہ کی طرز پر لکھتا تھا۔

نمبر۱۴۔ ایک وصلی جلال الدین رضوی فرزند سید امام علی رضوی کے ہاتھ کی ہے جو شہزادہ میرزا ابو ظفر کا ملازم اور اپنے باپ کی طرز پر لکھتا تھا۔[4]

---

[1] میر سید علی جواہر رقم تبریز کا رہنے والا تھا۔ عہد شاہجہاں میں ہندوستان آیا شاہجہاں نے جواہر رقم خطاب دیکر شہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ اپنے عہد حکومت میں اورنگ زیب نے اپنے بچوں کو خوشنویسی سکھانے کے لئے مقرر کیا اور شاہی کتب خانہ کی مہتممی کے عہدہ پہ سرفراز فرمایا۔ جواہر رقم حملہ دکن کے موقع پر اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) میں انتقال کیا اس کی لاش دہلی لاکر دفن کی گئی۔ میر عماد کے طرز پر لکھا کرتا تھا اس کے خط کا نمونہ دہلی میوزیم میں موجود ہے جس کا نمبر (۶۰) ہے۔

[2] تذکرۂ خوشنویساں ص۱۲۶

[3] تذکرۂ خوشنویساں ص۱۲۷

[4] تذکرۂ خوشنویساں ص۱۲۹

نمبر ۱۵ - ایک وصلی جس کا کچھ حصہ نسخ اور کچھ طغرا میں ہے دہلی کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ثانی (۵۷ - ۱۸۳۷ء) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے - بہادر شاہ کو خوشنویسی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ خود بھی کئی قسم کے خط لکھتا تھا لیکن سب سے زیادہ نسخ میں اس نے مہارت بہم پہنچائی تھی، قاضی عصمت اللہ کے طرز میں لکھا کرتا تھا - بیان کیا جاتا ہے کہ شاعری کی طرح خطاطی میں بہادر شاہ کے کئی شاگرد تھے اور سب کو دربار شاہی سے ماہانہ نقد روپیہ وظیفہ ملتا تھا -

نمبر ۱۶ - ایک طلاکار وصلی محمد ہمایوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو مغلیہ خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور آخری صدی کے وسط میں زندہ تھا -

نمبر ۱۷ - دعا کی ایک کتاب جس کے ابتدائی دو صفحے طلاکار ہیں یہ آغا میر حسین شیرازی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس پر سن ۱۲۴۹ھ (۳۴ - ۱۸۳۳ء) درج ہے -

نمبر ۱۸ - ایک وصلی تحریر کردہ عبدالرحمان

نمبر ۱۹ - ایک وصلی تحریر کردہ اسد علی

نمبر ۲۰ - ایک وصلی تحریر کردہ شمس الدین عاصی -

نمبر ۲۱ - دعا کی ایک کتاب موسومہ "صحیفہ کاملہ"

خط شکستہ کے نمونے

خط شکستہ نستعلیق کی بگڑی ہوئی شکل ہے - ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کب ایجاد ہوا - حالات خوشنویساں (ورق ۱۱) اور تذکرۂ خوشنویساں (۶-۱۰۰۵) کے مولفین کا بیان ہے کہ عہد جہانگیر (۲۷ - ۱۶۰۵ء) میں نور محمد حسین فرزند مرزا شکر اللہ نے جو دربار اکبری میں ایران کا پناہ گزین تھا اس خط کو ایجاد کیا - ابوالفضل نے خط شکستہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے - دونوں مولفین مذکور الصدر کے بیانات صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ دہلی میوزیم میں سلطان ابوسعید کا جو بابر کا دادا تھا ایک فرمان موجود ہے جو خط شکستہ میں لکھا ہوا ہے اور جس پر سن ۸۶۸ھ (۱۴۶۴ء) درج ہے - اغلب ہے کہ جہانگیر کے عہد تک خط شکستہ سے ہندوستان واقف نہ ہو اور میرزا محمد حسین نے اس کو یہاں رائج کیا ہو - دہلی میوزیم میں خط شکستہ کے حسب ذیل ۱۳ نمونے موجود ہیں -

نمبر ۹۰ - ایک فرمان جو وصلی کی طرح موٹے کاغذ پر چسپاں ہے اس کا سن ۸۶۸ھ (۱۴۶۴ء).

اور اس پر سلطان ابوسعید فرزند سلطان محمد کی مہر لگی ہوئی ہے یہ فرمان سید شادی اور سید شرف الحق کے حق میں ان کو کسی درگاہ کا متولی بنانے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ سلطان ابوسعید شہنشاہ بابر کا دادا تھا جس نے ۱۴۵۲ء سے ۱۴۶۷ء تک حکمرانی کی۔

نمبر ۹۱۔ بیاض بختاور خان (۵۰ ورق) یہ عہد اورنگ زیب (۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء) کے خوشنویس درایت خان کی تحریر کا نمونہ ہے۔ اس کا اصلی نام عبداللہ اور درایت خان خطاب ہے جو اورنگ زیب کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس کے باپ کا نام محمد جعفر اور لقب کفایت خاں ہے اور ہندوستان میں خط شکستہ کے موجد محمد حسین کی اولاد سے ہے۔

بختاور خان دربار اورنگ زیب کا ایک امیر تھا۔ شاہ نے اپنی حکمرانی کے دسویں سال اس کو منصب یک ہزاری سے سرفراز فرمایا اور تیرہویں سال خواجہ سراؤں کا مہتمم مقرر کیا۔ بختاور خان نے ۱۳ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۶۸۵ء میں وفات پائی خود شہنشاہ اورنگ زیب تھوڑی دور تک اس کے جنازہ کے ساتھ آیا تھا[1] دہلی میں بختاور خان کی بنائی ہوئی ایک سرا مشہور ہے وہ "مرآۃ عالم" نامی ایک تاریخ کا مولف بھی تھا۔

نمبر ۹۲۔ بیاض بختاور خاں (ورق ۱۶) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس محمد سعید انصاری کی تحریر کا ایک نمونہ۔

نمبر ۹۳۔ بیاض بختاور خان نواب اشرف خاں کی تحریر کا نمونہ جو شاہجہان اورنگ زیب کے دربار کا ایک امیر تھا۔ اس کا اصلی نام محمد اشرف ہے اور اشرف خان اورنگ زیب کا دیا ہوا خطاب ہے۔ اشرف خان نے ۱۰۹۷ھ (۸۶۔ ۱۶۸۵ء) میں انتقال کیا[2]

نمبر ۹۴۔ بیاض بختاور خاں (ورق ۸۴) نواب اشرف خاں کے شاگرد نورالدین محمد کی تحریر کا نمونہ اس پر سن ۱۰۸۱ھ (۲۔ ۱۶۷۱ء) درج ہے۔

---

[1] مآثر عالمگیری مولفہ محمد مستعد خاں شایع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۸۷۱ء) صفحہ ۲۵۳ ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا جلد ہفتم صفحہ ۱۵۱

[2] مآثر الامراء (شایع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) ص ۲۷۲ اور نیٹل بیوگرافیکل ڈکشنری مولفہ تھامس ولیم بیلی ص ۸۲

نمبر ۹۵ - بیاض بختاور خان (ورق ۲۹۰) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس سید احمد کی تحریر کا نمونہ -

نمبر ۹۶ - بیاض بختاور خان (ورق ۵۰۵) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس محمد نعیم اصفہانی کی تحریر کا نمونہ اس پر سن ۱۰۹۷ھ (۸۶ - ۱۶۸۵ء) درج ہے -

نمبر ۹۷ - بیاض بختاور خان (ورق ۱۸۲) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس مرزا محمد معز الدین محمد فطرت کی تحریر کا نمونہ -

نمبر ۹۸ - بیاض بختاور خان عہد اورنگ زیب کے ایک گمنام خوشنویس کی تحریر کا نمونہ -

نمبر ۹۹ - ایک وصلی ابو القاسم الحسینی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جس پر سن ۱۱۳۱ھ (۱۹ - ۱۷۱۸ء) درج ہے -

نمبر ۱۰۰ ایک وصلی مرید خان طباطبائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس پر عہد محمد شاہ کے بیسویں سال کا سن درج ہے (۱۷۳۸ء) مرید خان کا اصلی نام محمد صادق ہے یہ محمد شاہ (۴۸ - ۱۷۱۹ء) کا درباری امیر اور قوم سادات سے تھا - خوشنویسی میں درایت خان کا شاگرد تھا -

نمبر ۱۰۱ - ایک وصلی شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت کے ۲۷ ویں سال (۱۷۸۵ء) کی لکھی ہوئی ہے یہ عماد الدین حسن شاگرد پریم ناتھ کی تحریر کا ایک نمونہ ہے -

نمبر ۱۰۲ - ایک وصلی جس پر سن ۱۲۲۳ھ (۹ - ۱۸۰۸ء) درج ہے حیات خان شاگرد رائے پریم ناتھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے [1]

---

[1] تذکرۂ خوشنویسان ص۱۱۳ و ۱۱۴ حالات خوشنویسان ورق ۱۲ -

افسردہ دلی

از
جناب علی اختر صاحب

کلیوں میں تبسم ہے، لیکن اگلی سی وہ آب و تاب نہیں
اے صبح امیدِ افسردہ! کیوں آج یہ گل شاداب نہیں

ہے روحِ ترنم رقصیدہ، بیچین ہوا کی موجوں میں
انداز وہی ہیں، آج مگر رفتارِ نوا بیتاب نہیں

ہے گردشِ جام و صحبتِ مئے، پہلی سی نشاط انگیز مگر
ساقی کی نشیلی آنکھوں میں وہ عکس شرابِ ناب نہیں

پہلے بھی نمودِ حسن میں تھے انداز و ادائے صبر شکن
حیراں ہوں سماں ہے اب بھی وہی اور روح مری بیتاب نہیں

زلفیں تو وہی ہیں صید طلب، آزاد ہے لیکن پائے نظر
شوخی تو وہی ہے موجوں میں اب دام فگن گرداب نہیں

دل بھی ہے، ادائے بسمل بھی، خواہانِ ستم بھی ہوں لیکن
اب دل میں نہیں وہ ذوق طپش، یا تیغ نظر میں آب نہیں

غفلت میں نشاط بیداری، اک نیند سی ہر شئے پر طاری
اب بھی ہیں جوانی کی راتیں لیکن وہ سرورِ خواب نہیں

ہوتی ہیں بہاریں زیب چمن، کھلتے ہیں شگوفے بھی لیکن
محروم بصارت ہیں آنکھیں یا عیش کے وہ اسباب نہیں

افسردہ دلی کا راز ہے یہ، ہیں ورنہ وہی ساماں اختر
ہر ذرۂ عالم وجد میں ہے، تیری ہی نظر بیتاب نہیں

چارمینار کی سیر

از

جناب محمد معین الدین رہبر فاروقی متعلم دار العلوم ہائی اسکول حیدر آباد

یہ عمارت قطب شاہیہ حکومت کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہے۔ اس کے حالات قلم بند کرنے سے قبل موجودہ شہر حیدر آباد کی کچھ مختصر سی تاریخ بتلا دینی ضرور ہے۔ کیونکہ شہر کی بنا باعث وجود چارمینار ہوئی۔

شہر آباد ہونے سے قبل سب سے پہلے ایک پل رود موسیٰ پر بنایا گیا اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب گولکنڈے میں آبادی بڑھ گئی تو اکثر لوگ اس مقام پر آکر آباد ہو گئے تھے۔ رود موسیٰ بیچ میں حائل تھی۔ آمد و رفت میں سخت تکالیف درپیش ہوتے تھے۔ تو بادشاہ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ رفاہ عام اور فائدۂ انام کے لئے ایک پل اس ندی پر بنایا جائے۔ پل کی تیاری کا حکم ہوا حسب الحکم کام بھی اختتام کو پہنچا۔ [۱]

لیکن مورخین نے اس پل کے وجود کے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے جب لوگ گولکنڈے سے اٹھ کر اس مقام پر آکر آباد ہوئے تو ان میں ایک طوائف بھی تھی جو موضع چیچلم (موجودہ شاہ علی بنڈے کے قریب واقع تھا) میں سکونت پذیر تھی۔ حسن و جمال میں بے مثل تھی۔ بادشاہ (ابراہیم قطب شاہ) کا فرزند (محمد قلی) اس کے زلف سیاہ کا شکار ہو گیا، پوشیدہ طور پر اس کے پاس آتا تھا۔ ایک روز بارش کے زمانے میں حسب عادت یہاں آیا۔ رود موسیٰ چڑھاؤ پر تھی، پار جانا مشکل تھا۔ لیکن غلبۂ عشق سے بے چین و بے خود ہو کر ندی میں گھوڑا ڈال دیا، خوش قسمتی سے پار ہو گیا۔

---

[۱] اس مضمون میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔

(۱) تاریخ عزیز دکن مصنفہ منشی محمد عبد العزیز صاحب (۲) تزک دکن مصنفہ سید علی اصغر بلگرامی (۳) دی گیمس آف دی نظام ڈومینین مصنفہ کیمبل (۴) گلزار آصفیہ (۵) سیاحت نامہ موسیو تھیونو (۶) جریدۂ آثار قدیمہ (۷) پرچہ نظام گزٹ عدد - ۱ - جلد - ۱ - (۸) تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم (۹) تاریخ دکن مصنفہ عبد العلیم نصر اللہ خاں صاحب (۱۰) رسالہ تاریخ قطب شاہیہ در کیفیت تیاری بلدہ و عمارات بلدہ۔

خفیہ نویس نے اس سانحہ ہوش ربا کی بادشاہ کے جناب میں اطلاع بھیجی۔ بادشاہ بہت پریشان ہوئے شہزادے کے صحیح وسلامت بچ نکلنے پر شکر آلہی بجا لائے، اور فوراً حکم دیا کہ ایک پل بہت جلد تعمیر کیا جائے۔

داروغۂ عمارات حکم کے ملتے ہی نوئے پل کی تیاری میں مصروف ہوا، نہایت اہتمام وانتظام سے آٹھ مہینے کے عرصے میں دوسری موسم بارش تک کام تکمیل کو پہنچا۔

عرض اس پل کا بارہ ۱۲ گز تھا، اور اس میں بائیس ۲۲ در رکھے گئے تھے، قریب دو ۲ لاکھ ہون کے، اس کی تیاری میں صرف ہوے۔ تعمیر پل کے بعد چار ۴ ہزار روپے باقی رہے۔ داروغۂ مذکور نے بادشاہ جہاں پناہ سے اس کا حال کہا، تو حکم ہوا کہ "ان کو غرباء ومساکین میں تقسیم کردیں" ایک شخص نے پیشگاہ سلطان میں اس پل کی تاریخ "صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۹۸۱" لکھ کر گزرانی بادشاہ کو یہ تاریخ بے حد پسند آئی، اور اس کے صلے میں پانچ سو ۵۰۰ اشرفیاں مرحمت کیں۔ یہ پل شہر سے مغرب کی طرف واقع ہے اور اب تک "پل قدیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جب ابراہیم قطب شاہ کا ۹۸۸ھ میں انتقال ہوا، تو محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اب کیا تھا! بادشاہت اپنی ہی تھی، دلی حوصلے نکالنے میں کون حائل تھا۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں بیر شاہ مرزا کی دختر سے نسبت قرار پائی اور ۹۸۸ھ میں بڑے تزک واحتشام سے عقد سعید اختتام کو پہنچا شادی کے چند دن بعد ایک روز بادشاہ دار السلطنت گولکنڈہ سے شکار کھیلتے ہوے قلعہ سے جانب مشرق چار کوس کے فاصلے پر پہنچے۔ موسیٰ ندی کے کنارے ایک سرسبز وشاداب قطعہ دیکھا۔ جو بے حد پسند آیا حکم دیا کہ "اس جگہ شہر آباد کیا جائے"۔

پھر کیا تھا! حکم کے ساتھ ہی منجم بلائے گئے۔ ساعت نیک کی تلاش ہوئی۔ نجومیوں نے حساب لگایا اور ایک زبان ہوکر تاریخ وساعت عرض کردی۔ اسی مقررہ ساعت میں شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

بادشاہ کو طوائف سے حد درجہ محبت تھی۔ اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسی کے نام سے اس شہر کو موسوم کیا۔ طوائف کا نام بھاگ متی تھا۔ اس لئے شہر کا نام بھاگ نگر ہوا۔ محمد قاسم مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ سترہ سال تک شہر اسی نام سے موسوم رہا۔ اس عرصہ میں بادشاہ کی محبوبہ کا بھی انتقال ہوچکا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ اس نام سے شرمندہ ہوا اور حضرت علی حیدر کرار ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام مبارک سے منسوب کرکے "حیدرآباد" رکھا۔ تعمیر شہر کے بعد اس کا تاریخی نام "فرخندہ بنیاد" رکھا گیا۔

"تاریخ دکن (جو ۱۲۸۵ھ میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی تھی) کے مصنف عبدالعلیم نصر اشعاق ...

نے یہ روایت لکھی ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ کرکے طبقۂ قطب شاہیہ کے خاتم سلطان ابوالحسن تاناشاہ کو قید کرکے اپنے ہمراہ دولت آباد لے گیا، تو روانگی سے قبل، شہر حیدرآباد کو دارالجہاد سے موسوم فرمایا

اکثر مورخین شہر کے آباد ہونے کی یہ وجہ بھی لکھتے ہیں کہ جب شہنشاہ اکبر نے دکن پر فوج کشی کی، اکبری فوجوں نے خاندیس کی ریاست اجاڑ دی، اور نظام شاہی سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا تو اس بدامنی کے زمانے میں اکثر لوگ بے خانماں ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے ان میں کا بیشتر حصہ گولکنڈہ کی سلطنت میں آکر آباد ہو گیا۔ اس سے شہر گولکنڈے کی آبادی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کثرت آبادی کے باعث شہر میں بیماری پھیلی اور باشندوں کو پانی کی قلت سے سخت تکلیف ہونے لگی۔ محمد قلی قطب شاہ کو فکر ہوئی کہ کہیں دوسری جگہ شہر آباد کیا جائے۔ اس لئے موجودہ شہر حیدرآباد کا مقام منتخب ہوا۔

الغرض شہر کی بنا چار راستوں اور چار بازاروں پر قرار پائی۔ ہر ایک بازار ایک دوسرے کا ہم شکل تھا۔ بازار نہایت وسیع اور کمانیں بہت بلند تیار ہوئیں۔ چودہ ہزار دوکانیں اور بارہ ہزار محلے، خانقاہ اور مدرسے، لنگر، مہمان خانے تعمیر ہوئے۔ اکثر جگہ حمام بھی بنائے گئے اور شہر کے شمال جانب ایک طرف خاص جگہ مقرر ہوئی، جس میں ایوان ہائے شاہی اور قصر ہائے فلک رتبہ جہاں پناہ، اور خانوادۂ شاہی کے لئے تعمیر ہوئے۔

دکن کے مسلمان بادشاہوں میں ایک نہ ایک بادشاہ ایسا ضرور گزرا ہے جس کو تعمیر عمارات کا غایت درجہ شوق تھا۔ قطب شاہیہ سلاطین میں اور حالات کے قطع نظر محمد قلی قطب شاہ کا دور تعمیر عمارات کے باعث ایک درخشندہ کارنامہ ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اس شہر کو عروس البلاد بنانے کی فکر میں رہا کرتا تھا چنانچہ اس نے اس کار خاص کے لئے ایک معتدبہ رقم مختص کر دی تھی۔ میر ابو طالب جو شاہ کا خزانچی تھا، بادشاہ کے حضور میں ایک روز یہ عرض پیش کی کہ "جہاں پناہ! اب تک دو کروڑ روپے سے زیادہ صرف ہو چکے ہیں"

عربی میں ایک ضرب المثل ہے۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ بادشاہ کے مذہب پر ہوتے ہیں) بادشاہ کے اس شوق ذوق کو دیکھ کر رعایا، شہر امرائے دولت بھی اپنی حویلیوں، مکانوں اور باغوں وغیرہ کو آراستہ کرنے لگے۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک اپنی عمارات کو دوسرے سے

زیادہ خوبصورت بنانے میں سبقت لے جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کی آبادی میں اور چار چاند لگ گئے۔ شہر کے اطراف چاروں سمتوں میں دس دس کوس تک سرکاری باغات و عمارات کی تعمیر ہوئی۔ چار رفیع الشان کمانیں ہر ایک گوشے میں تیار ہوئیں، اور ہر کمان کے محاذی راستے نہایت کشادہ تیار کئے گئے۔ چاروں کمانوں کے بیچ میں ایک ہزار گز کا میدان چھوڑ گیا۔ اور اس میدان کے بیچوں بیچ ایک حوض تعمیر ہوا جو اب گلزار حوض کہلاتا ہے (بادشاہ جہاں پناہ ماہ محرم میں اسی حوض پر تشریف فرما ہوتے تھے اور سلطنت کی ساری فوج ملاحظۂ عالی سے گذرتی تھی)

شہر کی چاروں کمانوں میں صرف دو کو زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ ایک مشرقی کمان تھی، اس کا نام کالی کمان رکھا گیا، اس پر ایک بلند نقار خانہ تیار ہوا۔ ہر صبح و شام نقارہ بجایا جاتا تھا، ساکنان شہر کے علاوہ دور دور تک اس کی آواز ادنی و اعلیٰ کو سرور بخشتی تھی۔ دوسری شیر دل کی کمان جو مغرب میں واقع ہے وہ محل شاہی کا خاص دروازہ تھی۔

جب شہر کی بنا پڑ چکی تو اس کے دو سال بعد ۹۹۹ھ میں اس عمارت (چار مینار) کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دکن کے تواریخ ناقل ہیں کہ کسی شخص نے بادشاہ کے دربار میں اس کی تاریخ تعمیر "یا حافظ" لکھ کر پیش کی۔ قطب شاہیوں کا مذہب امامیہ تھا اس لئے تیمناً و تبرکاً یہ عمارت تعزیہ (تابوت) کی شکل پر تیار کی گئی۔

بعضے مورخ یوں بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ اس نئے شہر کو مشہد مقدس کے نمونے پر آباد کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے حضرت ضامن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے روضے کے عوض چار مینار تعمیر کروایا۔ ایک قول یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گولکنڈہ میں وبا پھیلی ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں کئی لوگ بے خانماں ہو گئے، لوگوں نے گھبرا کر خدا سے دعا مانگی۔ کسی نے یہ رائے دی کہ تابوت اور پنجہ کا جلوس نکالا جائے۔ تماموں نے اس فعل کو مقدس سمجھ کر بالاتفاق قبول کیا حسب مشورہ اسی طرح کیا گیا۔ حسن اتفاق سے بیماری کا زور کم ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی اس بلائے عظیم سے نجات پانے کی خوشی میں یادگار قائم رکھنے کے لئے گچ اور پتھر سے ایک تابوت (چار مینار) وسط شہر میں تعمیر کروایا۔

اتفاقاً ایک قلمی نسخہ، جس کا نام "رسالہ قطب شاہیہ اور کیفیت تیاری بلدہ و عمارات بلدہ"

تھا، میرے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب نے مجھے مطالعہ کے لئے عنایت فرمایا تھا، اس میں چار مینار کی تعمیر کا ایک نیا اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

مصنف رسالہ مذکور بیان کرتے ہیں کہ "جب شہر میں شدّت کے ساتھ و باپھیلی اور آسمانی بلاؤں سے، جب مخلوق خدا میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تو جمعرات کے روز محرم الحرام کی پہلی تاریخ سنہ ہجری میں، شہر کے بیچوں بیچ، بڑے حُسن و عقیدت کے ساتھ، ایک تعزیہ اٹھایا گیا خوش اعتقادی سے بیماری کا زور کم ہوگیا۔ اور جب بادشاہ کو اس بات کی اطلاع ہوی، تو سلطان نے اس تابوت کو مقدس سمجھ کر، ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے۔ یا شاید اس عقیدے سے کہ تعزیہ کی برکت سے ہمیشہ ملک آفات وبلیات سے محفوظ و مصئون رہے گا، جہاں یہ تابوت ایستادہ کیا گیا تھا، پتھر اور گچ سے اُسی وضع پر چار مینار کی تیاری کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دو لاکھ پچاس ہزار روپے کے صرفہ سے دکانیں اور کمانیں بھی تیار کروائیں۔

اس عمارت کے چار رُخ ہیں۔ اور ہر ایک رُخ چاروں سمتوں کے موافق بنائے گئے ہیں۔ چونکہ عمارت مربع ہے، اس نے اس کا ہر ایک رُخ (۶۰) فیٹ چوڑا اور (۴۲) فیٹ بلند ہے۔ وسطی عمارت چار رفیع الشان محرابوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک محراب کی بلندی ۴۲ فیٹ اور عرض ۳۰ فیٹ ہے۔ اور ہر ایک محراب کے روبرو سے ایک ایک رستہ گذرتا ہے۔ شمالی محراب کا راستہ گلزار حوض سے ہوتے ہوے رود موسیٰ کی طرف گیا ہے۔ اور جنوب کا شاہ علی بنڈے کی جانب، مشرقی کوٹلہ عالیجاہ اور مچھلی بندر کی طرف اور مغرب کا پُل قدیم کی طرف جاتا ہے۔ بالائی عمارت دو منزلہ ہے جس کا بیرونی رُخ خوش نما محرابوں اور قسم قسم کی گلکاریوں سے مزین ہے۔ اور چاروں طرف چار بلند مینار کھڑے ہیں۔ ہر مینار چار درجوں پر منقسم ہے اور، ہر ایک کا ارتفاع ۸۰ فیٹ ہے۔ اور ان میناروں کی بلندی سطح ارض سے ۱۸۰ فیٹ ہے[1]۔ چاروں میناروں میں سے اوپر چڑھنے کے لئے راستے بنائے گئے ہیں۔ اور تمام سیڑھیاں مدوّر ہیں۔ اور تقریباً ان کی کُل تعداد ایک سو چونتیس (۱۳۴) ہے۔

بالائی عمارت کی پہلی منزل پر مدرسہ آباد تھا۔ اور دوسری پر مسجد کے قریب خزانۂ آب بنایا گیا تھا۔ جس میں تالاب جل پلی سے پانی آتا تھا۔ اور اس خزانہ سے تمام شہر اور محلات

---

[1] مآثر دکن میں بلندی ۱۶۰ فیٹ بتلائی گئی ہے بجز دکن کی قدیم تاریخوں کے دیکھنے سے یہ بلندی صحیح ثابت نہیں ہوتی۔

شاہی میں پانی تقسیم ہوا کرتا تھا۔

پہلی منزل کے اندرونی حصہ کی ہر سمت میں ساتؔ، سات محرابیں ہیں، اور انکے درمیان کی محرابوں میں چاروں طرف چار گھڑیالیں نصب ہیں۔ ان کے اوزاروں کو اندرونی حصے کی طرف سے ایک بڑے چوبی دروازے کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور ایک گھڑی میں چھ برقی قمقمے لگائے گئے ہیں تاکہ رات میں بھی وقت بآسانی معلوم ہو سکے۔ ان گھڑیوں کو ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں نصب کیا گیا تھا ان کے عقب میں بہت کافی جگہ موجود ہے۔ اور اسی مقام پر مدرسہ آباد تھا۔ اس اندرونی حصے میں سولہ مدور محرابیں بنائی گئی ہیں۔

دوسری منزل کھلی ہوئی ہے اور اس میں ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ اس منزل کے مشرقی حصے میں پندرہ محرابیں ہیں۔ بیچ کی محراب ایک گول گنبد نما منبر ہے جو مسجد کے لئے تعمیر کی گئی تھی یہ محراب دوسری چار بڑی محرابوں پر مستحکم ہے۔ مشرقی جانب کی محراب سے مسجد میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ گویا یہ محراب منبر کے علاوہ مسجد کے دروازے کا کام بھی دیتا ہے۔ اس عمارت (چار مینار) کے اکثر فوٹو اسی رُخ سے اُتارے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ گنبد عمارت میں بہت خوش نما اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد مسجد کی تینوں جانب یعنی شمال، جنوب اور مشرق میں کمانوں کی مسلسل قطار ہے۔ اور ان کمانوں کی تعداد (تیس ۳۰) ہے۔ (یعنی ہر رُخ پر دس دس ۱۰ کمانیں ہیں) مسجد کا صحن نہایت کشادہ اور وسیع ہے۔ مسجد اور اس کے صحن میں کم از کم دو سو ۲۰۰ آدمی اچھی طرح نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اصل مسجد کی پانچ کمانیں ہیں۔ اور اس کے اندرونی حصے میں دو طاق ہیں جو شمالاً جنوباً واقع ہیں اور چار مغرب میں ہیں۔ مسجد کے اندر گچ کا فرش کیا گیا ہے فرش پر مصلوں کے نشانات بنائے گئے ہیں۔ صرف اندرون مسجد اکیس ۲۱ مصلے ہیں۔ اور مسجد کے کل سولہ ۱۶ مینار ہیں۔ مسجد نہایت خوش نما اور خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ اس میں گلکاری کا بہت بہترین اور نہایت لاجواب کام کیا گیا ہے۔

مینار کے پہلے اور دوسرے درجے میں دس دس ۱۰ محرابیں ہیں۔ اور تیسرے میں بارہ ۱۲ ہیں اور چوتھے درجے میں تیرہ ہیں۔ اور اس چوتھے درجے سے اوپر اور آٹھ محرابیں ہیں۔ اور یہ میناروں کی بالکل آخری حد ہے یہاں سے سارے شہر اور اُس کے گرد و نواح کی بستیوں کے

کے مناظر نہایت خوش نما اور دلفریب نظر آتے ہیں جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
ان محرابوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے اور ان میناروں کے بیرونی رخوں پر ایک ایک سونے کا کلس لگا دیا گیا ہے۔ اوپر سے محلات شاہی اور دیگر امراء وغیرہ کے مکانات نظر آنے کی وجہ سے، عام طور پر اس عمارت پر چڑھنے کی اجازت نہیں۔

چار مینار کی تیاری میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے۔ (ہون اس زمانے کا ایک سکہ ہے جو ساڑھے چار روپیہ سکۂ مغلیہ کے مساوی ہوتا تھا۔ آج کل کے حساب سے سات روپیہ سے زیادہ کا ہوتا ہے) جب سلطنت قطب شاہیہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ اورنگ آرائے حکومت ہوا تو تاج شاہی اور تخت سلطنت سے بے خبر ہو کر سارا راج وزراء و عمال ملک کے سپرد کر دیا۔ پھر کیا تھا؟ جس کو جو سوجھی وہ کر بیٹھا۔ جس کا ہاتھ بنا انہوں نے خزانۂ شاہی کو خوب لوٹا۔ غرض یہ کہ سلطنت میں جب ظلم و تشدد کی انتہا نہ رہی اور مخلوق خدا چیخ اٹھی اور اس کی خبر دارالسلطنت دہلی کو پہنچی، تو شہنشاہ ہند بگڑ بیٹھے اور ان کو رعیت کی پامالی اور مظلومیت ایک آنکھ نہ بھائی مع لشکر جرار گولکنڈے پر چڑھائی کی۔ اور بالآخر قلعہ گولکنڈہ کو عالمگیری فوجوں کے ہاتھوں نے سر کر لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب تانا شاہ کو مقید کر کے اپنے ساتھ دولت آباد لے گیا۔ بعد تسخیر گولکنڈے کی ریاست سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی۔ اور سلطنت دہلی کی طرف سے اس صوبہ کا عامل بہادر دل خاں کو قرار دیا گیا۔ اسی صوبہ دار کے عہد میں چار مینار کا مغربی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا، تو صوبہ دار موصوف نے فوراً اس کی تعمیر بصرفۂ سات ہزار کرا دی۔

۱۷۵۶ء میں فرانس کا مشہور جنرل بوسے (BUSAY) اور اس کی فوج اس عمارت کے اطراف کے باغات میں مقیم ہوئی تھی۔

۱۲۵۰ھ / ۱۸۲۴ء میں پہلی دفعہ نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل کے عہد حکومت میں اس پر ایک لاکھ روپے کے صرفے سے درستی اور استرکاری کی گئی۔ اس کے بعد پھر دوبارہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے عہد وزارت میں اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی، تو سید علی خاں المخاطب بہ حیدر نواز جنگ مہتمم صفائی کے اہتمام سے قریب دو لاکھ روپیہ کے خرچ سے اس کی استرکاری کی گئی۔

۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء سے چار مینار میں سٹی افغان پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا۔ اور ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی تشریف آوری پر اس کو لوہے کی جالی سے محصور کر دیا گیا تھا، اور صرف جانب شمال آمد و رفت کے لئے ایک آہنی پھاٹک لگایا گیا، جو اب تک موجود تھا۔

کچھ عرصہ قبل ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء/۱۳۴۸ھ میں جب ہز اکسلنسی لارڈ ارون وائسرائے و گورنر جنرل ہند تشریف فرمائے حیدر آباد ہوئے، تو قبل تشریف آوری، شہر آراستہ اور سنوارا جانے لگا، اور شوارع بلدہ کی طرح، محکمۂ آرائش سرکار عالی نے چار مینار کی سڑک کو بھی کشادہ کرنے کا انتظام کیا تھا، چنانچہ اس نے بغرض وسعت سڑک، اس لوہے کے کٹھرے (جالی) کو نکال دیا، لیکن اس جالی کی علیحدگی نے ایک تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ واقعہ یہ تھا کہ لوہے کے کٹھرے کی حفاظت کے لئے جن پتھروں کو استادہ کیا گیا تھا، ان میں کے جنوب مشرقی کونے کے پتھر کو، جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے چلے کے متصل تھا معلوم نہیں، پہلی مرتبہ کس ہندو نے اس پر سیندور ڈالا، اور یہ سیندور زدہ پتھر آہستہ آہستہ پرستش کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی عام طور سے پرستش اور پوجا ہونے لگی۔ جب اس کی علیحدگی کی نوبت پہنچی، تو اکثر ہندو اس کام میں مزاحم ہوئے۔ لیکن حکومت نے ان کی دلجوئی کی خاطر، پہلے پہل یہ حکم دیا کہ "پتھر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ پھر بھی ان لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی حکومت آصفی نے اپنی قدیم رواداری اور شہرۂ آفاق رعیت پروری کا ثبوت دیتے ہوئے، اور راستے کی بدنمائی پسند کرتے ہوئے، اپنے اس سرکاری) پتھر کو اور دیولوں کے عمارات کی طرح، ویسے ہی رکھ چھوڑنے کا حکم دیا، جس کو اب بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

ہم یہاں ایک بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ اکثر اہل ملک کا خصوصاً ان میں ہندو حضرات کا اس نیچے کے سیندور زدہ پتھر کو دیکھ کر یہ خیال ہے کہ شاید اوپر (چار مینار پر) بھی کوئی دیول ہو لیکن یہ ایک محض غلط واہمہ ہے، چنانچہ ہم کو رجب ۱۳۴۸ھ کی بیسویں تاریخ اس مشہور عمارت پر جب وائسرائے بہادر تشریف لیجا چکے تھے، اور روشنی وغیرہ کا سامان نکالا جا رہا تھا، مجھے اپنے ایک شفیق دوست جناب حبیب جعفر صاحب الکاف کے ساتھ چڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم دونوں نے خاص طور پر اس بات کی تحقیق کی، لیکن کہیں کچھ نشان تھا نہ مقام، نہ کوئی ایسی جگہ ملی کہ جہاں پر کچھ شائبہ بھی گزر سکے۔

صولت[1] عثمانی کے مولف کا یہ بیان ہے کہ، مہاراجہ چندولعل کے عہد وزارت میں چارمینار کے اطراف و باہیلی تو ہندوؤں نے اس عمارت کے سامنے بکروں کو لاکر ذبح کرنا شروع کیا۔ یہ واقعات اکثر مسلمانوں کو ناگوار گزرے، چنانچہ حافظ محمد علی خیر آبادی کے مریدوں نے اس کے جنوب مشرقی کونے کے مینار میں حضرت غوث اعظم رح کا چلہ قائم کر دیا جس سے ہندو اس کام سے باز رہے۔

جب سے کہ شہر آراستہ و پیراستہ کیا جارہا ہے، اس کا منظر نہایت ہی قابل دید ہے۔ اس عروس البلاد کی آرائش، جس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو اس وقت یہ عمارت شہر کے حسن میں اور چار چاند لگائے گی، جس کا منظر، بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھے گا۔ لیکن تاہم اب بھی دور سے ایک طرف تو عثمانیہ دواخانہ اور ہائیکورٹ و سٹی کالج اور دوسرے طرف چار مینار و مکہ مسجد اپنے عجیب و غریب منظر کے لحاظ سے بڑے ہی دلفریب و دلکش نظر آتے ہیں، جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ یہ نئی عمارتیں خاندان آصفیہ کے جم مرتبہ شاہ والا قدر سلطان العلوم اعلیحضرت نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی بے نظیر یادگاریں ہیں جو اپنا بلاد ہند میں جواب نہیں رکھتیں۔

اس عمارت پر بڑے بڑے موقعوں میں روشنی کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اعلیحضرت میر محبوب علی خان بہادر غفران مکان کے مبارک جشن تسمیہ خوانی میں اس پر روشنی کی گئی تھی جس وقت اکثر تبرک دنوں میں یا بڑی بڑی سرکاری تقاریب میں اس کو رنگ برنگ کی برقی روشنی سے سجایا جاتا ہے تو بس اس خوبصورت شہر میں یہ عمارت بقعۂ نور نظر آتی ہے۔ اور جس کی بہار اور خوبصورتی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کی اندرونی سطح پر ایک حوض بنایا گیا ہے، جس میں رات دن، پانی بھرا رہتا ہے۔ تاکہ متعین شدہ فوجی دستہ کو حصول آب میں آسانی ہو۔

اس عمارت کا نقشہ ہمارے چاندی اور سونے کے سکوں پر ہوا کرتا ہے۔ جو اس کی عظمت و بزرگی پر دال ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو صولت عثمانی، صفحہ (۲۰۵)، مؤلفہ قاضی ابوالفتح محمد امیر اللہ صاحب۔

غزل

از

جناب صفی اورنگ آبادی

چل دیا وہ رشکِ مہ گھر اپنا سونا ہو گیا — "چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا ہو گیا!"

پوچھتے کیا ہو کہ تیرا حال یہ کیا ہو گیا؟ — تم نہ جانو تو خدا جانے مجھے کیا ہو گیا!

عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا! — قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا!

ان کا دامن کیا پھٹا اک حشر برپا ہو گیا — اپنا قصہ "قصۂ یوسف زلیخا" ہو گیا!

قابلِ حیرت نہ ٹھہری زندگی تیرے بغیر — میرا مرنا یار لوگوں کو اچنبھا ہو گیا!

جس کو پہلے پہلے دل آزار ہم سمجھا کئے — رفتہ رفتہ اب وہی دل کی تمنا ہو گیا!

ان کو دیکھو، وہ نظر آیا کئے ہر رنگ میں — مجھ کو دیکھو، دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا!

میری آنکھیں تو لگی تھیں شوخیِ رفتار پر — اور وہ چلتے ہوئے دل لے کے چلتا ہو گیا!

وہ سراپا ناز ہے مجھ سے برا تو کیا کروں! — "چارہ نے اچھا کہا جس کو وہ اچھا ہو گیا"

اپنے دل کا خون کر ڈالوں تو شاید چین ہو ۔۔۔ یہ تو جس کا ہو گیا کم بخت اس کا ہو گیا!

تابِ نظارہ رہے ہر ایک کو ممکن نہیں ۔۔۔ ان کا بے پردہ نکل آنا ہی پردا ہو گیا

وقت بے وقت آئیے، بیشک آئیے، لاکھوں بار آئیے ۔۔۔ دھوپ میں پھرنے سے دیکھو رنگ کالا ہو گیا!

لے کے دل الزام دیتے ہو غنیمت ہے یہی ۔۔۔ "مال کا مول آگیا ادلے کو بدلا ہو گیا"

دل کی گھبراہٹ نسیم صبحدم سے کم ہوئی ۔۔۔ "تم نہ آئے تو غیب سے سامان پیدا ہو گیا"

چاہنے والوں کو دیوانہ بنایا آپ نے ۔۔۔ "اور بن پیسے کا لوگوں کو تماشا ہو گیا"

عاشقی میں نام اگر درکار ہے بدنام ہو! ۔۔۔ دیکھ سب کچھ ہو گیا جب قیس رسوا ہو گیا!

کچھ نہ کچھ میں بھی تو سن لوں اپنے دل کی واردات ۔۔۔ یا کسی کو دے دیا، گم ہو گیا، کیا ہو گیا؟

عاشقی میں نیک و بد پر آنکھ پڑتی ہی نہیں ۔۔۔ اس بلا نے آلیا جس کو وہ اندھا ہو گیا!

کیا یہی ہے شرم، تیرے بھولے پن کے میں نثار ۔۔۔ منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لینے سے پردا ہو گیا!

میری ہر اک بات قانونِ محبت ہے، مگر ۔۔۔ اے صفی! میں شاعری کرنے سے چھوٹا ہو گیا!

سُرخرو

از

(فرانکو ساشتی)

مترجمہ جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔اے

بوکاشیو کا یہ ہمعہد و معاصر ہے۔ سیاسی معاملات میں اس کی بڑی شہرت تھی لیکن درحصل وہ شاعر اور مصنف تھا۔ اس کی تصنیف "نویلرو" تین سو قصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بہترین وہ ہیں جن میں شوخی اور حسن بیان ہے ظرافت اور فکاہت اس کی تحریروں کا خاص جوہر ہیں۔ اپنے زمانے میں ادنیٰ طبقوں کی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قصہ میں بڑی نزاکت آمود ظرافت ہے۔ اپنے عام قصوں کے برخلاف اس میں مصنف نے اصلیت پیدا کر کے کرداروں کو زندہ بنا دیا ہے۔

(مدیر)

جس زمانہ میں شہر ارزو پادری گائیڈو کے زیر حکومت تھا شہر کیسن ٹینو کے باشندوں نے پادری موصوف کے ہاں اپنے دو سفیر بھیجے اور اس سے استدعا کی کہ بعض اشیا جن کی انہیں خواہش ہے۔ عطا کئے جائیں۔ اس پیام کی اطلاع دیجانے کے بعد قاصدوں سے کہا گیا کہ کل صبح روانگی کے لئے تیار رہیں۔ صبح اپنا سفری سامان عجلت سے تیار کر کے دونوں قاصد روانہ ہوئے اور ابھی وہ بہت دور نہیں گئے تھے کہ ایک نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا "کیا تمہیں تفصیلی پیام یاد ہے؟" ساتھی نے جواب دیا کہ "یاد نہیں کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ تھا" اس پر دوسرے نے کہا "اور میں نے تم پر بھروسہ کیا تھا" آخر دونوں نے کہا پھر تو ہم بڑی کشمکش میں ہیں، اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ سنکر ایک نے کہا: "آنے والے مسافر خانہ میں چلو۔ میں تمہیں کہتا ہوں کہ کیا کیا جائے غالباً کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں اچھی طرح سب یاد آجائے گا" ساتھی نے کہا "تم نے یہ خوب کہی" یہ کہکر دونوں نیم بیدار اور نیم خوابیدہ حالت میں تین بجے مسافر خانہ میں پہنچے۔ پہلے کھانے کا آرڈر دیکر کھانا آنے تک

دونوں فراموش شدہ پیام کو یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کھانا آنے کے بعد دونوں میز پر بیٹھے اور خوش قسمتی سے انہیں عمدہ شراب میسر آئی، اس لئے انہیں اپنے پیام کے فراموش کر جانے کا کچھ افسوس نہ ہوا۔ حقیقت میں شراب ایسی عمدہ تھی کہ وہ جام پر جام چڑھاتے گئے۔ اور قریب قریب وہ مدہوش ہو گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ کھانے کے بعد اپنا پیام یاد کرنا تو درکنار وہ بات بھی نہ کر سکے اور انہیں اس بات کا تک علم نہ تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں؟ اسی حالت نشہ میں دونوں سو گئے۔

بیدار ہونے پر ایک نے دوسرے سے سوال کیا کہ آیا اسکو پیام یاد آیا کہ نہیں؟ دوسرے نے جواب دیا: "مجھے معلوم نہیں لیکن ایسی عمدہ شراب میں نے آج تک نوش جان نہیں کی کھانا کھانے کے بعد میں نے پیام کا مطلق خیال نہیں کیا۔ اب مجھے یہ بھی علم نہیں کہ اس وقت میں کہاں ہوں" پہلے نے کہا: میرا بھی یہی حال رہا "خدا ہی جانتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے بہرحال آج کا روز اور شب ہم یہیں قیام کریں گے کیونکہ شب کا وقت حافظہ کے لئے موزوں ہوا کرتا ہے اور ہم اپنا پیام یاد کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس پر ساتھی بھی رضامند ہو گیا اور تمام دن وہ وہاں ٹھہرے ہوئے شراب اُڑاتے رہے اور کبھی کبھی زیر سماں جاتے تھے لیکن پیام یاد نہ آیا پر نہ آیا۔ رات کے کھانے کے وقت بھی شراب نوشی ہوئی اور پھر وہ سو گئے صبح ناشتہ کے وقت انہوں نے پیام یاد کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ انہیں جتنی توقع تھی اُس قدر پیام کے الفاظ یاد نہ آئے۔ آخر ایک نے کہا: "ساری خرابی شراب میں ہے اب ہمیں آگے چلکر دیکھنا چاہیئے کہ کیا افتاد پڑتی ہے" شاید راہ میں پیام ہم کو یاد آجائے" یہ کہکر دونوں روانہ ہوئے اور وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے پیام کے متعلق سوال کیا کرتے تھے۔ اسی حالت میں سفر کرتے ہوئے آخر وہ شہر ارزو پہنچ گئے۔ جہاں وہ پہلے ہوٹل میں اُترے۔ اپنے دماغوں کو آرام دینے کی غرض سے وہ ایک خانگی حجرہ میں گئے۔ کیونکہ اب انہیں اپنے پیام کو یاد کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن افسوس ان کی ساری کوشش بے فائدہ ہوئی۔ اور وہ بالکل مایوس ہو گئے۔ ایک نے کہا: "اب ہمیں جانا چاہیئے خدا ہماری مدد کرے گا" دوسرے نے کہا "کیا خدا ہماری مدد کرے گا! پادری گانٹیڈو سے اب ہم کیا کہیں ہمیں اصل مطلب کیا یاد ہے؟ تاہم ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے"۔ اس طرح تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے انہوں نے پادری سے ملنے کی استدعا کی اور بیان کیا کہ انہیں کوئی ضروری خبر بادشاہ کو سنانی ہے۔ جب وہ پادری

کے سامنے پہنچے تو نہایت ادب سے سلام کر کے خاموش کھڑے رہنے پر پادری خود ان کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر خیر مقدم کرنے کے بعد دریافت کیا "تم کیا خبر لائے ہو؟" دونوں قاصد ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر ایک دوسرے کو بادشاہ کے جواب کے لئے کہنے لگا۔ آخر کار ان دونوں میں سے جو قاصد دلیر تھا اس نے پادری سے مخاطب ہو کر کہا: "خداوند! ہم آپ کے خادمین یعنے شہر کیسن ٹینو کے باشندوں کی جانب سے بطور سفیر حاضر ہوئے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمیں بھیجنے والے اور ہم دونوں یکساں آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں لیکن ہم سب کہتے بہت کم ہیں لیکن کرتے بہت ہیں۔ ہمیں ایک پیام عجلت میں دیا گیا تھا اور خواہ اس کا کوئی موقع ہو یا تو مجلس نے ہمیں غلط اطلاع دی یا ہمیں اس کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی بہر حال ہم تمام آپ کی عنایت کے متمنی ہیں۔ اگرچہ ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ ہمارے یہاں بھیجنے کا کیا مقصد تھا"۔ پادری نے ایک عقلمند کی طرح صرف ان کی پیٹھ تھپک کر کہا: "ہاں۔ تمہارا کہنا درست ہے۔ واپس جاؤ اور میرے پیارے بچوں سے کہو کہ میں ہمیشہ خوشی سے ہر طرح ان کی خدمت کرنے تیار ہوں اور یہ کہ آئندہ سے انہیں میرے دربار تک سفرا بھیجنے کے مصارف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے خط و کتابت کیا کریں اور میں بخوشی ان کے سوالات کا جواب دیا کروں گا۔"

یہ کہکر پادری رخصت ہوا اور قاصدوں نے گھر کی راہ لی اثنائے راہ میں کہنے لگے "واپس ہونے کے بعد ہمیں پہلے کی طرح غلطی نہ کرنی چاہئیے" اس پر ایک نے کہا: "ہم یہ کام بہ آسانی نہیں کر سکتے ہمیں کچھ یاد نہیں ہے" دوسرے نے جواب دیا تاہم ہمیں اپنی عقل کو سلامت رکھنا چاہئیے کیوں کہ ہم سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے کیا پیام پہنچایا اور پادری نے کیا جواب دیا اس لئے کہ باشندگان شہر کو اگر اس بات کا شبہ ہو جائے کہ ان کے قاصدوں نے دیگر قاصدوں کی طرح محض مذاق کیا تو دوبارہ ہم سے یہ کام نہ لیا جائے گا اور ہمارے پیشے کا خدا ہی حافظ ہے؟" یہ سنکر جو قاصد زیادہ ہوشیار تھا اس نے کہا "اس کو مجھ پر چھوڑ دو ہمارا کام چلتا رہے گا پیام کی نسبت میں انہیں ایسا افسانہ سنا دونگا جو انہیں تو خیر بڑے بڑے عقلمندوں کو بھی حیران کر دے گا۔ پادری نے ایسی عمدہ باتیں کہی ہیں کہ انہیں سنکر وہ بہت خوش ہو جائیں گے۔ میں انہیں خط و کتابت کا حال سنا دوں گا نیز یہ کہ اتحاد و دوستی کو پادری اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے۔" دوسرے نے کہا:

وہ خوب سوجھی۔ اب ہمیں تھوڑی دور چلنا چاہیئے تاکہ ہم سابق کے مسافر خانہ میں ٹھیک وقت پر کھانے کے لئے پہنچ جائیں"۔ ساتھی نے کہا "تمہارا خیال درست ہے" یہ کہکر افتاں وخیزاں مسافرخانہ کو پہنچے اور کھانے کے انتظار کے بغیر شراب طلب کی۔ مسافرخانہ کے ملازم نے کہا "جناب پہلے سے زیادہ عمدہ شراب موجود ہے۔ ملازم فوراً شیشے خالی کر کے شراب دیتا گیا لیکن تھوڑی دیر میں سارے خم خالی ہو گئے۔ اس بات پر غصہ ہو کر دونوں قاصد وہاں سے گھوڑوں پر روانہ ہوئے اور دو ایک منزل طے کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچے۔ اصل واقعات ان کے ذہن سے فراموش ہو چکے تھے لیکن فرضی اور جھوٹ حالات کہنا بہت آسان تھا انہوں نے باشندگان شہر کو ایسی باتیں کہیں کہ وہ اپنی سفارت کی کامیابی پر بیحد خوش ہو گئے۔ اور شہر کا شہر ان کی شکرگزاری میں رطب اللسان تھا۔ فوراً اعلیٰ عہدوں پر انہیں ترقی دی گئی۔

یہ امر تعجب کے قابل نہیں کیونکہ جب ہم خود اپنے ملک کے اعلیٰ عہدہ داروں کا محاسبہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہدہ کے اس سے زیادہ موزوں نہیں جتنے کہ وہ معمولی سپاہی، جو فوج میں ابھی ابھی بھرتی کئے گئے ہوں، اپنے کام کے موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی یہ خالی ظرف، اس قدر بلند آہنگی سے عوام اور حکومت کو مرعوب کرتے رہتے ہیں کہ، خواہ مخواہ انہیں بلند سے بلند تر عہدے ملتے جاتے ہیں۔

یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے جس کا خمیازہ ملک اور قوم کو بھگتنا پڑتا ہے ؎

جذباتِ عالیہ

از

جناب ابو الاعظم مولانا امجد حیدر آبادی

کام، کب حسبِ مُدّعا نہ ہوا
اُس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ہم تو اک بار اُس کے ہو جائیں
وہ، ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا!

ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اُس کو
اک نفس مجھ سے جو جدا نہ ہوا

اب سویرے حضور جاگے ہیں
قافلہ، رات ہی روانہ ہوا

کیا مِلا وحدتِ وجودی سے
بندہ، بندہ رہا خدا نہ ہوا

ایسے آقا کا ہے غلام امجد
جس کے مانند دوسرا نہ ہوا

ایک گڈریا اپنی محبوبہ سے

از

جناب امجل حیدر آبادی

آ ! میرے ہمراہ چل ! اور میری محبوبہ بن کر رہ !

ہم ان تمام مسرتوں سے لطف اندوز ہوں گے ....

.... جو اونچے ٹیلوں، نیچی وادیوں، وسیع میدانوں سبز کھیتوں ٔ ....

.... اور کالے کالے پہاڑوں سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔

ہم پہاڑ کی چوٹیوں سے چراگاہ میں گلہ بانوں کی بھیڑیں چرانے کا تماشہ کریں گے۔

پایاب ندی کے کنارے جس کے ہر نغمے سے آبشار پر خوش الحان چڑیاں روح افزا نغمے الاپ رہی ہوں ....

.... میں تیرے لئے ایک سیج بناؤں گا، گلاب کی ....

.... ایسے مقام پر جو گوناگوں خوشبوؤں سے مہک رہا ہو، عطر بیز فضا ر میں۔

پھولوں کا ایک خوشنما تاج اور ایک ملبوس جو حنا کی پتیوں اور پھولوں سے مزین ہو۔

.... ایک لبادہ جو عمدہ ترین اون سے بنا ہوا ہو........

.....اس نرم و نازک اون سے جو خوبصورت بھیڑوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسم سے تراشی جاتی ہو............

.... سرد زمین کے مضر اثرات سے تجھے بچانے کے لئے۔

دلفریب نقش ونگار کی مخملیں پاپوش۔جس کے بکل خالص سونے کے ہوں۔

.... عشق پیچاں کی کلیوں اور پتیوں کا ایک کمر بند........

...... جس پر عنبر کے تکمہ لگے ہوں ....
...... اگر ان چیزوں میں تیرے لئے کچھ دلکشی ہے ....
...... تو آ ! میرے ساتھ چل ! اور میری محبوبہ بن کر رہ !
تیرے دسترخوان کی چاندی سونے کی قابیں، ....
...... جو لذیذ ترین تازہ بتازہ اغذیہ و اشربہ سے پُر ہوں، ......
...... ایسی بیش بہا ہوں کے دیوتاؤں کے خاصہ کے قابل ....
...... ہاتھی دانت کی میز پر چنی ہوئی ہوں۔
تیرا دل بہلنے کے لئے مئی کے خوشگوار مہینہ کی ہر صبح، ....
...... نوجوان سادہ لوح چرواہے تجھے ناچ گا کر خوش کریں گے ....
...... اگر ان چیزوں سے تجھے دلچسپی ہے، ....
...... تو پھر آ ! میرے ساتھ چل ! اور میری محبوبہ بن کر رہ ! (ماخوذ)

علامۂ بحر العلوم شمسی

از

جناب نواب محمد بہادر خاں صاحب خلف نواب نصیب یاور جنگ بہادر

تمہید علمائے متقدمین میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے سے کم درجہ اور کم علم افراد کو شہرت حاصل کرتے دیکھا۔ لیکن باوجود علم و فضل کے ان کے اپنے دل میں کبھی شہرت طلبی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس بیسویں صدی عیسوی میں جس کو اشتہار بازی و شہرت طلبی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی مثال صرف علامۂ بحر العلوم اشرف العلماء مولوی سید اشرف شمسی برد اللہ مضجعہٗ کی ذات ہی میں مل سکتی تھی۔ ہندوستان کے ان تمام اخبارات و رسایل میں جو گذشتہ ستر سال سے چھپتے اور شایع ہوتے رہے ہیں غالباً مجلہ مکتبہ وہ پہلا رسالہ ہے جس کو علامۂ مرحوم کے حالات زندگی کلام اور تصانیف کا تذکرہ ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

نام نسب بچپن سید اشرف نام تھا۔ ابو الشریف کنیت۔ شمسی تخلص فرماتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید علی صاحب اور دادا کا نام نامی سید اشرف عرف عالم اچھا میاں صاحب تھا۔ آپ گروہ مہدویہ کے ایک مشہور دودمان سیادت "یدُ اللّٰہی" کے چشم و چراغ تھے سنہ ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر تھی کہ والد بزرگوار نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد علامۂ مرحوم نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمود مرحوم و مغفور کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔

تحصیل علوم ذوقِ علم ورثہ میں ملا تھا۔ ابتدائے تعلیم برادر بزرگوار سے حاصل کی، پھر حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ اور مولانا سید داؤد صاحب قبلہ مشائخین مہدویہ سے فارسی کی تکمیل فرمائی۔ فطرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں طغرا، ظہوری اور چار عنصر بیدل جیسی کتابیں پڑھ لیں۔

عربی کا شوق ہوا تو آپ کے برادر محترم نے اپنے استاد علامۂ عباس علی خاں مرحوم کی خدمت میں حاضر کیا۔ شاگرد رشید کی غیر معمولی ذہانت و محنت نے آپ کو استاد علام خاص عنایات و الطاف کا مورد بنادیا۔ دس سال کی کوشش کے بعد ۲۵ سال کی عمر میں جب علامۂ مرحوم فارغ التحصیل ہوئے تو علامۂ عباس علی خاں مرحوم نے مکہ مسجد کے ایک عظیم الشان جلسہ میں دستاربندی فرمائی۔ اور علامۂ مرحوم کو اپنے ساتھیوں میں یہ امتیاز بخشا کہ سند حدیث میں آپ کو بحرالعلوم کے خطاب سے مخاطب کیا اور سر مجلس اپنی قبا اتار کر اپنے ہاتھوں سے علامۂ مرحوم کو پہنائی۔

اس دستاربندی و سند حدیث نے علامۂ مرحوم کی تشنگی علم کو بجھا نہیں دیا۔ اس کے بعد علوم ریاضی کی تکمیل علامۂ عبدالصمد خاں صاحب قندھاری سے فرمائی اور زمانۂ ملازمت میں حضرت سید اللہ بخش صاحب قبلہ مشایخ مہدویہ سے علم نجوم حاصل کیا۔ مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب سے قرات سبعہ کی تحصیل کی اور اپنے برادر بزرگوار سے علم تصوف وسلوک کی تعلیم پائی۔

علامۂ مرحوم کے برادر محترم فن شمشیر زنی اور بنوٹ میں یکتائے روزگار تھے۔ علامۂ مرحوم نے ان سے اس فن کو تمام و کمال حاصل فرمایا تھا اور اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

علامہ مرحوم کی تحصیل علم طالبان علم کے لئے درس عبرت ہے۔ وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے وہ متوکل فقراء مہدویہ کا گھرانہ تھا۔ جن کا توکل آج بھی بے نظیر ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ یومیہ اور وظیفہ کو عار اور جاگیر و منصب کو ننگ سمجھا۔ اور جو ہر وقت "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" کی مصداق رہے۔ جن کے مسلک میں ذریعہ معاش کا تعین ناجائز اور اپنے باپ اور بھائی کے سامنے بھی دست سوال دراز کرنا حرام تھا۔ دو دو روز تک کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ پھٹے پرانے کپڑے جسم پر ہوتے۔ رات کو چراغ کے لئے تیل نہ ہوتا۔ لیکن شوق علم میں کبھی فرق نہ آتا۔ اگر کبھی ان تکالیف نے ہمت پست بھی کی تو بڑے بھائی کے صبر و رضا نے ہاتھ تھام لیا جن کو دیکھتے تھے کہ تیسرے دن کا فاقہ ہے اور معتقدین سے مسکرا مسکرا کر ہم کلام ہیں۔ دستاربندی کے جلسہ کے روز حیدرآباد کے چھوٹوں اور بڑوں سے

کہ مسجد بھری ہوئی ہے اور حیدر آباد کا یہ قابل فخر فرزند اس میں بغیر شیروانی و عمامہ کے جلسہ میں شریک ہوتا ہے جسم پر ایک پھٹا ہوا کرتا ہے اور سر پر عمامہ کی بجائے ایک دستی لپیٹی ہوئی۔ غرض یہ کہ اس حالت گدائی اور ان تکالیف و مصائب کے باوجود حضرت مرحوم نے جن علوم میں کمال حاصل کیا وہ حسب ذیل ہیں:۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، معانی و بیان، صرف و نحو، عروض و قافیہ، ادب عربی و فارسی، منطق و علم کلام، تاریخ و مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، فلسفۂ قدیم۔

ذریعہ معاش۔ ملازمت حضرت علامۂ مرحوم بھی اس تذکرہ کو ناپسند فرماتے تھے اور میں بھی اس کو قلمبند کرتے ہوئے رنج و ملال محسوس کرتا ہوں کیونکہ حضرت علامہ نے فراغت تحصیل کے بعد حصول ملازمت تک اپنے جگر گوشوں اور دل کے ٹکڑوں یعنی تصانیف کو فروخت کر کر کے قوت لایموت کا سامان حاصل کیا۔ ایک دو مثنویاں اور علوم معقول و منقول میں کئی تصانیف جو ان کے معاصرین کے ناموں سے منسوب ہیں اگر اس خانہ خراب تنگ دستی نے ان کو مجبور نہ کیا ہوتا تو آج حضرت علامۂ مرحوم کی تصانیف کے ساتھ ان کے نام گنائے جاسکتے۔

ابتدائی ملازمت علاقۂ صرف خاص مبارک میں اختیار کی۔ پھر صدر محاسبی سرکار عالی میں کام کرتے رہے۔ اور بالآخر مدرسۂ دار العلوم میں جو اس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا کالج تھا، پروفیسر مقرر کئے گئے۔ یہاں علامۂ مرحوم کے ذمہ مولوی فاضل و کامل کی جماعتوں کی تعلیم رہی۔ جب مدرسۂ دار العلوم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں ضم ہوا تو مولانا کی خدمات بھی وہیں منتقل ہوگئیں۔ اور یہاں ملک و اہل ملک کی ناقدر شناسی اور حضرت علامہ کی غیور و خوددار طبیعت نے جو عہدہ داران وقت کی چاپلوسی اور آستاں بوسی کو کبھی گوارا نہ کرسکتی تھی نہ صرف ان کو مددگار پروفیسر کی جگہ دی بلکہ ایک ایسا مضمون یعنی فارسی جدید ان کے سپرد کیا گیا جس میں ان کو اپنے کمالات علمی کے اظہار کا بہت کم موقعہ تھا اور جو ان کے تلامذہ کے لئے بھی قابل التفات چیز نہ تھی۔ لیکن کبھی حضرت علامہ نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ فرمائی۔ بلکہ اس دلچسپی اور دلدہی سے پڑھایا کہ ان کے شاگرد ان کو کبھی نہیں بھلاسکتے

اسی محنت، فرض شناسی، پابندی وقت اور دلدہی کا نتیجہ تھا کہ بلا درخواست مسلسل پانچ سال تک ان کی توسیع سرکار سے منظور ہوتی رہی اور اپنے انتقال سے صرف تین سال قبل وہ وظیفہ حسن خدمت کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش کئے گئے۔

اشاعت علم حضرت علامہ مرحوم کا مقصد حیات صرف ایک تھا یعنی "اشاعت علم" اپنی عمر کے ۲۵ سال حصول علم میں صرف کئے تھے باقی ۴۲ سال اس کی اشاعت میں گذارے اور اس فرض کو جو "ورثۃ الانبیاء" کا منصب اولین ہے، حیات مستعار کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ادا کیا۔ جن جن علوم کی تحصیل کی تھی وہ سب مستحضر تھے۔ ان کو بلا کسی تیاری کے وہ اس طرح پڑھاتے تھے کہ طالب علم سیر ہو جاتا۔ مولانا کا دولت کدہ طالبان علم کا کعبہ تھا اوقات مدرسہ کے سوا ہر وقت طلباء کا مجمع رہتا۔ دن اور رات کے شاید ہی چند گھنٹے مولانا کو آرام ملتا تھا۔ نماز فجر کے بعد ہی درس شروع ہو جاتے۔ جب مدرسہ کا وقت آتا تو کوئی ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے جھٹکہ پر سامنے کی جانب بیٹھ جاتا۔ مدرسہ پہنچنے تک راستہ میں درس ہو رہا ہے۔ کالج میں بھی جن فرائض کو انجام دیتے تھے وہ اشاعت علم ہی سے متعلق تھے۔ واپسی میں بھی جھٹکہ میں ایک آدھ طالب علم کا ساتھ ہوتا۔ گھر پہنچتے اور تلامذہ کو منتظر پاتے۔ رات کو گیارہ گیارہ بجے تک اسی میں مصروف۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب جن کو کسی اور وقت میں فرصت نہ ہوتی تھی رات کو ۲ بجے حدیث پڑھنے کے لئے آتے اور مولانا کو مستعد پاتے۔ کبھی آپ نے اپنے پڑھے ہوئے علوم میں سے کسی کے پڑھانے میں تامل نہیں کیا۔ ایک مبتدی میزان ومنشعب کے پڑھنے کی خواہش کرتا تو اس کو بھی پڑھا دیتے اور منتہی تلامذہ فصوص الحکم وشمس بازغہ کے درس کی درخواست کرتے تو وہ بھی رد نہ ہوتی۔ حلقۂ درس میں امیر وغریب میں امتیاز نہ تھا۔ نواب کاظم علی خان فرزند نواب شوکت جنگ بہادر نواب سردار علی خان خلف نواب سردار یار جنگ مرحوم اور نواب معین الدین خان خلف صادق جنگ مرحوم کو بھی اسی بوریہ پر بٹھا کر پڑھایا جس پر ان سے قبل ایک گدائے گوشہ نشین کا فرزند بیٹھ کر پڑھ چکا تھا۔

سررشتۂ تعلیمات ودیگر دفاتر سرکار عالی میں جو نوعمر حیدرآبادی افاضل علوم شرقیہ میں

احصا کیا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا نکلے گا جس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت علامہؒ مرحوم کے چشمۂ فیض سے سیرابی کا موقع نہ ملا ہو۔ اپنے اور بیگانے کا کبھی خیال نہ کیا۔ سب کو شفقت اور دلچسپی سے تعلیم دی۔

اگر کوئی ذہین و محنتی طالب علم ملجاتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے کوئی خزانہ ان کو ملگیا ہے۔ اگر ایک دن کے لئے بھی اس کا سبق ناغہ ہوتا تو دوسرے روز حضرت علامہ کالج سے واپس ہوتے ہوئے اس کے گھر پر موجود ہوجاتے اور مزاج پرسی کے بعد وجہ غیر حاضری دریافت فرماتے۔ پابندی سبق کی نسبت نصیحت کر کے واپس تشریف لاتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس نے ایک دفعہ ان سے پڑھ لیا اس نے پھر کوئی دوسرا دروازہ نہ دیکھا۔

سوائے ملازمت سرکاری اور زمانۂ ابتدائی کی دو چار خانگی ملازمتوں کے کسی کو معاوضہ لیکر نہ پڑھایا۔ مجھے چودہ سال تک حضرت کی قدمبوسی کا شرف حاصل رہا ہے۔ حضرت قبلہ گاہی مرحوم کو تمنا ہی رہی کہ مجھے مولانا جو درس دیتے تھے اس کے معاوضہ میں کچھ قبول فرمائیں لیکن تنخواہ یا مشاہرہ تو کیا کبھی کوئی تحفہ و ہدیہ تک بھی قبول فرمانا گوارا نہ کیا۔

شاعری زبان فارسی کے پرگو شاعر تھے طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ ایک ایک نشست میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر لکھ دینا بڑی بات نہ تھی۔ تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔ لیکن غزل اور قصیدے زیادہ کہے ہیں۔ کسی امیر و بادشاہ کی شان میں شعر کہنا ان کی طبع غیور کے خلاف تھا۔ اکثر قصیدے نعت یا منقبت بزرگان دین میں کہے ہیں ابتدائی کلام میں بیدل کا انداز تھا، آخر میں حکیمانہ اور ناصحانہ طریقہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور برجستہ کہتے تھے۔ ان کے دواوین میں کئی عربی قصیدے موجود ہیں۔ اردو میں پانچ دس سے زیادہ شعر نہیں۔

دو تین ضخیم جلدیں علامہؒ مرحوم کے کلام سے پر ہیں اور یہ وہ کلام ہے جو اس بیاض کے سپرد آب ہونے کے کئی سال بعد جس میں دس ہزار ابیات تھیں مرتب ہوا اور جس کو علامہؒ مرحوم نے ایک امیر سے شعراء کی تنقیص سنکر اور یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں قدر سخن نہیں ہے باولی میں پھینک دیا تھا۔

اگرچہ آپ کا تخلص آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا مگر شاعری علامہ مرحوم کا اصلی فن نہیں تھا۔ اس کو انہوں نے محض اوقات فرصت میں دل بہلانے کے لئے اختیار فرمایا تھا۔ اور واقعہ ہے کہ جب وہ اپنے مشاغل علمیہ سے فارغ ہو جاتے یا علیل ہوتے اور کوئی کام نہ کر سکتے تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے۔

چند قصاید متفرق طور پر اور ایک مختصر مجموعہ انتخاب قصاید شمسی کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

اخلاق و عادات علامہ مرحوم میں بہت سی اخلاقی خوبیاں جمع تھیں جس کسی نے آپ سے ایک دفعہ ملاقات کی پھر وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ حد درجہ بامروت، خلیق، نرم مزاج اور حلیم تھے۔ خودداری اور غیرت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے اپنی کسی غرض کے لئے ہاتھ نہ پھیلایا۔ عہدہ داران و حکام سرکاری کی چاپلوسی و خوشامد کو ہمیشہ عار سمجھا کئے۔ اگر کسی شاگرد نے کوئی خدمت کردی (مالی خدمت تو کبھی قبول ہی نہیں کی) تو جب تک اس کے ساتھ علاوہ تعلیم و تدریس کے کوئی اور اچھا سلوک نہ کر دیا آرام نہ لیا۔

حسن معاملہ میں بے نظیر تھے۔ اگر کبھی کا قرض ہو جاتا تو اس کی ادائی تک کچھ عجیب بیقراری مولانا کو رہتی اور جب ادا کر دیتے تو شکر خدا بجالاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے موٹر اجازت پر منگوائی معلوم ہوا نواب کاظم علی خان صاحب سے اپنے صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ صاحب کی پہلی شادی کے لئے کچھ قرض لیا تھا اس کی ادائی کے لئے کوہ مولا کو جانا ہے جہاں نواب صاحب اس زمانہ میں رہتے تھے۔ میں نے موٹر بھیجی اور ایک عریضہ میں گلہ کیا کہ میرے ہوتے آپ نے اپنی ضرورت پر دوسروں سے قرض حاصل کیا۔ جواب میں تحریر فرمایا مجھے اندیشہ تھا تم روپیہ دیکر واپس نہ لوگے۔ میں جانتا تھا کہ ساڑھے چار سو کی تنخواہ ان کے یہاں بیس روز سے زیادہ کافی نہ ہوتی تھی۔ خرچ تو پچاس پون سو ہی کا ہے لیکن خیرات میں سب اٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی قرضہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس لئے وعدہ کر لیا کہ ایک روپیہ اگر آپ بطور قرض لیکر واپس کر دیں گے تو لے لوں گا۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ مجھ سے قرض حاصل کیا مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ تنخواہ یا وظیفہ انہوں نے

کالج یا خزانہ سے اٹھایا ہو اور میرا قرض ادا کئے بغیر گھر گئے ہوں۔

سادگی اس بلا کی کہ اچھے کپڑے، اچھے کھانے، اچھے لباس کا کبھی خیال نہ کیا۔ جب میں نے پہلی دفعہ سبق کے لئے حاضر ہونا شروع کیا تھا تو صرف ایک بوریا پر جو اکثر جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ جب باہر کے کمرے بنکر تیار ہو گئے تو ان میں ایک دری بچھا دی گئی تھی۔ اسی کمرہ کے ایک گوشے میں۔ حضرت مولانا تشریف فرما ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ پاندان ایک طرف رکھا ہے اور دوسری طرف کتابوں کے انبار ایک چھوٹا سا ڈسک جس پر ایک دوات قلم بھی ہے سامنے رکھا ہے اور حضرت مولانا مصروف درس ہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے حضرت مولانا علما رمتقدمین کا ایک مکمل نمونہ تھے جس کا اس زمانہ میں پھر نظر آنا دشوار ہے۔

تصانیف اشاعت علم کے عنوان سے میں نے ان صفحات پر جو کچھ لکھا وہ نامکمل ہے۔ جب تک مولانا مرحوم کی تصانیف کا تذکرہ نہ کیا جائے صرف درس و تدریس ہی کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اشاعت نہیں کی بلکہ اپنے بعد تمام اصناف علوم پر تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف کا ایک بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا۔ جو وقت مدرسہ اور درس و تدریس کے اوقات سے بچ جاتا اس میں تصنیف و تالیف کا شغل رہتا۔ نہ اُن کو تمنا تھی نہ ان کی تقدیر نے اپنی زندگی میں ان کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے شادکام ہونے کا موقع دیا۔ چند چھوٹے رسالوں کے سوا باقی سب کتابیں اب تک طبع نہیں ہو سکیں۔ ۲۰ سال کی محنت میں قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان میں لکھی جو کئی ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ علم نحو میں ایک (۸۰۰) صفحہ کا رسالہ لکھا۔ جو اپنی آپ نظیر ہے اور جس میں ان تمام مسایل نحوید پر جو علمار متقدمین میں مختلف فیہ رہے ہیں نہایت مبسوط بحث کی ہے۔ منطق، علم کلام، تصوف، قرأت، نجوم، عقاید، اصول حدیث اصول فقہ اور علم اخلاق میں کئی رسالے تصنیف فرمائے جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔

میری درخواست پر اپنے آخری ایام حیات میں تفسیر لوامع البیان کا مقدمہ

تحریر فرمانا شروع کیا تھا جس کے ساڑھے پانچ سو صفحات لکھے گئے تھے اور عبادات کا باب شروع ہوا تھا کہ حضرت علامہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور انتقال فرمایا۔ یہ حضرت مرحوم کی آخری تصنیف ہے۔

اہل وعیال علامۂ مرحوم نے اپنی زندگی میں اولاد کے بہت داغ اُٹھائے۔ آپ کو دو صاحبزادے اور کئی لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے فرزند مولوی سید علی مرحوم جن کو حضرت علامہ نے بڑی محنت سے تعلیم دی تھی اور جنہوں نے نوعمری میں اپنے آپ کو باپ کی جانشینی کے قابل ثابت کر دیا تھا عین اس وقت انتقال کیا جبکہ مولوی فاضل وکامل کے امتحانات میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب اور صاحب تصانیف ہو چکے تھے۔ ان کی تصانیف کے منجملہ "شرح دیوان زہیر" چھپ گئی ہے عربی میں نہایت برجستہ شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو کلام بھی بہت اچھا تھا۔ یہ داغ کچھ کم نہ تھا کہ مسلسل کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ سب سے بڑی اور نہایت قابل صاحبزادی کا انتقال حضرت علامہ کی وفات سے صرف ۷ ماہ قبل ہوا تھا جنہوں نے کئی چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بعد چھوڑے۔ زمانۂ مرض الموت میں ایک دفعہ فرمایا۔ میاں جو زخم دل میں تھے وہ پیٹھ میں نکل آئے ہیں۔

اب صرف ایک صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ ان کی یادگار ہیں اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت بی، اے میں زیر تعلیم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور حضرت علامۂ مرحوم کا سچا جانشین بنائے۔

علماء و کاملین کی صلبی اولاد کے ساتھ ان کی روحانی اولاد بھی قابل ذکر ہے جو ان کے نزدیک اول الذکر سے کچھ کم عزیز نہیں ہوا۔ یوں تو حضرت علامہ کے تلامذہ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا گنوانا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن قابل ذکر حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جانشین علامۂ مرحوم جناب مولانا مولوی محمد سعادت اللہ خان صاحب ہوش مولوی فاضل وکامل و متکلم اول مددگار پرنسپل مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم سرکار عالی

(۲) حضرت مولانا مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ فرزند حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ رح

جو اکابر مشایخین مہدویہ سے ہیں۔

(۳) حضرت مولانا سید عالم صاحب مولوی فاضل وکامل اہل چن پٹن علاقہ میسور۔

(۴) حضرت مولانا سید مرتضیٰ صاحب۔

(۵) حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب افضل العلماء۔

....

خدا اُن سب کے فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے جو درحقیقت حضرت علامہ کے فیوض و برکات علیہ ہیں۔

وفات اواخر ماہ ذیحجہ میں ۱۳۴۸ھ میں مرض سرطان میں حضرت علامہ مبتلا ہو گئے۔ ابتداء میں یہ مرض پہچانا نہ گیا۔ اور مختلف علاج کئے گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب سے یہ مرض شروع ہوا تھا حضرت مرحوم کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ عشرۂ محرم میں اپنے عقاید کے بموجب ترک دنیا کی اور وظیفۂ حسن خدمت سے دست بر داری فرمائی۔

جب مرض نے ترقی کی تو پھر میرے مجبور کرنے پر دواخانہ عثمانیہ میں علاج کروانے پر راضی ہوئے۔ ایک خاص کمرہ لیکر اس میں رکھا گیا اور عمل جراحی ہوا۔ لیکن مرض بڑھتا ہی گیا۔ ۲۵ محرم ۱۳۴۹ھ کو مکان واپس لایا گیا اور ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۹ھ روز سہ شنبہ کو صبح طلوع فجر کے وقت ۶۹ سال کی عمر میں تقدیر الٰہی کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس مرض میں حضرت علامہ کی قوت برداشت کے اندازہ کا موقع ملا۔ ہوشیار ہیں اور پیٹھ زخموں سے بھری ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کتر کتر کر علحدہ کر رہے ہیں لیکن پیشانی پر بل ہے نہ چہرے پر زردی۔ میں نے جب تسلی کے الفاظ کہے تو ارشاد ہوا کہ ہماری زندگی میں مسرت و آرام کے ایام اور مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں سو اور دس کی نسبت ہے لیکن انسان کتنا ناشکر گذار ہے کہ دس دن کی مصیبت کے لئے سو دن کے آرام کو بھول جاتا ہے۔

غرض حضرت علامہ کئی حیثیتوں سے اپنی آپ نظیر تھے۔ اب وہ آفتاب علم کہاں جو پچاس برس سے حیدرآباد پر ضیا پاش تھا۔ وہ دریائے علم کہاں جس نے ہزاروں تشنہ کامان علم کو سیراب کیا تھا۔ اب چنچل گوڑہ کا وہ مشرقی اور سنسان کنارہ جس کی پگڈنڈی کے راستوں پر صبح و شام ہر وقت طالبان علم کتابیں بغل میں دبائے قلم ہاتھ میں لئے سر جھکائے یا ایک دوسرے سے چپکے چپکے گفتگو کرتے ہوئے گذرتے نظر آتے تھے آج ویران پڑا ہے۔ وہ حجرہ جس کی میلی شطرنجی پر بیٹھنے سے قلب کو نور اور دماغ کو روشنی ملتی تھی شمع علم سے خالی ہے۔ آہ شمسی آنکھ تمھارے دیکھنے کو کان تمھاری آواز کے سننے کو اور قلب و دماغ تمھارے زبان سے نکلے ہوے مسایل علیہ و دینیہ کے سمجھنے کو بیقرار ہیں تم اپنے وقت پر گئے مگر ہم کو بے وقت چھوڑا۔ خدا تمھارے درجات بلند کرے۔ تم کو اپنے دیدار سے سرفراز کرے اور جنتیوں میں تم اسی عزت سے رہو جس عزت سے یہاں تھے تم کو زمانہ نے تمھارے بعد یاد کیا ہے لیکن اب بھلا نہیں سکتا۔ تمھاری تصانیف تم کو زندہ رکھیں گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے!

ماہیت عشق

از

علامہ سید اشرف شمسی مرحوم

ذیل کا مقالہ علامہ مرحوم کی گرانبہا تالیف "الحکمۃ العلمیہ" کا ایک جزو ہے جس میں علم العدد اور علم ارثماطیقی کے ذریعہ اعداد متحابہ کے استخراج کے اصول عالمانہ انداز میں نہایت تفصیل و تشدید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ فن اخلاق میں اخلاق جلالی اور اخلاقِ ناصری متداولہ کتب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں لیکن اول الذکر کتاب میں عنوانِ محبت کے تحت عشق کی ماہیت بیان کرتے ہوئے علامہ محقق دوانی نے صرف ان اعداد کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اساتذہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ کتاب مذکور میں طلبہ کے لئے یہ ایک دشوارگزار مقام ہے۔ اس سے کسی محدود قابلیت والے شخص کو کیا تشفی ہو سکتی ہے؟ آخرالذکر کتاب میں علامہ محقق طوسی نے سیاستِ مدن کی تحت فضیلت محبت کے موضوع پر بحث کی ہے۔ لیکن اعدادِ مذکور کا اس میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ علامہ مرحوم نے مقالہ زیر بحث میں ایک ایسے دقیق مسئلہ کو حل کرتے ہوئے جو فاضلانہ بحث کی ہے اس سے ان کی فضیلتِ علمیہ اور ہمہ دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ (مجلۂ مکتبہ)

بعض حکما نے ذکر کیا ہے کہ عشق بھی قوتِ شہوانیہ کے امراض میں سے ایک مرض ہے اور بیان کیا ہے کہ عشق سے مراد یہ ہے کہ انسان کی قوت شہوانیہ کسی شخص خاص کی طلب میں غالب ہوجائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ عاشق کو چاہیئے ناصحوں کی نصیحت میں غور و تامل کرے اور اس کے فوائد پر نظر ڈالے اور علما کی صحبت

اختیار کرے۔ یقین ہے کہ یہ فکر و تامل اس کے لئے نافع ہوگا۔ اگر یہ علاج اس کے حق میں نافع نہ ہو تو ان دواؤں کا استعمال کرے جن سے قوت شہوانیہ کا جوش دب جائے اور مادۂ شہوت کا ہیجان کمزور ہو جائے۔ بعض حکما کا یہ خیال ہے کہ عشق سے محبت کا غلبہ مُراد ہے جس سے انسان کا شعور ناقص ہو جاتا ہے اور اس کو معشوق کے سوائے دوسری اشیاء کی جان پہچان نہیں رہتی۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) عشق حیوانی (۲) عشق نفسانی۔ عشق حیوانی وہ ہے جس کا بیان ابھی کیا گیا۔ حکما کہتے ہیں کہ عشق مذموم ہے۔ کیونکہ یہ فسق ہے اور ہر فسق رذیلت ہے پس عشق بھی رذیلت ہے۔ عشق نفسانی وہ ہے کہ انسان روحانی تناسب کی وجہ کسی خاص شخص سے محبت رکھے ایسے انسان کو عمدہ راگوں اور اچھی صورتوں سے بھی محبت ہوتی ہے اور اس قسم کی محبت میں زوال نہیں۔ اس کا جب غلبہ ہوتا ہے تو انسان بے عمل و بے شعور ہو جاتا ہے۔ حکما کہتے ہیں کہ اس نوع کی محبت کا فضائل میں شمار کیا گیا ہے درحقیقت یہ محبت ایک نورانی کیفیت ہے جس کے دو مظہر ہیں: (۱) ایک مظہر محب ہے (۲) دوسرا مظہر محبوب ہے مگر قابلیت کے اختلاف سے ایک مظہر میں اس کیفیت کا پورا ظہور ہوتا ہے اور دوسرے مظہر میں ناقص۔ مظہر ناقص عاشق ہے اور مظہر کامل معشوق۔ حکما کہتے ہیں کہ معشوق مبداء عشق ہے کیونکہ بغیر ظہور معشوق عشق ظاہر نہیں ہو سکتا یہی کیفیت عشق حیوانی کی بھی ہے۔

جب ان حکما کو اس امر میں یقین ہے کہ نظامِ کائنات محبت یا عدالت سے ہے، اور وجود محبت کی حالت میں عدالت کی حاجت نہیں تو انھوں نے افرادِ انسان میں محبت کا سلسلہ قایم کرنے میں بہت کچھ غور و تامل کیا اور بالآخر ایک قاعدہ کی ایجاد کی جس پر عمل کرنے اور اس پر مداومت کرنے سے دو آدمیوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ اس قاعدہ کا علم العدد میں ذکر آیا ہے۔ اولاً انھوں نے ایسے عدد میں غور کیا جس کے اجزا دوسرے عدد کا مجموعہ ہو جائیں اور اس دوسرے عدد کے اجزا بھی اس پہلے عدد کا مجموعہ ہو جائیں مثلاً (۲۲۰) اور (۲۸۴) کہ ان میں سے

اگر پہلے عدد کے اجزا نکالے جائیں اور پھر ان کو جمع کریں تو دوسرے عدد کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے اور اگر دوسرے عدد کے اجزا نکالے اور جمع کئے جائیں تو ان سے بھی پہلے عدد کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے۔

حکما نے اس قاعدے کی اس طرح توضیح کی ہے کہ واحد یعنی (۱) میں وحدت حقیقی ہے اور یہی وحدت حقیقی اصل ہے۔ جب اس وحدت کے ساتھ ایک مرتبہ یا کئی مرتبوں کا اعتبار کیا جاتا ہے تو اس اعتبار سے کثرت پیدا ہوتی ہے پس کثرت امر اعتباری ہے۔ یہ بات ان کے پاس بہت بڑی چیز اور اصل کلی ہے جس سے انہوں نے سینکڑوں مجہول چیزوں کو معلوم کیا ہے، علم ارثماطیقی میں بھی یہی اصل اعظم ہے اور بیان کیا ہے کہ جب واحد (۱) کے ساتھ دوسرے مرتبہ کا اعتبار کیا گیا تو (۲) حاصل ہوئے اور جب اس کے ساتھ تیسرے مرتبہ کا اعتبار کیا گیا تو (۳) حاصل ہوئے پس (۲) واحد کا زوج اور (۴) زوج الزوج ہے۔ کیونکہ اس میں چار اکائیاں ہیں یعنے وحدت اصلی کا تین بار اعتبار کیا گیا ہے ان چار اکائیوں کو انہوں نے اس طرح لکھا ہے (۱و۱و۱و۱) ان میں سے پہلی اکائی کو مرتبہ آتش قرار دیا ہے کیونکہ واحد حقیقی اور بسیط ہے۔ دوسری اکائی کو مرتبۂ ہوا قرار دیا ہے کیونکہ اس نے دوسرے مرتبہ کے ساتھ ترکیب کھائی ہے۔ تیسری اکائی کو مرتبۂ آب قرار دیا ہے کیونکہ اس نے دوسرے مرتبہ کے ساتھ ترکیب کھائی ہے اور چوتھی اکائی کو مرتبہ خاک قرار دیا ہے کیونکہ اس نے تین مرتبوں کے ساتھ ترکیب پائی ہے۔

ان میں سے پہلی اکائی آتشی ہے، دوسری ہوائی، تیسری آبی اور چوتھی خاکی پس آتش مبدأ حرارت ہوئی اور ہوا مبدأ رطوبت، پانی مبدار برودت اور مٹی مبدا یبوست۔ کیونکہ چوتھی اکائی پر کیفیات اوّلیہ پورے ہوجاتے ہیں اس لئے چار کو عدد کامل کہتے ہیں۔ اخلاط میں بھی انہوں نے اسی ترکیب کا اعتبار کیا ہے پہلی اکائی سے صفرا کو دوسری سے خون کو تیسری سے بلغم کو اور چوتھی سے سودا کو تشبیہ دی ہے۔ غرض چار کیفیتوں چار طبیعتوں اور چار خلطوں میں اسی اکائی تک اعتبار کیا گیا ہے بہت سے امور حقیقیہ و اعتباریہ میں اسی عدد سے کام لیا گیا ہے۔ اہل علم الحروف نے اپنے

اصول صناعیہ میں اسی اصل طبعی کا اعتبار کیا ہے اور ان اعداد کے مقابلہ میں ا ب ج د کو ٹھہرایا۔

اہل محبت و قلبہ نے اعدادِ متحابّہ کے استخراج میں ان ہی اکائیوں اور اسی عدد سے مدد لی ہے۔

واضح ہو کہ اعداد متحابہ یعنی (۲۸۴) اور (۲۲۰) کے دریافت کرنے کا یہ قاعدہ ہے کہ پہلے عدد واحد یعنی (۱) زوج لیا جائے اور وہ (۴) ہیں جب چار کو تیسرے مرتبہ میں جو مرتبۂ آب ہے اور صفت میلان سے موصوف ہے ضرب دیا جائے تو (۱۲) حاصل ہوں گے اور پھر اس کو[1] (۳) کے نصف یعنی ۱½ میں اس وجہ سے ضرب دیا جائے کہ عدد (۳) جس میں مرتبہ میلان ہے محبوب و محب میں مشترک ہے جب اس کی[2] تنصیف کی جائے گی تو ہر ایک کا حصہ نصف ہوگا اور اس عمل ضرب سے (۶) حاصل ہوں گے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ (۱۲) (۶) کے مرتبۂ اثنینیت[3] میں ہیں یعنی دونوں عدد خود زوج ہیں اور عاشق و معشوق میں سے ہر اک فرد ہے پس اعداد اور معدود میں نسبتِ تضاد ہے اور اس تضاد کو رفع کرنے اور مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے کہ (۱۲) میں سے (۱) اور (۶) میں سے (۱) کی تفریق کی جائے تو (۱۱) اور (۵) باقی رہ جائیں گے۔ اس تفریق کے بعد محب کے عدد بھی فرد ہونگے اور معدود و عدد میں مناسبت ہوگی۔ جب ان دونوں میں ازدواج پیدا کرنے کے لئے ضرب دیا جائے گا ۵۵ حاصل ہوں گے اور جب اس کو (۴) میں ضرب دیا جائیگا تو (۲۲۰) حاصل ہو جائیں گے یہ عدد محبوب کے لئے ہے۔ محب کے اعداد اس طرح نکالے جائیں: پہلے (۱۱) و (۵) میں ضرب دیا جاے تو (۵۵) حاصل ہوں گے۔ پھر حاصل جمع[4] (۱۶) کو حاصل ضرب[5] (۵۵) کے ساتھ جمع کیا جائے تو (۷۱) حاصل

---

[1] یعنی چار کو۔ [2] یعنی تین کی۔ [3] یعنی ایک عدد دوسرے کا ضعف ہے ایک عدد جو کم ہے (۲) میں ضرب کھانے سے دوسرے عدد کے برابر ہو جاتا ہے۔ [4] یعنی گیارہ اور پانچ کے حاصل جمع کو جو سولہ ہوتا ہے۔
[5] یعنی گیارہ اور پانچ کے حاصل ضرب کے ساتھ جو پچپن ہوتا ہے۔

ہوں گے۔ پھر (۷۱) کو زوج الزوج یعنے چار میں ضرب دیا جائے گا تو (۲۸۴) حاصل ہوجائیں گے یہ اعداد محب ہیں۔ ہماری تقریر سے ظاہر ہے کہ دونوں عددوں کی اصل عدد کامل یعنے (۴) ہے۔ حکما کہتے ہیں کہ ان دو عددوں میں سے بڑا عدد (۲۲۰) ہے اور چھوٹا (۲۸۴) کیونکہ بڑے عدد کی انہوں نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ عدد بڑا ہے جس کے اجزا کا مجموعہ چھوٹے عدد سے بڑھ جائے چھوٹا عدد وہ ہے جس کے اجزا کا مجموعہ بڑے عدد سے گھٹ جائے۔ (۲۲۰) کو اس وجہ سے بڑا کہا ہے کہ جب اس کے اجزا نکال کر ان کا مجموعہ بنایا جاتا ہے تو یہ مجموعہ (۲۲۰) سے بڑھ جاتا ہے اور پورے (۲۸۴) نکلتے ہیں اور یہ عدد محب ہے۔ اسی طرح جب (۲۸۴) کے اجزا نکالے جاتے ہیں تو (۲۲۰) نکلتے ہیں اور یہ عدد محبوب ہے۔ (۲۲۰) کے اجزا یہ ہیں ۱۱۰ و ۵۵ و ۴۴ و ۲۲ و ۲۰ و ۱۱ و ۱۰ و ۵ و ۴ و ۲ و ۱۔ کیونکہ ہماری تقریر سابق سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان اعداد کے ارکان یہ ہیں ۴ و ۵ و ۱۱۔ جب ان میں سے (۵) اور (۱۱) کو باہم ضرب دیا گیا تو ۵۵ حاصل ہوئے[1] اور (۴) اور (۱۱) کو ضرب دیا گیا تو (۴۴) حاصل ہوئے۔ جب (۵) اور (۴) کو ضرب دیا گیا تو (۲۰) حاصل ہوئے (۴۴) کا نصف (۲۲) ہے اور اس کا نصف (۱۱) ہے اور (۲۰) کا نصف (۱۰) ہے اور (۱۰) کا نصف (۵) ہے اور (۴) جو زوج الزوج ہے اس کا نصف (۲) ہے اور اس کا نصف (۱) ہے ان سب اجزا کا مجموعہ (۲۸۴) ہوتے[2] اور (۲۸۴) کے یہ اجزا ہیں ۱۴۲ و ۷۱ و ۴ و ۲ و ۱ جب عدد (۷۱) ۵ و ۱۱ کے مجموعہ اور ۵ و ۱۱ کے ضرب[3] اور حاصل جمع و حاصل ضرب کے مجموعہ سے حاصل ہوا ہے تو اس میں پھر ضرب کی ضرورت نہیں[4]۔ اس لئے ان اجزا کے مجموعہ سے (۲۲۰) حاصل ہوتے ہیں[5]۔ غرض عدد محبوب سے عدد محب اور عدد محب سے عدد محبوب نکلتے ہیں اسی وجہ سے ان کو اعدادِ متحابہ کہتے ہیں۔

---

[1] (۵۵) کو ۲ میں ضرب دینے سے (۱۱۰) حاصل ہوئے۔ [2] یعنی (۱۶) [3] یعنی (۵۵) [4] یعنی ۴ کو ۲ سے باہم ضرب دینئے سوائے کسی اور عدد سے ضرب دینے کی ضرورت نہیں [5] اس طرح کہ ۷۱ × ۲ = ۱۴۲ + ۷۱ + ۴ + ۲ + ۱ = (۲۲۰)

محقق دوانی نے اخلاق جلالی میں اعداد متحابہ کا ذکر اور ان کے خواص کو بیان کیا ہے کہ ان اعداد کا تعویذ بنا کر جب انسان ساتھ رکھتا ہے تو محبت کا ہیجان ہوجاتا ہے اور محب و محبوب میں محبت ہوجاتی ہے۔ مگر ان اعداد متحابہ کا استخراج اور ان کے اجزا کو دریافت کرنے کی کیفیت نہیں لکھی۔ اسی واسطے ہم نے ان اعداد اور ان کے اجزا کو اصول ارثماطیقی کے موافق دریافت کیا ہے اور اس مختصر رسالہ میں ان کے استخراج کے قواعد لکھدئے گئے ہیں تا طالبان علم کو ان کے استخراج کی کیفیت معلوم ہوجائے۔ حکماء الہیین نے ان اعداد سے عشق و محبت کے معاملات میں ہنگام لیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ان اعداد کی مشق سے روح کی تنویر ہوتی ہے واضح ہو کہ اس تقریر و توضیح کا یہ مناسب موقع نہیں ہے بلکہ اس کا موقع مناسب بیان محبت ہے مگر جب دیگر علما نے علاج عشق میں یہ تقریر کی ہے تو ہم نے بھی ان کی تقلید کی ہے۔

علامہ شمسی کا تبحر علمی

از
جناب محمد سعادۃ اللہ خاں صاحب ہوش منشی فاضل و مولوی کامل
اول مددگار فوقانیہ دارالعلوم بلدہ مرکاوالی

تمہید دنیا ناپائیدار ہے! یہ ایک ایسا مقدمہ ہے جس کو برہان سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ روزمرہ کے مشاہدات و حالات نے اس کو ایک امر بدیہی بنا دیا ہے۔ اس ناپائیدار دنیا میں بقا و دوام کے وجود کا خیال امور متضادہ کے اجتماع کے تصور سے کم نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اعتبارات کی دنیا میں یہ نظریہ غلط اور یہ قضیہ غیر صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کو ایک اعتبار سے اچھی اور پاک کہتے ہیں تو پھر اسی چیز کو دوسرے اعتبار سے بری اور ناپاک قرار دیتے ہیں نفس ہی کو لیجئے حقیقت میں ایک ہے لیکن اس اعتبار سے کہ اس سے اچھے افعال صادر ہوتے ہیں مطمئنہ کا لقب پاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ اس سے برائیاں سرزد ہوتی ہیں امارہ کہلاتا ہے اسی طرح بقا و فنا بھی ہیں کہ دونوں ایک شئے کی صفت بن سکتی ہیں حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے اس شعر سے ہمارے مقصد پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے ؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت — نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

اسی طرح دنیا کی پاک ہستیاں گو اس عالم فانی سے منتقل کرتی ہیں لیکن ان کے اعمال و اخلاق کے کارنامے دنیا میں رہ جاتے ہیں جو ان کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھتے ہیں۔

حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت علامہ بحرالعلوم مولانا سید اشرف صاحب شمسی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ

اُن پاک ہستیوں میں سے تھے جو مرنے کے بعد صاحب اعمال صالحہ و حسنات جاریہ اور منبع برکات ہونے کی حیثیت سے زندہ جاوید ہیں جب تک حضرت مرحوم کی تصنیفات و تالیفات کے چشمے ابلتے رہینگے۔ آپ کی حیات بعد الممات کے چمن زار سرسبز رہیں گے اور آپ کی یاد کی روئیدگیاں زمین قلوب پر ہمیشہ سبزہ بار بار روئیدہ ہو کر منظر پیش کرتی رہینگی مولانا کی زندگی کی مبارک گھڑیاں یا تعلیم و تدریس میں صرف ہوتی تھیں یا تصنیف و تالیف میں رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چند ساعتیں آرام کی تھیں اسی محنت شاقہ نے آپ کو حقیقی معنوں میں بحر العلوم بنا دیا مولانا مرحوم کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر تبصرہ کرنے اور آپ کے تبحر علمی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے ایک طویل مدت ایک بڑی واقفیت اور کافی دیدہ ریزی کی ضرورت ہے نیز اس امر کی ضرورت ہے کہ علامہ کے تبحر علمی کا اجمالی طور پر ذکر کر کے کم از کم آپ کی علمی صحبتوں کی یاد تازہ کریں۔

تبحر علمی کا لفظ دیکھنے اور بولنے کے لئے مختصر اور لکھنے کے لئے چند حروف کا مجموعہ ہے لیکن اس صفت سے متصف ہونے کے لئے جن مصیبتوں کو جھیلنا پڑتا اور جن مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان کا تفصیلی علم اسی کو ہو سکتا ہے جو اس صفت سے متصف ہو۔

تبحر علمی زندگی کے دو شعبوں میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کا نام ہے:

(۱) ایک تدریس و تعلیم (۲) دوسرا تصنیف و تالیف۔ تدریس و تعلیم کی کامیابی یہ ہے کہ علوم و فنون متداولہ کی درسی کتابوں پر اتنا عبور ہو کہ تشفی بخش طریقہ پر ان کی تفہیم کر سکے اور معرکۃ الآرا مسائل کے مالہا و ماعلیہا بیان کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے سے ان کے عقدوں کو کھول دے اور الجھنوں کو سلجھا دے کامیاب تصنیف و تالیف یہ ہے کہ علمی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص خاص مسائل یا فنون پر جن کے تفہم و تفہیم میں دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ایسا تبصرہ کرے کہ مسائل کا انکشاف ہو جائے اور طالبین فنون کی راہ طلب میں کوئی دقت حائل نہ ہو۔ الحمد للہ ہمارے بحر العلوم کو علمی زندگی کے ان ہر دو شعبوں میں وہ شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کے فیضان علم کے چشمے ابل ابل کر تشنگان علوم و فنون کی پیاس ہمیشہ بجھاتے ہیں اور بجھاتے رہیں گے۔ علوم شرقیہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جنہیں مولانا کا شرف

تلمذ حاصل رہا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا کا طریقہ تعلیم کیسا تھا اور کس قدر کامیابی کے ساتھ آپ تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ کامیابی انسان کی زندگی کے آخری لمحوں تک اس کا ساتھ دیتی ہے اس کے بعد اس کا طریقہ تعلیم اس کی چلتی ہوئی زبان کے سکوت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن تصنیف و تالیف کی کامیابی مصنف و مولف کی یاد قیامت تک باقی رکھ سکتی ہے۔ دیکھئے امام غزالی، امام رازی، سعدی رحمہم اللہ کو اس دارِ فانی سے گئے ہوئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کی تصانیف نے ان کو آج تک زندہ رکھا ہے اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

اگرچہ مولانا کی تصانیف پر تبصرہ کرنے کے لئے خواہ اجمالی کیوں نہ ہو کافی وقت اور محنت کی ضرورت ہے تاہم یہاں ہم صرف تصانیف کا شمار کرانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان پر تھوڑی سی روشنی ڈال کر قارئین کو ان سے روشناس کرائینگے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بارش کے مہینوں میں جس طرح بادل یکساں نہیں آتے، ایک ہی قسم کی بارش نہیں برساتے اور سمندر کی موجیں ایک ہی قسم کی نہیں ہوتیں اسی طرح صفتِ علمی کا ظہور بمصداق کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ مختلف رنگوں اور گوناگوں جلووں کے ساتھ ہوتا ہے جس کے افادیت ہمیشہ رہے گی لیکن جامعیت والی ہستیاں صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت علامہ مرحوم کے نام کے ساتھ علامہ متبحر لکھنا شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے آپ کی تصانیف و تالیفات شاہدِ صادق ہیں جن جن علوم و فنون میں آپ نے تعلیم پائی اس میں اتنی مشق پیدا کی کہ اچھے خاصے مصنف بن گئے۔

نحو علم نحو میں ایک ضخیم کتاب موسوم بہ تلخیص النحو تالیف فرمائی جو تمام مسائل نحو کی جامع ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیش بہا تالیف کے وقت علم نحو کی معرکۃ الارا کتابیں مولانا کے پیش نظر تھیں کیونکہ جا بجا مغنی اللبیب مفصّل اور مفصّل کی متعدد شروح شیخ نجم الدین رضی کی شرح کافیہ اور کتاب سیبویہ کا حوالہ دیا ہے ہر مسئلہ کے تحت اشعار جاہلیت اور فصحاء عرب کے مشہور کلام اور کہیں آیات قرآنی کے متعلق نہایت

تفصیل کے ساتھ بحث فرمائی ہے ہر عنوان کے تحت نحوی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس خوبی سے علم نحو کی تمام کتب متداولہ کا نچوڑ ضبط قلم فرمایا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا پھر کسی علم نحو کی کتاب کا محتاج نہیں رہتا۔ جو مسائل کافیہ میں آپ کو نہ ملیں گے وہ اس کتاب میں موجود ہیں مثلاً علامہ نے اس کتاب کے آخر میں اسے سکت کا باب قائم فرمایا ہے جس کی تحت تحریر فرماتے ہیں " اس مسئلہ کا شیخ ابن حاجب نے کافیہ میں ذکر نہیں کیا بلکہ علامہ جار اللہ زمخشری مفصل میں اور شیخ نجم الدین رضی نے شرح کافیہ کے آخر میں لکھا ہے کہ کتاب سیبویہ رحمہ اللہ میں مسئلہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے "

راقم سے حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ تفسیر کی تالیف کے زمانے میں علم نحو کے وہ نادر مسائل میرے علم میں آئے جن کا کتب درسی میں کہیں بھی پتہ نہیں چلتا اور جن کو میں علیحدہ ضبط قلم کرتا گیا۔ اسی طرح علم نحو کے نایاب جواہر جو بحر تفسیر کی غواصی کے وقت مولانا کے ہاتھ لگے تھے وہ تمام کے تمام تلخیص النحو کے زرین قلمدان میں محفوظ ہیں کتاب کی ضخامت خود اس کے دامن مسائل کی وسعت پر دلالت کرتی ہے ۔ یہ کتاب (۸۰۸) صفحات پر ختم ہوئی ہے دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے فرزند رشید مولوی سید علی صاحب مرحوم منشی فاضل و مولوی فاضل کی تعلیم نصاب کامل کے زمانہ یعنی ۱۳۳۵ھ میں اس کی بنیاد پڑی تھی اور ۱۹ شعبان ۱۳۳۵ھ روز پنجشنبہ کو ختم ہوئی

منطق | منطق میں مولانا کو خاصی دستگاہ حاصل تھی مسلم اور اس کے معرکۃ الآرا شروح قاضی حمد اللہ و بحر العلوم نہایت صفائی سے پڑھایا کرتے تھے دار العلوم کی معلمی کے زمانہ میں مولانا کو یہ خیال ہوا کہ کوئی ایسا متن منطق میں لکھا جانا چاہیے کہ جس میں مضامین سلیس پیرایہ میں بیان کئے جائیں اور متعلم کو تفہیم میں کوئی دقت نہ ہو چنانچہ مولانا اپنے ارادہ میں کامیاب ہوئے ۔ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ کو "کشف المنطق" کے نام سے ایک رسالہ لکھنا شروع کیا اور ۹ محرم ۱۳۳۳ھ کو ختم فرمایا۔ اس رسالہ کا ماخذ شمسیہ ہے لیکن مسائل کی توضیح میں مطالع سے مدد لیگئی ہے گویا یہ رسالہ شمسیہ اور مطالع کے مسائل کا خلاصہ ہے مولانا کے قلم سے باریک خط میں (۴۳) صفحوں پر ختم ہوا ہے ۔ مولانا نے قضایائے شرطیہ اور قضایائے موجہات مرکبہ اور مباحث عکس مستوی و عکس نقیض کی جہاں بحث کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوح مسائل میں مرقاۃ سے

کچھ زیادہ ہی ہے اس کا اردو ترجمہ ہو جائے تو مرقاۃ کے اردو ترجمے سے زیادہ طالبین کو فائدہ پہونچے گا۔ ایک اور رسالہ عربی زبان میں فوائد کے نام سے لکھا ہے اس رسالہ کا ماخذ قطبی اور سعدیہ ہے اس رسالہ کے تبصرہ میں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ قطبی اور سعدیہ جیسی کتابوں کی تلخیص ہے اس کے سوا ایک اور رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا نام توضیح المنطق ہے۔ یہ رسالہ سعدیہ و قطبی کا پورا پورا خلاصہ ہے اس کا حجم ..ا صفحوں تک ہے اور زبان اردو میں لکھا گیا ہے۔ اسی فن میں مولانا نے ایک اور کام شروع کیا تھا یعنی سلّم کی تلخیص لکھ رہے تھے تصورات کی تلخیص فرمالی تھی تصدیقات میں وجود محال کی مشہور بحث تک پہنچے تھے نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر تصدیقات کی تکمیل نفرما سکے اس رسالہ کا نام اسلم تلخیص سلّم رکھا ہے۔ اس رسالہ سے واضح ہے کہ تلخیص کے وقت منطق کی مشہور کتابیں اور سلّم کی تمام شروح اور شفا بو علی سینا پیش نظر رہی ہے۔ مشکل مسائل کو آسان بنانے اور سلیس عبارت میں مفہوم ادا کرنے کی سعی فرمائی ہے گو یہ رسالہ ناتمام ہے لیکن تصورات کا حصّہ کامل ہونے کی حیثیت سے ایک حد تک مکمل سمجھا جا سکتا ہے۔

فلسفہ مولانا کو فلسفہ قدیم پر بڑا عبور تھا صدرا اور شرح اشارات جیسی ادق کتابیں طلبہ آپ سے پڑھا کرتے تھے۔ صدرا کی ثنا ۃ بالتکریر کے مباحث جو عسیر التفہیم مشہور ہیں آپ سے پڑھنے کے بعد سہل الحصول ہو جاتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ علم ہندسہ سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی اور اس قسم کے مباحث وہی شخص اچھی طرح پڑھا سکتا ہے جس کی ریاضی بھی اچھی ہو حضرت علامہ رحمہ اللہ نے ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق کی تلخیص اردو زبان میں کی ہے اور اس کا نام "حکمت عملیہ" رکھا ہے۔ فن اخلاق میں اردو زبان کا نہایت مفید رسالہ ہے۔ علم الاخلاق میں معرکۃ الآراء بحث مسئلہ محبت پر کیجاتی ہے جلال الدین محقق دوانی نے اپنی کتاب اخلاق جلالی میں اس عنوان پر بحث کرتے ہوا عداد متحابّہ کی طرف اشارہ کیا ہے اخلاق جلالی میں یہی ایک مقام عسیر الفہم ہے لیکن علامہ مرحوم نے اپنی کتاب حکمتہ عملیہ میں اس مسئلہ کو نہایت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ کو وہی شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے جو علم ارثماطیقی سے واقف ہو اس رسالہ کا حجم (٢٢٠) صفحات ہے کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ رسالہ سلسلہ تعلیم

جامعہ عثمانیہ میں علم الاخلاق کی تعلیم کے لئے منتخب ہوتا۔

طب | اس فن میں مولانا کی تصانیف تلخیص الشفاء تلخیص میبذی تلخیص شرح اشارات کا بھی ہونا تنویر الہدایہ کی فہرست سے ظاہر ہے لیکن ہماری نظر سے یہ کتابیں نہیں گزریں۔

اس فن میں حیات بعد الممات کے عنوان پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا ماخذ شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات امام رازی کی تحریرات اور احادیث نبویہ ہیں یہ رسالہ (۷۹) صفحہ پر ۱۳۱۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ جو چار ابواب اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔

قراءت | علامہ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ہونے سے پہلے جناب مولوی قاری محمد ابراہیم صاحب مرحوم سے قراءت سبعہ کی تعلیم پائی تھی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قراءت حفص رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر "المفید فی التجوید" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ قاری صاحب نے مولانا کو قراءت کی سند دیتے ہوئے اس میں اس رسالہ کا بھی ذکر فرمایا ہے مضمون سند یہ ہے:

"میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بلدۂ حیدرآباد میں مجھ سے صدہا اشخاص نے قراءت سبعہ پڑھی مگر وہ پہلی ہی منزل میں رہ گئے لیکن خدا نے ان کو اس فن شریف میں کامیاب فرمایا قراءت سبعہ کی تحصیل کے بعد اردو زبان میں ایک رسالہ القول المفید فی التجوید لکھا جب میں نے اس رسالہ پر نظر ڈالی تو اس کو کتاب جزری کا ملخص پایا اور مولانا سے کہا کہ ضرور اس کو طبع کرائیے کم استعداد بچوں کے لئے بحد مفید ثابت ہوگا" قراءت عشرہ پر بھی ایک رسالہ لکھنا شروع فرمایا تھا جس میں حسب ذیل فصول لکھی ہیں۔

فصل اول۔ روایت قالون میں فصل دوم روایت ورش میں فصل سوم روایت امام ابن کثیر میں فصل چہارم قواعد امام ابو عمرو بصری میں فصل پنجم ابن عامر شامی کے بیان میں فصل ششم روایت امام عاصم کوفی کے بیان میں فصل ہفتم۔ روایت امام حمزہ کوفی کے بیان میں فصل ہشتم روایت قواعد قراءت امام کسائی کے بیان میں لکھی آٹھویں فصل ناتمام ہے باقی دو قراءتوں کے بیان کی تکمیل کردی جائے تو اردو زبان میں قراءت عشرہ کا ایک اچھا مختصر رسالہ ہو جائیگا۔ یہ رسالہ (۲۹) صفحوں پر ختم ہوا ہے۔

اصول فقہ و فقہ

مولانا اصول فقہ کے ایک زبردست عالم تھے اور اکثر فرماتے کہ ادبیات میں علم نحو اور دینیات میں اصول فقہ بڑے گہرے فن ہیں۔ اس فن میں علامہ ابن حاجب رحمہ اللہ اور امام غزالی رحمہ اللہ کی بڑی تعریف فرماتے۔ خود آپ نے بھی ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور چند ابواب بھی تحریر فرمائے تھے۔ اس وقت جتنی بھی تحریر موجود ہے اس میں وجوہ نظم کی چار اقسام سے دو قسموں یعنی خاص و عام پر کافی بحث موجود ہے۔ یہ تحریر عربی زبان میں (۱۰۷) صفحات پر لکھی گئی ہے افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے مولانا کا جام حیات لبریز ہو چکا تھا ورنہ اس فن شریف میں یہ کتاب مولانا سے ایک بڑی اور بہترین یادگار رہتی۔

ایک اور مختصر رسالہ "القول المختصر فی رکعت الفجر" بزبان اردو فقہ میں لکھا ہے جس میں بعد اقامت سنت فجر کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، اور علماء محدثین اور فقہاء مجتہدین کے اقوال اور احادیث شریفہ کے حوالے ہیں یہ رسالہ (۲۲) صفحات پر ختم ہوا ہے۔

"قراۃ الفاتحہ خلف الامام" کے عنوان پر ایک رسالہ توضیح المرام تحریر فرمایا ہے جس میں فقہی اصول پر بحث کی گئی ہے یہ رسالہ مولانا کے قلم سے (۴۲) صفحوں پر ختم ہوا ہے جو ماہ شوال ۱۳۲۹ھ ہجری میں لکھا گیا ہے۔

نیز ایک رسالہ بنام رسالہ دعا فقہی انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

علم الکلام

علامہ مرحوم نے علم الکلام کے مطالعہ اور اس کی تعلیم و تدریس میں عمر کا ایک حصہ صرف کیا ہے۔ علم کلام کی متداول کتب شرح مواقف شرح مقاصد شرح تجرید علامہ قوشجی وغیرہ جس وقت آپ پڑھانے بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خود مصنف اپنا کلام آپ سمجھا رہے ہیں۔ آپ کا بیان صاف اور سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ آپ کے علم کلام کا تبحر آپ کی مولفہ کتاب "القول الاظہر فی شرح الفقہ الاکبر" سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقہ اکبر حضرت امام اعظم کی تالیف ہے مولانا نے اس کی فاضلانہ شرح عربی زبان میں فرمائی ہے یہ شرح (۲۱۷) صفحات پر ختم ہوئی ہے

اسی فن میں ایک اور کتاب "تقریر الفوائد فی تحریر العقائد" تالیف فرمائی ہے یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے۔ اس کتاب کے (۲۳۲) صفحات میری نظر سے گزرے جن میں

امور عامہ اور الٰہیات کے مسائل درج ہیں مولانائے مرحوم کے تلمیذ رشید مولوی سید احمد صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ اسکے (٢٣٢) صفحات مبتیضہ کئے ہوئے ہیں تبییض طلب حصّہ اس سے کہیں زیادہ باقی ہے۔ غالباً یہ حصّہ اور تبییض طلب حصّہ مل کر ایک کامل کتاب ہوگی۔ اس کتاب کے متعدد مقامات میں نے دیکھے ہر مسئلہ کو سلیس عبارت میں بیان فرمایا ہے جہاں مولانا کی تحقیق علمائے فن کی آرا سے مخالف ہوتی ہے ان پر نقض یا منع جیسی صورت ہو پیش فرماتے ہیں۔ دلیل گزاری کا انداز وہی ہے جو علمائے متقدمین کا تھا۔
ایک اور رسالہ عقائد کے نام سے جماعت مولوی و جماعت عالم کے افادہ کی غرض سے تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے مسائل نہایت سہل اور آسان طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ (٩٠) صفحات پر ختم ہوا ہے اور اس میں الٰہیات اور مسائل رسالت و نبوّت اور دیگر عقائد اسلامی کا ذکر ہے زیادہ تر براہین نقلیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس رسالہ سے کالج کے شعبہ دینیات کے طلبہ مستفید ہو سکتے ہیں اور ایک رسالہ بنام "رسالہ معراج" تحریر فرمایا جس میں موافق اصول اہل سنت کے مسئلہ معراج پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور معراج جسمانی کا ثبوت دیا ہے اس کے علاوہ اس فن میں حسب ذیل کتب عقائد و روایات مہدویہ سے متعلق تحریر فرمائی ہیں جن میں منقولات شرعیہ پر بحث کی گئی ہے اور جن کے منجملہ ایک "تنویر الہدایہ" ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی اور ١٥٩ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ دوسری کتاب الواح الذہب ہے جو کتاب معدن الادب مولفہ حضرت مجتہد المہدویہ علیہ الرحمۃ کی شرح ہے یہ شرح ١٥٠ صفحوں پر ختم ہوئی ہے اس کی تاریخ اختتام ٢٦ ذیقعدہ سنہ ١٣٤٢ھ ہے۔ تیسری "العقائد" حصّہ سوم و چہارم ہے۔ یہ دونوں حصّے ١٢٢ صفحوں پر ختم ہوئے ہیں۔ چوتھی الدیانۃ فی بیان الامانۃ ہے جو ٢٤ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ اس تالیف کی تاریخ اختتام غرہ محرم سنہ ١٣٤٠ھ ہے پانچویں "ایضاحات" ہے یہ تالیف ٢ صفحوں پر ختم ہوئی ہے سنہ ١٣٤٢ھ میں اس کا مسودہ لکھا گیا اور ١٥ رجب سنہ ١٣٤٣ھ میں اس کی تبییض ہوئی اس کے علاوہ ایک اور معرکۃ الآرا رسالہ اصلاح الظنون فی جواب ابن خلدون ہے۔ اس رسالہ میں مولانا نے ابن خلدون کے ان شکوک وظنون کو دفع فرمایا ہے جو علامہ مذکور نے

روات احادیث متعلق مسئلہ مہدیؑ میں ذکر کئے ہیں اس رسالہ کا تعلق نہ صرف مہدویہ سے ہے بلکہ دنیا کے ان تمام مسلمانوں سے ہے جو بھی مہدیؑ کو ضروری سمجھتے ہیں اس رسالہ کی تاریخ اختتام ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ بروز چہارشنبہ ہے پتلے اوراق پر لکھا ہوا ہے جو بہت بوسیدہ ہوگئے ہیں ایک اور رسالہ بنام "ایصال ثواب" عام مسلمانوں کے افادہ کی غرض سے مولانا سید جلال الدین توفیق کی استدعا پر تالیف فرمایا جس میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ سے صحت ایصال ثواب پر استدلال کیا گیا ہے اس رسالہ کی تاریخ اختتام معلوم نہ ہوسکی البتہ اوراق کی کہنگی اور بوسیدگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو لکھے ہوئے ۱۵-یا ۲۰-سال ہوئے ہونگے۔ "الہدیؑ" ایک رسالہ ہے جس میں وہ احادیث شریفہ ہیں جن کا تعلق بھی مہدیؑ سے ہے۔ یہ رسالہ فہرست کی شکل میں ہے بظاہر غیر مکمل معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور رسالہ بنام "الشہادۃ" (۴۸) صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ ایک اور معرکۃ الآرا شرح "بنام انوارِ رحمانی شرح مکتوب ملتانی" لکھی ہے مکتوب ملتانی قبلۂ اربابِ یقین قدوۃ اصحاب تمکین حضرت بندگی صدیق خوندمیر صدیق ولایت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تالیف منیف ہے جس کو حضرت ممدوح نے تبلیغ مذہب کے لئے ملتان روانہ کیا تھا اس کے علاوہ اور بھی مذہبی کتب مثلاً جلاء العینین فی تسویۃ السیدین تبیین الہدایہ قول الاتم وغیرہ ہیں جو تخمیناً دس سے زیادہ ہیں۔

تصوف: تصوف علامہ مرحوم کا خاندانی فن ہے اس فن کی تعلیم آپ نے اپنے برادر معظم مولانا سید محمود رحمۃ اللہ سے پائی تھی علم تصوف میں آپ کے معلومات نہایت وسیع تھے۔ اس کا اندازہ آپ کی مولفہ کتاب "لوامع المشرقہ" سے ہوسکتا ہے یہ کتاب حضرت محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ کے رسالہ وحدتِ مطلقہ کی شرح ہے ماہ صفر ۱۳۲۹ھ میں اس تالیف کو ختم فرمایا تھا اس کا حجم (۱۹۴) صفحوں کا ہے۔ ایک اور رسالہ بنام "بیان الحقائق" اپنے فرزند رشید مولوی سید علی مرحوم کی یادداشت کے لئے تحریر فرمایا تھا جس میں تصوف کے ضروری مسائل درج ہیں اس رسالہ کی تاریخ آغاز ۱۰ شعبان ۱۳۳۲ھ روز دوشنبہ ہے۔ اس رسالہ کا ماخذ زیادہ تر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تحریرات ہیں اور جا بجا متکلمین کے مذہب کا ذکر کیا گیا ہے۔ فلاسفہ کے خیالات اور ان کی آراء پر بحث کی گئی ہے اس رسالہ کی

تحریر ۹۶ صفحات تک پہونچی ہے اور وہ نامکمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی تجلی مرحوم کے انتقال کے بعد اس کا سلسلۂ تحریر حضرت علامہ نے جاری نہ رکھا جس قدر بھی اس وقت تک ضبطِ قلم ہوچکا ہے ایک حد تک کافی ہے اسمار و صفات باری پر اچھی طرح بحث کی گئی ہے۔

اصولِ حدیث اصول حدیث کی مشق برسوں رہی۔ حدیث کا درس جاری رہا کرتا تھا اس کے ساتھ ساتھ آپ اصولِ حدیث کی طرف رہنمائی فرماتے جاتے تھے۔ اس فن میں کوئی خاص کتاب یادگار نہیں ہے لیکن تنویر الدرایۃ فی شرح اصول الروایۃ مولانا کی تالیف ہے جس کا مقدمہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ علامۃ العصر مولانا سید نصرت علیہ الرحمہ کی مولفہ کتاب اصول الروایۃ کی شرح لکھی ہے اصول الروایۃ کا ماخذ اصول حدیث ہی ہے علامہ سید نصرت رحمہ اللہ کو اس امر میں اولیت حاصل ہے۔ کہ روایات مہدویہ کو اصول حدیث پر منطبق کرکے اس کو ایک فن کی حیثیت عطا فرمائی اس کتاب کے دیکھنے سے علامہ ممدوح کے اصولی زبردست معلومات کا پتہ چلتا ہے طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

علم العروض مولانا جس وقت مدرسہ دارالعلوم میں مدرس تھے ناچیز کی درخواست پر اردو زبان میں علم العروض پر ایک رسالہ لکھا دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کی تالیف کے وقت علم العروض کی تمام متداولہ کتابیں مولانا کے پیش نظر تھیں اس رسالہ کے آخر کی عبارت اس کے ناتمام رہ جانے پر دلالت کرتی ہے۔

نجوم و رمل نجوم و رمل کی تعلیم مولانا نے حضرت مولانا سید مصطفی صاحب مشائخ مہدویہ سے پائی تھی اس فن میں ایک رسالہ بنام رسالۂ نجوم تحریر فرمایا جس کا پتہ فہرست مندرجہ تنویر الہدایہ سے چلتا ہے۔ لیکن یہ رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا نجوم میں آپ کو ایسی مہارت تھی کہ زائچہ باسانی نکال لیتے تھے۔

خوش نویسی علماء عموماً بہت کم خوشنویس ہوتے ہیں لیکن مولانا باوجود عالم متبحر ہونے کے اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے مولانا کی قلمی کتابیں ہمارے بیان کی شاہد عادل ہیں۔

قیافہ شناسی علم قیافہ میں بڑی مہارت حاصل تھی قیافہ سے جب کسی کے متعلق حکم لگاتے تو تجربہ کے بعد صحیح نکلتا ۔ ایک طالب علم مولانا کے پاس آیا آپ نے قیافہ دیکھکر فرمایا کہ یہ تیز طبیعت سبک خیال ہے ۔ اس کی طبیعت میں استقلال نہیں ہے چند روز تعلیم پانے کے بعد چھوڑ دیگا ۔ چنانچہ آپ نے اس کو نہیں پڑھایا بلکہ میرے پاس روانہ فرمایا میں نے ایک عرصہ تک تعلیم دی جتنی باتیں مولانا نے فرمائی تھیں صحیح نکلیں ۔

انشاء ایک مکتوب بنام "مکتوب دلپذیر" اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے جس میں تفاسیر متداولہ کا تذکرہ اور ان پر مختصر تبصرہ فرماتے ہوئے ضرورتِ تفسیر پر کافی بحث فرمائی ہے ۔ اور بتایا ہے کہ مفسر کو کن کن علوم میں مہارت کی ضرورت ہے یہ مکتوب (۲۲) صفحات پر ختم ہوا ہے ۔ تاریخ مکتوب ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت علامہ مرحوم نے سورہ فاتحہ و پارہ عم کی تفسیر ختم کر کے سورۂ بقرہ کی تفسیر لکھنا شروع فرمایا تھا ۔

"لوامع البیان" مولانائے مرحوم کی ایک بیش بہا تالیف ہے یعنی قرآن شریف کی تفسیر عربی زبان میں ہے مولانا نے اس میں حسب ذیل امور پیش نظر رکھے ہیں:-

(۱) اول یہ کہ تفسیر اصولِ اہل سنت کے مطابق ہو ۔

(۲) دوم یہ کہ ان مقامات میں تاویل نہ ہو جہاں فلسفہ کو قرآن مجید کے مضامین سے مخالفت ہے ۔

(۳) سوم یہ کہ اصول فقہ کی پابندی نہ چھوٹے یعنی

(الف) مجمل آیتوں کی تفسیر کے وقت حدیث کی طرف رجوع کرے اور رواۃ میں غور کرے ۔

(ب) آیاتِ متشابہ کو حق جانے ان کی معانی میں چوں و چرا نہ کرے ۔

(ج) مجازی تفسیر اس وقت کرے جب کہ قرینہ موجود ہو ۔ قرینہ موجود نہ ہو تو تفسیر کرنے میں احتیاط سے کام لے ۔

(د) حقیقی معنی جہاں متروک یا دشوار ہو تے ہیں تو مجبوراً مجازی معنی کرنا پڑتا ہے پس اس

صورت میں معنی متروک یا دشوار میں بے انتہا غور کرے۔

(۸) مطلق کی تفسیر بحالت اطلاق رکھ کر کرے۔ اور وہی آیت کہیں قرآن شریف میں مقید ہو کر مذکور ہوئی ہے تو اس کو مقید سمجھے لیکن مولانا اپنی تفسیر میں جس معنی میں عزیمت معلوم ہوتی ہے اسی کو لیتے ہیں اور اکثر جگہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب میں عزیمت سمجھتے ہیں۔

(۹) کسی آیت میں حکم صریح ہو اور اس کے الفاظ حقیقی و لغوی معنی میں مستعمل ہوں یا مجازی معنی میں تو مفسر کمی یا زیادتی تبدیل و تاویل نہ کرے۔

(ز) کسی آیت میں حکم صریح نہو۔ اور کنایہ یا اشارہ کسی خاص حکم پر دلالت کرتا ہے تو اس حکم کے بیان کرنے میں کسی مجتہد کی پیروی کرے۔

(ح) اخبار گذشتہ کی تفسیر میں معتبر تواریخ کا قدر مشترک بیان کرے۔ اخبار آئندہ میں چونکہ انسان کی حق طلبی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے الفاظ لغوی معانی پر دلالت نہیں کرتے۔ بلکہ مجاز و استعارہ یا کنایہ کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے لہذا ان کی تفسیر میں بہت احتیاط سے کام لے۔

مولانا ان اصول کی پابندی کرتے ہوئے جا بجا اپنی تفسیر میں علماء اسلاف کے اقوال و آرا نقل فرماتے ہیں کسی کا سوق دلیل کمزور پاتے ہیں تو اس پر نہایت آزادی سے بحث فرماتے ہیں چنانچہ آیۃ: حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنوا اسرائیل و انا من المسلمین الآن و قد عصیت قبل وکنت من المفسدین ۵ کے تحت علما نے توبہ فرعون کے مقبول ہونے یا مقبول نہ ہونے پر بحث کی ہے۔ جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ فرعون کی توبہ مقبول نہیں ہے اس کے متعلق انہوں نے عدم قبولیت توبہ کے متعلق جو وجوہ بیان کئے ہیں مولانا انکو تفصیل سے لکھتے ہیں۔ جو وجہ قوی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق لکھدیتے ہیں کہ یہ وجہ قوی ہے۔ اور جو وجہ ضعیف ہوتی ہے اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کی وجہ ضعف ظاہر فرمادیتے ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :-

واختلف في ايمانه هل هو مقبول
ام لا فقال جمهور العلماء انه غير
مقبول بوجوه الاول انه لم يقل
ذالك الا بعد معاينة العذاب
وهو الغرق وذالك لقوله تعالى
فلم يك ينفعهم ايمانهم لما
رأوا باسنا واذا كان
كذالك فكيف يقبل ايمانه وهذا
هو الوجه القوى ۔

فرعون کے ایمان میں اختلاف کیا گیا ہے۔
کہ آیا وہ مقبول ہے یا نہیں جمہور علماء نے
کہا ہے کہ وہ غیر مقبول ہے کئی وجہوں سے
پہلی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا مگر
عذاب کے معائنہ کے بعد اور وہ عذاب غرق تھا
اور یہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
ان کا ایمان ان کے حق میں نفع بخش نہوا
جب کہ دیکھا انہوں نے ہمارے عذاب کو
اور جب ایسا ہے تو اس کا ایمان کسطرح مقبول ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں یہ وہ وجہ ہے جو قوی ہے۔

والثاني انه لم يؤمن حقيقة لكنه
قال هذا القول لينجو عن الغرق
اقول وهذا الوجه باطل لان
كلماته تدل على انه امن ثلاث
مرات كما يدل عليه
قوله امنت وقوله لا اله الا
الذي امنت به بنوا اسرائيل
وقوله انا من المسلمين الآن
ولا يعقل من هذه الاقوال
الا كونه مومناً ولا يُعقَلُ منها
انه قال للنجاة عن الغرق ولا يدل عليه
الاية لا صراحته ولا كناية

الثالث ان ذالك الاقرار

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت ایمان نہ لایا
صرف غرق سے نجات پانے کے لئے آمنت الخ
کے الفاظ کہدئے مولانائے مرحوم فرماتے ہیں۔
میری رائے میں یہ وجہ باطل ہے۔ کیونکہ اس
کے کلمات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس
نے تین بار ایمان کے کلمات کہے چنانچہ پہلے
آمنت کہا اس کے بعد لا الہ الا الذی آمنت
بہ بنوا اسرائیل کہا اس کے بعد انا من المسلمین
کا اعتراف کیا اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ
مومن تھا۔ اور کبھی یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اس نے
غرق سے نجات پانے کے لئے کہا تھا نہ صراحۃً
اس کا پتہ چلتا ہے نہ کنایۃً۔
تیسری وجہ یہ ہے کہ فرعون کا اقرار بطور تحقیق

ما كان على وجه التحقيق بل كان
على محض التقليد
فلذلك لم يقبل اقول ان
هذا الوجه باطل لانه كان
امن بالله واقر بوحدانيته
بعد ما رأى من موسى ع
آيات شتى باهرة دالة
على نبوة موسى عليه السلام
وخفية ما دعا اليه وبعد
مشاهدة هذه الآيات
العظيمة والمعجزات الفخيمة
كيف يكون ايمانه لا على وجه
التحقيق لاسيما حين كان
يدرك الغرق۔

کے نہ تھا بلکہ محض تقلید کے طور پر تھا
اس لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ مولانا فرماتے
ہیں یہ وجہ بھی باطل ہے کیونکہ فرعون
نے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت
کرنے والے متعدد معجزات باہرہ
دیکھنے کے بعد یہ کلمات کہے تھے خصوصاً
وہ اس معجزہ کو بھی دیکھ رہا تھا جو اس کے غرق
سے متعلق تھا پھر اس کا ایمان لا علی وجہ
التحقیق کس طرح ہو سکتا ہے؟

الرابع ما قال الامام الرازي
اني رأيت في بعض الكتب ان
بعض اقول من بني اسرائيل
لما جاوزوا البحر اشتغلوا
بعبادة العجل فلما قال فرعون
امنت انه لا اله الا الذي
امنت به بنوا اسرائيل
انصرف ذالك الى العجل
الذي امنت به بنوا اسرائيل

چوتھی وجہ وہ ہے جو امام رازی علیہ الرحمہ نے
فرمائی ہے کہ میں نے ایک کتاب میں یہ
دیکھا ہے کہ بنی اسرائیل جب دریا کے
پار ہو گئے تو پھر گوسالہ پرستی میں مشغول ہو گئے
فرعون نے جب امنت لا الہ الا الذی
امنت بہ بنوا اسرائیل کہا تو
اس کا یہ کہنا گوسالہ پرستی کی طرف
عود کرتا
ہے

فکانت ھذہ الکلمۃ فی حقہ سببا لزیادۃ الکفر۱ قولہ من ھذا الامام الاعلم کیف ذکر ھذا الوجہ فی سلسلۃ الوجوہ لان عبادۃ العجل لم تصدر من بنی اسرائیل الا بعد عبورھم عن البحر وغرق فرعون فکیف یمکن ان یقال ان فرعون ارادہ بایمانہ باللہ تعالی الایمان بالعجل۔

اور یہ اس کے حق میں زیادتی کفر کا سبب ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں تعجب ہے کہ امام رازی جیسے زبردست عالم نے اس وجہ کا سلسلہ وجوہ میں کس لئے ذکر فرمایا؟ کیونکہ جس کتاب کو امام رازی نے معائنہ فرمایا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھر گوسالہ پرستی بنو اسرائیل میں ان کے دریا کے عبور کر جانے اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد آغاز ہوئی تھی پھر کس طرح ممکن ہے کہ فرعون کے اس قول کو اس کے ڈوب جانے کے بعد کے واقعہ سے متعلق کیا جائے؟

ان وجوہ کے سلسلہ میں اور تین وجہوں کو بیان کر کے مولانا نے ان کی تردید فرمائی ہے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان وجوہ کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے لیکن اقوی وجہ وہی ہے جس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ اس کے بعد شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا قول نقل فرمایا ہے وہ فرعون کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ غرق سے پہلے ثبات عقل و حواس کے ساتھ اقرار توحید کیا ہے شیخ اکبر علیہ الرحمتہ کے قول کو ضعیف ٹھہراتے ہوئے مفسرین کے اس قول کو نقل کیا ہے جو فرعون کے منہ کو اقرار ایمان نکرنیکی غرض سے جبرئیل علیہ السلام نے مٹی سے بھر دیا تھا۔ اس کے بعد امام رازی کی ان چار وجہوں کو نقل کیا ہے۔ جو قول مذکور کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں پھر اس اعتراض کو نقل کیا ہے جو صاحب تفسیر لباب نے امام رازی کے بیان کردہ دلایل پر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

واعترض علیہ صاحب اللباب وقال ان الحدیث الذی ذکر فیہ ان جبرئیل ملاءم فم فرعون

مولانا فرماتے صاحب لباب نے امام پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حدیث جس میں یہ مذکور ہے کہ جبرئیل نے

بالطين لئلا يتوب حديث صحيح ثبت من النبي صلى الله عليه وسلم

فرعون کے منہ کو کیچڑ سے بھر دیا تھا تاکہ توبہ نہ کر سکے، حدیث صحیح ہے۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے۔

لہٰذا اس پر کوئی اعتراض اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد مولانا نے خود صاحب لباب کی رائے پر اصولِ روایت حدیث کے مدنظر اعتراض کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اقول ان هذا القول مردود لانه لم يوثق هذا الحديث من طريق الرواية مع ان هذا الحديث قد عارضه كتاب الله لان فرعون قد تكلم وتاب وقال امنت انه لا اله الخ ان كان خبرا واحد ايجب تركه او يأول فيه على مقتضى الكتاب ليطابقه وذلك لانه قال عليه السلام ستكثر لكم الاحاديث من بعدى فاعرضوها على كتاب الله فان وافقه فاقبلوها والا فردوها وهذا الحديث لما لم يوافقه الكتاب فيجب رده كما هو فحوى قول النبي صلى الله عليه وآله وسلم والله اعلم۔

میری رائے میں صاحب لباب کا قول قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیث طریقہ روایت سے درجہ وثوق کو نہیں پہنچی حالانکہ اس کا معارضہ کتاب اللہ سے بھی ہو چکا ہے اس وجہ سے کہ فرعون نے کلام کیا اور توبہ کی اور کہا امنت انہ لا الہ الخ اگر یہ حدیث خبر واحد ہے تو قرآن کے مقابلہ میں اس کا چھوڑنا واجب ہے یا مقتضی ہے تو کتاب کے موافق اس میں تاویل کرنی ہوگی تاکہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جائے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "میرے بعد تمہارے لئے کثرت سے حدیثیں ہو جائینگی تم ان کو کتاب اللہ پر پیش کرو اگر اس کے موافق ہیں تو قبول کرو ورنہ رد کر دو۔" یہ حدیث چونکہ کتاب اللہ کے موافق نہیں ہے اس لئے اس کا رد کرنا واجب ہے چنانچہ حدیث نبوی کا منشا یہی ہے واللہ اعلم۔

یہ تفسیر چار ضخیم جلدوں میں ہے جو تقریباً (۲۰۰۰) صفحات پر ختم ہوئی ہے اور ہر صفحہ مولانا کے

قلم سے باریک خط میں لکھا ہوا ہے۔ جو معمولی خط سے لکھا جائے تو تقریباً ہر صفحے میں تین صفحے ہو نگے تنویر الہدایہ میں جو فہرست دیگئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تالیفاتِ متذکرہ کے علاوہ مولانا کی اور بھی تالیفات ہیں جن کے دیکھنے کی سعادت ابتک حاصل نہیں ہوئی ان کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

(۱) تلخیص الشفاء (۲) الاجماع (۳) حاشیۂ عقائد جلالی (۴) شرح مصباح العرفان (۵) شرح میزان العقائد (۶) شرح عقیدۂ شریفہ (۷) رسالہ اشراقات (۸) فرہنگ سفرنامہ شاہ ایران (۹) رسالہ نجوم (۱۰) ترجمہ قول المحمود (۱۱) القول السدید (۱۲) سوانح فارابی (۱۳) النساع (۱۴) رسالۂ ضرورت مہدی (۱۵) حاشیۂ کحل الجواہر (۱۶) تلخیص میبذی (۱۷) تلخیص شرح اشارات (۱۸) التنقید

کتب متذکرہ کے اسماء سے ان کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

شاعری مولانا بڑے پرگو شاعر تھے۔ آپ کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ قلمبند کرنے کیلئے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر شعراء متقدمین خاقانی، انوری، عرفی، بیدل وغیرہم اور مولانا کے دواوین اس وقت مجھے ملتے اور کافی وقت میسر ہوتا تو میں متقدمین اور مولانا کے کلام کا توازن پیش کر سکتا جس سے ناظرین پر مولانا کی بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا اندازہ ہو جاتا۔ فی الوقت میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تین ضخیم جلدیں آپ کی شاعری سے بھری پڑی ہیں۔ فارسی کلام زیادہ ہے عربی میں بھی آپ کو شعرگوئی کا خاص سلیقہ تھا اردو میں بھی شعر فرمایا کرتے تھے۔

الغرض مولانا تمام علوم متداولہ میں ماہر تھے اور علوم وفنون مثلاً نحو، منطق، فلسفہ، قراۃ، اصول فقہ، فقہ، علم الکلام، تصوف، اصولِ حدیث، علم العروض، نجوم اور علم التفسیر میں بیش بہا تصنیف و تالیف کر کے علمی دنیا پر ایسا احسان کیا ہے کہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کلامِ شمسی

استاد مرحوم علامہ شمسی جس طرح بحرِ علوم و فنون کے شناور تھے، میدان شاعری کے بھی وہ تیز رفتار شہسوار ہیں کہ بہت کم لوگ ان کی گرد کو پہنچ سکتے ہیں۔ شاعری اس عالم بے بدل کی فہرستِ کمالات میں حقیر درجہ رکھتی ہے اور خود علامۂ مرحوم نے بھی اس کو کبھی اپنے کمالات کا طرۂ امتیاز بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اس کے علی الرغم وہ اپنے اس ذوق فطری کے اظہار میں قدرے بخل سے کام لیتے تھے۔ وہ قدرتی طور پر شاعر اور بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے تھے مگر درس و تدریس کو اپنا مقصد حیات بنا کر علم کی شمع برداری میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ اس طرف خاطر خواہ متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی طبیعت کا فطری لگاؤ شعرگوئی پر مجبور کرتا رہا۔ ایک دفعہ زمانہ شباب میں نواب محسن الملک بہادر مرحوم کی زبان سے شاعری کی مذمت سنکر اپنا ضخیم دیوان جو کئی برس کی جگرکاوی کا نتیجہ تھا، کنوئیں کی نذر کردیا اور ایک عرصہ تک شعرگوئی سے مجتنب رہے۔ مگر فطرت کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہوکر پھر اس کوچے میں قدم رکھنا پڑا۔

علامہ مرحوم کا موجودہ کلام جو تین دیوانوں پر مشتمل ہے، اس کے بعد ہی کا کہا ہوا ہے۔ درس وتدریس کی روزانہ مشغولیات اس قدر زیادہ تھیں کہ انہیں بمشکل اتنا وقت مل سکتا تھا کہ فکر سخن کرسکیں، مگر طبیعت کی روانی اور برّاقی کا یہ عالم تھا کہ جب ذرا فرصت ملی یا علالت وغیرہ کی وجہ سے درس وتدریس کے کام سے کچھ نجات حاصل ہوئی تو پھر وہ شعر کہنے لگے اور ایک ایک نشست میں سینکڑوں شعر کہہ ڈالے۔

علامہ مرحوم کا کلام کم و بیش ہر صنف کے اشعار پر مشتمل ہے مگر زیادہ مقدار قصائد و غزلیات کے حصوں کی ہے۔ ان کا مسلکِ حیات، دنیاوی جاہ و ثروت اور حصولِ دولت ہرگز نہیں تھا اس لئے ہم ان کے کلام میں ارباب حکومت اور امرائے دولت کی مدح میں کچھ نہیں پاتے

تقریباً تمام قصائد حضور دو عالم صلعم کی نعت، باب العلم سیدنا حضرت علی رضؓ کی منقبت اور دوسرے بزرگان دین کی توصیف میں ہیں۔ شاعر اساتذہ سلف خاقانی، انوری اور عرفی کا ذوق سخن رکھتا ہے اور انہی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے کہتا ہے۔ قصاید کا زور بیان مضامین کی بلندی اور الفاظ کا در و بست اس شان کا ہے کہ پڑھنے والا شبہے میں پڑجاتا ہے کہ آیا یہ کلام کسی ہندی یا دکنی کا ہے؟ علامہ مرحوم کے انتقال کے چند دن بعد ہی اُن کے ایک شاگرد جناب دولت خان صاحب شترؔ نے ان کے قصاید کا ایک چھوٹا سا انتخاب شائع کیا ہے اگرچہ ذیل میں قصائد کا کچھ انتخاب دیا جاتا ہے مگر یہ مشتے نمونہ از خروارے بھی نہیں کہا جاسکتا۔

غزلیات کا حصہ بہت ہی ضخیم ہے۔ اور اگر بہ امعان نظر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایسے کثیر التعداد جواہر پارے نظر آئیں گے جو فارسی شاعری میں انمول قرار پا سکتے ہیں۔

نثر من است رازنمائے کمال عقل　　　نظم من است آئینہ دار ہنروری

ہمیں اس کا افسوس ہے کہ اپنی آرزو کے موافق استاد مرحوم کے کلام کے تنقیدی مطالعے اور انتخاب کی فرصت نہیں ملی اور اس کو کسی آیندہ فرصت کے لیئے اٹھا رکھنا پڑا۔ فی الوقت تبرکاً قصیدہ اور غزل دونوں اصناف کے چند شعر دیئے جاتے ہیں۔ غزلیں بھی وہی ہیں جو بڑے بڑے اساتذۂ غزل کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔

قصائد

(۱)
نعت

دل آئنۂ حجلۂ ناز است صنم را　　　ایں برق بلا کرد صنم خانہ حرم را

آں فتنہ کہ از عشوہ گریہائے تو آموخت　　　با غمزہ فلک دوختہ پیوند ستم را

ننگم ز دم معجز جاں بخش مسیح است　　　چشمت کہ دہد در دل من ذوق ستم را

زیں پیر کماں پشت کہ پر عشوہ خدنگ است　　　باشد کہ گرفت از خم ابروئے تو خم را

آں کم نگہی شیشۂ دل را شکست است — از سنگِ فلاخن زدہ قندیل حرم را

آشفتۂ گیسوئے خیالت نگزارد — چوں قیس ز کف حلقۂ سودائے الم را

تو جلوہ نمائی و پر در نگ زہے چشم — خورشید بسوزد نگہ دیدۂ نم را

آں نالہ کہ از پردۂ عشق تو شرر ریخت — نگذاشتہ در پردۂ دل زیر و نہ بم را

ہر زخم دل از فیض تمنائے تو دارد — در ہر گل داغش چمنستانِ ارم را

از خندہ ز لب آب بقا را بچکانی — از غمزہ گر آہیختۂ تیغ دو دم را

مستی کہ ز چشمت بدلم ریخت تجلی — با توبہ شکست است بہم ساغر جم را

این بارقۂ حسن کہ ریزد ز جبینت — آئینۂ برقیست کہ افروخت ظلم را

برقیست کہ از وادیٔ ایمن شرر انداخت — بر طور کہ مے داشت بدل خرمنِ غم را

ور تاب و تب افگند روانِ ارنی گوئے — وان سوختہ کامانِ سیہ بخت و دژم را

آن برق دگر بر سر فاراں بدرخشید — وز نور خود افروخت عرب را و عجم را

برنکہ نتابید دگر از سر فاراں — تا نور فزاید نگہِ چشم حرم را

نور عرب و مہر عجم آنکہ فروغش — رخشندہ چراغیست شبستانِ قدم را

سلطانِ رسل احمدِ مرسل کہ بہارش — پیرایہ دہد گلشنِ بطحا و حرم را

نامش کہ نوشتند بصفا خانۂ ہستی — پیش از ہمہ آراست قضا لوح و قلم را

آن شاہدِ یکتا کہ کمندِ خمِ زلفش — در رشتۂ وحدت کشد اصنافِ امم را

اورنگ نشینے کہ ز ایوانِ جلالش — تا کنگرۂ عرش نشانید خدم را

خورشید رکابیکہ فلک پیش سپاہش — در دست زر اندود سپر داد علم را

نگذاشتہ در دامنِ کہسار ز عدلش — ہر شیرِ عریں گوشۂ آغوشِ غنم را

از برّہ پس پشت اسد ترکِ فلک رفت — تا دید کمانداریِ آں ابروئے خم را

خورشید لقائیکہ بیاضِ رخِ صافش — از صفحۂ دل ریختہ سودائے ظلم را

آن صدر نشینیکہ فلک بہر قبایش — از انجمِ رخشاں زند اوتادِ خیم را

گر فکر مہندس شدہ آئینہ رایش — از ہر عدد افگند بروں جذرِ اصم را

ناقوس بت و نعرهٔ تکبیر نشنود — دیوانهٔ کو بیش چه کند دیر و حرم را

از جود وجودش که وجوبست دلائل — جزو همه نه شد آئینه اطلاق اعم را

چون ابر که بارید گهر در مه نیسان — موج نفسش ریخته دریائے قدم را

آئینهٔ امکان شود ار پرتو رایش — هر ذره بسر سنگ زند ساغر جم را

گر چله کشاید نگهش شوق رمیدن — پیکان شکند پائے غزالان ارم را

شاهے که سر پایش بسر عرش برین است — بگرفت ملک بر در او جائے خدم را

خواهم که نگه را بسرا پرده گزارم — چون در دل و در جان زند اوتاد خیم را

آن بحر نوالیکه در آتشکدهٔ حشر — جودش سپے هر تشنه دهد قلزم و یم را

شمسی بدل از یاد رخ لمعه فشانش — در بتکده افروخته قندیل حرم را

شاها ملکا! جز تو ضمانذار کسے نیست — در داوری روز جزا جمله امم را

از مطلع اعجاز تو مهر یکه درخشید — شمع سحری ساخت نوامیس حکم را

این تفته شراریکه ز داغ جگر افروخت — چون موجهٔ آئینه کند موجهٔ یم را

زان لب که بجوشید از و کوثر و تسنیم — زان دم که از و جوشش بهار است ارم را

یک نغمه کرامت کن و یک رشحه بیفشان — این جان و دل افسرده و این سوخته دم را

چشم کرمے هم بسگ کوئے خود افگن
زان لطف که بنواخته ارباب کرم را

(۲)

نعت

حسن جو یا نیکه در اشباح امکان دیده اند — جلوهٔ هر ذره را آئینه سامان دیده اند

موج عرفانیکه جوشد از فروغستان قدس — قطره را آئینه دار بحر عمان دیده اند

زان نسیم روح افزائیکه از مینو وزید — غنچهٔ دل حیرت چندین گلستان دیده اند

دیده کو که به بیند جلوه هائے ماه و مهر — وان دلے کو کاندرونش پرتوستان دیده اند

چون نمی باشند به بزم آن دیده هائے حسن بین — هم تحیر پرده دار روئے جانان دیده اند

گرچہ چون آئینہ باشد دیدۂ حیرت فزا
لیک چون نرگس نہ چیزے در گلستان دیدہ اند

میحرۂ صد عشوہ امارنگ رعنائی محبت
صد نیاز اینجا برنگ ناز پنہان دیدہ اند

می تپیم از کوری خفاش چشمان درون
صورت آہنگان دل را کعبۂ جان دیدہ اند

یاوہا را ازہائے نغز خود پنداشتند
تُرّہات ہرزہ را طامات اخوان دیدہ اند

سیر اقلیم قدم دانند این کوران شوم
گر ہوس را کوچہ گرد ملک امکان دیدہ اند

پند دانا بہتر از چاویدن گنجشک نیست
خویشتن را عندلیب باغ رضوان دیدہ اند

لخت لخت دل اگر چشم فشاند دور نیست
بر دلم از روزگار آجیدہ سوہان دیدہ اند

ہمت پاکان عنان از دیدہ است از کاروان
راہِ دل در حلقۂ زلف پریشان دیدہ اند

سینہ کاہیدند و داغ درد را کم یافتند
پارۂ سنگ سیہ در زیر پیکان دیدہ اند

دل تبا بستان درد من کہ می سوزد ہنوز
اخگر ہر نالہ بر انبار دہگان دیدہ اند

بہرمان افشرد زخم دل درون چشم من
در صدف جائے گہر صد شاخ مرجان دیدہ اند

درد یاران را کہ افروزد دل غمخوار من
اخگرے را در میان جاش پنہان دیدہ اند

دل نہان دارد ۔ ارم در کنج داغ آرزو
اندرین زندان گلستان در گلستان دیدہ اند

دل بکالائے گران ارجم ہزاران ناز داشت
پردہ چون برداشتند آشفتہ سامان دیدہ اند

سینہ آذر صفت بے طلعت یوسف وشان
چون دل یعقوب محزون بیت احزان دیدہ اند

شد نہان نظارہ بازیہائے مشتاقان مست
کاندرو خیل پری را عشوہ سامان دیدہ اند

لیکن آن پاکان کہ چشم جان بمعنی دوختند
جلوہ کونین در آئینۂ جان دیدہ اند

سرمہ از خاک دری در چشم دل افشاندہ اند
انچہ بر طور است بر بالائے فاران دیدہ اند

دیدگانے کز ازل دارند نور معرفت
گوشۂ غار حرا را خاورستان دیدہ اند

گاہ در اقصاش بشنیدند آواز ملک
گہ گاہ بر بالاش سالار سروشان دیدہ اند

گاہ شاہ نوریان با فرزمان کردگار
ہمزبان با خسرو اقلیم امکان دیدہ اند

بوسہ گاہ روحیان و سجدہ گاہ نوریان
احمد مرسل کہ جان نور یزدان دیدہ اند

عتبۂ سالار کونین است یا عرش برین
بر درش بہنام فرخ زاد دربان دیدہ اند

معجزش تا رنگ صورت بست در کون و مکان　　یک ہیولے را بہر شکلے نمایان دیدہ اند
جلوہ ریزان موکب سلطان حسن آمد ببیں　　ہمرہش فرخ سروشان را شتابان دیدہ اند
بر فراز دل بیا کین ہست اوج واقصہ　　محرمان عشق زینجا کعبہ جان دیدہ اند
کعبۂ جان و زیارت گاہ پاکانِ قدیم　　آستانش را کہ زیر چرخ گردان دیدہ اند
بر فراز عالم دل رو کہ بینی رفعتش　　بے رصد کہ چرخ گردان را پرنشان دیدہ اند
مطلعے گویم بہ نعت آن فروغ چشم قدس　　آنکہ در ہر منزلش صد مہر رخشان دیدہ اند

کوکب ذات تو تا در دہر تابان دیدہ اند　　ذرہ را آئینہ انوار یزدان دیدہ اند
باغ امکان راست رونق از رخ گلرنگ تو　　از گلے آرایش چندین گلستان دیدہ اند
راز تو تا بست در حرف تو رنگ انعقاد　　عقل کل را در تماشائیش حیران دیدہ اند
شوق ہمرنگی سرشت آخشیجان را نبود　　الفت را ارتباط چار ارکان دیدہ اند
سہم تو گر پنجۂ نیرو کشا اندر نبرد　　شیر قالین بہتر از شیر نیستان دیدہ اند
خلق تو نسرین فروش حلہ ہائے دوستان　　قہرت آتش جوش از خفقان خصمان دیدہ اند
چشم راحت تکیہ گاہ دہر شد از عدل تو　　فتنہ ہمخواب عدم بر طاق نسیان دیدہ اند
خوبی رائے نو آرایش دہ ملک دلست　　رونق بند تو نظمِ کشور جان دیدہ اند
منطقت را رود بار آب کوثر یافتند　　پنجہ ات را جوئبارِ بحر عمان دیدہ اند
از شمیم نفحۂ خلق تو از بدوِ ازل　　مایۂ آرائش گلزار رضوان دیدہ اند
مصحف حکم تو تا شد قہرمانِ ملک و دیں　　شرع را از نیروے رائے تو فرقان دیدہ اند
با لب پاکت دم عیسے مگر ہمراز بود　　تا بحرفش جوئبار آب حیوان دیدہ اند
گر ز فیضان تو گلشن گشت بزمِ خاکیاں　　ہم ز جامت رونق بزم سروشان دیدہ اند
شد چو نور وحدتت آئینہ تمثال دار　　جلوہ چندیں صور در بزم امکان دیدہ اند
یک نگہ بر بندۂ شمسی فگن از مہر خویش　　کین رہے را ذرۂ آن مہر تابان دیدہ اند
بندہ ام بشمار و لطفے چو خداوندان بکن　　فر و تاب بندگان از فر شاہان دیدہ اند
نے غلط گفتم کہ اندر شارسان بخردی　　فر و تاب شاہی از فر تو شاقان دیدہ اند

سرمه از خاک درت خواهم که می بینم ترا
ورنه بر رویت مرا موسیٰ عمران دیده اند

چنبر گردون که بر دم دست و پایم بسته است
پیکرم را حلقهٔ زنجیر مطران دیده اند

در بلاغت سنجی رنگین نواهائے خیال
بر دل من پرتو نظام شروان دیده اند

مریم آسا صد مسیح آورد از عذرائے فکر
در دل او پرتو فرنوش رخشان دیده اند

من کجا و آن حقایق سنجی معنیٰ کجا
تابش این نظم از ان خورشید تابان دیده اند

گر بخود بالم مرا بالیدن من می سزد
چون ستایش خوان آن دستور یزدان دیده اند

دانش شمسی نه بگزارد بروز رستخیز
کاندران پیچیده صد مینوئے رضوان دیده اند

(۳)
منقبت

بلبل ز شوق روئے بتان سمن بری
بنگر بخویش بین که همان جلوه بنگری

در دام آهوان ختن پیچ و تاب هست
وز آب رنگ لاله رخان داغ پروری

بنگر که در کمند ترا گلرخان ناز
پنهان همی کشند اگر نیک بنگری

در ذوق یاد لعل لبان سمن عذار
تا کے بسینه معدن یاقوت پروری

تا کے در آرزوئے بتان سجده ریز بت
مثل کشیش دیر در آهنگ تنگبری

بر روئے ساقیان گل اندام و گلعذار
مشتاق جرعه نوشی مینائے احمری

تا کے جگر فگار بیت از عشوه هائے ناز
تا کے جنون خیالیت از دیده پری

از جوش وحشتیکه بصحرا کشند دلت
طاؤس وار از چمن قدس می پری

تا چند در کمینگه شوق جگر فگار
جان باز دلبران بادا هائے کافری

تا چند حیله هائے فریب سمن زنان
تا چند عذر حلقهٔ گیسوئے عنبری

اے دل فریب دیدهٔ فتان مخور که خود
موسائی ار رمی ز طلسمات سامری

زنهار در صنمکده ظاهری مرو
معنیٰ طلب که جلوهٔ او لا بنگری

آئینه ات بعالم رنگ است پر غبار
باشد سحاب تیره بخورشید خاوری

زنگے ز روئے آئینهٔ خویش بر فشان
وز دیده نیز پردهٔ صورت بدر بری

زین نکتہ جوش موجِ خون است در دلم — دل ہست یا کہ معدن کبریت احمری

سیماب وار می تپم از آتشین رخان — بال خس است مدعی شعلہ پروری

إِنْ كَانَ ذَابَ قَلْبُ عَمِيدٍ بِلَوْعَةٍ — إِنْ سَالَ دَمْعَهُ بِدَمِ الْمَاقِ أَحْمَرِ

تَاللّٰهِ لَا يَلِينُ بِهِ قَلْبُ جَلْمَدٍ — لَوْ صَبَّتِ السَّمَاءُ شَآبِيبَ هَامِرِ

صد لالہ زار این دل پرخون نشاندہ است — ہر داغ را سزد دم یاقوت پروری

من پاسبان باب علوم زمن مپرس — رازیکہ یافتم ز رموز پیمبری

ق

این بادسنجی کہ بنظم فرو چکد — دین ہرزہ جوشی کہ لبم ریخت سرسری

زیبد بذرہ گر بزند جوشش آفتاب — زانجا کہ نسبتی است گہی را بمہتری

بر آستان منقبت مصر حکمتم — شکر فشان چو طوطیم اندر نواگری

پیش گزیدہ کہ بہ تعظیم عتبہ اش — پیوستہ پشت خم شدہ افلاک اخضری

سلطان دین علی کہ بتاج ولایتش — پیداست جلوہ ہائے فروغ پیمبری

نور احد جلال خدا ضوء سرمدی — سر نقا ضمیر ہدیٰ فرّ داوری

رَاسُ الْهُدٰى اَسْرِيُّ اُولِي الْفَضْلِ وَالتُّقٰى — كَهْفُ الْوَرٰى اِمَامُ جَمِيعِ الْاَكَابِرِ

اِصْلِيَتُهُ بِجُودٍ نُسُورًا اَقْشَاعِمًا — اَرْمَاحُهُ تُضِيفُ بُطُونَ الْمَقَابِرِ

حَازَ الْمَلِيكُ فَوْقَ سَمَاءٍ بِفَارِسٍ — اِذْ فَرَّقَ الْفَيَالِقَ بَيْنَ الْعَسَاكِرِ

كَالنُّورِ لِلْاَحِبَّةِ لٰكِنَّ لِلْعِدٰى — حَدُّ السُّيُوفِ طَرْفُ رِمَاحٍ شَوَاجِرِ

اَعْطَى الرَّسُولُ رَايَةَ فَتْحٍ غَضَنْفَرًا — رَاسُ الْمُدَجَّجِينَ حِمَامُ الْعَسَاكِرِ

بَيْنَ الْوَرٰى هُمَامُ شُعُوبٍ اَكَارِمٍ — فِي الْاَتْقِيَاءِ اِمَامُ جُمُوعِ اَكَابِرِ

اِذْ كَرَّ فِي الْمَعَامِعِ كَالْبَرْقِ خَاطِفًا — وَالْقَاعُ اَضْحَتْ بِقِدَاحِ الْحَوَافِرِ

يَفْرِي كُلَّ فَوَارِسِ جَيْشٍ عَرَمْرَمٍ — بِالذَّابِلِ الْمُتَقَصِّفِ تَحْتَ الْخَوَاصِرِ

اے آفتاب چرخ جلالت کہ یکنفس — بر ذرہ ہائے خویش بکن سایہ گستری

شاہا ز نور روئے تو خورشید ذرہ ایست — ہم بحر قلزم از کف جود سنی بود تری

از لطف خویش لمعہ فگن تا عیان شود — قلب سیاہ من چو رخ مہر خاوری

گر باز صفائے خاطر پاکت نمی چکد — از روئے ژاله جلوه کند تاب گوهری
بر اوج بارگاه مدیحت ستاده ام — چون کعب نغمه سنج به نعت پیمبری

دارد امید با تو روان حزین من
تا بر سرم ز لطف و کرم سایه گستری

غزلیات

(۱)

بے رخ رنگین نگه در چشم دیدن داغ شد — بی لب نوشین سخنها در شنیدن داغ شد
بر طپیدن ہائے خود داریم پاس زندگی — چون شرار این نقطهٔ دل در آرمیدن داغ شد
پرتو آئینهٔ تابِ رخ زیبائے کیست — اشک در مژگانم که هنگام چکیدن داغ شد
نازم از شادابی دل کز نسیم عشوه اش — شاخ سبزے این گلستان در دمیدن داغ شد
در چمن افسانهٔ طرز خرام ناز کیست — سرو از آرایش قامت کشیدن داغ شد

این جواب آن غزل نفسی که بیدل گفته است
تا جدا شد دل ز آغوش طپیدن داغ شد

(۲)

خالی از خویشم و صد آفت جانم دادند — همچو نی زندگی از آه و فغانم دادند
تلخی تیرگی از ذوق دلم بیرون رفت — ساغر جم ز کفِ پیر مغانم دادند
شمع سان خامشیم روشنی دل افزود — چون زبان راهبر بند بیانم دادند
چشم بستن خضر منزل مقصود دل است — در شب این جرعهٔ آب حیوانم دادند
صورت نغمه بهر پردهٔ آهنگ یکیست — ذوق تسبیح بنا قوس بتانم دادند
ناله از تیرگی بخت ز من کس نه شنید — سرمه در کام فشاندند و فغانم دادند
شمع رازِ دلِ من رنگ ز اظهار نه بست — گه بیانم بربودند و زبانم دادند

سینہ ام ہر نفس آئینۂ صد برق بلاست ... دل نہ دادند مگر آفتِ جانم دادند
فارغ از تاب وتب وغصہ اغیار شدم ... دل ربودند وز آزار امانم دادند

از سخن زندہ جاوید بنام شمسی
دل نہ دادند کہ آبِ حیوانم دادند

(۳)

اضطراب دل بسوز در شتہ تدبیر را ... بر ہدف کے میرساند دست لرزان تیر را
یک نفس دیوانۂ زلف تو گر پامی نہد ... نالہ از وحشت گزارد حلقۂ زنجیر را
شوخی دل دامنش بگرفت وخشم آلود رفت ... ہر کس افشاند ز دامن خار دامنگیر را
زلف بر دوش آن غزال شوخ می آید بدست ... دام آہو میکشد صیاد آہو گیر را
کس چہ می داند کہ دارد خون فرہادی بسر ... بامدادان می نماید صبح جوئے شیر را
کشتۂ نازت کہ زینسان زندہ گردد ہر نفس ... می شمارد موجۂ آبِ بقا شمشیر را

قصرِ شمسی را کہ بر عمرِ رواں بر بستہ اند
نقش بر موج روان کردند این تعمیر را

سید محمد

مبادی فلسفہ

از

مولوی میر حسن الدین صاحب بی، اے، ال ال بی، وکیل عدالت عالیہ

اگر آپ فلسفہ جیسے مشکل اور ادق مضمون کو آسان سے آسان صورت میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو مبادی فلسفہ پڑھیئے جو راپوپورٹ کی شہرہ آفاق کتاب پرائمر آف فلاسفی کا ملخص و بامحاورہ اردو ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتا :۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدر آباد دکن

ایک تعزیتی مشاعرہ

ذیل کی نظمیں حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں جو حضرت شمسی کی وفاتِ حسرت آیات کی تعزیت میں تسکین صاحب کے مکان واقع کاچی گوڑہ پر منعقد ہوا تھا بانی مشاعرہ بھی یہی بزرگ تھے فارسی کا طرح مصرع "ای اہل ملک شمسی شیریں بیاں کجا است" اور اردو "زیرِ زمیں غروب ہوا آفتابِ علم" تھا شعرا اور اہل علم کا کافی مجمع تھا۔ اکثر نظمیں (جن کا انتخاب ذیل میں پیش کیا گیا ہے) پُردرد و موثر تھیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔

(مجلہ مکتبہ)

شمسیِ شیریں بیاں کجا است!

(از جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی بی۔اے)

تا زیرِ پا زمین است فراغ از زماں کجا است   آنجا کہ نیست بر سرِ ما آسماں کجا است
ہر کس نشیمن از ستم ہفت اختر است   آن رشتہ کہ سر کند این ہفت خوان کجا است
بحرِ جہاں مقامِ ثبات و قرار نیست   لنگر بہ بازگشتی عمرِ رواں کجا است
اے تشنگان بادہ الفت نشان دہید   آن ساقی کہ بود بما مہرباں کجا است
اے عندلیب بستہ زبان ماجرا بگو   آن گل کہ بود رونق این گلستاں کجا است
یعنی بگو کہ طوطیِ شکر شکن چہ شد   یعنی بگو کہ شمسیِ شیریں بیان کجا است
گم گردہ اند راہ ہمہ طالبانِ علم   آن رہنما و راہبرِ طالبان کجا است
صد عقد ہائے علم و ہنر نا کشودہ ماند   آنکس کہ می کشاد بہ ہر فن زبان کجا است
سبز شاخسارِ سدرہ و جز گلستانِ قدس   اے عندلیبِ علم ترا آشیاں کجا است
شمسی ز خوانِ بخشش و رحمت نصیب برد   یا رب نصیبِ محوی افسردہ جان کجا است

وفات شمسی پر خونتابہ فشاں اشک ریزی

(از جناب سید محمود صاحب صفوار آرائش ملیح)

(۱)

اک طلسم بزم پر اسرار حکمت علم ہے — اک راہ منزل مقصود قدرت علم ہے

اہل بینش کے لئے شمع ہدایت علم ہے — رہنمائے کاروان نقش فطرت علم ہے

علم ہی میں ہے جو کچھ ہے راز تفصیل حیات

علم ہے وہ کتاب شرح تکمیل حیات

ملتیں جو بام رفعت پر نظر آتی ہیں آج — باوجود اختلاف رنگ و ترکیب مزاج

ہند کا سوراج ہو یا چین کا آزاد راج — زیر بار علم ہیں سب ملک سارے تخت و تاج

آسانی راز حکمت کا خلاصہ علم ہے

اوج بام اوج فطرت کا سراپا علم ہے

ہو نشاط لطف منظر یا سرور بے کشاں — ہیں چمن کے رنگ پر موقوف ساری مستیاں

پھول جب ہوتے ہیں نازاں یہ صد گلستاں — آبیاری گر کرے اک ماہر فن باغباں

پتہ پتہ سے ٹپکتی ہے بہار رنگ و بو

ہر شگوفہ اس کا ہوتا ہے شرار رنگ و بو

آہ اے شمسی وجود فیض بخش ناز علم! — اے سراپا نغمۂ تار رباب و ساز علم!

اے نگار بزم فن اے شاہد جانباز علم! — ملک پر تو نے کئے ہیں منکشف وہ راز علم!

ہو گئی انسانیت پیدا سلیقہ آ گیا

فیض صحبت سے ترے کس کس کو کیا کیا آ گیا

آج تو گم ہے گر دنیا میں تیرا نام ہے — تیری علمی خدمتوں کا واہ کیا انجام ہے

تو مٹا ہے اور نہ مٹنا تیرا آساں کام ہے — موت تیری خود بقائے زیست کا پیغام ہے

تو کبھی جب تک کہ ہے تفسیر مر سکتا نہیں

تجھ کو آسانی سے عالم محو کر سکتا نہیں

مل گیا تھا قوم کو قسمت سے ایسا اک گہر — کارنامہ جس کا ہے خورشید تابندہ تر

قوم وہ خوش بخت ہے جس میں ہوں ایسے باہنر
مفتخر وہ ملک پیدا جس میں ہوا ایسے بشر

تھی سراپا اک ہدایت کا ورق اس کی حیات
اہلِ دل کو تھی بصیرت کا سبق اس کی حیات

ہو گیا ہے خاک میں دفن آج اک فخرِ زمیں
وقفِ اجزائے پریشاں ہے وجودِ علم و فن

یاد آتی ہے وہ بزمِ عشرتِ عہدِ کہن
اب وہ ہے اور نہ وہ آباد اس کی انجمن

وہ نہیں لیکن ہیں باقی اس کی عظمت کے نشاں
تذکرے اس کے رہیں گے مدتوں وردِ زباں

اے علمبردارِ شانِ حسنِ احکامِ عمل
تھا تری صورت سے ظاہر تیرا انجامِ عمل

سازِ تیرے نطق کا گویا تھا اک الہامِ عمل
اب بھی نغمے پھر رہے ہیں لیکے پیغامِ عمل

گا کے مطرب ساز رکھ دیتا ہے جب زیرِ فلک
گونجتا رہتا ہے اک نغمہ فضا میں دیر تک

تابشِ خورشید کہیے یا کمالِ نورِ علم
یا چراغِ زیرِ داماں جمالِ طورِ علم

رہگذارِ جلوہ مستانہ منشورِ علم
یا معارف آشنائے جذبہ منصورِ علم

ذرہ ذرہ اس کا تھا کیفیتِ جذباتِ علم
گوشہ گوشہ اس کا تھا طوفانِ محسوساتِ علم

اے کمالِ بزمِ عرفانِ سلف کی یادگار
تجھ سے تازہ تھی بہارِ یادِ دورِ خوشگوار

وہ مروت وہ محبت وہ ترا اخلاص پیار
کون تھا جو تیرے احساں کا نہیں تھا زیرِ بار

حبِ جاہ و مال سے فطرت تری بیگانہ تھی..
ہستیِ دنیا ترے نزدیک اک افسانہ تھی

کتنے ذرے اس کے نورِ علم سے پرنور ہیں
بادۂ علمی سے کتنے آج دل مخمور ہیں

کتنے سینے آج اس کے فیض سے معمور ہیں
کتنے ہیں جو اس کی نسبت سے یہاں مشہور ہیں

فیض اس کا عام تھا تھی سب پہ چشمِ التفات
جمع تھے محمود اس میں سب بہ اللہی صفات

نالۂ فراق شمسی

(۲)

امید کے خلاف یہ کیسا سماں ہے آج　　کہیے کہاں وہ شمسی شیریں بیاں ہے آج
خواب و خیال ہوگئی وہ بزم علم و فن　　اب وہ زمیں رہی ہے نہ وہ آسماں ہے آج
وہ چارہ گر بجا ہے مسیحا اگر کہیں　　وہ دردمند قوم کا درماں کہاں ہے آج
وہ مصدرِ فنون و کمالاتِ علمیہ　　سرمستِ فیض عالم عرفاں کہاں ہے آج
تھا مست جس کے ذوق سے ہر شعبہ علم کا　　وہ رمز دانِ معرفتِ حق کہاں ہے آج
کیا انقلاب قوم بتاؤں میں ہم نشیں　　گردش میں خود ہی گردشِ دورِ جہاں ہے آج
اے ناسپاس قوم ترا ضبط مستقل　　کیوں زیر بار نالہ و آہ و فغاں ہے آج

یہ صاف آ رہا ہے نظر انقلاب علم
دکھلا گئی ہے آج سے بس قوم خواب علم

وہ فخر قوم عالم دوراں کدھر گیا　　کیا ہو گئی وہ بزم وہ ساماں کدھر گیا
کل تک تھی دھوم جس کے فضائل کی چار سو　　تھا قوم میں جو ایک ہی انساں کدھر گیا
وہ صدر بحوم نازشِ اربابِ علم و فن　　دریائے فیض منبع احسان کدھر گیا
تھا نور بار جس سے جہانِ فروغ علم　　وہ شمس قوم شمسی تاباں کدھر گیا
اے شمع تو بھی رات کو سرگرم رقص تھی　　بتلا وہ تیری بزم کا مہماں کدھر گیا
کیا ہو گیا وہ مرشدِ اربابِ باصفا　　نور چراغ جادۂ ایماں کدھر گیا
آبا صالحین کی ظاہر تھی جس سے شان　　آنکھیں ہیں جستجو میں وہ ذیشاں کدھر گیا

یا یوں برس رہا تھا برابر سحاب علم
یا منقطع ہے سلسلۂ اکتساب علم

غروب آفتاب علم

(از جناب سید عبدالکریم صاحب [illegible])

کیوں آج ہو رہا ہے بپا انقلاب علم　　آنکھوں میں پھر رہا ہے زوال شباب علم

تاریک ہو رہا ہے جہاں کیوں نگاہ میں / وہ کون تھا جو ڈوب گیا آفتاب علم

آواز دی یہ دل نے کہ علامۂ جہاں / شمس العلوم اشرف عالیجناب علم

جس کی خوشی علامت خوشنودیٔ علوم / تھا جس کا اک عتاب کمال عتاب علم

جس کا خیال آئینۂ جلوۂ کمال / جس کا کمال تاب دہ آب و تاب علم

تھا گرچہ وہ ضعیف ہماری نگاہ میں / پر تھا اسی کے دم سے عروج شباب علم

اے آسمان علم و فضیلت ترے نثار / پیدا کئے ہیں تو نے کئی آفتاب علم

یوں چھپ گیا ترا تن مجروح خاک میں / پارینہ جس طرح متبرک کتاب علم

افسوس تیرے بعد کہاں سن سکیں گے ہم / اب وہ مناظرے وہ سوال و جواب علم

تھی فیض بخش علم و ہنر تیری زندگی / گویا برس رہا تھا دکن پر سحاب علم

بحر العلوم و اشرف و علامۂ زماں / زیبا ہر ایک تیرے لئے تھا خطاب علم

صحبت کا تیری جس کو میسر ہوا شرف / ناکامیاب علم ہوا کامیاب علم

وہ کمسنی وہ فقر و توکل وہ ذوق شوق / کن آفتوں سے تو نے کیا اکتساب علم

میت پہ تیری اہل فضیلت تھے بیقرار / مرنے پہ تیرے دیکھ لیا پیچ و تاب علم

جس نے کیا تھا ضیغم پنجاب کو خموش / خاموش کیوں ہے آج وہ حاضر جواب علم

ہر سو نسیم فیض کی تھیں عطر بیزیاں / کھنچتا تھا تیری بزم میں عطر گلاب علم

اے نور اس کا کرتا ہے دشمن بھی اعتراف
کہتا ہے گر کوئی در شمسی کو باب علم

یاد شمسی

از مولوی محمد سعادۃ اللہ خاں ہوش مولوی کامل

بحر العلوم عارف سر کتاب علم / علامہ اشرف العلما آفتاب علم

دیکھی ہوئی تھی نقشۂ معارف کا جس کی آنکھ / گزرا ہوا تھا جس کی نظر سے نصاب علم

تعلیم جس کی وہ کہ جھڑی اک لگی ہوئی / فیضان جس کا وہ کہ برستا سحاب علم

دروازے سیکڑوں کے تھے جس کے کھلے ہوئے / بٹتی تھی جس کے در سے ہمیشہ شراب علم

کس کی زمینِ دل پہ شعاعیں نہیں پڑیں / پر تو فگن کہاں نہ رہا آفتابِ علم
چھو ہی لیا ترے یدِ طولیٰ نے آفریں / گو آسمان سے بھی تھی اونچی جنابِ علم
ہمت نے تیری دوشِ اشاعت پہ رکھ دیا / رکھی ہوئی تھی طاق پہ کب سے کتابِ علم
تحقیق تیری صدر نشینِ کمال و فضل / تیرا بیان مصرعِ موزونِ بابِ علم
کھیتوں کو لہلہا دیا دریا بہا دیئے / کیا ہی امنڈ امنڈ کے برسا سحابِ علم
لاکھوں میں ایک اور ہزاروں میں انتخاب / تجھ پر تھی اس لئے نظرِ انتخابِ علم
تفسیر تیری شاہدِ رعنائے معرفت / تاویل تیری محملِ سلسلے دابِ علم
جس کا ہر ایک لفظ ہے یاقوتِ آبدار / نقطہ ہر ایک لفظ کا دُرِّ خوشابِ علم
جس کا ہر اک ورق ہی نہالِ رموز ہیں / جس کی ہر ایک سطر ہے شاخِ گلابِ علم
بہتا رہے گا چشمۂ فیضانِ علم و فن / جاری رہیں گے یوں تو دروسِ کتابِ علم
لیکن وہ تیری بات کہاں جامع الکمال / گو ہستیاں بہت ہیں فضائل مآبِ علم
مرقد پہ تیری رحمتِ باری کا ہو نزول / جب تک کہ طالبین کریں اکتسابِ علم
رویا کریگا ہوش ترے افتراق میں / جب تک رہے گی سامنے اس کے کتابِ علم!

آہ مولانا شمسی!

ازجناب نواب محمد بہادر خاں صاحب خلیق جاگیردار

ہم کس کو تیرے بعد کہیں آفتابِ علم / اے فخرِ قوم شمسی عالیجنابِ علم
سینہ میں تیرے سرِّ معارف تھے بے شمار / گنتی کہاں کی اور کہاں کا حسابِ علم
ساقی کا اپنے سب پہ برابر رہا کرم / بٹتی رہی ہے سب میں برابر شرابِ علم
دنیائے علم میں ہے قیامت کا اضطراب / مشرق میں ہو رہا ہے غروبِ آفتابِ علم!
کیوں زیر و بم سے خالی فضائے کمال ہے / کیا تیرے ہاتھ ہی کے لئے تھا ربابِ علم!
تجھ میں علوم ظاہر و باطن ہوئے تھے جمع / لاریب تیری ذات تھی لب لبابِ علم!
ہے ہوش ہم میں ما صفت جلوہ گر مگر / تجھ کو کہاں سے پائیں ہم اے آفتابِ علم
اب خلیق کس کے سامنے پھیلائے جا کے ہاتھ
ہے تین پشت سے وہ ترا فیضیابِ علم

حضرت شمسی کا طرزِ اصلاح

از

جناب سید مودود احمد صاحب تشنہ وخفائی ۔

اِن آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا ۔ داغ

حال ہی کی بات ہے کہ ایرانی گلی اور کوچہ نسیم میں جو جمگھٹے رہتے تھے ۔ وہ خواب وخیال ہوگئے ۔ اور طرفہ یہ ہے کہ اُس مجلس میں بیٹھنے والے ، ان بزرگوں کے دیکھنے والے ، غرض ۔ اب ان پر ماتم کرنے والے ، ایک ہم اور ایک میر رحمت علی رفیق باقی رہ گئے ۔ اور بس ۔ سچ ہے

ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا ۔

ہماری فارسی شاعری کی ابتدا ۱۳۴۰ھ سے ہوئی ۔ اور ایک ایسے مقام میں جہاں روشن خیالی نیچریت، اور روشن ضمیری دہریت، اور وسیع النظری لامذہبی کے مترادف تھی ۔ وہاں بیک وقت ایک ہی جلسے میں اتفاقاً دو غزلیں ہوگئیں مقطع میں تخلص کی نئی اپج پر غور کرتے رہے ۔ سوائے خافی ۔ خفی ۔ مخفی ۔ چوتھا یاد نہ آتا تھا کہ اتفاقاً غالبؔ کا شعر زبان پر جاری ہوگیا ۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ   میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ہم نے اس کو فال نیک سمجھا اور جانا کہ خود غالبؔ ہدایت فرمارہے ہیں کہ خفائی تخلص کرنا اور یوں بھی شہرت سے پہلے ظہوری ۔ خفائی ہی تھے ۔ بس یہی اختیار کیا ۔

تخلص کی منزل طے ہوجانے کے بعد، اُستاد کی تلاش رستم واسفندیار کے ہفت خواں سے کچھ کم دشوار نہیں تھی ، مگر ہم نے تو مولانا سید اشرف شمسیؔ کو منتخب کیا اور وہ دونوں غزلیں انہی کی خدمت میں روانہ کردیں ۔ اور عرض کی یہ پہلی کوشش ہے اگر تخلص اس کے علاوہ دوسرا مرحمت ہو تو سرفرازی ہوگی ۔

مولانا نے تو اصلاح فرمادی لیکن تخلص وہی برقرار رکھا ۔ ایک عرصے کے بعد بلدہ آنا ہوا اور

موقع بموقع غزلیں پیش کی جاتی رہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ روزانہ ایک غزل اگر چھ مہینے تک دکھلاتے رہو گے تو تم کو اصلاح کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں نے عرض کی کہ یہ ناممکن ہے بہرحال جب کبھی پرچہ پیش کیا جاتا تھا۔ محبت اور بزرگانہ نوازش سے ملاحظہ فرماتے۔ افسوس ہے کہ سرمایۂ موجودہ میں صرف دو غزلیں اور چند متفرق اشعار رہ گئے جو اصلاح پا نہ سکے۔ اب سوچ رہے ہیں کہ اس بے تکلفی سے ہم کس کے پاس جائیں۔ اور کون محبت و نوازش سے ہمارے اشعار بنانے والا ہے ہماری اضلاع کی شترگردی، جو حضرت موصوف کے انتقال سے کچھ عرصے بعد ختم ہوئی اسے سوء اتفاق نہ کہیں تو کیا کہیں شمسی نمبر کی اطلاع کپل میں ملی۔ اور پھر تبادلہ ہوجانے سے وہاں کچھ بھی لکھ نہ سکے۔ اب معلوم ہوا۔ تو رواروی میں یہ چند سطریں حاضر ہیں۔ معزز قارئین معاف فرمائیں۔

ذیل میں چند اشعار اصل و اصلاح شدہ پیش ہیں جن کے ملاحظہ سے ہمارے نقشِ تخیل اور حضرت مرحوم کے طرزِ اصلاح کا بخوبی اندازہ ہوگا۔ وہو ہذا:

غزل

(۱)

اصل	اصلاح
نیست جز یادِ تو کارِ دلِ من	ہست تا یادِ تو یارِ دلِ من
نام تو ہست قرارِ دلِ من	
زان کہ در ہر دو جہان کارے نیست	
گشت مذکورِ تو کارِ دلِ من	ہر نفس یادِ تو کارِ دلِ من
جلوۂ طور دگر بار کلیم	
گشتہ است دار و مدارِ دلِ من	بو کہ بیند بشرارِ دلِ من

اصل	اصلاح
(۲)	
ناخوشش وخوش روزگارے داشتم حسرتِ پروردگارے داشتم	بر مشیت طرحِ کارے داشتم
یاد ایامے کہ یارے داشتم ہم نوائے ہم کنارے داشتم	دل نوازے غم گسارے داشتم
از چہ پرسی وصف جانان بوالہوس گلعذارے غم گسارے داشتم	رشکِ گلرویان نگارے داشتم
گرد اسیر عمر صیاد ازل خوش بہ طوبیٰ شاخسارے داشتم	ورنہ بر طوبیٰ قرارے داشتم
التہاب سوزشِ عشقم بسوخت طبع موسیقا روارے داشتم	چون سمندر صد شرارے داشتم
در کنارِ یار جنت بودہ است باعجب باغ و بہارے داشتم	در کنارِ یار بودم در بہشت
باز آمد موسم گل ساقیا توکجائی از تو کارے داشتم	توکجائی با تو کارے داشتم
شد خفائی آن دل و مدت گذشت خاکسارے جان نثارے داشتم	آن دلِ مونس خفائی ہم نماند

اردو کے اسالیب بیان

مصنفہ مولوی سید غلام محی الدین زور ایم ۔ اے ، پی ، ایچ ڈی (لندن) نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشاپردازوں کے حسن اسالیب بیان پر تبصرہ ۔ ضخامت (۲۰۴) صفحے پاکٹ اڈیشن ۔ قیمت مجلد (عہ) مکتبہ ابراہیمیہ مداد باہمی حیدرآباد دکن

تنقید

مبادیاتِ سائنس از مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب بی، اے، بی ٹی، مددگار سٹی کالج۔ درسی تقطیع ضخامت (۱۲۸) صفحات، قیمت (۱۲/) ۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

مولفِ کتاب ہذا جناب محمد عبدالحفیظ صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ سائنس کے طیلسانی اور ایک تجربہ کار مدرسِ سائنس ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے دیباچے میں بتایا ہے مختلف مدارس فوقانیہ میں انہیں سائنس کی تعلیم دینے کے بعد جو تجربات حاصل ہوئے ان کے پیش نظر انہوں نے یہ مفید اور دلچسپ کتاب تالیف کی۔ اس میں سائنس کے مبتدیوں کے لیے خاصا مواد جمع کیا گیا ہے۔ اور سائنس کے ابتدائی اصول و مبادیات ایک ایک کر کے جدید طریقۂ تعلیم پر تفہیم کرائے گئے ہیں۔ اردو میں خالص علمی اور سائینٹفک کتابوں کا جس قدر فقدان ہے، اس کے مدنظر جناب حفیظ صاحب کی یہ کوشش نہ صرف طلبہ کے لیے غیر معمولی طور پر کار آمد بلکہ بطور خود بھی لایقِ تحسین ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام سائنس کی متعدد اعلے درسی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور اس مضمون سے متعلق اصطلاحات بھی اردو میں ترجمہ کر لی گئیں مگر نہ اربابِ جامعہ اور نہ متعلمینِ شعبۂ سائنس نے ان اصطلاحوں کو عام کرنے کی کوشش کی اور آج جامعہ عثمانیہ قایم ہو کر کوئی پندرہ برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر جامعہ میں ترجمہ ہو چکی ہیں مگر جامعہ کی چار دیواری کے باہر ان سے کوئی واقف نہیں۔ ہندوستان کے کسی صوبے میں جائیے بمشکل کوئی ادارہ ایسا ملے گا جسے جامعہ عثمانیہ کی ان کوششوں کا علم ہو مختلف صوبجات ہند میں سائنس اور دیگر مضامین اردو میں پڑھائے جانے لگے ہیں مگر وہاں کے مدرسین اور اہل علم بھی اس کوشش سے قطعاً ناآشنا ہیں جو یہاں سرکار عالی کی بے نظیر فیاضی سے عمل میں آرہی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولفِ مبادیات سائنس نے بڑا کام کیا ہے۔

حافظ شیراز از مولوی سید یوشع صاحب بی، اے (علیگ)، درسی تقطیع ضخامت (۶۹) صفحات

قیمت (۸ر) ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۔

خواجہ حافظ مشرق کے وہ مقبولِ انام شاعر ہیں جن کی شہرت مشرق سے گزر کر آج سارے مغرب میں بھی پھیل گئی ہے ۔ مشرق کی ان چیدہ ہستیوں میں جن کے افکار صدیوں سے اہلِ عالم کے قلوب مسخر کیے ہوئے ہیں، ایک خواجہ صاحب بھی ہیں جن کا دیوان ہر ملک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی طور پر قبولیت رکھتا ہے ۔ اردو میں بھی دیوان حافظ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں ۔ کئی سوانح عمریاں تالیف ہوئیں ۔ انگریزی اور فرانسیسی سے بھی اس عنوان پر بعض مضامین کے ترجمے شایع ہوئے ۔

یہ ایک نئی اور تخلیقی چیز ہے جو جناب یوشع صاحب نے پیش کی ہے ۔ مقالہ نگار نے اس امر کی کامیاب کوشش کی ہے کہ شاعر کو صرف اُس کے کلام کی روشنی میں پیش کیا جائے جیسا کہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "حافظ اپنی شاعری میں مبالغہ بھی کر جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اصل حقیقت کی طرف رہنمائی میں دقت پیش آتی ہے" مولف کے بعض افکار و خیالات کلام کی روشنی میں تو بالکل صحیح مگر تاریخ و سیر کی روشنی میں محتاجِ توثیق رہ جاتے ہیں ۔ مولف مقالہ نے بڑی دلچسپ کوشش کی ہے اور کلام حافظ کا متجسسانہ مطالعہ کر کے بڑی کار آمد باتیں نکالی ہیں ۔

مضامین فرحت حصّہ دوم

از مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی مددگار دفترِ معتمدی امورِ عامہ حیدرآباد ۔ ڈبل کراؤن تقطیع ضخامت (۱۹۱) صفحات قیمت (عہ/) ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۔

مرزا الم نشرح (مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب) اردو دنیا میں اپنے ظریفانہ نیز محققانہ مضامین کے ذریعہ خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔ یہ مرزا صاحب کے نئے اور پرانے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ابتدا و انتہا کی دو تمہیدی و اختتامی سرخیوں سے قطع نظر بارہ ۱۲ مضمون ہیں ۔ ان میں حکیم آغا جان عیش دہلوی والا مضمون بڑی علمی تحقیق کا نتیجہ ہے "بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر" اور "ایک وصیت کی تعمیل" اسلوب بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے بڑے مقبول مضمون ہیں ۔ باقی مضامین ان کے بعد ہیں مگر بعض فی نفسہ بہت اچھے ہیں ۔

ہندوستان کا سب سے سستا، دلچسپ اور مفید مشہور و معروف ماہوار رسالہ

باتصویر

نیرنگ دہلی

جسکے اعلیٰ و دلکش افسانوں، وجد آفریں ڈراموں، پرکیف نظموں اور مفید علمی مضامین اور حسین و رنگین تصاویر کو ملاحظہ فرما کر اکابرین ادب کا فیصلہ ہے کہ ؎

"نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز"

لیکن ہم اس اصول کے خلاف احتجاجی طور پر خدمت زبان و ادب کو ملحوظ رکھکر بالکل جدید فیصلہ کر چکے ہیں۔ اسوقت "نیرنگ" کی اشاعت اُسکے معاونین کی توجہ و عنایات سے اسقدر ہے کہ خرچ اور آمدنی کا حساب برابر ہے۔ چونکہ ہمارے لائحہ عمل میں صرف خدمت زبان و ادب شامل ہے تجارت نہیں ہم اشاعت کے اضافہ کیساتھ خوبیوں کا اضافہ کر کے چندہ بڑھانے کے اصول کو نظر انداز کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ضخامت اعلیٰ سے اعلیٰ طباعت و کتابت اور دلکشی اور دلچسپی کے مرغوب سامان پیدا کر کے کم سے کم چندہ میں رسالہ پیش کرنا خدمت ادب سمجھتے ہیں۔ کہ اشاعت کی زیادتی سے خرچ کی کمی کو پورا کیا جائے۔ اور عوام و خواص برابر کا فائدہ علم و ادب سے اٹھا سکیں۔ اسلئے یہ انقلابی پروگرام مرتب کیا گیا ہے کہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء سے نیرنگ کا سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنہ کی بجائے صرف دو روپیہ جسکی ضخامت تقریباً چار جزو ہے پانچ چھ دلربا تصاویر رنگین ٹائٹل اور عام فہم وجد آفریں مضامین۔

آئندہ ان تمام خوبیوں میں کافی اضافہ منظور کیا جا رہا ہے۔ اور سائز بھی بڑھائے جانیکا فیصلہ ہے۔

سال میں کئی خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جلد چندہ بھیجیے نمونہ کا پرچہ ۳ کے ٹکٹ بھیجکر منگائیے۔

اور جلد سے جلد اس عجیب و غریب موقعہ سے فائدہ اٹھائیے۔

خادم ادب

جنرل منیجر نیرنگ دہلی